وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا

درسِ حدیث

زندگی کے بنیادی مسائل اور ان کے حل کے لئے مستند احادیث کا خوبصورت مجموعہ

علماء، خطباء، طلباء اور عامۃ النّاس کے لئے بہترین ذخیرہ

تالیف

مولانا حافظ فضل الرحیم اشرفی مدظلہ العالی

نائب مہتمم و استاذ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور

خلیفہ مجاز

حضرت ڈاکٹر محمد حفیظ اللہ مہاجر مدنی رحمہ اللہ

اقرا اشرفیہ کمپنی (رجسٹرڈ)

تقریظ

حضرت مولانا عبد الرحمٰن اشرفی صاحب مدظلہ العالی

نائب مہتمم وشیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین ۔ اما بعد

مولانا حافظ فضل الرحیم اشرفی حفظہ اللہ نے کم وبیش اٹھارہ سال سے درس حدیث پر جو محنت فرمائی ہے وہ آپ حضرات کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے مجھے یقین ہے کہ اس کے پڑھنے والوں کو فائدہ ہوگا ۔اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کے اندر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کی عظمت ڈال دے۔ میں اکثر جمعہ کے خطاب اور دیگر مواعظ میں اس بات کو بار بار بیان کرتا ہوں کہ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بغیر نہ ہم قرآن سمجھ سکتے ہیں اور نہ دین سمجھ سکتے ہیں ۔ساری دنیا کے علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ احادیث رسول کا انکار کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

قارئین کرام احادیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس عظمت کو دل و دماغ میں بٹھاتے ہوئے اس کتاب کا مطالعہ کیجیے۔اس میں مختلف موضوعات پر جمع کی ہوئی احادیث مبارکہ ہیں جو زندگی کے تقریباً ہر شعبہ میں آپ کی راہنمائی کریں گی ۔اے اللہ ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ، سچی محبت اطاعت اور شفاعت نصیب فرما۔ مؤلف کتاب اور اسکے معاونین کیلئے دارین کی سعادتیں نصیب فرما(آمین)

محتاج دعا

عبد الرحمٰن اشرفی عفی عنہ

(جمعہ ۲۴ ربیع الاول ۱۴۲۸ ہجری)

تقریظ

حضرت مولانا حافظ قاری محمد عبید اللہ صاحب دامت برکاتہم
مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ۔ اما بعد

زیر نظر کتاب ''درس حدیث'' جو عزیزم مولوی حافظ فضل الرحیم سلمہ نے ماہنامہ ''الحسن'' میں درس حدیث کے عنوان سے کم وبیش اٹھارہ سال میں ترتیب دی ہے۔ گاہے گاہے اسکا مطالعہ نظر سے گزرتا رہا۔ امید ہے کہ یہ عظیم ذخیرہ قارئین کیلئے بہت مفید ثابت ہوگا۔

دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حدیث پر لکھی ہوئی اس کتاب کو قبولیت عطا فرمائے اور مولف کتاب اور انکے معاونین کے لئے صدقہ جاریہ بنائے (آمین)

محتاج دعا

محمد عبید اللہ عفی عنہ

۲۶ ربیع الاول ۱۴۲۸ ہجری

فہرست مضامین



ایمان اوراس کی طاقت

عَنْ عُبَادَۃَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم یَقُوْلُ مَنْ شَھِدَ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰہِ حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ النَّارَ. (رواہ مسلم)

ترجمہ۔''حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ میں نے خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سنا ہے، آپ ارشاد فرماتے تھے، کہ''جو کوئی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت و بندگی کے لائق نہیں ہے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں، تو اللہ نے اس شخص پر دوزخ کی آگ حرام کر دی ہے۔''

ہم اور آپ روزانہ پانچ وقت کی نماز میں کئی بار سورہ فاتحہ پڑھتے ہیں جس میں بار بار اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگتے ہیں: **اھدنا الصراط المستقیم** ۔اے اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا اور پھر سیدھے راستے کی تشریح بھی زبان پر لاتے ہیں **صراط الذین انعمت علیھم** یعنی ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا۔

معلوم ہوا کہ ہمیں صراط مستقیم کو تلاش کرنے کے لیے ان لوگوں کے بارے میں آگاہی حاصل کرنی ہوگی جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا یا جنھیں اللہ رب العزت نے انعام کا مستحق قرار دیا چنانچہ اس وقت بات ایمان لانے والوں کے متعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے کیا انعام مقرر فرمایا۔

مشکوٰۃ شریف میں کتاب الایمان کی پہلی حدیث جو حدیث جبرئیل کے نام سے محدثین کے نزدیک مشہور ہے۔ اس میں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے سوال وجواب کے ذریعہ صحابہ کرام کو دینی تعلیمات سے آگاہ کیا ان سوالات میں ایک سوال حضرت جبرئیل علیہ

السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرمایا **اخبرنی عن الایمان** کہ مجھے ایمان کے بارے میں بتائیے کہ ایمان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: **ان تؤمن باللہ وملٰئکتہٖ و کتبہٖ ورسلہٖ والیوم الاٰخرِ وَالقدر خیرِہٖ وَشرہٖ** یعنی ایمان کہتے ہیں اللہ اوراس کے فرشتوں، اللہ کی نازل کردہ کتابوں اوراس کے رسولوں پراور آخرت کے دن پراوراچھی اور بری تقدیر کو صدق دل سے ماننا، اگران میں سے ایک چیز کے بارے میں بھی ایمان نہ ہوتو وہ شخص مؤمن ہی نہیں رہتا۔

ایمان لانے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ **اولٰئِك هم المفلحون** یہی لوگ کامیاب ہیں۔کسی بھی انسان کے لیے آخرت میں کامیاب ہونے سے بڑا انعام اور کچھ نہیں ہوسکتا۔لیکن ایمان لانے والے کو دنیا میں بھی بہت سے انعامات میسر آجاتے ہیں بلکہ ایمان کے پانچ اجزاء میں ہر جز پر ایمان لانے سے الگ الگ فائدے نظر آتے ہیں۔

عقیدۂ توحید ہی کو لیجئے یعنی اللہ کو ایک ماننا اس بات کا ایمان انسان کو عزت نفس عطا کرتا ہے انسان جب یہ یقین کر لیتا ہے کہ اس کا خالق اور مالک اللہ ہے وہی طاقت کا سرچشمہ ہے اور وہی قادر مطلق ہے تو اس بات پر ایمان لانے کے بعد انسان صرف اللہ کے سامنے جھکتا ہے اور اسی سے ڈرتا ہے اب اس کی پیشانی انسانوں یا پتھر کی بے جان مورتیوں کے سامنے نہیں جھکتی۔

اللہ پر ایمان رکھے کے بعد انسان کو عجز وانکساری جیسی دولت انعام میں ملتی ہے کہ یہ انسان پھر اس بات پر پختہ یقین رکھتا ہے کہ اس کے پاس جو کچھ دیا ہوا ہے سب اسی مالک حقیقی کا ہے، جو خدا دینے پر قادر ہے وہ چھین لینے پر بھی قادر ہے لہٰذا بندے کے لیے تکبر اور غرور کرنے کی گنجائش نہ رہی اس لیے یہ عجز وانکساری ہی سے کام لے گا تب اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والے کو وسعت نظری کی دولت نصیب ہوتی ہے کیونکہ یہ انسان اس رحمٰن اور رحیم پر ایمان رکھتا ہے جو کائنات کی ہر چیز کا خالق ہے سب کو اپنی رحمتوں سے نوازتا ہے چنانچہ اللہ پر ایمان رکھنے والے کی ہمدردی، محبت اور خدمت کا جذبہ پوری دنیا کے لیے عام ہوجاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والے کے دل سے دوسروں کا خوف نکل جاتا ہے اور وہ بہادری اور استقامت کی خوبیوں والا بن جاتا ہے چاہے بدر کی لڑائی ہو یا حنین وخندق کی۔ ہرمؤمن کا ایمان ہوتا ہے کہ تمام ظاہراور پوشیدہ باتوں کواللہ جانتا ہے، بندہ جانتا ہے کہ میں چھپ کر بھی گناہ نہیں کرسکتا اب مومن کوتقویٰ اور پرہیز گاری اسی ایمان لانے کی بدولت نصیب ہوئی۔معاشرہ اسی وقت صحیح معنوں میں انسانی معاشرہ بن سکتا ہے جب لوگوں کے اعمال درست ہوں‘انسان کے تمام اعمال اس کے دل کے تابع ہوتے ہیں اگر دل میں ایمان کی روشنی موجود ہوتو عمل صالح ہوگا اگر کوئی شخص زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگراس کے اعمال اچھے نہیں تو یہی سمجھا جائے گا کہ ایمان اس کے دل کی گہرائیوں میں پوری طرح رَچا نہیں۔

نیک اعمال میں اگر کوئی روکاوٹ نظر آئے تو وہ اس وجہ سے بھی ہوسکتا ہے کہ آخرت پر اس شخص کا ایمان کمزور ہے کیونکہ آخرت پر ایمان لانے سے انسان کے دل میں نیکی پر جزااور بدی کی سزا کا احساس پیدا ہوتا ہے۔اسی طرح جو شخص آخرت کی زندگی پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کی نظر اعمال کے صرف ان ہی نتائج پر نہیں ہوتی جو اس کی زندگی میں ظاہر ہوتے ہیں بلکہ وہ ان نتائج پر بھی نگاہ رکھتا ہے جو آخرت کی زندگی میں ظاہر ہوں گے چنانچہ ایمان رکھنے والے شخص کے دل میں برائیوں سے نفرت ہوتی ہے اور وہ نیک کاموں کو اس طرح ضروری سمجھتا ہے جیسے کھانا پینا، یہ تمام خوبیاں دنیا میں انسان کو بطور انعام اس وقت ملتی ہیں جب یہ شخص ایمان لاتا ہے اور پھر ایمان لانے کے تقاضے پورے کرتا ہے اور ان تمام خوبیوں اور انعامات کی بدولت آخرت میں فلاح وکامیابی کا حقدار بن جاتا ہے۔ اور یہی ہرانسان کی سب سے بڑی تمنا اور آرزو ہے۔

اللہ رب العزت ہمیں اپنے ایمان کو مضبوط بنانے کے ساتھ اس پر مرتب ہونے والے انعامات سے سرفراز فرمائے۔اورہم سب کا خاتمہ پر ایمان پر فرمائے۔آمین



ایمان کا مزہ کیسا ہوتا ہے

اور کسے نصیب ہوتا ہے؟

﴿عن انس رضی اللّٰہ عنہ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قَالَ ثَلٰثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْاِيْمَانِ اَنْ يَّكُوْنَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَاَنْ يُّحِبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهٗ اِلَّا لِلّٰهِ وَاَنْ يَّكْرَهَ اَنْ يَعُوْدَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ اَنْ يُّقْذَفَ فِي النَّارِ﴾ (رواہ البخاری، باب حلاوۃ الایمان)

''حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں فرمایا کہ جس شخص میں تین باتیں ہوں گی وہ ایمان کا مزہ پائے گا۔ ایک یہ کہ اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس کو سب سے زیادہ ہو، دوسرے یہ کہ صرف اللہ کے لیے کسی سے دوستی رکھے، تیسرے یہ کہ دوبارہ کافر بننا اسے اتنا ناگوار ہو جیسے آگ میں جھونکا جانا۔''

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کی مٹھاس کسے نصیب ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے انسان حلاوت ایمان کی منزل کو پہنچتا ہے۔ ایمان کو کسی میٹھی چیز سے تشبیہ دے کر یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ جو دل غفلت، نفسانی خواہشات اور اس قسم کے دوسرے امراض سے محفوظ اور تندرست ہیں حقیقت میں وہی ثمرات محبت اور روحانی لذتوں سے لطف اندوز ہوسکیں گے، جیسے ایک تندرست اور صحیح معدہ رکھنے والا انسان ہی اچھی غذاؤں کے اصل ذائقہ کی لذت پاسکتا ہے اور غیر صحت منداور صفراء کے مریض اچھی غذاؤں کے لطف سے محروم ہوتے ہیں، مرغوب چیزوں کو معدہ جیسے اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اسی طرح ایمان بھی قلب سلیم کے نزدیک بہت ہی شیریں اور مرغوب ہے۔

ارشاد نبوی ہوا کہ جس میں تین باتیں ہونگی وہ ایمان کا مزہ' حلاوت پائے گا، حلاوت

سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں عموماً شارح محدثین لکھتے ہیں کہ حلاوتِ معنوی مراد ہے کیونکہ ایمان کوئی حسی (محسوس کی جانے والی) چیز نہیں کہ اس کی حلاوت حسی مراد ہو، اب معنوی حلاوت کیا ہے اس بارے میں علامہ نوویؒ نے اس کو استلذ اذ بالطاعات (اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی پیروی کر کے لذت پانے) سے تعبیر کیا ہے یعنی انشراح صدر ہو جائے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں کوئی تنگی اور دل پر بوجھ نہ ہو بلکہ انبساط، خوشی اور اطمینان ہو۔

جیسا کہ ارشاد باری ہے'' پس تیرے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہونگے جب تک کہ اپنے اختلافات میں تجھے منصف نہ مان لیں پھر آپ کے فیصلہ پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں اور خوشی سے قبول کر لیں۔'' (سورۂ نساء آیت ۶۵)

چنانچہ حلاوت سے مراد یہ ہوا کہ اطاعت اللہ اور اطاعت رسول میں قلب کو شیرینی جیسی حلاوت محسوس ہو جیسا کہ حضرت مولانا گنگوہیؒ نے اپنے ایک مکتوب میں کہا جو انہوں نے اپنے شیخ حاجی امداد اللہ مکیؒ کی خدمت میں لکھا تھا کہ'' بندہ کو بحمد للہ تین چیزیں حاصل ہیں جو محض اللہ کا فضل و کرم ہے پہلی چیز یہ کہ اطراف و اکناف سے دو سو سے زائد طالب علم مجھ سے حدیث شریف پڑھ کر اپنی اپنی جگہ درس دے رہے ہیں دوسری چیز یہ ہے کہ امور شرعیہ امور طبعیہ کی مانند بن گئے ہیں یعنی امور شرعیہ کو چھوڑنے میں ویسی ہی تکلیف محسوس ہوتی ہے جیسی کہ بھوک پیاس اور دھوپ سے طبعاً تکلیف ہوتی ہے اور امور شرعیہ کی طرف ویسی ہی رغبت ہوتی ہے جیسی کہ انسان کو بھوک کے وقت میں روٹی کی طرف اور پیاس کے وقت ٹھنڈے پانی کی طرف طبعاً میلان ہوتا ہے تیسری چیز یہ کہ مادح اور ذام (یعنی تعریف اور مذمت کرنے والے) دونوں برابر معلوم ہوتے ہیں۔''

اب اس میں دوسری چیز جو حضرت مولانا گنگوہیؒ نے اپنے اس مکتوب میں لکھی ہے وہی دراصل استلذ اد بالطاعات (احکامات دین کی پیروی میں لذت پانا) ہے اس کو علامہ نوویؒ نے حلاوت معنوی فرمایا ہے۔ بعض لوگوں نے اس حلاوت معنویہ کی تشریح جزل بالایمان والقیاد الی احکامہ (ایمان پر یقین اور اس کے احکام پر خلوص سے عمل کرنا) سے کی ہے

ابن ابی جمرہ نے اس تفسیر کو فقہاء کی طرف منسوب کیا ہے۔بعض عارفین نے یہ کہا ہے کہ یہاں حلاوت معنویہ مراد لینے کی ضرورت نہیں بلکہ یہاں حسی حلاوت ہی مراد ہے' ارشاد نبویہ میں مذکور تین باتوں سے حسا حلاوت معلوم ہوتی ہے' اگر چہ ایمان باطنی چیز ہے لیکن اس کا اثر ظاہری جسم تک پہنچ جاتا ہے چنانچہ محدث عارف کبیر شیخ ابن ابی جمرہ نے منتخب بخاری پر جو شرح ''بہجۃ النفوس'' لکھی ہے اس کی جلد دوم صفحہ ۲۵ تا ۲۸ میں اس بارے میں بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ کوئی وجہ نہیں کہ یہاں حلاوت حسیہ کا انکار کیا جائے وہ لکھتے ہیں کہ'' حلاوتِ ایمان'' ایک ایسی بات ہے کہ اس کا ادراک وہی کر سکتے ہیں جو خود بھی اس مقام تک پہنچتے ہوں لہٰذا اگر تمہیں یہ مٹھاس محسوس نہیں ہوتی تو جن کو محسوس ہوتی ہے ان کو نہ جھٹلاؤ۔''

یہاں حلاوت ایمان کے لیے تین چیزوں کا ذکر کیا گیا ان میں سب سے بنیادی چیز اللہ تعالیٰ کی محبت ہے' اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ محبت کے لائق ہیں کیونکہ محبت کے تمام اسباب مکمل طور پر اللہ تعالیٰ میں موجود ہیں' اس کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور پھر تمام نیک لوگوں سے اللہ کی خاطر محبت رکھنا۔

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے عجیب وغریب نظارے صحابہ کرامؓ کی حیات میں ملتے ہیں۔ایک انصاری عورت کا باپ، اس کا بھائی اور شوہر شہید ہوئے وہ عورت آ کر پکارتی رہی ہر ایک کے متعلق یہ خبر ملی کہ وہ شہید ہو گیا اس پر اس نے کچھ نہ کہا، بعد میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خیریت دریافت کی ، لوگوں نے بتایا کہ خیریت سے ہیں تو اس نے کہا مجھے دکھاؤ تا کہ دیکھ کر یقین کر لوں جب اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیا تو کہنے لگی'' آپ کے بعد تو تمام مصیبتیں حقیر ہیں۔''



ایمان کی طاقت

(جس کی بدولت انسان بزدلی سے محفوظ رہتا ہے)

﴿عن انس قال کان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یَقُوْلُ اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْھَمِّ وَالْحُزْنِ وَالْعَجْزِ وَالْکَسَلِ وَالْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَضَلَعِ الدَّیْنِ وَغَلَبَةِ الرِّجَالِ﴾ (رواہ البخاری و مسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے ''اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں فکر سے، غم سے، اور کم ہمتی اور کاہلی و بزدلی سے اور بخل و کنجوسی سے اور لوگوں کے دباؤ سے۔''

ایمانی طاقت کی بدولت انسان کس طرح بزدلی سے محفوظ رہتا ہے تاریخ بتاتی ہے کہ غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کی بعض کوتاہیوں کی وجہ سے ابتدائی فتح کے بعد پھر مسلمانوں کو شکست ہوئی' ستر صحابہ کرامؓ شہید ہوئے' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زخم آئے مگر ان سب باتوں کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے جنگ کا پانسہ پلٹا اور دشمن پسپا ہو گئے۔

اس عارضی شکست کے تین سبب تھے۔ پہلا یہ کہ حضور ﷺ نے تیراندازی کا جو حکم دیا تھا وہ بعض وجوہات کی بناء پر اس پر قائم نہ رہے کیونکہ اس بارے میں اختلاف رائے ہو گیا' کسی نے کہا ہمیں یہیں جمے رہنا چاہیے اور بعض نے کہا اب یہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں رہی بس اب چلنا چاہیے اور سب کے ساتھ مل کر مال غنیمت حاصل کرنا چاہیے دوسرا سبب یہ ہوا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل ہو جانے کی جھوٹی خبر مشہور ہو گئی تو فطری طور پر مسلمانوں کے دلوں میں کمزوری پیدا ہو گئی جس کا نتیجہ کم ہمتی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ تیسرا سبب جو ان دو سے بھی زیادہ اہم تھا وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں اختلاف ہو گیا تھا۔ یہ تین لغزشیں مسلمانوں سے ہوئیں جس کی بناء پر انہیں عارضی شکست ہوئی۔ اس وقت مسلمان مجاہدین زخموں سے چور چور تھے' ان کے بڑے بڑے بہادروں کی

لاشیں سامنے پڑی تھیں۔ بدبخت دشمن نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی زخمی کر دیا تھا۔ مسلمانوں کو اپنی لغزشوں کا صدمہ بھی تھا لیکن یہاں ایک خطرناک بات پیدا ہونے کا خطرہ تھا وہ یہ کہ مسلمانوں کے اندر کہیں بزدلی پیدا نہ ہو جائے اور آئندہ کے لیے کمزور نہ ہو جائیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا:

﴿وَلَا تَهِنُوا وَلَاتَحْزَنُوا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُم مُّؤْمِنِيْن﴾

''یعنی تم اپنے اندر بزدلی اور سستی کو بالکل نہ آنے دو اور گذشتہ باتوں پر رنج و ملال بھی نہ کرو آخر کار تم ہی بلند رہو گے' اگر تم مومن رہے۔''

اس قرآنی آواز نے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دیا اور مرجھائے ہوئے جسموں کو جن میں بزدلی پیدا ہونے کا خطرہ تھا ان میں ایک نئی روح پھونک دی۔ بزدلی کی حقیقت کیا ہے اس کے اسباب کیا ہیں۔ یعنی بزدلی کن چیزوں سے پیدا ہوتی ہے پھر بزدلی کے نقصانات سامنے آجائیں اور آخر میں اس کا علاج عرض کیا جائے گا۔

بزدلی کی حقیقت سمجھنے کے لیے ہمیں ایک قوت کے بارے میں سوچنا ہوگا۔ جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر رکھی ہے اور وہ ہے غصہ کی قوت جسے قوت غضبیہ کہہ لیجیے اسلام نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ہر قوت کو خدا کے بتائے ہوئے طریقے پر استعمال کرو اور خدا کا بتایا ہوا طریقہ اعتدال اور میانہ روی سے کرنا ہوگا۔ اگر غصہ کی قوت کا استعمال ہر جگہ انسان اپنی مرضی سے کرے تو پھر ایک انسان اچھے بھلے معاشرہ میں بے چینی پیدا کر دیتا ہے اہل معاشرہ کی زندگیوں سے سکون رخصت ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف وہ شخص دنیا اور آخرت میں اپنے لیے سزاؤں کے انبار لگا لیتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں سورۂ آل عمران میں فرمایا۔

﴿وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ﴾

''جو لوگ اللہ کے محبوب ہیں ان کے بارے میں فرمایا کہ غصہ پر قابو رکھنے والے اور غصہ کی آگ کو بجھانے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے اللہ کو پسند ہیں۔''

واقعی یہ مومن کی شان ہے لیکن اگر غصہ کی قوت کو بالکل ختم کر دیا جائے تو پھر انسان مایوس، کم ہمت اور بزدل ہو جاتا ہے اسی سے بزدلی کی حقیقت سمجھ میں آتی ہے۔

بزدلی انسان کے اندر کیوں پیدا ہوتی ہے؟ جب ہم اس کے اسباب پر غور کرتے ہیں تو ہمارے سامنے مختلف اسباب آتے ہیں جن میں احساس کمتری، معاشرتی کمزوری، جہالت، خوف اور حرص و لالچ وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے ایک اہم چیز اور نظر آتی ہے جو انسان کو بزدل بناتی ہے وہ Frustration یا ناکامی ہے۔ دیکھئے زندگی کے ہر قدم پر رکاوٹیں ہیں کوئی بھی پلان بنائیں اسے عملی جامہ پہنانے پر ہزاروں دقتیں پیش آئیں گی لیکن ان مشکلات سے گھبرا کر بزدل نہیں بننا چاہیے بلکہ ہمت اور کوشش سے کام لینا چاہیے پلان کو زیادہ سے زیادہ خلوص کے ساتھ قابل عمل بنائیں رکاوٹیں خود بخود ختم ہو جائیں گی پھر نیا راستہ تجویز کریں پھر بھی ناکامی سامنے آئے تو بزدل نہ بنیں۔ اس لیے کہ ہمارا خالق یہ فرماتا ہے:

﴿لَا تَقْنَطُوْا مِن رَّحْمَةِ اللّٰهِ﴾

''تم اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔''

جب انسان اپنی خواہشات' اپنی مرضی پوری نہ ہوتے ہوئے دیکھتا ہے تو پھر اس کے بعد جو مرحلہ پیش آتا ہے' اس کے بارے میں یہ بات پیش نظر رہے کہ جب بھی آپ کو ناکامی کی ایسی صورت پیش آئے تو آپ فوراً اپنے Behawiovr in Frustration یعنی ناکامی کے جذباتی کردار کو چیک کریں اگر وہاں Aggression یا Angry یعنی غصہ یا دست درازی کی کوئی بھی صورت ہے اسلامی تعلیمات نے ہمیں یہی تعلیم دی ہے۔ کہ اس صورت میں اپنے اوپر قابو رکھا جائے۔

دیکھئے حضرت علی رضی اللہ عنہ جنگ کے میدان میں ہیں مسلح ہیں دشمن کو زیر کر رہے ہیں دشمن کے سینے پر سوار ہیں۔ قریب ہے کہ نیزہ اس کے سینے کے پار کر دیں کہ دشمن آپ کے چہرہ مبارک پر تھوک دیتا ہے آپ فوراً اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ دشمن حیران ہو کر سوال کرتا ہے کہ اے علی! اب تو نے کیوں چھوڑ دیا؟ اب تو مجھے ضرور مار دینا چاہیے تھا۔ حضرت علی رضی

اللہ عنہ کے جواب پر غور فرمایئے؟ فرماتے ہیں پہلے میں نے تجھے اللہ کے حکم پر عمل کرتے ہوئے قتل کرنا تھا لیکن اب اگر میں تجھے قتل کرتا تو شاید اپنے نفس کے غصہ کی وجہ سے قتل کرتا۔ معلوم ہوا کہ انسان محض اپنے غیظ وغضب کو تسکین پہنچانے کے لیے انتقامی کاروائی کرے تو وہ بزدلی ہے بہادری نہیں۔

لیکن اگر بندوں کے حقوق کا مسئلہ ہو' حقوق اللہ کا مسئلہ پیش آ جائے وہاں انسان رشوت کی وجہ سے، کسی اعلیٰ افسر کی خوشی کی خاطر یا کسی کے خوف کی وجہ سے دب جائے تو اب یہ بھی بزدلی ہوگی۔ ایسی بزدلی کے پیدا ہونے کی وجہ سے انسان میں سب سے بڑی جو خرابی پیدا ہوتی ہے وہ یہ کہ اس میں قوتِ فیصلہ ختم ہو جاتی ہے۔ ایسا انسان زندگی بھر Daydredming یا Imagination جیسی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے جنہیں خالص نفسیاتی بیماریاں کہنا چاہیے اور یہ اس انسان نے خود اپنے اندر پیدا کی ہوتی ہیں۔ اس کا علاج اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں فرمایا:

﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾

''اور تم ہی بلند رہو گے اگر ایمان دار ہو گے۔''

جہاں ایمان کی طاقت ختم ہو گی وہاں بزدلی جنم لے گی اور جب انسان ایمان اپنے اندر پختہ کر لیتا ہے اور اس کے تمام لوازمات کو پورا کرتا ہے' ان پر ثابت قدم رہتا ہے تو پھر خدا یوں فرماتا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا﴾

''یعنی جو لوگ یہ کہہ دیں ہمارا رب، پالنے والا اللہ ہے پھر اس پر ثابت قدم رہیں تو فرشتے اس پر نازل ہوتے ہیں تاکہ وہ نہ ڈریں نہ غمگین ہوں۔''

لہٰذا اگر ہمارا ایمان ہے تو یقین جانئے کہ ہمارے نزدیک بزدلی پر بھی نہیں مار سکتی اور بزدلی تو ایسی بُری چیز ہے کہ آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک فرمایا:

﴿اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْجُبْنِ﴾

''یعنی اے اللہ میں بزدلی کے بارے میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں۔''

میں بھی انہی الفاظ پر اپنی بات ختم کرنے کی اجازت چاہوں گا اور دعا کروں گا کہ اے اللہ ہمیں بزدلی سے بچا۔

☆☆☆

مومن کی شانِ صبر و شکر

﴿عن صهيبٌ قال قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم عجباً لا مر المؤمن ان امره كله خيرٌ وليس ذالك لاحدٍ الّا للمؤمن ان اصابتهُ سراء شكر فكان خيراً له وان اصابتهُ ضراء صبر فكان خيراً له﴾ (رواه مسلم)

''حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مومن بندہ کا معاملہ بھی عجیب ہے ہر معاملہ اور ہر حال میں اس کے لیے خیر ہی خیر ہے اگر اسے خوشی اور راحت پہنچے تو وہ اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہے اور یہ اس کے لیے خیر ہی خیر ہے اور اگر اسے کوئی دکھ اور رنج پہنچتا ہے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے اور یہ صبر بھی اس کے لیے خیر ہی ہے۔''

اس دنیا میں دکھ اور رنج بھی ہے اور آرام و خوشی بھی، مٹھاس بھی ہے اور تلخی بھی، خوشگواری بھی ہے اور ناخوشگواری بھی، مومن کا ایمان ہے کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے اور اسی کے حکم اور فیصلہ سے ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والے بندوں کا یہ حال ہونا چاہیے کہ جب کوئی دکھ اور مصیبت پیش آئے تو مایوسی کا شکار ہونے یا غلط طریقے سے اظہارِ غم کرنے کے بجائے صبر سے کام لیں اور اس یقین کو دل میں تازہ رکھیں کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور وہی دکھوں سے نجات دینے والا ہے۔ اس طرح جب مومن خوشی و شادمانی کے دور سے گزر رہا ہو تو اس کو اپنا کمال اور اپنی قوتِ بازو کا نتیجہ نہ سمجھیں بلکہ یہ ذہن میں رکھیں کہ یہ اللہ کا فضل و کرم ہے وہ کسی بھی وقت نعمت چھین بھی سکتا ہے اس لیے نعمت ملنے پر شکر ادا کیجیے۔

ان اسلامی ہدایات کا منطقی نتیجہ ایک طرف تو یہ نکلتا ہے کہ خوشی کی حالت میں بھی بندہ خدا سے وابستہ رہتا ہے اور دوسری طرف مصیبتوں اور ناکامیوں سے شکست نہیں کھاتا، مایوسی اور دل شکستگی سے اس کی عملی قوتوں پر بُرا اثر نہیں پڑتا۔

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابن آدم! اگر تو نے ابتدا ہی سے صدمہ کو برداشت کیا اور میری رضا اور مجھ سے ثواب کی نیت کی تو میں راضی نہیں ہوں گا کہ جنت سے کم اور اس کے سوا کوئی ثواب تجھے دیا جائے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو بندہ کسی جانی یا مالی مصیبت میں مبتلا ہو اور وہ کسی سے اس کا اظہار نہ کرے اور نہ لوگوں سے شکایت کرے تو اللہ کا ذمہ ہے کہ وہ اسے بخش دیں گے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم نزع کے وقت آپ کی گود میں تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ بھی روتے ہیں؟ آپ نے فرمایا اے ابن عوف! یہ رحمت کے آنسو ہیں اس کے بعد پھر آنسو جاری ہو گئے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آنکھیں آنسو بہاتی ہیں، دل غمگین ہے اور ہم زبان سے کوئی بات نہیں کہتے مگر جس سے ہمارا رب راضی ہو"

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "وہ شخص ہم میں سے نہیں جو رخساروں کو پیٹے، گریبان پھاڑے اور زمانہ جاہلیت کی طرح پکار پکار کر روئے۔"

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ مؤمن کی شان یہ ہے کہ وہ صدمہ اور غم ملنے پر صبر کرے۔ زبان پر شکوہ نہ لائے۔ فطرت انسانی میں جذبۂ رحم کی بنا پر آنسو نکل آئیں، یہ صبر کے منافی نہیں۔ لیکن غم کی حالت میں اظہار غم کے ایسے طریقے جو مومن کو شرعی حدود سے باہر لے جائیں کسی بھی طرح جائز نہیں اللہ تعالیٰ ہمیں صدمہ اور مصیبت سے، غم اور رنج سے محفوظ فرمائے اور اگر اس کی مشیت سے یہ غم و رنج پہنچ بھی جائیں تو ہمیں صبر پر ثابت قدم رکھ کر شرعی حدود سے تجاوز کرنے سے محفوظ فرمائے۔ (آمین)

اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے لیے بغض وعداوت

﴿عن ابی ذر رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ان احب الاعمال الی الله تعالیٰ الحب فی الله والبغض فی الله﴾ (رواه ابوداؤد)

''حضرت ابوذرغفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندوں کے اعمال میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب وہ محبت ہے جو اللہ کے لیے ہو اور وہ بغض وعداوت ہے جو صرف اللہ کے لیے ہو۔''

(سنن ابی داؤد)

کسی بندہ کا یہ حال اور طبیعت بن جانا کہ وہ محض اللہ کے لیے محبت کرے اور صرف اللہ کے لیے کسی سے بغض وعداوت رکھے بلاشبہ بہت بلند مقام ہے جیسا کہ ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذرغفاریؓ سے ارشاد فرمایا کہ ایمان کی مضبوط ترین دستاویز اللہ کے لیے محبت و تعلق جوڑنا اور اللہ کے لیے کسی سے تعلق توڑنا ہے۔ دراصل اللہ کے لیے محبت اس کی تعظیم اور عبادت کے زمرے میں شامل ہےجیسا کہ ایک حدیث کے مفہوم سے پتہ چلتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص نے اللہ کے لیے کسی بندہ سے محبت کی اس نے اپنے رب عزوجل ہی کی عظمت وتوقیر کی۔ پھر اللہ کے لیے محبت کرنے والے اللہ کے محبوب بن جاتے ہیں چنانچہ معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میری محبت واجب ہے ان لوگوں کے لیے جو باہم میری وجہ سے محبت کریں اور میرے تعلق سے کہیں جڑ کر بیٹھیں اور میری وجہ سے باہم ملاقات کریں اور میری وجہ سے ایک دوسرے پر خرچ کریں۔ اللہ کے جن بندوں نے اپنی

محبت و چاہت اور اپنے ظاہری و باطنی تعلق کو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے تابع کر دیا ہے ان کا حال یہ ہے کہ وہ جس سے محبت کرتے ہیں اللہ کے لیے' جس کے پاس بیٹھتے ہیں تو اللہ کے لیے' جس سے ملتے ہیں تو اللہ کے لیے' جس پر خرچ کرتے ہیں تو اللہ کی رضا اور محبت کے لیے ایسے لوگوں کو اللہ کی رضا اور محبت نصیب ہوتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے اس بشارتی منشور کا اعلان فرمایا ہے کہ میرے ان بندوں کے لیے میری محبت واجب اور مقرر ہو چکی ہے میں ان سب سے محبت کرتا ہوں ان سے راضی ہوں وہ میرے محبوب اور پسندیدہ بندے ہیں۔ اے اللہ! تو ہمیں بھی اپنے ان پسندیدہ بندوں میں سے کر دے جو تیرے ہی لیے آپس میں محبت کرتے ہیں اور تیرے ہی لیے باہم جڑ کر بیٹھتے ہیں اور تیرے ہی لیے ایک دوسرے پر خرچ کرتے ہیں۔

اللہ کے لیے محبت کرنے والوں کا قیامت کے دن خاصا امتیاز ہوگا جیسا کہ حضرت عمرؓ کی حدیث کا مفہوم ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے کچھ ایسے خوش نصیب بھی ہیں جو نبی یا شہید تو نہیں لیکن قیامت کے دن انبیاء وشہداء ان کے خاص مقام وقرب کی وجہ سے ان پر رشک کریں گے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں بتلا دیجیے کہ وہ بندے کون ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے بغیر کسی رشتہ اور قرابت کے اور بغیر کسی مالی لین دین کے رضاءِ خداوندی کی وجہ سے باہم محبت کی پس قسم ہے خدا کی ان کے چہرے قیامت کے دن نورانی ہوں گے بلکہ سراسر نور ہوں گے اور وہ نور کے ممبر پر ہوں گے اور عام انسانوں کو جس وقت خوف و ہراس ہوگا اس وقت وہ بے خوف اور مطمئن ہوں گے جس وقت عام انسان غم میں مبتلا ہوں گے وہ بے غم ہوں گے اس موقع پر آپ نے قرآن کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿الآ ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولاھم یحزنون﴾

''جو اللہ کے دوست اور اس سے خاص تعلق رکھنے والے ہیں ان کو خوف وغم نہ ہوگا۔''

آج دنیا کے اندر ہر شخص اپنے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ محبت و تعلق کی بناء پر اچھا

سلوک ایک فطری تقاضہ کی بنا پر تو کرتا ہی ہے لیکن کسی قرابت اور رشتہ داری کے بغیر اور کسی مالی لین دین اور کسی ہدیہ اور تحفے کے بغیر محض اللہ کے دین کے تعلق سے کسی سے محبت کرنا ایک ایسی ایمانی صفت ہے جس کی اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑی قدرو قیمت ہے اور اس کی وجہ سے بندہ اللہ تعالیٰ کا محبوب خاص ومقرب بن جاتا ہے اور قیامت میں اس پر اللہ تعالیٰ کی ایسی نوازشیں ہوں گی کہ انبیاء اور شہداء اس پر رشک کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں خالصتاً اپنی رضاء کے لیے محبت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین



اپنے آپ کو منافقانہ عادات سے بچایئے

﴿عن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اربع من کن فیہ کان منافقًا خالصًا ومن کانت فیہ خصلۃ منھن کانت فیہ خصلۃ من النفاق حتی یدعھا واذا اؤتمن خان واذا حدث کذب واذا عھد غدر واذا خاصم فجر﴾ (بخاری و مسلم)

”حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چار عادتیں ایسی ہیں کہ جس میں وہ چاروں جمع ہو جائیں تو وہ خالص منافق ہے۔ اور جس میں ان چاروں میں سے کوئی ایک خصلت ہو تو اس کا حال یہ ہے کہ اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے اور وہ اسی حال میں رہے گا، جب تک کہ اس عادت کو چھوڑ نہ دے۔ وہ چاروں عادتیں یہ ہیں کہ جب اس کو کسی امانت کا امین بنایا جائے تو اس میں خیانت کرے اور جب باتیں کرے تو جھوٹ بولے اور جب عہد معاہدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے اور جب کسی سے جھگڑا اور اختلاف ہو تو بدزبانی کرے۔“

حقیقی اور اصلی نفاق، انسان کی جس بدترین حالت کا نام ہے وہ تو یہ ہے کہ آدمی نے دل سے تو اسلام قبول نہ کیا ہو (بلکہ دل سے اس کا منکر اور مخالف ہو) لیکن کسی وجہ سے وہ اپنے آپ کو مؤمن مسلم ظاہر کرتا ہو جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عبداللہ بن ابی وغیرہ مشہور منافقین کا حال تھا، یہ نفاق دراصل بدترین اور ذلیل ترین قسم کا کفر ہے اور ان ہی منافقین کے بارہ میں قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ **المنافقین فی الدرك الا سفل من النار** ضرور بالضرور یہ منافقین دوزخ کے سب سے نیچے کے طبقہ میں ڈالے جائیں گے۔ لیکن بعض بری عادتیں اور بد خصلتیں بھی ایسی ہیں جن کو ان منافقین سے خاص نسبت اور

مناسبت ہے اور وہ دراصل ان ہی کی عادتیں اور خصلتیں ہیں اور کسی صاحب ایمان میں ان کی پرچھائیں بھی نہیں ہونی چاہیے۔

اگر بدقسمتی سے کسی مسلمان میں ان میں سے کوئی عادت ہو تو یہ سمجھا جائے گا کہ اس میں یہ منافقانہ عادت ہے اور اگر کسی میں بدبختی سے منافقوں والی وہ ساری عادتیں جمع ہو جائیں تو سمجھا جائے گا کہ وہ شخص اپنے کردار میں پورا منافق ہے۔ الغرض ایک نفاق تو ایمان و عقیدے کا نفاق ہے، جو کفر کی بدترین قسم ہے، لیکن اس کے علاوہ کسی شخص کے کردار کا منافقوں والا کردار ہونا بھی ایک قسم کا نفاق ہے، مگر وہ عقیدے کا نہیں بلکہ سیرت اور کردار کا نفاق ہے، اور ایک مسلمان کے لیے جس طرح یہ ضروری ہے کہ وہ کفر و شرک اور اعتقادی نفاق کی نجاست سے بچے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ منافقانہ کردار اور منافقانہ اعمال و اخلاق کی گندگی سے بھی اپنے آپ کو محفوظ رکھے۔

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصائل نفاق میں سے چار کا ذکر فرمایا ہے۔ (۱) خیانت، (۲) جھوٹ، (۳) عہد شکنی، (۴) بدزبانی اور ارشاد فرمایا کہ جس شخص میں ان میں سے کوئی ایک خصلت ہو اس کو سمجھنا چاہیے کہ اس میں منافقانہ خصلت ہے اور جس میں یہ چاروں خصلتیں جمع ہوں وہ اپنے کردار میں خالص منافق ہے۔

ان عادات کے علاوہ اور بھی منافقانہ عادات کا تذکرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اس حال میں مرا کہ نہ تو اس نے کبھی جہاد کیا اور نہ اپنے جی میں اس کی تجویزیں سوچیں اور نہ تمنا کی، تو وہ نفاق کی ایک صفت پر مرا۔ یعنی ایسی زندگی جس میں دعوائے ایمان کے باوجود نہ کبھی راہِ خدا میں جہاد کی نوبت آئے اور نہ دل میں اس کا شوق اور اس کی تمنا ہو، یہ منافقوں کی زندگی ہے اور جو اسی حال میں اس دنیا سے جائے گا وہ نفاق کی ایک صفت کے ساتھ جائے گا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تو منافق والی نماز ہے کہ بے پروائی سے بیٹھا آفتاب کو دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ زرد ہو

گیا اور اس کے غروب ہونے کا وقت قریب آ گیا تو نماز کو کھڑا ہوا اور چڑیا کی طرح چار چونچیں مار کے ختم کر دی اور اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی اس میں بہت تھوڑا کیا۔

مطلب یہ ہے کہ مومن کی شان تو یہ ہے کہ شوق کی بے چینی سے نماز کے وقت کا منتظر رہے، اور جب وقت آئے تو خوشی اور مستعدی سے نماز کے لیے کھڑا ہو اور یہ سمجھتے ہوئے کہ اس وقت مجھے مالک الملک کے دربار عالی کی حضوری نصیب ہے، پورے اطمینان اور خشوع کے ساتھ نماز ادا کرے، اور قیام وقعود اور رکوع وسجود میں خوب اللہ تعالیٰ کو یاد کرے، اور اس سے اپنے دل کو شاد کرے،لیکن منافقوں کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نماز ان کے لیے ایک بوجھ ہوتی ہے، وقت جانے پر بھی اس کو ٹالتے رہتے ہیں، مثلاً عصر کی نماز کے لیے اس وقت اٹھتے ہیں، جب سورج بالکل ڈوبنے کے قریب ہو جاتا ہے، اور بس چڑیا کی سی چار چونچیں مار کر نماز پوری کر دیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا نام بھی بس برائے نام ہی لیتے ہیں، پس یہ نماز منافق کی نماز اور جو کوئی ایسی نماز پڑھتا ہے وہ مخلص مومنوں والی نہیں، بلکہ منافقوں والی نماز پڑھتا ہے۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص مسجد میں ہو، اور اذان ہو جائے اور وہ اس کے بعد بھی بلا کسی خاص ضرورت کے مسجد سے باہر چلا جائے اور نماز میں شرکت کے لیے واپسی کا ارادہ بھی نہ رکھتا ہو، تو وہ منافق ہے۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص مسجد میں ہو اور اذان ہو جائے اور وہ اس کے بعد بھی بلا کسی خاص ضرورت کے مسجد سے باہر چلا جائے اور نماز میں شرکت کے لیے واپسی کا ارادہ بھی رکھتا ہو، تو وہ منافق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ منافقانہ طرز عمل ہے، پس ایسا کرنے والا اگر عقیدے کا منافق نہیں ہے تو وہ منافق عمل ہے۔

اللہ رب العزت ہم سب کو ایمان کاملہ اور اعمال صالحہ کی دولت سے نوازے اور ہر طرح کی منافقانہ عادات سے حفاظت فرمائے۔

دعوت حق

یا ایھالناس قولوُا لا الہ الا اللّٰہ تفلحُوا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات مبارکہ میں دعوتِ حق کا اندازہ کرنے کے لیے اس پہاڑی کے وعظ کو دیکھئے جس پر سے یا اٰلَ فِھْرٍ وَیَا اٰلَ غَالِبٍ کی آواز سے عرب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بلایا تھا۔

اس خلوت کدہ کا خیال کیجیے جہاں مکہ سے دور اور دامانِ کوہ کے سایہ میں ارقم بن ابی ارقم کے گھر کے اندر خفیہ خفیہ تعلیم دی جاتی تھی۔

کوہِ طائف کا واقعہ یاد کیجیے جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خون جسم سے بہہ رہا اور جوتے میں جم رہا تھا اور زبان پر دعوت الی اللہ کا وعظ جاری تھا۔

عکاظ کے بڑے سالانہ میلے پر نظر ڈالیے جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم "**یا یھا الناس قولوا لا الہ الا اللّٰہ تفلحوا**" کا نعرہ لگا رہے ہیں اور ابولہب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے جاتے ہوئے حضور ﷺ کو دیوانہ بتا رہا ہے۔

مکہ سے باہر پہاڑیوں کی گھاٹی عقبہ کا تصور کیجیے تاریکی چھا گئی ہے کوئی مسافر اس پر خطر مقام پر ٹھہرنا نہیں چاہتا ہے، مگر راستہ کی صعوبت کے تصور نے یثرب کے قافلہ کو اسی جگہ ٹھہر جانے پر مجبور کر دیا ہے۔ نور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اسی تاریکی میں یکہ وتنہا اس لیے گئے کہ شاید کسی ایک نفس ہی کے کان میں اپنی دعوت کی آواز پہنچا سکیں۔

کوہ تنعیم کے دامن تک نظر کو بڑھائیے چالاک دشمن نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بے یارو مددگار اور آرام میں دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار پر قبضہ کر لیا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گستاخانہ لہجہ اور متکبرانہ انداز سے جگایا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم دیکھتے ہیں کہ

دشمن ایک تلوار تانے کھڑا ہے اور پوچھتا ہے کہ اب تمہیں کون بچائے گا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت بھی دعوت الی اللہ کے فرض کو فراموش نہیں فرماتے' اسے وہی مبارک نام سناتے ہیں، جو غافل انسان کے زنگ آلود دل کا حجاب اٹھا دیتا ہے، جو قلب مردہ کو حیات تازہ عطا کرتا ہے۔

راہِ ہجرت کی سیر کیجیے سینکڑوں میل کا سفر درپیش ہے' خشک پہاڑیوں اور بے آب و گیاہ میدانوں سے دو اونٹ گزر رہے ہیں جنھوں نے راہ میں کہیں آرام نہیں کیا' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب دو مخلص اور ایک وفادار ہے کینہ دوز دشمن کے تعاقب کا ہر لحظہ خطرہ لگا ہوا ہے اور یہی اندیشہ مسافروں کو جلدی لیے جا رہا ہے پھر بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم دعوت الی اللہ کے فرض کو نہیں بھولے اُم معبد الخزاعیہ سراقہ بن مالک المدلجی اور بریدہ بن الحصیب اسلمی اور اس کے ستر ساتھی وغیرہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس بیابان ہی میں آب حیات پیا اور چشمۂ زندگی حاصل کیا ہے۔

خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم قبا پہنچتے ہیں' صبر آزما سفر نے بے زبان حیوانوں کو بھی تھکا دیا ہے۔مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس دعوت الی اللہ کے شوق کی تعمیل میں دوسرے ہی دن ایک مسجد کے قیام کا اہتمام فرما رہے ہیں جہاں سے **حی علی الصلوۃ** اور **حی علی الفلاح** کی صدا ہر صبح و شام پہاڑیوں سے ٹکراتی غافلوں کو جگاتی، شائقوں کو بلاتی ہے اور آج تک اس داعی کی پکار کو تازہ کر رہی ہے۔

مدینہ میں بنو اشہل اور بنو غفار، اوس خزرج کا ہر شخص دل و جان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بابی وامی، بابی وامی عرض کر رہا ہے، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعوت الی اللہ کے لیے ابن سلول کے پاس جاتے ہیں کوچہ میں صاف زمین پر اس کے قریب جا بیٹھتے ہیں وہ ناک چڑھاتا' تیوری پر تیوری ڈال کر رومال کو منہ پر رکھ لیتا ہے اور زبان سے کہتا ہے۔محمد تم نے گرد سے اور تمہاری سواری نے اپنی بو سے میرے دماغ کو پریشان کر دیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑتے ہیں اور آیاتِ قرآنیہ کی تبلیغ فرما کر دعوت الی اللہ کو مکمل فرماتے ہیں۔

ربیع بنت معوذ ایک شب کی بیاہی ہوئی دلہن کے پاس تشریف لے جاتے اور اسے دعوت الی اللہ فرماتے ہیں' وہاں انصار کی چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو عربیہ اشعار فخریہ لہجہ میں پڑھتے ہوئے سنتے ہیں تو ان کو بھی عقائد صیحہ کی تلقین فرماتے ہیں۔

سسکتی ہوئی جان توڑتی نواسی کو گود میں لیتے ہیں۔ اس وقت بھی دعوت الی اللہ میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اکلوتے بچہ ابراہیم کی لاش پر بیٹھے ہیں اس وقت بھی حاضرین کو رضائے الٰہی کے معانی سمجھاتے، استقامت کا نمونہ دکھاتے ہیں۔

آخری مرض میں گیارہ دن کے تپ شدید اور دردِ سر میں ذرا تخفیف ہوئی ہے' ضعف اس قدر ہے کہ پاؤں کے بل کھڑا نہیں ہوا جاتا، مگر دعوت الی اللہ میں وہی سرگرمی ہے سر پر پٹی باندھے ہوئے حضرت عباس رضی اللہ عنہ وحضرت علی رضی اللہ عنہ کے کندھوں پر سہارا دیئے ہوئے مسجد میں تشریف لاتے ہیں۔ ممبر پر نہ کھڑا ہوا جاتا ہے اور نہ چڑھا جاتا ہے۔ بیٹھ جاتے ہیں۔ اس کی نچلی سیڑھی پر ہی دعوت الی اللہ کی تکمیل فرماتے ہیں۔

آخری دن ہے۔ سفر آخرت میں صرف پانچ گھنٹہ کا وقفہ رہ گیا ہے۔ مسلمان صبح کی نماز کے لیے مسجد میں جمع ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ضعف اور شدتِ دردِ سر کی وجہ سے اپنے بستر پر جسے کھجوروں کے پٹھوں سے نرم بنایا گیا ہے لیٹے ہیں۔ دعوت الی اللہ کا فرض پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پاک میں تازہ حرارت پیدا کرتا ہے مسجد اور حجرہ مبارک کے درمیان جو پردہ پڑا ہوا تھا اسے ہٹاتے ہیں تھوڑی دیر تک تبسم کے ساتھ اس نظارہ کو ملاحظہ فرماتے ہیں جو ایک خدا کی عبادت کے لیے سینکڑوں مسلمانوں کے یک دل و یک جہت و یک آواز ہونے سے پیدا ہو گیا تھا اب پھر زمین پر گھسٹتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور اس بڑے مجمع کے سامنے پھر آخری دفعہ دعوت الی اللہ کی نورانی مثال قائم فرماتے ہیں۔

آخری گھڑی ہے۔ بیوی' بیٹی' نواسے اس چھوٹے سے حجرہ میں جمع ہیں جس کے اندر دس سے زیادہ اشخاص کے لیے گنجائش نہیں ہے اس وقت بھی دعوت الی اللہ اور تعلیم زبان پر ہے الصلوٰۃ. الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم (نماز، نماز اور لونڈی غلام کے حقوق تم پر لازم ہیں)

ہمارا نصب العین......اطاعت الٰہی

قال رسول الله ﷺ ترکت فیکم امرین. تضلوا ماتمسکتم بهما کتاب الله وسنة نبیه ﷺ.

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں جب تک تم ان کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے گمراہ نہ ہو گے۔ اور وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ ہے۔(رواہ فی المؤطا)

اسلام کے تمام شعبوں کو دیکھا جائے چاہے وہ عبادات ہوں یا معاملات، اخلاق ہوں یا آداب، معاشرت ہو یا معیشت ان سب کی بنیاد اس بات پر ہے کہ ان سب ہدایات کا مقصد اصلی کیا ہے۔

لفظ مقصد اور نصب العین میں تھوڑا سا فرق ہے۔ جس بات کے لیے ہم کوئی کام کریں وہ بات اس کام کا مقصد ہوتی ہے لیکن نصب العین مقصد اعلیٰ کو کہتے ہیں جیسے ہم محنت مزدوری کریں تجارت کریں تو مقصد یہ ہوتا ہے کہ روپیہ پیسہ حاصل ہو گا۔ دولت آئے گی زندگی گزارنے کا سامان پیدا ہو گا۔ یہ تجارت وصنعت کا مقصد ہے لیکن اس کا مقصد اعلیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو پورا کرتے ہوئے ہم روزی کمائیں پھر اپنے بیوی بچوں، اپنے والدین اپنے بہن بھائیوں کے اخراجات کو پورا کریں، رشتہ داروں، غربا اور مساکین کا خیال رکھیں کیونکہ ان تمام باتوں کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے یہ تجارت کا مقصد اعلیٰ ہے جسے نصب العین کہتے ہیں۔ اگر مکمل طور پر اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک انسان کا نصب العین صرف اور صرف اطاعت الٰہی ہے۔ اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾

اگر بے مقصد زندگی گزاری جائے تو پھر یہ انسان، انسانیت کے دائرے سے باہر نکل جاتا ہے جبکہ ایک بے شعور بچہ بھی ماں کی گود میں بے مقصد نہیں روتا۔ یا اسے بھوک لگتی ہے یا کوئی تکلیف ہوتی ہے تو پھر ایک عقلمند انسان بے مقصد زندگی گزارنے کا تصور ہی نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اسی بات کو سوالیہ انداز میں خود انسان سے پوچھا:

﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا﴾

''کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں یوں ہی بے کار پیدا کیا۔''

یہ اللہ رب العزت کا حکیمانہ انداز ہے کہ خود انسان کو اس بات پر غور وفکر کر کے قائل کروا لیا جائے کہ تمہارا کوئی نصب العین ہونا چاہیئے اگر انسان کا نصب العین نہ ہو تو پھر نیک آدمی کو کس طرح نیکی پر آمادہ کیا جا سکے گا؟ برے شخص کو برائی سے کس طرح روکا جا سکے گا؟ اس لیے کہ نیک کام کی خواہش اور برے کام سے پرہیز جب ہی ممکن ہے جب کوئی نصب العین ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿افنجعل الّذین آمنوا وعملوا الصلحت کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار﴾

''کیا ہم نیک کام کرنے والے مومنین کو ان لوگوں کی طرح رکھیں گے جنہوں نے زمین میں فساد پھیلایا؟ کیا ہم پرہیزگاروں کو بدکاروں کی طرح رکھیں گے؟۔''

جب سے دنیا وجود میں آئی ہے اس وقت سے آج تک پوری انسانیت کا نصب العین صرف ایک ہی چیز ہے اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء کا نصب العین صرف ایک ہی تھا کہ ایک خدا کی عبادت کرو۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب اس ارشاد نبوی کو ذہن میں نقش کر لیا جائے۔

''فرمایا میں نے تمہارے پاس دو چیزیں چھوڑی ہیں جب تک تم ان کو مضبوطی سے

پکڑے رہو گے گمراہ نہ ہو گے ان میں سے ایک کتاب اللہ اور دوسری سنت رسول اللہ ﷺ ہے۔"

بخاری شریف کے "باب الزکوٰۃ من الاسلام" کی پہلی روایت میں ایک صحابی کو رسول اللہ علیہ وسلم نے اسلامی تعلیمات سکھائیں آپ کے ارشادات کو سن کر جب وہ صحابی جانے لگے۔ تو انہوں نے کہا:

﴿و اللّٰہ لا ازیدُ علیٰ ھذا و لَا اَنُقُصُ﴾

"خدا کی قسم میں اس میں نہ زیادتی کروں گا نہ اس میں کمی کروں گا۔"

اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿اَفُلَحَ انُ صَدَقَ﴾

"اگر یہ سچ کہتا ہے تو کامیاب ہے"

معلوم ہوا کہ اطاعت الٰہی صرف جب ہی ممکن ہے جب ان دونوں راستوں کو مضبوطی سے تھامے رکھیں گے کیونکہ یہی نصب العین فلاح و کامیابی کا راستہ ہے۔ لیکن مسلمان اگر اپنا نصب العین کچھ اور بنا لیں، آخرت کی طرف سے رخ موڑ کر دنیا کو مقصد اعلیٰ قرار دے لیں تو وہ مقصد بھی ضرور حاصل ہو گا۔ لیکن ہم اصل نصب العین سے ہٹ کر الگ ہو جائیں گے اور سوائے خسارے کے کچھ بھی نہ ملے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَنُ کان یرید حرث الآخرۃ نزدلہ فی حرثہٖ ومن کان یرید حرث الدنیا نُؤتہٖ منھا وَمَالَہ‘ فی الآخرۃِ من نَّصیب﴾

"جو شخص دنیا کی کھیتی چاہتا ہے تو ہم اس کی کھیتی میں اور اضافہ کریں گے لیکن اگر کوئی شخص دنیا کی کھیتی چاہتا ہے تو ہم اسے دے دیں گے لیکن آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہ ہو گا۔"

اللہ رب العزت ہمیں ہر کام میں خلوص اور محض اطاعتِ الٰہی کے لیے اعمال صالحہ کی توفیق عطا فرمائے۔



سب سے زیادہ قابل رشک انسان

﴿عن ابی امامة عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قال اغبط اولیاءِ ی لمؤمن خفیف الحاذ ذوحظ من الصلوٰة احسن عبادة ربہٖ واطاعه فی السر وکان غامضًا فی الناس لا یشار الیه بالاصابع وکان رزقُه کفافاً فصبر علیٰ ذٰلك ثم نقد بیده فقال عجلت منیته قلت بواکیه قل تُراثُه﴾ (رواہ احمد والترمذی وابن ماجه)

''حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے دوستوں میں بہت زیادہ قابل رشک میرے نزدیک وہ مؤمن ہے جو ہلکا پھلکا ہو (دنیا کے ساز و سامان اور عیال کے لحاظ سے ہلکا پھلکا) نماز میں اس کا بڑا حصہ ہو اور اپنے رب کی عبادت خوبی کے ساتھ کرتا ہو اور اللہ کی اطاعت وفرماں برداری اس کا شعار ہو اور یہ سب کچھ اخفا کے ساتھ خلوت میں کرتا ہو اور وہ چھپا ہوا گمنامی کی حالت میں ہو اور اس کی طرف انگلیوں سے اشارے نہ کیے جاتے ہیں اور اس کی روزی بھی بس کافی ہونے کے بقدر ہو اور وہ اس پر صابر اور قناعت کرنے والا ہو۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے چٹکی بجائی اور فرمایا کہ جلدی سے اسے موت آ گئی اس پر رونے والے بھی کم ہوں اور اس کی میراث بھی تھوڑی ہو۔''

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشک کے قابل اس مومن کو قرار دیا جس میں پہلی صفت یہ ہو کہ وہ ''**خفیف الحاذ**'' ہو۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ مرقات المفاتیح میں اس لفظ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''**ای خفیف الحال الذی یکون قلیل المال**

و خفیف الظھر من العیال'' یعنی ہلکا پھلکا ہونے سے مراد یہ ہے کہ مال و دولت کے اعتبار سے بھی ہلکا ہو اور اس پر کنبہ اور اولاد کا بھی زیادہ بوجھ نہ ہو۔'' لیکن اس لفظ سے یہ مراد نہ لینا چاہیے کہ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ بچے کم ہونے چاہئیں۔ اس لیے کہ ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

جو لوگ سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے ان میں سے ایک وہ ہو گا جس کا کنبہ بڑا ہو اور اس کے اعمال تقویٰ سے آراستہ ہوں۔''

لٰہذا ہلکا پھلکا ہونے سے مراد یہ ہوا کہ دنیاوی مشکلات اور مصروفیات جو کہ مال و اولاد سے متعلق ہیں ان کا بوجھ اس شخص پر زیادہ نہ ہو۔

قابل رشک بندہ کی ایک صفت یہ بھی بیان فرمائی کہ نماز کی عبادت سے بھی خوب حصہ ملا ہو۔ یعنی نماز میں مصروفیت زیادہ ہو۔ مزید یہ کہ وہ اللہ کی عبادت و اطاعت چھپا کر کرتا ہو۔ اتنا نیک ہونے کے باوجود یہ قابل رشک مومن اتنا غیر معروف اور گمنام کہ آتے جاتے کوئی ان کی طرف انگلی اٹھا کر نہیں کہتا کہ یہ فلاں بزرگ یا فلاں صاحب ہیں اس بندے کو اللہ نے روزی بھی بس اتنی دی جو کہ اسے کافی ہو جائے اور اس پر صبر کرتا ہے۔ اور قناعت اختیار کرتا ہے۔ پھر جب موت کا وقت آیا تو ایک دم رخصت، اپنے پیچھے نہ مال و دولت چھوڑا نہ جائیداد اور نہ دکانیں نہ مکانات کی تقسیم کے جھگڑے، اور ان کے مرنے پر ان پر رونے والے بھی کم۔

بلاشبہ اللہ کے ایسے نیک بندوں کی بڑی قابل رشک زندگی ہے اور الحمدللہ ہماری دنیا اب بھی اس قسم کی زندگی رکھنے والوں سے خالی نہیں۔ اور جب بھی ہمیں اس قسم کے برگزیدہ اللہ کے بندے نصیب ہو جائیں تو ہمیں ان کے ساتھ محبت اختیار کرنی چاہیے ان کے پاس آنا جانا ان کی مجالس میں بیٹھنا چاہیے اس لیے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿اذا رأیتم العبد یعطیٰ زھداً فی الدُنیا وقلة منطقٍ فاقتربوا منه

فانہٗ یلقی الحِکُمۃ﴾

''کہ جب تم کسی بندہ کو اس حال میں دیکھو کہ اسے دنیا کے بارے میں زہد عطا کیا گیا ہے (دنیا کی طرف بے رغبت ہے) اور کم سخن (یعنی لغو اور فضول باتوں سے محفوظ) ہے تو تم اس کے قریب رہا کرو۔ کیونکہ جس بندے کا یہ حال ہوتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکمت عطا ہوتی ہے۔''

حکمت القاء ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ حقیقتوں کو صحیح طور پر سمجھتا ہے اور اس کی زبان سے وہی باتیں نکلتی ہیں جو صحیح اور فائدہ مند ہوتی ہیں اور دانائی سے بھرپور ہوتی ہیں۔

اے اللہ ہمیں بھی اپنا قابل رشک بندہ بنا لے۔ (آمین)

☆☆☆

نیکی اور بدی کی پہچان

عَنِ النَّواسِ بْنِ سَمْعَانَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسَلّم عَنِ الْبِرِّ وَالْاِ ثْمِ فَقَالَ اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ وَالْاِ ثْمُ مَاحَاكَ فِیْ صَدْرِكَ وَكَرِهْتَ اَنْ یَّطَّلِعَ عَلَیْہِ النَّاسُ. (رواہ مسلم)

''حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ نیکی اور گناہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: نیکی اچھے اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے اور تم اس بات کو برا سمجھو کہ لوگ اس پر مطلع ہوں۔''

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دوسوال کئے گئے ایک نیکی کے بارے میں اور دوسرا گناہ کے بارے میں۔

اسلامی تعلیمات میں نیکی اور گناہ کے لیے بنیادی اصول یہ ہے کہ جو عمل اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے مطابق ہو وہ نیکی ہے اور اگر اس کے خلاف ہو تو وہ گناہ ہے۔ حتیٰ کہ عبادات جو کہ سراسر نیکی ہیں اگر وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف کی جائے تو بجائے نیکی کے گناہ کا سبب بن جاتا ہے مثلاً نماز پڑھنا بہت بڑی عبادت ہے لیکن سورج کے طلوع ہوتے وقت' غروب ہوتے وقت نماز پڑھنا مکروہ ہے اگر کوئی شخص ان مکروہ اوقات میں نماز پڑھے تو وہ گناہ کا سبب بن جائے گا۔ اسی طرح روزہ رکھنا عظیم عبادت ہے لیکن عید کے دن چونکہ روزہ رکھنا ممنوع ہے اس لئے اگر عید کے دن روزہ رکھا تو یہ گناہ کا سبب ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نیکی اصل میں اطاعت الٰہی کا نام ہے اللہ رب العزت نے اسلام کے ذریعہ ہمیں اچھے اخلاق کی تعلیم دی حسن خلق یعنی لوگوں سے اچھا برتاؤ کرنا بہت بڑی نیکی

ہے۔

علامہ خازن اپنی تفسیر میں حسن خلق کے اجزاء بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ لوگوں سے محبت کرنا' معاملات کی درستگی، اپنوں اور بیگانوں سے اچھے تعلقات رکھنا' سخاوت کرنا، بخل اور حرص سے پرہیز کرنا' تکلیف پہنچنے پر صبر کرنا، اور ادب واحترام کے تقاضوں کو پورا کرنا۔ امام غزالیؒ نے حسن خلق کے بارے میں بڑی قیمتی بات کہی فرماتے ہیں۔ ''حسن خلق کا ثمرہ الفت ہے اور برے اخلاق کا پھل بیگانگی اور دلوں کی دوری ہے۔''

دراصل اچھے اخلاق سے لوگوں کو فائدہ ہی پہنچے گا اور نیکی وہی ہوسکتی ہے جس سے مخلوق کو فائدہ پہنچے جب لوگوں کو کسی کام سے فائدہ پہنچتا ہے تو وہ اس کام کو پسند کرتے ہیں اور خود کام کرنے والا بھی اس بات کو فطری طور پر چاہتا ہے کہ میرے اچھے کام لوگوں کو معلوم ہوں چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نیکی کے برعکس گناہ کی پہچان یہ بتائی کہ گناہ وہ عمل ہے جس کے کرنے کے بعد آدمی دل کے اندر کھٹکا محسوس کرے حقیقت یہی ہے کہ مومن کا دل ہی نیکی اور بدی کی کسوٹی ہے جب انسان سے برا کام سرزد ہوجاتا ہے تو پھر وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ لوگوں کو میرا یہ برا کام معلوم ہو اور وہ اسے چھپانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے لیکن اب ایک بات ذہن میں پیدا ہوتی ہے کہ بہت سے لوگ رشوت لیتے ہیں اور سرعام خود کہہ کرلیتے ہیں اور اس کا اعتراف بھی کرتے ہیں اور ان کا دل بھی رشوت لینے کو برا نہیں سمجھتا تو پھر کیا یہ کام برا نہ ہوا اس بات کی وضاحت کے لیے ایک بات ضرور ذہن میں رکھنی چاہئے کہ جس دل کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اس سے مراد قلب سلیم یعنی تندرست دل مراد ہے بیمار دل مراد نہیں اور بیمار دل وہ ہوتا ہے جو نیکی اور گناہ میں تمیز نہ کرسکے۔ جیسے تندرست زبان کے ذریعہ آپ میٹھے اور کڑوے کو بالکل صحیح طور پر معلوم کرسکتے ہیں لیکن جس شخص کو بخار ہوجائے تو پھر اسے چینی بھی کھلائیں تو وہ اسے کڑوی محسوس ہوگی۔ اسی طرح تندرست دل وہ ہوتا ہے جو گناہ کا عادی نہ ہو جب انسان کو کسی گناہ کی عادت پڑ جائے تو پھر اس کا دل بیمار ہوجاتا ہے کیونکہ اس کے دل کے اندر گناہ کو گناہ سمجھنے کا احساس ہی ختم ہوجاتا ہے۔

اب مثال کے طور پر رشوت کے گناہ کا تذکرہ ہوا تو کسی ایسے شخص کو دیکھئے جس نے

کبھی رشوت نہ لی ہو، اگر کوئی شخص زبردستی اسے رشوت دینے کی کوشش کرے تو وہ لینے سے انکار کرے گا بہت اصرار ہوا تو جب وہ لینے کے لیے ہاتھ بڑھا رہا ہو تو آپ غور سے دیکھئے اس کے ہاتھ کانپ رہے ہوں گے، دل کی دھڑکن تیز ہو جائے گی اور سردی کے موسم میں بھی اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نظر آئیں گے اور وہ شخص اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہو گا کہ کوئی مجھے رشوت لیتے ہوئے دیکھ تو نہیں رہا۔ یہ سب کیفیات بتا رہی ہیں کہ اس کے دل میں رشوت سے نفرت ہے لیکن خدا نہ کرے اس شخص کو شیطان نے بہکا دیا اب وہ رشوت لینے کا عادی ہو گیا تو پھر اب اس کے دل میں وہ رکاوٹ اور کھٹکا ختم ہو جائے گا اس لیے دل کو تندرست رکھنے کے لیے سب سے بڑی پابندی یہ اختیار کرنی ہو گی کہ وہ انسان کسی بھی گناہ کا عادی نہ ہونے پائے اور گناہ کی عادت سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ جب گناہ سرزد ہو فوراً اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لے توبہ اور استغفار کرے بس یہ شخص اس گناہ کا عادی نہیں بن سکتا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اچھے اخلاق سے آراستہ ہونے اور گناہ سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے اور ایسا قلب سلیم عطا فرمادے جو نیکی اور گناہ میں پہچان کرلیا کرے۔



زُہد کے ثمرات و برکات

زہد اختیار کیجئے اللہ بھی محبت کرے گا لوگ بھی محبت کریں گے

﴿عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِی اللّٰه عَنه قَالَ جَاءَ رَجُلٌ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ دُلَّنِیْ عَلٰی عَمَلٍ اِذَا اَنَا عَمِلْتُهٗ اَحَبَّنِیَ اللّٰهُ وَاَحَبَّنِی النَّاسُ قَالَ اِزْهَدْ فِی الدُّنْيَا يُحِبُّكَ اللّٰهُ وازْهَدْ فِیْ مَاعِنْدَ النَّاسِ يُحِبُّكَ النَّاس﴾

(رواہ الترمذی)

''حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا، یارسول اللہ! مجھے کوئی ایسا عمل بتائیے کہ جب میں اسے کروں تو اللہ بھی مجھ سے محبت کرے اور لوگ بھی مجھ سے محبت کریں آپ نے فرمایا، دنیا کی طرف سے اعراض اور بے رخی اختیار کرلو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگے گا اور جو کچھ لوگوں کے پاس ہے تم اس سے بے رخی اختیار کرلو تو لوگ تم سے محبت کرنے لگیں گے۔''

زہد کا لفظی مطلب کسی چیز سے بے رغبت ہوجانا ہے اور دین کی خاص اصطلاح میں زہد کا مفہوم یہ ہے کہ آخرت کے لیے دنیا کی لذتوں اور مرغوب چیزوں کی طرف سے بے رغبت ہوجانا اور عیش وعشرت کی زندگی ترک کردینا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات اور اپنے عمل مبارک سے امت کو زہد کی ترغیب اور تعلیم دی۔ حقیقت یہی ہے کہ دنیا کی محبت اور چاہت ہی آدمی سے وہ سارے کام کراتی ہے جن کی وجہ سے وہ خدا کی محبت کے لائق نہیں رہتا۔ اس لیے اللہ کی محبت حاصل کرنے کا راستہ یہی ہے کہ دنیا کی چاہت اور رغبت دل میں نہ رہے جب دنیا کی محبت

دل سے نکل جائے گی تو پھر دل اللہ کی محبت کے لیے فارغ ہوجائے گا اور پھر اللہ کی اطاعت وفرمانبرداری اتنے خلوص کے ساتھ ہوگی کہ وہ بندہ اللہ تعالیٰ کو محبوب اور پیارا ہوجائے گا۔

اسی طرح جب کسی بندہ کے متعلق لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ یہ ہماری کسی چیز میں حصہ نہیں چاہتا، نہ مال کا طالب، نہ کسی عہدہ اور منصب کا، تو پھر فطری طور پر لوگ اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زاہدوں کی صحبت اختیار کرنے کی نصیحت بھی فرمائی۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم کسی بندہ کو اس حال میں دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے اسے دنیا کے بارے میں زہد (یعنی دنیا کی طرف سے بے رغبتی اور بے رخی) اور کم بولنا (یعنی بے کار اور فضول باتوں سے زبان کا محفوظ رہنا) نصیب فرمایا ہے تو اس کے قریب رہا کرو کیونکہ جس بندہ کا یہ حال ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اسے دانائی عطا فرماتے ہیں۔''

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو بندہ بھی زہد اختیار کرے (یعنی دنیا کی رغبت اور چاہت دل سے نکال دے) تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں دانائی کو اُگائے گا، اور اس کی زبان پر دانائی کو جاری فرمائے گا، اور دنیا کے عیوب اور اس کی بیماریاں اور پھر ان کا علاج بھی اس کو دکھا دے گا اور پھر اللہ تعالیٰ اسے دنیا میں سے سلامتی کے ساتھ نکال کر جنت میں پہنچا دے گا۔''

حضرت معاذ بن جبلؓ کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کی طرف روانہ فرمایا تو نصیحت فرمائی، اے معاذ! آرام طلبی اور خوش عیشی سے بچتے رہنا اس لیے کہ اللہ کے خاص بندے آرام طلب اور خوش عیش نہیں ہوا کرتے۔''

دنیا میں آرام وراحت اور خوش عیشی کی زندگی گزارنا اگرچہ حرام نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کا مقام یہی ہے کہ وہ دنیا میں عیش وعشرت کی زندگی اختیار نہ کریں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے جس بندہ کو خاص درجہ سے نوازنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس شخص کے دل

میں ایک خاص نور اور جذبہ پیدا کر دیتا ہے جس سے اس کا سینہ عبادت کے لیے کھل جاتا ہے (اسے شرح صدر بھی کہتے ہیں) اور پھر اس کے نتیجہ میں دنیا سے بے رغبتی' آخرت کی فکر، اللہ تعالیٰ سے ملاقات، جنت کا شوق اور اس کی تیاری جیسی نشانیاں اس بندہ کی زندگی میں نظر آنی شروع ہوجاتی ہیں اس سے یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ اس بندہ کو وہ خاص نور نصیب ہوگیا ہے اور اسے شرح صدر نصیب ہوگیا ہے۔

بیہقی میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿فَمَنۡ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنۡ يَّهۡدِيَهٗ يَشۡرَحۡ صَدۡرَهٗ لِلۡاِسۡلَامِ﴾

"یعنی جس شخص کے بارے میں اللہ تعالیٰ ہدایت دینے کا ارادہ فرماتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس کے سینے کو کھول دیتے ہیں۔"

اس آیت کی تشریح میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نور جب سینہ میں آتا ہے تو سینہ اس کی وجہ سے کھل جاتا ہے عرض کیا گیا کہ کیا اس کی کوئی علامت بھی ہے جس سے اس کو پہنچانا جائے؟ فرمایا ہاں، دنیا جو دھوکہ اور فریب کی جگہ ہے اس سے طبیعت کا ہٹ جانا اور اُچاٹ ہوجانا (یعنی زہد نصیب ہوجائے) اور آخرت جو ہمیشہ قیام کی جگہ ہے اس کی طرف طبیعت کا مائل ہونا اور موت آنے سے پہلے اس کی تیاری میں لگ جانا۔"

حضرت عمرو بن شعیبؒ سے بیہقی میں روایت ہے کہ ارشاد نبویؐ ہے۔" اس امت کی پہلی نیکی یقین اور زہد ہے اور پہلی خرابی بخل اور دنیا میں زیادہ رہنے کی آرزو ہے۔"

بعض لوگ جہالت کی وجہ سے زہد کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ آدمی دنیا کی ساری نعمتوں، راحتوں اور لذتوں کو اپنے اوپر حرام کرلے، نہ کبھی لذیذ کھانا کھائے، نہ ٹھنڈا پانی پیئے' نہ اچھا کپڑا پہنے، نہ اچھے بستر پر سوئے، نہ اچھی سواری استعمال کرے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "زہد" کے متعلق ان خیالات کی نفی فرمائی، ترمذی میں حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" دنیا کے بارے میں زہد اور اس کی طرف سے بے

رغبتی (جو ایک ایمانی صفت ہے) وہ حلال کو اپنے اوپر حرام کرنے اور مال کو برباد کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ زہد کا اصل معیار اوراس کا تقاضا یہ ہے کہ جو کچھ تمہارے پاس اور تمہارے ہاتھ میں ہو اس سے زیادہ اعتماد اور بھروسہ تمہیں اس پر ہو جو اللہ تعالیٰ کے پاس اوراس کے قبضہ میں ہے۔"

معلوم ہوا کہ زہد کا معیار یہ ہے کہ جو کچھ دنیا میں انسان کے پاس ہو اوراس کے ہاتھ میں ہو اسے فانی اور ناپائیدار یقین کرتے ہوئے اس پر اعتماد اور بھروسہ نہ کرے اوراس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کے غیر فانی غیبی خزانوں پر اوراس کے فضل وکرم پر زیادہ اعتماد اور بھروسہ کرے۔

آج ہمارے معاشرہ میں زہد کی کمی کی وجہ سے بالکل اُلٹ معاملہ چل رہا ہے دنیا میں بہت زیادہ رغبت رکھنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی محبت سے محروم ہورہے ہیں اور دوسری طرف حرص ولالچ اور دنیا کے اعتبار سے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی روش نے لوگوں کے دلوں میں آپس کی محبت کا خاتمہ کردیا۔آج بھی اگر زہداختیار کرلیا جائے تو اللہ کی محبت اور لوگوں کی محبت یقیناً نصیب ہوگی۔



پاکیزہ تندرست دل

(پورے جسم کے صحیح ہونے کا ضامن ہے)

﴿عن ابی عبداللّٰہ النعمان بن بشیر رضی اللّٰہ عنہما قال سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول اَلَا اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَۃً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلّہ وَاذَا فَسَدَت فَسَدَالْجَسَد کُلُّہ اَلَاوَھِیَ الْقَلْبُ﴾ (رواہ البخاری و مسلم)

ہمارے جسم میں خون کی گردش کو برقرار رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے دل کی ایسی مشین رکھ دی ہے کہ اگر حرکت قلب جاری ہو تو انسان کو زندہ سمجھا جاتا ہے اور جب اس کی حرکت بند ہو جائے تو وہ انسان مردہ کہلاتا ہے ایک تو یہ دل ہے جس سے جسم کی زندگی اور موت کا تعلق ہے دوسری طرف اسلامی تعلیمات میں انسان کے باطن یعنی اس کے اندر کی حقیقت کا تعلق بھی دل ہی کے ساتھ وابستہ ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”آگاہ رہو جسم میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے جب وہ درست رہے تو تمام بدن درست رہتا ہے اور جب وہ خراب ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے فرمایا کہ وہ گوشت کا ٹکڑا دل ہے۔“

جب حق کو دیکھنے کے باوجود لوگوں نے اسے تسلیم نہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ حج کی چھیالیسویں آیت میں فرمایا:

﴿فَاِنَّھَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ﴾

”یعنی بلاشبہ ان لوگوں کی آنکھیں نہیں لیکن ان کے دل اندھے ہیں جو سینوں میں ہیں۔“

جس طرح ہماری روزمرہ کی زندگی میں آنکھوں سے دیکھنے کے لیے دو روشنیوں کی ضرورت ہوتی ہے ایک آنکھ کی روشنی اور دوسری باہر کی روشنی' اگر نابینا ہو تو دن کی چمکتی دھوپ میں بھی نہیں دیکھ سکتا اور اگر آنکھیں تو صحیح سلامت ہوں لیکن باہر گہری تاریکی ہو تو بھی دیکھ نہیں سکے گا بالکل اسی طرح انسان کے لیے معاشرہ میں صحیح سوچ رکھنے' صحیح عمل کرنے اور درست زندگی گزارنے کے لیے بھی دو روشنیوں کی ضرورت ہے ایک دل کی روشنی اور دوسری اسلامی تعلیمات کی روشنی اگر ان میں سے ایک بھی روشنی نہ رہے تو یہ انسان زندگی میں گمراہی کے سوا کچھ بھی نہ پا سکے گا معلوم ہوا کہ انسان کو اسلامی تعلیمات سے آگاہی کے ساتھ ساتھ دل کو بھی تندرست، روشنی سے منور اور پاک وصاف رکھنا ہوگا جب ہی یہ انسان دنیا کی زندگی اور آخرت کی دائمی زندگی میں کامیابی کی دولت سے سرفراز ہوگا۔

دل کو کن چیزوں سے پاک وصاف رکھا جائے اس بارے میں اللہ رب العزت نے قرآن حکیم میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں خوب واضح فرما دیا امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب اربعین میں دل کی ان بیماریوں کو ایک جگہ جمع کیا اور پھر سب سے پہلے دل کی بیماری یہ بتائی کہ دل کو حرص و لالچ سے پاک رکھنا چاہیے کیونکہ حرص و لالچ دل میں آ جائے تو پھر انسان کو دو چیزوں کی طلب بہت زیادہ ہو جاتی ہے ایک مال اور دوسرا مرتبہ، جسے حبّ جاہ کا نام دیا جب یہ دو باتیں انسان کے دل کے اندر آ جائیں تو پھر تکبر، ریاکاری، حسد، کینہ، عداوت جیسی آفتیں دل میں جمع ہو جائیں گی جو دین و دنیا تباہ کرنے والی ہیں اس لیے دل کو ان تمام بیماریوں سے پاک کرنا لازمی ہے۔ دل میں تکبر پیدا ہوا تو پھر دوسروں کے بارے میں دل میں حقارت آ جائے گی اور اسی وقت انسان اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ شخص بن جاتا ہے' دل میں ریاکاری، دکھلاوا آ گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے چھوٹا شرک قرار دیا' حسد پیدا ہوا تو فرمایا کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے لہٰذا جب دل سے ان تمام بیماریوں کو صاف کر لیا جائے تو اس کے ساتھ ان خوبیوں سے دل کو آراستہ اور منور کیا جائے جس کی تعلیم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دی چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو

اس کے دل پر ایک سیاہ داغ پڑ جاتا ہے پھر جب وہ توبہ کرتا ہے تو داغ ڈھل کر دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر گناہ کرتا رہے توبہ نہ کرے تو دل داغ پڑتے پڑتے سیاہ ہو جاتا ہے اب ذہن میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ گناہ تو بار بار انسان کرتا رہتا ہے تو پھر بار بار توبہ کرنا کچھ عجیب سا لگتا ہے جب انسان سے گناہ ہونا ہی ہے تو پھر توبہ کا کیا فائدہ؟ جب بھی ذہن میں یہ خیال آئے تو سوچئے تو سہی انسان نئے اور صاف ستھرے کپڑے آج پہنے پھر جب میلے ہو جائیں گے تو انہی کپڑوں کو دھلوا کر پہن لیں گے پھر میلے ہوں گے تو پھر دھلوالیں گے تو جب ان کپڑوں نے میلا ہونا ہی ہے تو پھر بار بار دھلوانے کی کیا ضرورت ہے۔ میلا ہونے دیا جائے۔ جب بالکل خراب ہو جائیں تو ضائع کر دیا جائے حالانکہ کوئی سمجھ دار انسان ایسا نہیں کرتا۔

بالکل اسی طرح انسان کا دل اگر اللہ کی نافرمانی کی وجہ سے میلا ہو جائے تو اسے بھی بار بار صاف کر لیا جائے ورنہ یہ دل بھی اگر اس قدر میلا ہو گیا تو پورے انسانی نظام کی خرابی کا سبب بن جائے گا اور توبہ کی توفیق جب ہوتی ہے جبکہ دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور ڈر موجود ہو پھر اس دل کے اندر صبر کی دولت ہو جس سے وہ دل پر آنے والی مصیبتوں کو بخوشی جھیل سکے اور جب نعمتوں سے زندگی آرام سے گزرنے لگے تو یہ انسان اب دل کے اندر شکر جیسی نعمت پیدا کرے' جب بھلائی کرنے لگے تو دل کے اندر خلوص کو خوب اچھی طرح سنبھال کر رکھے کہیں ریا کاری نہ آ جائے کہیں حقارت اور دل آزاری نہ آ جائے اور جتنی نعمتیں ملیں ان پر قناعت ہو' مزید نعمتوں کے لیے اللہ پر توکل رکھتے ہوئے دن رات کوشش و محنت میں لگا رہے' لیکن دل میں دنیا کی محبت اور حرص جگہ نہ بنا سکیں۔ اسلام دنیا سے دور رہنے کی تعلیم نہیں دیتا اور نہ دنیا چھوڑ چھاڑ کر جنگلوں میں نکلنے کی تعلیم دیتا ہے' انسان اور دنیا میں کس قسم کا تعلق ہونا چاہیے؟ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں بڑی خوبصورت مثال دی فرمایا کہ دنیا اور انسان کا تعلق اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ کشتی اور پانی کا تعلق' کشتی بغیر پانی کے بالکل بے کار ہے اس کی صلاحیت پانی کے بغیر ظاہر نہیں ہو سکتی اسی طرح انسان کی صلاحیتیں بھی بغیر دنیا کے بیکار ہیں البتہ ایک احتیاط کی ضرورت ہے کہ وہ پانی کشتی کے اندر نہ داخل ہونے پائے

بس یہ کشتی پانی کے اوپر چلتی رہے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے منزل تک پہنچ جائے لیکن اگر وہ پانی کشتی کے اندر داخل ہو گیا تو یہ کشتی ڈوب جائے گی، فرمایا کہ اسی طرح انسان دنیا اور اس کی چیزوں سے فائدہ اٹھاتا رہے لیکن اس دنیا کو اپنے دل کے اندر نہ آنے دے اگر یہ دل کے اندر آ گئی تو پھر فلاح و کامیابی کی منزل تک پہنچنا انسان کے لیے بہت مشکل ہو جائے گا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا دل کو بھی لوہے کی طرح زنگ لگ جاتا ہے اور اس زنگ کا علاج تلاوت قرآن حکیم اور موت کا دھیان ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے دل کو سکون اللہ کی یاد ہی سے نصیب ہوتا ہے آخر میں ہم بھی وہی دعا زبان پر لاتے ہیں جو دل کی صفائی کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی:

﴿اَللّٰھُمَّ نَقِّ قَلْبِیْ عَنِ الْخَطَایَا وَالذُّنُوْبِ کَمَا یُنَقَّی الثَّوْبُ الْاَبْیَضُ مِنَ الدَّنَسِ﴾

”اے اللہ میرے دل کو غلطیوں اور گناہوں سے ایسا صاف فرما دے جیسے سفید کپڑے کو میل کچیل سے صاف کیا جاتا ہے۔“

☆☆☆

راہِ حق پر کون؟

﴿عن عبداللّٰه بن عمرو رضی اللّٰه عنه قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم.......... تَفْتَرِقُ اُمَّتِیْ عَلٰی ثَلٰثٍ وَّسَبْعِیْنَ مِلَّةً کُلُّھُمْ فِی النَّارِ اِلَّا مِلَّةً وَّاحِدَةً قَالُوْا مَنْ ھِیَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ ما اَنَاعَلَیْهِ وَاَصْحَابِیْ﴾ (رواہ الترمذی، وابوداؤد واحمد)

''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا.......... میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی، سب کے سب جہنم میں جائیں گے سوائے ایک ملت کے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے پوچھا یا رسول اللہ! وہ کون سی ملت ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔''

تمام مسلمان جانتے ہیں کہ ''دین حق'' وہ پیغام الٰہی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر تشریف لائے اور اس دین کی تعلیمات پر مکمل طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عمل کیا۔ اس پیغام الٰہی یعنی قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور یہ وعدہ پورا کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور اعمال کو صحابہ کرامؓ کے عمل اور ائمہ مجتہدین کی تشریحات کی صورت میں محفوظ کر دیا۔ الحمدللہ اس امت کے پاس آج بھی یہ ساری چیزیں بالکل صحیح و سالم محفوظ ہیں لیکن پھر اس کے باوجود امت میں مختلف انداز میں اختلافات کیوں ہوئے اور اب ہم کیسے معلوم کریں کہ حق پر کون ہے؟

اس سوال کا محققانہ جواب، مستند جریدہ ماہنامہ ''بینات'' کراچی کی اشاعت خاص

’’اختلاف امت اور صراطِ مستقیم‘‘ میں ممتاز عالم دین مولانا محمد یوسف لدھیانوی صاحبؒ نے تحریر فرمایا، احقر اسی جواب کو بعینہ پیش کر رہا ہے موصوف لکھتے ہیں:

اس بات کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ امت میں دو قسم کے اختلافات ہوئے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان دونوں قسم کے اختلافات سے مطلع بھی کیا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کے بارے میں امت کو ہدایات بھی عطا فرمائیں۔

پہلی قسم کا اختلاف وہ ہے جو اجتہادی مسائل میں صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعینؒ اور ائمہ مجتہدین کے درمیان رونما ہوا اور جو آج حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی اختلاف کے نام سے مشہور ہے یہ اختلاف خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دور میں بھی کبھی کبھی رونما ہو جاتا تھا۔ جیسے ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو بنو قریظہ کی بستی میں پہنچنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا آج تمام صحابہ بنی قریظہ ہی میں جا کر نماز عصر پڑھیں۔ صحابہ کرامؓ کو وہاں پہنچنے میں تاخیر ہوگئی اور نماز عصر کا وقت ضائع ہونے لگا، مشورہ ہوا تو دو فریق بن گئے، دونوں منشائے نبوی کی تکمیل میں کوشاں تھے، اپنی اپنی رائے پر عمل کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی تصویب فرمائی۔ اس قسم کی اور بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں یہ اختلاف نہ صرف ایک فطری اور ناگزیر چیز ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے رحمت فرمایا ہے اور جس شخص کو حق تعالیٰ نے ذرا بھی نورِ بصیرت عطا کیا ہو اس کو اس اختلاف کا رحمت ہونا کھلی آنکھوں نظر آتا ہے یہ اختلاف بالکل صحیح ہے اور اس کا حکم یہ ہے کہ جس امام مجتہد سے اعتقاد ہو اس کے اجتہاد پر عمل کیا جائے اور باقی بزرگوں کے بارے میں عدل ادب و احترام کو ملحوظ رکھا جائے کیونکہ یہ تمام حضرات اعلیٰ درجہ کے ماہر دین بھی تھے اور صاحب باطن عارف باللہ بھی' بعد کے لوگوں میں سے کوئی شخص نہ ان کے پائے کا عالم ہوا ہے اور نہ نورِ معرفت میں کوئی ان کی ہمسری کر سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے اکابر اولیاء اللہ مثلاً حضرت پیرانِ پیر سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ، شیخ محی الدین ابن عربیؒ، خواجہ علی ہجویریؒ، مجدد الف ثانیؒ سب ائمہ مجتہدین کے پیروکار رہوئے ہیں۔

دوسری قسم کا اختلاف ’’نظریاتی اختلاف‘‘ کہلاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے اس اختلاف کی بھی پیشگوئی فرمائی تھی اور اس اختلاف میں حق و باطل کو جانچنے کا معیار بھی مقرر فرمایا تھا چنانچہ ارشاد نبوی ہے ''بنو اسرائیل ۷۲ فرقوں میں بٹے تھے اور میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹے گی یہ سب کے سب سوائے ایک کے جہنم میں جائیں گے عرض کیا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ نجات پانے والا فرقہ کون سا ہے؟ فرمایا ''**ما انا علیه و اصحابی**'' جو لوگ اس راستے پر قائم رہیں گے جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں۔

''ایک اور حدیث میں ہے ''جو شخص تم میں سے میرے بعد زندہ رہا وہ بہت سے اختلافات دیکھے گا اس لیے میرے طریقے کو اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کے طریقے کو لازم پکڑو اور اسے دانتوں سے مضبوط پکڑ لو اور دیکھو جو باتیں نئی نئی ایجاد کی جائیں گی ان سے احتراز کرنا اس لیے کہ ہر وہ چیز جو دین کے نام پر نئی ایجاد کی جائے وہ بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔''

ایک اور حدیث میں ہے: ''کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خط کھینچ کر فرمایا: ''یہ تو اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے'' اور اس کے دائیں بائیں کچھ لکیریں کھینچ کر فرمایا یہ وہ راستے ہیں جن پر ایک ایک شیطان بیٹھا لوگوں کو ورغلا رہا ہے کہ ادھر آؤ یہ صحیح راستہ ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی اللہ نے فرمایا ''یہ میرا سیدھا راستہ ہے پس اس پر چلو۔'' (یہ تمام احادیث مشکوٰۃ شریف میں ہیں)

ان ارشادات مقدسہ سے واضح طور پر حسب ذیل باتیں معلوم ہوئیں۔

(۱) آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت میں نظریاتی اختلاف کے رونما ہونے کی پیش گوئی فرمائی۔

(۲) اس اختلاف کو ناپسند فرمایا اور سوائے ایک جماعت کے باقی سب کو دوزخ کی وعید سنائی۔

(۳) اس اختلاف میں حق و باطل کو پہچاننے کا معیار آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ متعین فرمایا کہ جو شخص یا جو گروہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے طریقے پر قائم ہے جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے صحابہ کرام بھی عمل پیرا رہے وہ حق پر ہے اور جو اس کے خلاف چلے وہ باطل پر ہے گویا معیارِ حق

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا راستہ ہے۔ قرآن کریم نے بھی بہت سی جگہ اسی کو ''معیارِ حق'' فرمایا ہے۔

(۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام امور کو جو دین کے نام پر بعد میں ایجاد کیے گئے ''بدعت'' فرمایا۔

(۵) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدعات اور گمراہیوں کے ایجاد کرنے کی علت بھی بیان فرمائی یعنی غلط خواہشات کی پیروی اور یہ ایسا مرض ہے کہ آدمی کے دل و دماغ ہی کو مسخ نہیں کرتا بلکہ اس کا اثر زہر کی طرح سارے بدن میں سرایت کر جاتا ہے اور یہ خود رائی کا زہر اتنا اثر دکھاتا ہے کہ اسے اپنے تراشے ہوئے نظریات کے سوا تمام دنیا افسانۂ غلط نظر آنے لگتی ہے۔

(٦) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو یہ ہدایت فرمائی کہ ان اختلافات کے ظہور کے وقت وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے راشدین کے طریقے پر سختی سے قائم رہیں، جن کا ہدایت پر ہونا ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے۔

(۷) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی بتایا کہ ''اللہ تعالیٰ کا راستہ'' وہی ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا اور جس پر صحابہ کرامؓ چلے یہ راستہ قیامت تک رہے گا، لیکن اس ''خدائی راستہ'' کے بالمقابل کچھ شیطانی راستے بھی نکلیں گے اور ہر راستہ پر ایک شیطان بیٹھا لوگوں کو اپنے راستے پر چلنے کی دعوت دے گا' اپنی اس دعوت میں لوگوں کے مزاج اور ان کی نفسیات کے مطابق دلائل بھی دے گا اور خدائی راستہ کو فرسودہ اور رجعت پسندانہ بھی بتائے گا مگر امت کو آگاہ رہنا چاہیے کہ خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا ٹھیک راستہ وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا جس پر صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدینؓ چلے اور جس کی پیروی ہمیشہ سلف صالحین اور اولیائے امت کرتے آئے۔

یہ اصول وضوابط جو قرآن کریم اور احادیث نبویہ میں واضح طور پر ذکر کیے گئے ہیں اگر اچھی طرح ذہن نشین کر لیے جائیں تو ایک متوسط ذہن کے آدمی کو یہ سمجھ لینا زیادہ مشکل نہیں ہوگا کہ حق پر کون ہے؟

قول وفعل میں تضاد کی ممانعت

﴿عن عبدالله بن عمرو رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اربع من کن فیه کان منافقا خالصا ومن کانت فیه خصلة منهن کانت فیه خصلة من النفاق حتی یدعها اذاؤتمن خان واذا حدث کذب واذا عاهد غدر واذا خاصم فجر﴾ (متفق علیه)

''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص میں چار باتیں پائی جائیں وہ خالص منافق ہے اور جس میں ان چاروں باتوں میں سے کوئی ایک بات پائی جائے اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی یہاں تک کہ وہ اس خصلت کو چھوڑ دے۔ اور وہ چار باتیں یہ ہیں جب امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے، بات کرے تو جھوٹ بولے، عہد کرے تو اسے توڑ دے، جھگڑے تو بدزبانی کرے۔''

اللہ تعالیٰ نے اسلامی تعلیمات کے ذریعہ زندگی کے جو آداب سکھائے ان میں سے ایک ادب قول وفعل میں مطابقت ہے۔

احکام اسلام میں اس ادب کی اتنی زیادہ اہمیت ہے کہ اس کی خلاف ورزی کو منافقت قرار دیا گیا اور نفاق کی نشانیوں میں شمار کیا گیا۔

منافقت، منافق یا نفاق عربی زبان کے الفاظ ہیں اور یہ اصل میں نفق سے بنے ہیں عربی میں نفق دو منہ والی سرنگ کو کہتے ہیں، اس لیے منافقت دو غلے پن کو کہتے ہیں۔ اندر کچھ اور ہو اور ظاہر میں کچھ اور، ظاہر و باطن ایک جیسے نہ ہوں تو اسے منافقت کہتے ہیں اور جس انسان کے اندر یہ انداز پایا جائے اسے دورخا یا دو چہروں والا کہا جاتا ہے۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق منافقت دوطرح کی ہوتی ہے ایک اعتقادی اور دوسری عملی، اعتقادی منافقت تو یہ ہے کہ کوئی انسان دل سے اسلام کی سچائی اور اس کے حق ہونے کو نہ مانتا ہو صرف زبان سے کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں۔ ایسے لوگوں کا تذکرہ سورۃ البقرہ کے دوسرے رکوع میں کیا گیا۔ ان کے قول وفعل میں تضاد تھا' جب ایمان والوں سے ملتے تو کہتے ہم ایمان لائے اور جب کفار کے پاس جاتے تو کہتے ہم تو ان کا مذاق اڑا رہے تھے ورنہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔ ایسے منافق حقیقت میں کافر ہی ہوتے ہیں بلکہ ان کا جرم کافر سے بڑھ جاتا ہے۔

دوسرے قسم کے عملی منافق ہیں جو دل سے اسلام کی سچائی اور اس کے حق ہونے کو تسلیم کرتے ہیں لیکن اپنی انسانی کمزوریوں کی وجہ سے احکام اسلام پر عمل کرنے میں کوتاہی کرتے ہیں۔ ایسے منافق کی اصلاح تربیت کے ذریعہ کی جاسکتی ہے۔

اب یہ کام بہت قابل توجہ ہے کہ نفاق اور منافقت کو کیسے پہچانا جائے۔ جیسے کسی بیماری کی کچھ علامات، نشانیاں ہوتی ہیں ان نشانیوں کو دیکھ کر معالج بیماری تشخیص کرتا ہے اور پھر اس کا علاج شروع کردیتا ہے۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافق کی چار نشانیاں بتائی ہیں اور فرمایا کہ اگر کسی شخص کے اندر ان میں سے کوئی ایک نشانی بھی پائی جائے تو اس کے اندر نفاق کی ایک علامت پائی گئی۔ پہلی علامت یہ بیان فرمائی **اذا حدث کذب** جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ دوسری نشانی یہ بتائی **اذا وعد اخلف** وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے۔ ایک اور روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں **اذا عاھد غدر** جب معاہدہ کرے تو غداری کرے۔ تیسری نشانی نفاق کی یہ بتائی **اذا اوتمن خان** جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے اور چوتھی نشانی یہ بتائی **اذا خاصم فجر** جب جھگڑے تو بدزبانی کرے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ارشاد فرمائی گئی ان نشانیوں میں غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کی بنیاد قول وفعل میں تضاد ہے۔

دیکھئے ایک شخص ایک بات کرتا ہے خبر کے طور پر، حالانکہ ایسا نہیں ہوا تو اس شخص کا

قول جھوٹ ہو گا اور یہ نفاق کی نشانی ہے۔ پھر کوئی شخص وعدہ کرے یا باہمی معاہد کرے اور کہے میں یہ کروں گا یا میں اس بات کی پابندی کروں گا پھر وہ بات پورا نہ کرے یا معاہدہ سے پھر جائے، یہ بھی قول وفعل کا تضا ہوا۔ یا کسی شخص کے پاس امانت رکھی جائے گویا کہ وہ یہ کہتا ہے کہ میں اس کی حفاظت کروں گا پھر وہ امانت میں خیانت کرنے لگے تو اب اس کی بات اوراس کے عمل میں تضاد آ گیا اور یہ بھی نفاق کی نشانی ہوگئی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سورہ صف کی دوسری اور تیسری آیت میں ارشادفرمایا:

﴿یـایھـا الذین امنوا لم تقولون مالاتفعلون ○ کبـرمقتا عنداللہ ان تقولوا مالاتفعلون﴾

”یعنی اے ایمان والو! ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ بات انتہائی ناپسندیدہ ہے کہ ایسی بات کہو جو نہ کرو۔“

اس آیت سے ایک اور پہلو بہت واضح طور پر سامنے آ رہا ہے کہ اس میں انسان کو یہ تعلیم دی گئی کہ جو کام تم نے کرنا نہیں اس کا دعویٰ کیوں کرتے ہو۔ لہٰذا ایسے کام کا دعویٰ کرنے کی ممانعت معلوم ہوئی جس کو کرنے کا عزم اور ارادہ ہی انسان کے دل کے اندر نہ ہو۔ کیونکہ یہ دعویٰ جھوٹا ہو گا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے انسان کسی کام کرنے کا دعویٰ کرتا ہے دل میں کام کرنے کا عزم بھی ہوتا ہے لیکن وہ کام کسی وجہ سے نہیں ہوتا تو پھر بھی انسان پر قول وفعل میں تضاد کا الزام آ جاتا ہے۔ اس لیے اللہ رب العزت نے ہمیں یہ تعلیم دی کہ اگر دل میں کسی کام کرنے کا ارادہ اور پختہ عزم ہو پھر بھی اپنے نفس اور اپنی ذات اور اپنی قوت پر اعتماد کرتے ہوئے انسان براہ راست یہ نہ کہے کہ میں یہ کام کروں گا بلکہ یوں کہے ان شاء اللہ میں یہ کام کروں گا یعنی اگر اللہ نے چاہا۔

قول وفعل میں تضاد کا ایک پہلو تو دعویٰ کا تھا۔ لیکن دوسرا پہلو دعوت کا ہے یعنی کوئی شخص دعوت وتبلیغ کا کام کرتا ہے وعظ ونصیحت کرتا ہے لوگوں کو بھلائی کا کام کرنے کی دعوت دیتا ہے لیکن خود نہیں کرتا۔ یہ بھی قول وفعل کے تضاد کی ایک شکل ہے لیکن یہ نفاق کی نشانیوں میں شمار

نہیں بلکہ عملی کمزوریوں میں شمار کی جاتی ہے۔جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں فرمایا: **اتـامـرون الناس بالبر وتنسون انفسکم** تم لوگوں کوتو نیکی کا حکم دیتے ہواور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو دعوت وتبلیغ کے کام میں واقعی یہ بڑی کمزوری شمار ہوتی ہے۔اس کا منفی اثر یہ ہوتا ہے کہ دعوت وتبلیغ کا صحیح طریقے سے اثر نہیں ہوتا۔

لیکن قول وفعل کا وہ تضاد جو نفاق کی نشانیوں میں شمار کیا گیا اس کے نقصان دینی اور دنیوی اعتبار سے بہت شدید ہیں۔ پہلا نقصان تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ منافقین جہنم کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے۔اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے بری حالت دو چہروں والوں یعنی منافقین کی ہو گی، معاشرتی نقصانات میں سے سب سے بڑا نقصان قول وفعل میں تضاد رکھنے والے کو یہ ہوتا ہے کہ یہ شخص لوگوں کی نظروں میں گر جاتا ہے اس کی وقعت ختم ہو جاتی ہے اور اسے ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے لہٰذا لوگ ایسے شخص پر اعتماد نہیں کرتے۔اعتماد کی دیوار بڑی محنت اور بہت زیادہ وقت میں تعمیر ہوتی ہے لیکن اس دیوار کو گرانے کے لیے قول وفعل کے تضاد کے صرف ایک دھکے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے معاشرتی زندگی میں انسان کو اپنے قول وفعل میں مطابقت کی بہت فکر کرنی چاہیے۔ تاکہ دنیا وآخرت میں سرخرو ہو سکے اور معاشرے کے افراد کا باہمی اعتماد حاصل رہے۔

اللہ رب العزت ہمیں اپنے قول وفعل میں مطابقت پیدا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

واخر دعوانا ان الحمد اللّٰہ رب العالمین



راہ حق میں نصرت الٰہی کب نصیب ہوتی ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿ان النصر مع الصبرO﴾

”بے شک اللہ کی مدد صبر کے ساتھ ہوتی ہے۔“

اللہ رب العزت نے سورۂ محمد کی ساتویں آیت میں ارشاد فرمایا:

﴿یایھا الذین امنوا ان تنصروا اللّٰہ ینصرکم ویثبت اقدامکم﴾

”اے ایمان والو اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدمی عطا کرے گا۔“

حق و باطل کے دونوں راستے ہر دور میں انسان کے سامنے رہے اور اللہ تعالیٰ نے انسان کی نجات اور تباہی کا معیار اسی بات کو بنایا۔ ہر انسان کو اللہ نے صحیح فطرت پر پیدا فرمایا اور پھر حق و باطل میں سے جو راستہ بھی یہ انسان اختیار کرنا چاہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کا اختیار دے دیا۔

﴿فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر انا اعتدنا للظالمین نارا﴾

”جو چاہے ایمان لائے جو چاہے کفر اختیار کرے لیکن ایمان والوں کے لیے نجات اور ظلم اور کفر اختیار کرنے والوں کے لیے جہنم کی آگ مقرر فرما دی۔“

اب سلیم الفطرت انسان حق کی تلاش میں رہتا ہے‘ جب حق کا راستہ مل جاتا ہے تو پھر اسے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اللہ کی نصرت اور مدد اس کے ساتھ ہے یہاں تک کہ وہ راہ حق میں جان بھی قربان کر دیتا ہے لیکن کسی انسان کو باطل میں کشش نظر آتی ہے‘ اسے باطل

میں اپنا ذاتی مفاد نظر آتا ہے باطل کو اختیار کرنے سے اس کی انا کو تسکین ہوتی ہے یقیناً باطل میں میں بھی بظاہر بہت سے فوائد نظر آتے ہیں جب ہی تو بسا اوقات باطل راستے میں انسان بہت زیادہ پختہ ہو جاتا ہے اور اس سے ہٹنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

دوسری طرف راہ حق اختیار کرنے والا انسان جان و مال قربان کرنے کے جذبہ سے حق پر قائم رہتا ہے اور اللہ کی نصرت اور اس کی مدد پر بھروسہ کرتا ہے لیکن وہ وقت بڑی کڑی آزمائش کا وقت ہوتا ہے جب حق پر قائم رہنے والے کو بظاہر نصرت خداوندی کے آثار نظر نہیں آتے اور یہ اللہ کی مدد کے آثار اس لیے دکھائی نہیں دیتے کہ حق پر ہونے کے باوجود اس بندے سے کچھ ایسے اعمال سرزد ہو جاتے ہیں جو اللہ کی طرف سے آتی ہوئی مدد کو روک دیتے ہیں جیسے غزوۂ احد میں ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دستے کو ایک خاص درہ پر متعین فرمایا جہاں سے دشمن کے حملہ کا خطرہ تھا اور اس دستہ کو تاکید فرما دی کہ اس جگہ کو خالی نہ چھوڑیں چاہے فتح ہو یا شکست۔ جب پہلے ہی حملہ میں کفار کے پاؤں اکھڑ گئے اور بھاگنا شروع ہو گئے، مسلمانوں کو اپنی فتح کا یقین ہو گیا تو مال غنیمت اکٹھا کرنے لگے اور درہ پر متعین دستہ بھی پہاڑ سے اتر کر مال غنیمت کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دشمن نے درہ خالی دیکھ کر پیچھے سے حملہ کر دیا جس سے مسلمانوں کو جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران میں غزوہ احد کے موقع پر فتح و نصرت نہ ملنے کی وجوہات اور تفصیلات کے بارے میں ساٹھ آیات نازل فرمائیں۔ آیت نمبر ۱۵۲ میں فرمایا جب تم اللہ کے حکم سے کافروں کو قتل کر رہے تھے **حتی اذا فشلتم وتنازعتم فی الامر وعصیتم من بعدما اراکم ماتحبون** یہاں تک کہ جب تم کمزور پڑنے لگے اور آپس میں جھگڑنے لگے اور تم نے حکم عدولی کی جب کہ اللہ نے تمہاری پسندیدہ چیز یعنی فتح و نصرت دکھا دی تھی پھر اللہ نے وہی فتح شکست میں بدل دی تاکہ تمہارا امتحان لے۔ **ولقد عفاعنکم** کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری اس کوتاہی پر تمہیں معاف بھی کر دیا اب قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ نے اصول بتا دیا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہ کرنے پر اللہ کی نصرت اور مدد ساتھ نہیں دیتی۔

اس طرح جب مسلمان کمزور ہو جائیں اور آپس میں جھگڑنے لگیں تو پھر بھی راہ حق پر ہوتے ہوئے بھی اللہ کی مدد نصیب نہیں ہوتی۔ اور امت کو یہ سبق ملتا ہے کہ اگر اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہوئے دین کے بجائے دنیا کے مال و دولت کی طرف انسان متوجہ ہو جائے تو پھر بھی نصرت خداوندی ساتھ نہیں دیتی۔

راہ حق میں نصرت خداوندی انسان کے ساتھ کب شامل حال رہتی ہے اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران کی ۱۴۶ آیت میں فرمایا:

﴿و کاین من نبی قتل معه ربیون کثیر فما وهنوا لما اصابهم فی سبیل اللّٰه و ما ضعفوا و ما استکانوا و اللّٰه یحب الصابرین﴾

''اور بہت سے پیغمبروں کے ساتھ مل کر خدا پرستوں نے کافروں سے جہاد و قتال کیا لیکن ان تکلیفوں کی وجہ سے جو ان کو خدا کی راہ میں پہنچیں نہ تو سست ہوئے اور نہ کمزور ہوئے نہ دشمنوں سے دبے اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

اس سے یہ اصول معلوم ہوا کہ اللہ کے مقرب بندوں کو راہ حق میں طرح طرح کی تکلیفیں اور قسم قسم کی مصیبتیں پہنچیں لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری نہ دشمنوں سے دبے نہایت صبر و استقلال کے ساتھ اللہ کے دشمنوں کے سامنے ثابت قدم رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنی شجاعت اور اپنی افرادی قوت، اور اپنے ساز و سامان پر نظر نہیں رکھی بلکہ رب ذوالجلال پر رکھی اور ساتھ ساتھ اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے رہے اور ثابت قدم رہنے کی دعا کرتے رہے۔ **فاتهم اللّٰه ثواب الدنیا وحسن ثواب الاخرة** تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا کا انعام اور آخرت کا بہترین انعام عطا فرمایا۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی آخری رات اپنے خیمہ میں جو اشعار پڑھ رہے تھے ان میں سے ایک شعر یہ بھی تھا۔

وانما الامر الی الجلیل

وکـــل حـــی ســـالك السبيـــل

بے شک سارا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے اور ہر زندہ موت کے راستے پر چلا جا رہا ہے۔ وہ پوری رات آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے استغفار اور دعاؤں میں گزاری اس رات خیمہ میں موجود ساتھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو سورہ آل عمران کی یہ آیات بلند آواز میں پڑھتے ہوئے سن رہے تھے۔

﴿ماكان الله ليذر المؤمنين على ماانتم عليه حتى يميز الخبيث من الطيب﴾

یعنی اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس حالت میں چھوڑنے والا نہیں جس پر تم ہو یہاں تک کہ وہ پاک کو ناپاک سے الگ کرے گا ان کیفیات کو دیکھ کر خیمہ میں موجود ہر شخص کو آنے والی آزمائش کا اندازہ ہونے لگا لیکن حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے ضبط نہ ہو سکا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

﴿يااختى اتقى الله فان الموت نازل لا محالة﴾

”اے میری بہن اللہ سے ڈرو۔ موت تو یقیناً ایک آنے والی چیز ہے۔“

پھر فرمایا:

﴿فان لى ولكل مسلم اسوة برسول الله صلى الله عليه وسلم﴾

”یعنی میرے لیے اور ہر مسلمان کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور ان کے اعمال بہترین نمونہ ہیں۔“

یہاں تک کہ راہ حق میں مسلمان شہید ہو جائے تو بھی کامیاب۔ سورہ محمد میں ارشاد باری ہے:

﴿والذين قتلوا فى سبيل الله فلن يضل اعمالهم سيهديهم ويصلح بالهم ويدخلهم الجنة عرفها لهم﴾

”جو لوگ اللہ تعالیٰ کے راستے میں قتل کیے گئے اللہ ان کے اعمال کو ضائع نہیں

کرے گا' ان کو راہ ہدایت دکھائے گا ان کے حال کو سنوارے گا اور جنت میں داخل کرے گا۔''

اللہ رب العزت ہمیں راہ حق اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور پھر دنیا کے مال و دولت کی محبت کی جگہ ہمیں آپس میں اتفاق و محبت نصیب فرمائے' سستی اور کمزوری سے محفوظ فرمائے' ہمارے دلوں میں دین کی محبت پیدا فرمائے' زندگی کے ہر مرحلے میں اپنی اور اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نصیب فرمائے اس لیے کہ راہ حق میں اللہ کی نصرت اور اس کی مدد کے حق دار یہی لوگ ہیں۔ آمین یارب العلمین۔

☆☆☆

عدوات اور محبت صرف اللہ کے لیے ہو

عن ابی امامة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: من احب لله وابغض لله، واعطی لله ومنع لله فقد استکمل الایمان.

(رواہ ابوداؤد)

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جس نے اللہ ہی کے لیے کسی سے محبت کی اور اللہ ہی کے لیے دشمنی رکھی اور اللہ ہی کے لیے دیا (جس کسی کو کچھ دیا) اور اللہ ہی کے لیے منع کیا اور نہ دیا تو اس نے اپنے ایمان کی تکمیل کر لی۔''

ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد، اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ اس لیے مسلمان کی کوشش اپنے ہر قول و فعل سے یہی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کام کرنے کی وجہ سے ایمان کامل ہوتا ہے یعنی جس شخص نے اپنی حرکات وسکنات، اپنے جذبات اور احساسات اس طرح اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع کر دیئے کہ وہ جس سے تعلق جوڑتا ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہی جوڑتا ہے اور جس سے تعلقات توڑتا ہے اللہ تعالیٰ ہی کے لیے توڑتا ہے۔ جس کو کچھ دیتا ہے اللہ ہی کے لیے دیتا ہے۔ اور جس کے دینے سے ہاتھ روکتا ہے صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مقصود ہوتی ہے۔

جس شخص کی سوچ اور تفکرات اس قدر رضائے الٰہی کے تابع ہوں، اسے اللہ تعالیٰ سے کامل تعلق اور کامل ایمان نصیب ہوتا ہے۔ عداوتیعنی دشمنی اور محبت اللہ ہی کے لیے کرنا ایسا عمل ہے جس سے انسان اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

﴿سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: قال الله تعالیٰ وجبت محبتی للمتحابین فی﴾

یعنی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا...... کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''جو لوگ میری رضا کے لیے آپس میں محبت کرتے ہیں ان کے لیے میری محبت واجب ہو جاتی ہے۔''

اور ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے کہ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں ''جس بندے نے بھی اللہ کے لیے کسی سے محبت کی، اس نے دراصل اپنے رب کریم کی عظمت اور توقیر کی۔'' کیونکہ جب عداوت اور محبت اللہ کی رضا کے لیے ہو تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی قدر و منزلت کا اندازہ، حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہو سکتا ہے۔

وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں:

﴿ان احب الاعمال الی اللہ تعالیٰ الحب فی اللہ والبغض فی اللہ﴾

''یعنی بندوں کے اعمال میں سے اللہ کو سب سے زیادہ پسند وہ محبت اور عداوت ہے جو اللہ کی رضا کے لیے ہو۔''

اللہ کی رضا کے لیے مسلمان بھائی سے محبت کرنا اور رضائے الٰہی کے لیے اس سے ملاقات کرنا، کتنا عظیم عمل ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے اندازہ ہو سکتا ہے فرماتے ہیں کہ آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک شخص اپنے مسلمان بھائی سے ملاقات کے لیے چلا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ اس کے راستے میں منتظر بنا کر بٹھا دیا گیا۔ جب وہ شخص اس جگہ سے گزرا تو فرشتے نے پوچھا: کہاں کا ارادہ ہے؟ اس شخص نے جواب دیا کہ ''میں اپنے ایک مسلمان بھائی کی ملاقات کے لیے جا رہا ہوں۔'' فرشتے نے کہا کیا تمہارا اس پر کوئی احسان ہے یا کوئی اور حق ہے جس کی خاطر اس کے پاس جا رہے ہو؟ ''اس شخص نے جواب دیا'' مجھے تو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے اس سے محبت ہے اس لیے اس سے ملاقات کے لیے جا رہا ہوں'' فرشتے نے کہا کہ'' مجھے اللہ تعالیٰ نے تمہارے پاس بھیجا ہے کہ اللہ

تعالیٰ تم سے محبت کرتا ہے جس طرح تم اللہ تعالیٰ کے لیے اس شخص سے محبت کرتے ہو۔''

آج معاشرے میں محبت اور عداوت کے لیے دنیوی مفادات کو بنیاد بنا لیا گیا۔ چنانچہ کسی سے کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو اس سے محبت کی جاتی ہے۔ اس کی عزت اور توقیر معاشرے کی نگاہ میں ہوتی ہے اور جس کسی سے فائدہ نہ پہنچے، اسے عزت کی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا، بلکہ اس سے نفرت کی جاتی ہے۔

اس دنیا میں رشتہ داری اور قرابت کی وجہ سے محبت اور تعلق کا ہونا تو عام ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کی مالی مدد کرتا ہے اسے ہدیے اور تحفے دیتا ہے، تو اس محسن کی محبت بھی ایک فطری بات ہے۔ حالانکہ اسلامی تعلیمات کی رو سے ان تمام تعلقات سے قطع نظر کرتے ہوئے، محبت اور عداوت اللہ کی رضا کے لیے ہونی چاہیے۔

آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں واضح ہو چکا کہ جب ہماری محبت اور نفرت کا مدار ''رضائے الٰہی'' پر ہوگا، تو اس سے ایمان کامل ہوگا، دنیا اور آخرت میں نجات اور فلاح نصیب ہوگی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور محبت حاصل ہوگی۔

اور جس سے اللہ تعالیٰ محبت کریں گے اس سے تمام مخلوق محبت کرے گی۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''جب اللہ تعالیٰ کسی سے محبت فرماتے ہیں تو حضرت جبریل علیہ السلام سے ارشاد ہوتا ہے کہ ''مجھے فلاں شخص سے محبت ہے تم بھی اس سے محبت کرو۔'' اس پر حضرت جبریل علیہ السلام خود بھی اس شخص سے محبت کرتے ہیں اور آسمان میں اعلان کر دیتے ہیں کہ فلاں شخص اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ ہے تم سب اس سے محبت کرو۔'' پس آسمان والے اس سے محبت کرتے ہیں اور زمین والوں کے دلوں میں بھی اس کی محبت ڈال دی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے، کسی سے محبت کرنے کا کتنا بڑا انعام ملتا ہے، کہ سب آسمان اور زمین والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ والوں کی طرف، دل

خود بخود کھنچتا ہے۔کسی اندرونی جذبے کے تحت ان سے محبت اور الفت جوش مارنے لگتی ہے۔

بے لوث محبت کی وجہ سے دوسروں کے دل میں بھی عزت اور توقیر بڑھتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیوی اور اخروی انعامات ملتے ہیں اور آخرت میں بلند و بالا درجات نصیب ہوتے ہیں۔حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ

''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ارشادفرمائیں گے:

﴿این المتحابون بجلالی الیوم اظلهم فی ظلی یوم لا ظل الاظلی﴾ (رواہ مسلم)

''یعنی کہاں ہیں میرے وہ بندے جو میری عظمت اور میرے جلال کی وجہ سے آپس میں محبت کرتے تھے؟ آج جب کہ میرے سائے کے سوا کوئی سایہ نہیں، میں اپنے ان بندوں کو اپنے عرش کے سائے میں جگہ دوں گا۔''

بے لوث محبت کرنے والوں کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

﴿لا یخافون اذا خاف الناس، ولا یحزنون اذا حزن الناس﴾

''یعنی پس اللہ کی قسم ان کے چہرے قیامت کے دن نورانی ہوں گے اور وہ لوگ نور کے منبروں پر ہوں گے۔اور عام انسان جس وقت قیامت کے دن خوف و ہراس کا شکار ہوں گے۔اللہ کی رضا کے لیے آپس میں محبت کرنے والے ''بے خوف اور مطمئن'' ہوں گے۔''

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی باہمی محبت اور عداوت اپنی رضا کی خاطر نصیب فرمائے۔آمین ثم آمین۔



آداب معاہدہ

﴿عن صفوان بن سلیم...... عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال الا من ظلم معاھدا اوانتقصه او کلفه فوق طاقته شیئاً بغیر طیب نفس فانا حجیجه یوم القیمة﴾(رواہ ابوداؤد)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خبردار! جس شخص نے ظلم کیا اس پر جس سے معاہدہ ہو چکا یا اس کے حق کو نقصان پہنچایا یا اس کو تکلیف دی اس کی طاقت سے زیادہ یا اس کی رضامندی کے بغیر اس سے کوئی چیز لے لی تو میں اس سے قیامت کے دن جھگڑوں گا۔''

لفظ عقود عقد کی جمع ہے۔ عقد کا معنی ہے باندھنا۔ لہٰذا جو معاہدہ دو شخصوں یا دو جماعتوں میں بندھ جائے اسے عقد کہا جاتا ہے۔ علامہ جصاصؒ فرماتے ہیں کہ کسی معاملہ کو عقد کہا جائے یا عہد و معاہدہ اس کا یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ دو فریقوں نے آئندہ زمانے میں کوئی کام کرنے یا نہ کرنے کی پابندی اپنے لیے لازم کر لی ہو اور دونوں متفق ہو کر اس کے پابند ہو گئے ہوں۔ آج کل ہمارے عرف میں اس کا نام معاہدہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''اے ایمان والو! تم اپنے معاہدوں کو پورا کیا کرو۔'' اس ارشاد باری میں ہر طرح کے معاہدے شامل ہیں اس سے مراد وہ معاہدہ بھی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے ایمان و اطاعت کے سلسلے میں کیا ہے۔ وہ معاہدات بھی شامل ہیں جو دو فرد کریں جیسے شادی بیاہ کے معاہدے اور خرید و فروخت کے معاہدے اور وہ معاہدے بھی داخل ہیں جو دو قومیں کرتی ہیں لہٰذا بین الاقوامی معاہدوں کی پابندی بھی لازم ہو گی۔

زمانہ اسلام سے پہلے بھی لوگ معاہدے کرتے تھے لیکن عموماً معاہدات کی پابندی محکومی کی علامت اور معاہدات کو توڑنا جرأت اور برتری کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاہدات فرمائے وہ معاہدات کی تاریخ میں مثالی معاہدے تسلیم کیے

جاتے ہیں۔

ان معاہدات میں بنیادی معاہدہ وہ ہے جو صلح نامہ ''حدیبیہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ حدیبیہ ایک کنویں کا نام ہے اس کے ساتھ ایک گاؤں آباد تھا اس وجہ سے اس کا نام حدیبیہ ہوا۔ یہ علاقہ مکہ معظّمہ سے تقریباً ۹ میل کے فاصلہ پر ہے اکثر حصہ حرم میں ہے باقی حرم سے باہر ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کے ارادہ سے مدینہ منورہ سے مکہ معظّمہ یکم ذی قعدہ ٦ ھ کو روانہ ہوئے تقریباً پندرہ سو انصار و مہاجرین صحابہ آپ کے ہمراہ تھے۔ جب آپ حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو قریش مکہ سمجھے کہ یہ جنگ کرنے آئے ہیں۔ آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قاصد بنا کر بھیجا تاکہ وہ قریش کو آگاہ کر دیں کہ مسلمان جنگ کے ارادہ سے نہیں آئے' کفار نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو روک لیا' مسلمانوں کو یہ افواہ پہنچی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے قصاص عثمان کے لیے موت تک لڑنے کی بیعت کی جو کہ بیعت رضوان کہلاتی ہے۔ قریش کو جب بیعت کی خبر ہوئی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو رہا کر دیا اور سہیل بن عمرو کو صلح کا پیغام دے کر بھیجا۔ طویل گفتگو کے بعد ایک معاہدہ تیار ہوا جو کہ ''صلح نامہ حدیبیہ'' کہلاتا ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ لکھنے کا حکم دیا اور سب سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھوائی۔ عرب میں قدیم دستور یہ تھا کہ وہ **باسمك اللهم** لکھا کرتے تھے اسی وجہ سے سہیل نے کہا میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو نہیں جانتا قدیم دستور کے مطابق **باسمك اللهم** لکھو چنانچہ یہی لکھا گیا۔ پھر جب آپ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لفظ لکھوایا تو پھر سہیل نے کہا ہم تو آپ کو رسول اللہ نہیں مانتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خدا کی قسم میں اللہ کا رسول ہوں اگرچہ تم میری تکذیب کرو۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ یہ مٹا دو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میں تو ہرگز نہیں مٹاؤں گا پھر آپ نے خود مٹا کر محمد بن عبداللہ لکھوایا۔ معاہدہ لکھنے کے آداب میں اسوۂ حسنہ سے یہ مثالیں ایک اعلیٰ ترین نمونہ ہیں۔

پھر معاہدہ کی شرائط میں سے ہر شرط خوب توجہ کے مقابل ہے۔

ایک شرط یہ تھی کہ دس سال تک لڑائی نہیں ہو گی۔ دوسری شرط یہ تھی کہ قریش کا جو شخص بغیر سرپرست کی اجازت کے مدینہ جائے گا وہ واپس کیا جائے گا اگرچہ وہ مسلمان ہو اور جو شخص مسلمانوں میں سے مکہ آئے گا اسے واپس نہیں کیا جائے گا اور یہ کہ اس سال محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھی بغیر حج وعمرہ کیے مدینہ واپس جائیں اور آئندہ سال صرف تین دن مکہ میں رہ کر عمرہ کر کے واپس ہو جائیں۔ تلوار کے علاوہ کوئی ہتھیار نہ ہو اور تلواریں بھی نیام میں ہوں اور یہ بھی شرط تھی کہ قبائل عرب کو یہ آزادی ہو گی کہ وہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ کر لیں۔

یہ شرائط ہر مسلمان کی کمزوری پر دلالت کرتی ہیں بلکہ بعض مسلمانوں کے ذہنوں میں کچھ بوجھ بھی محسوس ہوا لیکن اس معاہدہ کے بعد پیش آنے والے مفید نتائج نے ثابت کر دیا کہ یہ معاہدہ تاریخ اسلام کا ایک ایسا اہم واقعہ تھا جو مسلمانوں کی آئندہ کامیابیوں کا پیش خیمہ بنا۔

چنانچہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ سے واپس ہوئے تو راستے میں سورۂ فتح نازل ہوئی جس میں اس صلح کو فتح مبین کہا گیا۔

اس معاہدہ سے بطور اسوۂ حسنہ یہ بات معلوم ہوئی کہ مسلمانوں کے سربراہ اگر کافروں سے صلح کا معاہدہ کرنے میں اسلام اور مسلمانوں کا نفع سمجھیں تو صلح کر لینا جائز ہے اور اگر صلح کا معاہدہ کرنے میں اسلام اور مسلمانوں کا فائدہ نہ ہو تو پھر صلح جائز نہیں کیونکہ یہ فریضہ جہاد کے خلاف ہے۔ اس معاہدہ سے ایک اصول یہ بھی معلوم ہوا کہ کافروں سے معاہدہ کے وقت بلامعاوضہ اور معاوضہ دے کر اور معاوضہ لے کر تینوں طرح معاہدہ جائز ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد یہود مدینہ سے معاوضہ لیے اور دیئے بغیر معاہدہ فرمایا اسی طرح معاہدہ حدیبیہ میں بھی معاوضہ کا تذکرہ نہیں ہے۔ لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نصارائے نجران سے جو معاہدہ فرمایا اس میں مال لینے کی شرط ٹھہرائی اس معاہدہ میں یہ تھا کہ اہل نجران ہر سال دو ہزار یمنی چادروں کے جوڑے دیں گے ایک ہزار صفر میں اور ایک ہزار رجب

میں اور غزوۂ احزاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیینہ بن حصن فزاری کو مدینہ کی نصف کھجوریں دے کر صلح کا ارادہ فرمایا معلوم ہوا کہ معاہدہ میں معاوضہ کی تینوں صورتیں جائز ہیں۔

معاہدات کے بارے میں اسوۂ حسنہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ معاہدات کو لکھوا لینا چاہیے۔ جیسا کہ احادیث اور تاریخ کی کتب میں مختلف معاہدات کے لکھنے کا حکم موجود ہے جیسے معاہدہ صلح نامہ "حدیبیہ" اہل نجران سے کیا گیا معاہدہ ' ثقیف سے کیا گیا معاہدہ، بنو ثقیف کے مسلمانوں سے کیا گیا معاہدہ، دومۃ الجندل کے باشندوں کے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدہ، ہجر کے باشندوں کے لیے معاہدہ، اہل مدینہ اور یہود کے درمیان کیا گیا مشہور معاہدہ۔

معاہدات کے بارے میں اسوۂ حسنہ سے یہ تعلیم بھی ملتی ہے کہ اسلامی تعلیمات کے خلاف کسی بات پر معاہدہ نہ کیا جائے۔ چنانچہ جب اہل نجران نے معاہدہ کے وقت خلاف اسلام شرائط پیش کیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ماننے سے انکار فرمایا اور معاہدہ نجران میں یہ لکھوایا کہ یہ ان پر پابندی ہوگی کہ یہ سود نہیں لیں گے اور جو سود لے گا وہ معاہدہ سے خارج ہو جائے گا۔

معاہدات کے بارے میں یہ ادب بھی اسوۂ حسنہ سے معلوم ہوا کہ عہد نامہ کی دو نقلیں ہونی چاہئیں تا کہ ہر فریق کے پاس ایک ایک کاپی محفوظ رہے۔ جیسا کہ صلح نامہ حدیبیہ کی ایک کاپی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہی اور دوسری کاپی سہیل بن عمرو کے پاس رہی۔

معاہدات کے لیے ایک بات یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھائی کہ جب معاہدہ ہو جائے تو دونوں فریقوں کے ذمہ دار افراد ان دستاویزات پر دستخط کریں۔ جیسا کہ حدیبیہ میں جب عہد نامہ لکھا گیا تو مسلمانوں کی طرف سے حضرت ابوبکر بن ابی قحافہ، حضرت عمر بن الخطاب ' حضرت عثمان بن عفان، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح، رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے دستخط کیے اور معاہدہ لکھنے والے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی دستخط فرمائے اور مشرکین کی طرف سے بھی کئی افراد نے دستخط کیے ان میں سے ایک حویطب بن عبدالعزیٰ اور مکرز بن حفص کے دستخط ہوئے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے بھی معاہدے فرمائے ان میں یہ بات بہت نمایاں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدات میں انسانی حقوق کا خوب خیال رکھا۔ ہر علاقہ کے شہریوں کو بنیادی حقوق عطا فرمائے' مذہبی حقوق بھی دیئے۔ چنانچہ معاہدات میں عقیدوں کی آزادی رکھی جاتی ہے۔ کسی شہری کو اپنا مذہب چھوڑنے اور اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا گیا۔ عبادت کی آزادی دی گئی اور ثابت کیا کہ اسلام کے زیر سایہ رہنے والے غیر مسلموں کی عبادت گاہیں بالکل محفوظ رہتی ہیں۔ چنانچہ معاہدہ نجران میں یہ بات شامل تھی کہ اہل نجران کی جان و مال، مذہب، عبادت گاہیں اور ان کے راہب محفوظ رہیں گے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لوگوں سے معاہدہ فرمایا ان کے معاشی اور تجارتی حقوق کا بھی خیال رکھا۔ چنانچہ بنو ثقیف کے معاہدے کی یہ شق بھی تھی اور اس میں اس کی واضح مثال موجود ہے اور پھر معاہدات کی پابندی اور پاسداری کرنے کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے ان معاہدات کی پابندی اور پاسداری کا ایک اعلیٰ معیار امت کے سامنے رکھ دیا۔ اس لیے کہ وہ ذات امین اور صادق ہے جس کے معاہدات بھی دین اسلام کی دعوت کا ذریعہ ہیں۔

اللہ رب العزت ہمیں زندگی کے تمام معاہدات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سکھائے ہوئے آداب کی پابندی کرنے کی توفیق عطا فرمائے تا کہ دنیا میں یہ معاہدات امن و سکون اور باہمی اعتماد کا ذریعہ بنیں اور آخرت کی فلاح کا سبب بنیں۔



عہد کی پابندی دینداری کی علامت ہے

﴿عن انس رضی الله عنه قال قلما خطبنا رسول الله صلی الله علیه وسلم الاقال لاایمان لمن لاامانة له ولا دین لمن لا عهدله.﴾

(رواه البیهقی فی شعب الایمان)

”حضرت انس رضی اللہ سے روایت ہے کہ بہت کم ایسا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا اور یہ ارشاد نہ فرمایا ہو کہ جس میں امانت نہیں اس کا ایمان (کامل) نہیں اور جس میں عہد (کی پابندی) نہیں اس کا دین (کامل) نہیں۔“

اللہ تعالیٰ نے جس دین کامل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انسانوں تک پہنچایا ہے اس میں ایمان کے بعد جن باتوں پر بہت زیادہ تاکید بیان کی گئی ہے وہ اچھے اخلاق اختیار کرنا ہے اور برے اخلاق سے حفاظت کرنا ہے۔

انسان کی زندگی میں اخلاق کی بڑی اہمیت ہے اگر انسان کے اخلاق اچھے ہوں تو اس کی اپنی زندگی بھی قلبی سکون اور خوشگواری سے گزرے گی اور دوسروں کے لیے بھی اس کا وجود رحمت اور چین کا باعث ہوگا اور اگر انسان کے اخلاق برے ہوں تو وہ خود بھی زندگی کے لطف ومسرت سے محروم رہے گا اور جن لوگوں سے اس کا واسطہ اور تعلق ہوگا ان کی زندگیاں بھی بدمزہ اور تلخ ہوں گی۔ یہ تو خوش اخلاقی اور بداخلاقی کے دنیا کی زندگی میں ظاہر ہونے والے نتائج ہیں جن کا ہر انسان اپنی روزمرہ زندگی میں مشاہدہ کر رہا ہے لیکن مرنے کے بعد آنے والی ابدی زندگی میں اچھے اور برے اخلاق کے اور زیادہ اہم نتائج نکلنے والے ہیں۔خوش اخلاقی کا نتیجہ ارحم الراحمین کی رضا اور جنت ہے اور بداخلاقی کا انجام خداوند قہار کا غضب اور جہنم کی آگ ہے۔

ان ہی اخلاقی خوبیوں میں سے ایک خوبی عہد کی پابندی ہے۔ جس کے بارے میں سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۳۴ میں فرمایا:

﴿واوفوا بالعهد ان العهد كان مسئولا﴾

''اور تم عہد کو پورا کیا کرو بے شک عہد کے بارے میں قیامت کے دن پوچھا جائے گا۔''

اس بارے میں تین الفاظ بولے جاتے ہیں وعدہ، عہد اور معاہدہ۔

وعدہ اور عہد دونوں عربی زبان کے الفاظ ہیں، دونوں کا معنی تقریباً ایک جیسا ہے یعنی قول وقرار کسی بات کو پختہ کر کے طے کر لینا لیکن اردو زبان میں ان دونوں لفظوں کے استعمال میں کبھی فرق بھی کرلیا جاتا ہے اگر کسی بات کو عام انداز میں ذکر کر دیا جائے تو وعدہ کرنا کہتے ہیں اور بہت ہی پختہ کر دیا جائے تو عہد کہتے ہیں۔ اور جب دو انسانوں یا دو قوموں کے درمیان کوئی بات طے ہو جائے تو اسے معاہدہ کہتے ہیں۔ اور کبھی یہ فرق بھی کیا جاتا ہے کہ اگر ایک شخص یکطرفہ قول وقرار کر لے تو اسے وعدہ کہتے ہیں اور دوطرف سے قول وقرار ہو تو اسے عہد کہتے ہیں عہد دوطرح کے ہیں ایک وہ عہد جو بندے اور اللہ کے درمیان ہو۔ جیسے ازل میں بندہ کا یہ عہد کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہمارا رب ہے، اس عہد کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان پر اللہ کی اطاعت لازم ہو جاتی ہے۔ یہ عہد تو اسلامی تعلیمات کے مطابق ہر انسان نے ازل میں کیا ہے اور پھر دنیا میں وجود میں آنے کے بعد مومن کا عہد جو اس نے کلمہ شہادت کے اقرار کے ذریعہ کیا ہے، اس معاہدہ پر عمل کرنا بہرصورت واجب ہے۔

دوسری قسم عہد کی وہ ہے جو ایک انسان دوسرے انسان سے کرتا ہے اس میں تمام تجارتی معاہدات، سیاسی معاہدے اور دوسرے تمام معاہدوں کی صورتیں شامل ہیں۔ اس قسم کے تمام عہد اگر ان میں اسلامی تعلیمات یعنی احکام شرعیہ کے خلاف کوئی بات نہ ہو تو ان کا پورا کرنا بھی واجب ہوتا ہے۔ اور اگر اس عہد میں کوئی خلاف شرع بات ہو یا غیر شرعی کام کا عہد کیا ہو تو دوسرے فریق کو اطلاع کر کے اس معاہدہ کو ختم کر دینا واجب ہے۔ اگر کوئی سے دو

فریق کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا معاہدہ کر لیں پھر ایک فریق معاہدہ پر عمل نہ کرے تو عدالت میں دعویٰ دائر کر کے معاہدہ پر عمل کرایا جا سکتا ہے۔

اگر کوئی شخص کسی سے یکطرفہ وعدہ کر لیتا ہے کہ میں آپ کو فلاں چیز دوں گا یا فلاں وقت آپ سے ملوں گا یا آپ کا فلاں کام کر دوں گا۔ اس کا پورا کرنا بھی انسان کے ذمہ واجب ہوتا ہے بسا اوقات وعدہ کو بھی عہد کے مفہوم میں داخل سمجھا جاتا ہے لیکن پھر بھی وہ فرق موجود رہے گا کہ اگر یکطرفہ وعدہ یا عہد ہو تو اسے عدالت کے ذریعہ جبراً پورا نہیں کروایا جا سکتا جب کہ دوطرفہ معاہدہ میں عدالت سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

یکطرفہ عہد یا وعدہ کی پابندی بھی شرعاً لازمی ہے۔ اگر کوئی شخص بلا عذر شرعی عہد کی پابندی نہ کرے وہ شرعی طور پر گنہگار ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں جواب دہ ہوگا ارشاد باری تعالیٰ ہے **واوفوا بالعهدان العهد كان مسؤلا** ۔اور تم عہد کو پورا کرو بے شک عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا اور سورۃ المومن کے آغاز میں مومنین کی فلاح و کامیابی کے جو اصول بیان فرمائے ان میں ایک اصول آیت نمبر ۸ میں فرمایا **والذين هم لامانتهم وعهدهم راعون** ۔ اور وہ لوگ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا خیال رکھتے ہیں۔

طبرانی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **العدة دين** ۔''یعنی وعدہ بھی ایک طرح کا قرض بنتا ہے۔'' لہٰذا اگر کسی کو کچھ دینے کا یا کسی کا کام کرنے کا عہد کیا جائے تو پھر اسے پورا کرنا اپنے اوپر فرض کی طرح سمجھنا چاہیے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی زندگی میں عہد کی پابندی کس قدر فرماتے تھے اس کا اندازہ ابو داؤد کی اس روایت سے ہوتا ہے جس کے راوی عبداللہ بن ابی الحمساء ہیں کہتے ہیں کہ اس دور کی بات ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا اعلان نہیں فرمایا تھا' میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے خرید وفروخت کا ایک معاملہ کیا' جو کچھ میں نے دینا تھا اس کا کچھ حصہ میں نے دے دیا اور کچھ اداء کرنا باقی رہ گیا تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کیا کہ میں

باقی حصہ ابھی اسی جگہ لے کر آتا ہوں پھر میں بھول گیا اور تین دن بعد مجھے یاد آیا' میں اسی وقت وہ لے کر وہاں پہنچا' عبداللہ بن ابی الحمساء کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی جگہ موجود ہیں۔آپ نے فرمایا:

﴿لقد شققت علی انا ھھنا منذثلث انتظرك.﴾

''تم نے مجھے بڑی مشکل اور مشقت میں ڈالا میں تمہارے انتظار میں تین دن سے یہاں ہوں۔''

عہد کی پابندی کا یہ اعلیٰ ترین معیار ہے جو اعلان نبوت سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا لیکن آپ نے اس حد تک عہد کی پابندی کو شرعی طور پر ضروری قرار نہیں دیا اس لیے کہ اسلام دین کامل ہونے کے ساتھ ساتھ دین فطرت بھی ہے چنانچہ رزین میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے کسی دوسرے سے وعدہ کیا پھر نماز کے وقت تک ان میں سے ایک نہیں آیا اور یہ انتظار کرنے والا نماز پڑھنے کے لیے مقررہ جگہ سے چلا گیا تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔

اس ارشاد نبوی سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص عہد کی پابندی کرتے ہوئے دوسرے کا انتظار کرتا رہا تو اس نے حق ادا کر دیا۔اب اگر یہ شخص نماز کا وقت ہونے پر نماز پڑھنے چلا جائے یا کسی دوسری ضرورت کے لیے چلا جائے تو اس پر وعدہ خلافی اور عہد شکنی کا الزام نہیں آئے گا اور نہ ہی یہ گنہگار ہوگا۔

عہد کرتے ہوئے اس بات کی نیت ضرور کرنی چاہیے کہ میں عہد کی پابندی کروں گا اگر یکطرفہ عہد کرتے وقت نیت پابندی کرنے کی ہو لیکن پھر کسی وجہ سے عہد اور وعدہ پورا نہ کر سکے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ گنہگار نہیں ہوگا۔

حضرت زید بن ارقمؓ سے ابوداؤد اور ترمذی میں روایت منقول ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿اذا وعد الرجل اخاه ومن نیته ان یفی ولم یجئی للمیعاد

فلا اثم علیه﴾

یعنی ''جب کسی شخص نے اپنے بھائی سے آنے کا وعدہ اور عہد کیا اور اس کی نیت یہی تھی کہ وہ وعدہ پورا کرے گا لیکن کسی وجہ سے وہ مقررہ وقت پر نہیں آیا تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔''

(البتہ جس شخص سے عہد کیا ہو اس سے معذرت کر لی جائے تا کہ اس شخص کا اعتماد بحال رہے) لیکن عہد کرتے ہوئے بڑی یقین دہانی کرا دی جائے اور اگر عین اس وقت دل میں نیت یہ ہو کہ اسے پورا نہیں کرنا، تو یہ بہت بڑی خیانت ہے۔

حضرت سفیان بن اسید حضرمی سے ارشادِ نبوی منقول ہے:

﴿کبرت خیانة ان تحدث اخاك حدیثا هولك به مصدق و انت به کاذب﴾

فرمایا'' کہ یہ بہت ہی بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے کوئی بات کرو، وہ تمہیں سچا سمجھ رہا ہو حالانکہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔''

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو بچوں کے ساتھ کیے گئے عہد کی پابندی کرنے کی بھی تعلیم دی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ اپنے بچپن کا واقعہ بتاتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر میں تشریف فرما تھے کہ میری والدہ نے مجھے کہا **ھا تعال اعطیك** ادھر آؤ میں تمہیں کچھ دوں گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تم نے اسے کیا چیز دینے کا ارادہ کیا ہے میری ماں نے کہا ایک کھجور دینے کا ارادہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **اما انك لولم تعطیه شیئا کتبت علیك کذبة.** اگر تم اس کو کچھ نہ دیتی تو تمہارے نامہ اعمال میں ایک جھوٹ لکھا جاتا۔

معلوم ہوا کہ بچوں سے بھی بدعہدی کی اجازت نہیں جب کہ عموماً معاشرہ میں اس بات کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ عہد کی پابندی ایمانی تقاضا ہے اس لیے کہ وعدہ خلافی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافق کی نشانیوں میں شمار فرمایا ہے۔ جب معاشرے میں عہد کی پابندی کا

خیال رکھا جاتا ہوتو پھر معاشرے میں افراد کا ایک دوسرے پر اعتماد قائم رہتا ہے۔ اور جب عہد شکنی عام ہو جائے تو پھر معاشرے میں باہمی اعتماد ختم ہو کر رہ جاتا ہے جب کہ زندگی کے اکثر معاملات کا انحصار اعتماد پر قائم ہے۔ اس لیے کسی سے عہد کرنے سے پہلے سوچ لیا جائے کہ میں پورا کر سکوں گا یا نہیں۔ اور پورا کرنے کی نیت بھی ہے یا نہیں اور پھر عہد کرنے کے ساتھ انشاء اللہ بھی کہہ دیا جائے۔ اس کے بعد اگر عہد پورا کرنے میں رکاوٹ نظر آ رہی ہو تو کوشش کر کے مقررہ وقت سے پہلے معذوری اور عذر ظاہر کر دیا جائے تا کہ عین وقت پر دوسرے کو پریشان نہ ہونا پڑے اور اگر دوسرا شخص چاہے تو اس کام کے لیے متبادل انتظام بھی کر لے۔ لیکن حیلے بہانے یا جھوٹ اور فریب سے کام لے کر عہد شکنی نہیں کرنی چاہیے بلکہ اصل بات ظاہر کر کے عذر پیش کر دیا جائے۔ اور اگر کبھی عہد شکنی ہو جائے تو دوسرے انسان سے معافی مانگ لی جائے اور کسی نہ کسی طرح اس کو پہنچنے والی تکلیف کا ازالہ کر کے اس کے دل کو خوش کر دیا جائے تا کہ یہیں دنیا میں معاملہ اور حساب صاف ہو جائے اور آخرت میں عہد کا حساب نہ دینا پڑے۔

اللہ رب العزت ہمیں عہد کرنے سے پہلے سوچنے اور عہد کرتے وقت خلوص نیت اور بعد میں عہد کی پابندی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

☆☆☆

خوشگوار زندگی کے نو اصول

﴿عن ابی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله عليه وسلم امرنی ربی بتسع خشية الله فی السرو العلانية وكلمة العدل فی الغضب والرضا و القصد فی الفقر والغنا وان اصل من قطعنی واعطی من حرمنی و اعفو عمن ظلمنی وان تكون صمتی فكرا ونطقی ذكرا ونظری عبرة وامر بالمعروف وقيل بالمعروف﴾ (رواه رزين، مشکوٰۃ باب البکاء والخوف)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے میرے پروردگار نے نو باتوں کا حکم دیا ہے: (۱) ظاہر و باطن میں خدا سے ڈرنا، (۲) انصاف کی بات کہنا غصہ میں اور رضا مندی میں، (۳) افلاس اور دولت مندی دونوں حالتوں میں میانہ روی اختیار کرنا، (۴) جو مجھ سے قطع تعلق کرے میں اس سے قرابت کو قائم رکھوں، (۵) جو مجھے محروم رکھے میں اس شخص کو دوں، (۶) جو شخص مجھ پر ظلم کرے میں اسے معاف کر دوں، (۷) میری خاموشی غور وفکر ہو میرا بولنا ذکر الٰہی ہو، (۸) میرا دیکھنا عبرت کے لیے ہو، (۹) اور میں نیکی کا حکم دوں۔''

ان میں سے اول چیز خوف خدا ہے قرآن حکیم میں انسان کے اندر اللہ کا ڈر پیدا کرنے کے لیے مختلف انداز سے دلائل دیئے گئے۔ کہیں اللہ تعالیٰ کے انعامات کا تذکرہ کہ دیکھو اللہ نے تمہارے لیے دنیا کی تمام نعمتیں بنائی ہیں یہ آسمان و زمین اور اس کے اندر کی تمام چیزیں یہ پہاڑ، دریا، درخت اور بارش برسا کر زمین سے تمہارے لیے رزق پیدا کرنا، اس قدر نعمتیں اس رب نے انسان کو عطا فرمائی ہیں کہ اس نے فرمادیا ''ان تعدوا نعمة الله لا تحصوه''[۱] یعنی اگر تم اللہ کی نعمتیں گننے لگو تو شمار نہیں کر سکو گے۔ رب ذوالجلال نے انسان کو اپنی

عطا کردہ نعمتیں یاد دلا کر کہا کہ دیکھو اب صرف مجھ سے ڈرو اور میری نافرمانی سے بچو۔

اسی طرح انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کا ڈر پیدا کرنے کے لیے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی بات اور اس کی قدرت کا خوب تذکرہ کیا گیا۔ تا کہ انسان کے اندر خدا کا صحیح تصور پیدا ہو جائے اس لیے کہ اگر خدا کا تصور انسان کے دل میں پختہ ہو جائے تو پھر اس کے نتیجہ میں اللہ کا ڈر یعنی تقویٰ پیدا ہو جائے گا۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے گذشتہ دور کے انسانوں کے واقعات بیان کر کے انسان کی حیات کو خوب واضح فرمایا کہ بعض لوگ اللہ کے احسانات و انعامات کی وجہ سے اللہ سے ڈرتے ہیں اور بعض لوگ اللہ کی قدرت کا مظاہرہ دیکھ کر ڈرتے ہیں۔ یہی کیفیات آج کیمعاشرے کے انسان میں بھی نظر آتی ہیں۔ بسا اوقات انسان پر اللہ کی نعمتوں کی برسات ہو رہی ہوتی ہے تو انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ تو میرا حق تھا اور یہ تو میری محنت اور زور بازو کا کمال ہے۔ بس اس غلط فہمی کی وجہ سے اللہ کا ڈر دل سے نکل جاتا ہے۔ پھر اسی انسان کے دل سے یہ بھی نکل جاتا ہے کہ نماز سے کیا ہوتا ہے تلاوت قرآن حکیم کی کیا ضرورت ہےیہ تمام باتیں اللہ کا ڈر نہ ہونے کی علامات ہیں۔ پھر اسی انسان کو جب دنیا میں دکھوں اور مصیبتوں کا سامنا ہوتا ہے کوئی قریبی عزیز بیمار ہو جاتا ہے یا خود کسی مالی یا ذہنی پریشانی میں مبتلا ہو جاتا ہے پھر خوب قرآن حکیم کی تلاوت کرتا ہے پانچ وقت نماز مسجد میں ادا کرتا ہے اس لیے کہ اس کے دل میں اللہ کا یقین تو تھا اگر یہی یقین انسان کے دل میں پختہ ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ اس انسان کے ہر کام کو دیکھ رہا ہے تو پھر اس ڈر کی وجہ سے وہ اللہ کی نافرمانی نہیں کرے گا اور یوں یہ انسان ایک کامیاب زندگی گزارے گا۔ معلوم ہوا کہ کامیاب زندگی گزارنے کے لیے اللہ کا ڈر انسان کے اندر ہونا بہت ضروری ہے۔

قرآن مجید میں اللہ نے انسان کے اندر اپنا ڈر پیدا کرنے کے لیے جہاں اپنے احسانات انعامات اور اپنی قدرت اور صفات کا تذکرہ فرمایا وہاں انسان کو اس کے برے اعمال کے برے انجام سے بھی ڈرایا۔ انسان کے دل میں اللہ کا ڈر پیدا کرنے کا ایک اہم

محرک عقیدۂ آخرت ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں عقیدہ آخرت کے تمام پہلوؤں کو خوب وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا کہ انسان کو آخرت میں یعنی موت کے بعد آنے والی زندگی میں اس کے ہر عمل کا اچھا بدلہ اور برے عمل کا برا بدلہ ملے گا۔

جب انسان کے اندر اللہ کا ڈر پیدا ہو جاتا ہے تو اس انسان کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب آجاتا ہے اس کی زندگی میں بہت سی خوشگوار اور عمدہ تبدیلیاں آجاتی ہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان باتوں کی نشاندہی فرمائی ہے جو اللہ سے ڈرنے کے نتیجہ میں سامنے آتی ہیں ایسا شخص اللہ پر پختہ ایمان رکھتا ہے، پابندی سے نماز ادا کرتا ہے **و مما رزقنھم ینفقون** جو کچھ اللہ نے اسے دیا اس میں سے خرچ کرتا ہے زکوٰۃ ادا کرتا ہے۔ **والموفون بعھدھم اذا عاھدوا** جب وعدہ کرتے ہیں تو پھر ایسے لوگ وعدہ پورا کرتے ہیں۔ **والصابرین فی الباساء والضراء و حین الباس** ۔اور اللہ سے ڈرنے والے لوگ جب تنگ دستی میں مبتلا ہوتے ہیں یا بیماری اور مصیبت میں گھر جاتے ہیں تو صبر کرتے ہیں اور ثابت قدم رہتے ہیں۔

اللہ سے ڈرنے والوں میں ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ کون سی چیز حلال ہے اور کون سی حرام ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق تو انسان متقی یعنی اللہ سے ڈرنے والوں میں اس وقت شمار ہوتا ہے جب وہ ہر اس چیز سے بچتا ہے جو دل میں کھٹکتی ہے۔ اس لیے کہ جب خوف خدا نصیب ہوتا ہے تو انسان مشتبہ چیزوں سے بھی بچتا ہے۔ بلکہ بظاہر چھوٹے گناہ کو بھی پہاڑ کے برابر بوجھل سمجھتا ہے۔ ایسا انسان پھر دوسرے انسان کے حقوق کا بھی ہر مرحلے میں خیال رکھتا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس بندے کے لیے بہت سے فوائد بتائے ہیں جو اللہ سے ڈرتا ہے جیسے سورۂ حجرات میں فرمایا:

﴿**ان اکرمکم عنداللہ اتقکم**﴾

”تم میں سے اللہ کے نزدیک زیادہ عزت والا وہ شخص ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیزگار ہو۔“

جوشخص اللہ سے ڈرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے اور وہاں سے رزق دیتا ہے جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا۔ یہی بات سورۂ طلاق میں ارشاد فرمائی:

"ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لا یحتسب" اور اسی سورت کی چوتھی آیت میں فرمایا جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے کام آسان کر دیتا ہے۔

سورۂ انفال میں فرمایا۔ اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو گے تو اللہ تمہیں حق اور باطل میں فرق کرنے کی قوت عطا فرما دے گا اور تمہارے گناہ دور کر کے تمہیں بخش دے گا پھر جو شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے اور اللہ سے ڈرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے دوسری چیزوں کے ڈر سے نجات دیدیتا ہے سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا جن لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا اور نیک ہو گئے ان پر کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ غمگین ہوں گے۔

اللہ سے ڈرنے والوں پر برکتوں اور رحمتوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ سورۂ اعراف میں فرمایا اگر اسی بستی والے ایمان لے آتے اور اللہ سے ڈرتے ہوئے پرہیزگاری اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

سورۃ البقرہ میں فرمایا:

﴿واعلموا ان اللہ مع المتقین﴾

"اور تم مان لو بیشک اللہ متقین کے ساتھ ہے۔"

معلوم ہوا کہ جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں تو پھر اللہ بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے آج معاشرہ میں کسی کا تعلق کسی بڑے عہدیدار سے ہو جائے تو وہ کتنا فخر کرتا ہے اور یوں کہتا ہے کہ مجھے صرف اسی کا ڈر ہے اور کسی کا نہیں۔ اگر انسان کے دل میں صرف اپنے رب کا ڈر پیدا ہو جائے تو یوں کہنے لگے کہ مجھے تو صرف خدا کا ڈر ہے اور کسی کا نہیں تو پھر یقیناً انسان کی زندگی کا ہر لمحہ سنور جائے۔

اللہ رب العزت ہم سب کے دلوں سے مخلوق کا ڈر نکال کر خالق کا ڈر ڈال دے اور پھر

اس کے نتیجہ میں رب ذوالجلال اپنے وعدے کے مطابق ہمارے تمام کام آسان بنا دے مشکلات سے نکلنے کے راستے بنا دے، جہاں سے گمان بھی نہ ہو وہاں سے رزق عطا کرے اور ہماری دنیا و آخرت کی زندگی میں برکتیں اور رحمتیں نازل فرما دے۔

☆☆☆

خوشگوار گھریلو زندگی کے بنیادی اصول

﴿عن عائشة رضی الله عنها قالت قال رسول الله صلی الله علیه وسلم خیر کم خیر کم لا هله وانا خیر کم لا هلی﴾

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، وہ شخص تم میں سے زیادہ اچھا ہے جو اپنی بیوی کے حق میں اچھا ہو (اور فرمایا) اور میں اپنی بیویوں کے لیے تم میں سے زیادہ اچھا ہوں۔''

مل جل کر زندگی بسر کرنا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ انسان کی اس فطری ضرورت کی وجہ سے اسلام نے عائلی زندگی اختیار کرنے کی تلقین کی ہے۔

عائلۃ عربی زبان میں بیوی اور گھر کے دیگر افراد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ عائلی زندگی سے اسلام نے قرآن حکیم اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے ذریعہ ایک مکمل عائلی نظام اور اس کے اصول و آداب سکھائے جس کی بدولت انسان کو عائلی زندگی میں راحت وسکون نصیب ہوتا ہے۔ مال و مکان کا تحفظ، عصمت و عفت کی حفاظت، اولاد کی تربیت، ایک دوسرے کے بارے میں احساس ذمہ داری اور آپس کی محبت نصیب ہوتی ہے۔

چنانچہ اسلام نے بیوی کے حقوق و فرائض کے بارے میں خاص طور پر تعلیم دی۔ جس سے زندگی میں راحت وسکون ہونے کی وجہ سے بچے بھی خوشگوار ماحول میں تربیت پا کر عمدہ شہری اور آنکھوں کی ٹھنڈک بنتے ہیں۔

جب بیوی کے حقوق و فرائض کی بات کی جائے گی تو شوہر کے حقوق و فرائض کی بات بھی آ جائے گی اس لیے کہ جو بیوی کے حقوق ہیں وہ شوہر کے فرائض ہیں اور جو بیوی کے فرائض ہیں وہ شوہر کے حقوق ہیں۔

چنانچہ بیوی بننے کے بعد اسلام نے عورت کا یہ حق بیان فرمایا:

﴿واتوا النساء صدقتهن نحلة﴾

یعنی ''تم عورتوں کے حق مہر کوخوش دلی سے ادا کر دیا کرو۔''

چنانچہ اگر مہر نکاح کے وقت ادا نہ کیا جائے تو پھر بھی ساری زندگی وہ واجب الاداء رہتا ہے۔ مرد صرف حق مہر دے کر فارغ نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے بعد بیوی کا حق ہے کہ شوہر بیوی کی ضروریات زندگی کو پورا کرے نان نفقہ اور رہائش یعنی بیوی کا کھانا پینا، اور اس کے رہنے سہنے کا بندوبست کرنا یہ بیوی کا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب ''**الرجال قوامون علی النساء**'' فرمایا تو اس کی وجہ یہ بھی بیان فرمائی کہ ''**وبما انفقوا من اموالھم**'' یعنی ''ان مردوں نے اپنے مال کو خرچ کیا ہے۔''

ایک شخص نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے پوچھا کہ بیوی کا شوہر پر کیا حق ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو خود کھائے وہ اسے کھلائے جو خود پہنے وہ اسے پہنائے۔

لہٰذا بیوی کا یہ حق ہے کہ شوہر اس کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ کرے۔ بلکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بیوی کا اس سے بھی آگے یہ حق ارشاد فرمایا:

﴿وعاشرو ھن بالمعروف﴾

''اور تم ان عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔''

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہترین انسان کی پہچان یہ بتائی کہ:

﴿خیر کم خیر کم لاھلہ﴾

''تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل خانہ کے ساتھ بہتر ہو۔''

اس لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیوی کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم خود اپنی زندگی کے ذریعہ سکھائی کیونکہ کامیاب ازدواجی زندگی کا یہ بنیادی اصول ہے۔

اسلام نے بیوی کے علاوہ باقی غیر عورتوں سے ہر طرح کے قلبی رجحانات کی ہر مرحلہ میں حوصلہ شکنی کی اور سخت ممانعت فرمائی اور یہ بتایا کہ ازدواجی زندگی کے اعتبار سے قلبی محبت کا حق صرف بیوی کا ہے۔ اس سے پاک دامنی اور عفت نصیب ہوتی ہے اور گھریلو

زندگی میں ایک دوسرے کا اعتماد حاصل رہتا ہے۔ باہمی اعتماد کو اس وقت ٹھیس پہنچتی ہے جب ایک دوسرے کی نجی باتوں اور رازوں کی حفاظت نہ کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس حق کو ان الفاظ میں بیان فرمایا:

﴿هن لباس لكم وانتم لباس لهن﴾

"عورتیں تمہارے لیے لباس ہیں اور تم عورتوں کے لیے لباس ہو۔"

جس طرح لباس بدن کو ڈھانپ لیتا ہے اسی طرح شوہر اور بیوی ایک دوسرے کے رازوں پر پردہ ڈالے رکھیں۔ بیوی کا یہ حق ہے کہ شوہر اس کے ساتھ بے تکلفی اور شگفتہ مزاجی کے ساتھ پیش آئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی گھریلو زندگی میں یہ بات خاص طور پر امت کو سکھائی تاکہ دونوں ایک دوسرے کی زندگی میں تعاون کرنے والے بنیں۔

اسی طرح بیوی کے رشتہ داروں سے اچھے سلوک سے پیش آنا بھی بیوی کے حقوق میں شامل ہے اور بیوی کے فرائض میں یہ شامل ہے کہ وہ شوہر کے رشتہ داروں سے حسن سلوک سے پیش آئے۔ گھریلو زندگی میں عام طور پر اس وقت بے سکونی آتی ہے جب شوہر یہ توقع کرے کہ بیوی اس کے رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ لیکن وہ خود بیوی کے رشتہ داروں سے اچھے سلوک سے پیش نہ آئے حالانکہ یہ بھی بیوی کے حقوق میں شامل ہے

لیکن اگر حالات آئندہ زندگی گزارنے کے قابل نہ رہیں تو اسلام نے عورت کو خلع کا حق دیا ہے کہ بیوی کچھ معاوضہ دے کر شوہر سے علیحدگی اختیار کر لے لیکن اگر ہمارے خالق و مالک نے بیوی کے جو فرائض بتائے ہیں ان کو بیوی پیش نظر رکھے اور شوہر کے جو فرائض بتائے ہیں، شوہر ان کا خیال رکھے تو طلاق اور خلع تک نوبت ہی نہیں پہنچتی۔

اللہ تعالیٰ نے بیوی کے فرائض یوں بیان فرمائے:

﴿فالصلحت قنتت حفظت للغيب بما حفظ الله﴾

"کہ بیویاں فرمانبردار ہوتی ہیں اور خاوند کی غیر حاضری میں ان چیزوں کی حفاظت کرتی ہیں جن کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے ان کے سپرد کی ہے۔"

اس مختصر سے جملے میں اللہ تعالیٰ نے کامیاب گھریلو زندگی کے لیے بیوی کے اہم ترین فرائض بتا دیئے۔ ظاہر ہے نیک بیوی تب ہو گی جب کہ وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرے گی۔ اور قانتات یعنی فرمانبردار تب ہو گی جب کہ آپس میں محبت اور عزت و احترام ہو اگر دل میں شوہر کے لیے محبت نہ ہو تو پھر اطاعت و فرمانبرداری، عزت و احترام اور خدمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح اللہ رب العزت نے بیوی کا یہ فرض بھی بتایا کہ "**حفظت للغیب**"معلوم ہوا کہ شوہر کے گھر اور اس کے مال کی حفاظت اس کے فرائض میں شامل ہے اور یہ تمام امور سلیقہ شعاری میں شامل ہیں۔ سلیقہ شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے اس سے گھر میں پرسکون ماحول نصیب ہوتا ہے اس سے شوہر اور بچوں کے لیے گھر میں دلچسپی کا سامان پیدا ہوتا ہے اور یہی باتیں آئندہ آنے والی نسل میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ سلیقہ شعار اور دیندار بیوی کے بچے بھی یقینی طور پر دیندار اور سلیقہ شعار ہوں گے۔

اللہ رب العزت ہمیں گھریلو زندگی میں ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھنے اور اپنے فرائض انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے اور یہ دعا ہم سب کے لیے قبول فرمائے۔

﴿**ربنا هب لنا من ازواجنا و ذریتنا قرة اعین**﴾

"اے ہمارے رب! ہمیں ہماری بیویوں اور ہماری اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما" آمین۔

انسان شکر گزار کیسے بنے؟

﴿عن ابی ھریرة رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا نظر احد کم من فضل علیہ فی المال و الخلق فلینظر الی من ھو اسفل منہ﴾ (متفق علیہ)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تم میں سے جو شخص کسی ایسے آدمی کو دیکھے جو اس سے زیادہ مالدار ہو اور اس سے زیادہ اچھی شکل وصورت کا ہو (اور اس کو دیکھ کر اپنی حالت پر ناشکری ہو) تو اسے چاہیے کہ وہ اس شخص پر نظر ڈالے جو اس سے کم تر ہو۔''

اللہ رب العزت نے اتنی نعمتیں ہمیں عطا کی ہیں کہ نعمتوں کو انسان شمار نہیں کرسکتا۔ انسان سوچتا ہے کہ مجھے فلاں چیز کی ضرورت ہے اور وہ چیز تو میرے پاس ہونی چاہیے لیکن اگر انسان چند لمحے کے لیے سوچے کہ مجھے کتنی نعمتیں اللہ سے مانگ کر اور خود محنت کر کے ملی ہیں اور کتنی چیزیں ہیں جس کے لیے انسان نے سوچا ہے کہ مجھے مل جائیں تو ہر انسان اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں دی ہیں بغیر اس کے سوچے بغیر مانگے بغیر محنت کیے ان کی مقدار بہت زیادہ ہے کئی نعمتیں ایسی نظر آئیں گی جن کے مانگنے کا کبھی خیال بھی نہ آیا ہو گا حالانکہ ان کے بغیر انسان زندہ بھی نہیں رہ سکتا لیکن اللہ نے وہ نعمتیں بھی انسان کو عطا فرمائی ہیں۔

اب ان تمام نعمتوں کا تقاضا ہے کہ انسان ان کا شکر ادا کرے یعنی انسان اللہ کی بے شمار نعمتوں کا دل سے اقرار کرے زبان سے اس کی تعریف کا اظہار کرے لہٰذا صرف وہی انسان اللہ کا شکر گزار بندہ کہلائے گا جو عملی زندگی میں احکام الٰہی کا پورا پابند ہو۔

اللہ کی عبادت جس انداز کی اللہ نے سکھائی وہ بھی شکر کا بہترین انداز ہے۔ رسول

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ شکر خداوندی کا بہترین نمونہ ہے۔ راتوں کو اٹھ کر اتنی دیر مصروف عبادت رہتے کہ پاؤں مبارک سوج جاتے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک رات میں نے یہ حالت دیکھ کر عرض کیا کہ آپ کے لیے تو اللہ نے مغفرت کا وعدہ فرما لیا ہے پھر آپ اتنی تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں؟ آپ نے جواب میں فرمایا:

﴿افلا اکون عبداشکورا﴾

''کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟''

اب انسان سوچتا ہے کہ واقعی مجھے بھی شکر ادا کرنا چاہیے لیکن آخر شکر ادا کرنے میں رکاوٹ کیا ہوتی ہے صرف آج کے دور میں نہیں ہر دور میں انسان کے لیے شکر گزار بندہ بننے میں یہ بات رکاوٹ بنتی ہے کہ جب کوئی انسان مال و دولت میں دنیا کی چیزوں اور نعمتوں کے لحاظ سے اپنے سے اوپر والے کو دیکھتا ہے تو دل و دماغ میں بس ان چیزوں کی فہرست چلتی رہتی ہے یہ میرے پاس ہونا چاہیے۔ اور فلاں کے پاس اتنا ہے میرے پاس بھی ہونا ضروری ہے۔ فلاں کے پاس ایسی رہائش گاہ ہے میرے پاس بھی ہونی چاہیے۔ فلاں کے پاس اتنی شاندار سواری ہے میرے پاس کیوں نہیں۔ اس طرح انسان دنیا کی ان چیزوں کے اس تانے بانے میں الجھا رہتا ہے شکر کے کلمات زبان پر آنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس کا علاج بتایا کہ دنیا کے بارے میں اپنے سے کم تر کو دیکھو اور دین کے معاملہ میں اپنے سے بلند تر کو دیکھو۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ مال و دولت اور دنیا کی نعمتوں کے لحاظ سے جو شخص کم تر ہو اس کی طرف دیکھنے سے ان نعمتوں کا احساس ہوگا جو اللہ نے اس انسان کو دی ہیں اور اس سے انسان میں شکر کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ شکر کی اس کیفیت میں اللہ کے بڑے بڑے نیک بندوں کے ساتھ ایسے واقعات پیش آجاتے ہیں جو بڑے عجیب اور سبق آموز ہوتے ہیں۔ شیخ سعدیؒ کے پاس ایک مرتبہ جوتا نہیں تھا، ننگے پاؤں جا رہے تھے شیخ سعدیؒ کہتے ہیں میرے دل میں خیال آیا کہ میں اللہ کا ایک نیک بندہ ہوں لوگوں کو اتنی اچھی

اچھی باتیں بتاتا ہوں لیکن اللہ نے مجھے جوتا بھی نہ دیا۔ شیخ سعدیؒ کہتے ہیں کہ میں اسی خیال میں جا رہا تھا کہ ایک شخص کو دیکھا جس کے پاؤں کٹے ہوئے تھے۔ تو فوراً اللہ کا شکر بجالایا کہ اے اللہ جوتا نہیں تو کوئی بات نہیں تو نے مجھے چلنے کے لیے پاؤں تو دیئے ہیں اس پر تیرا بڑا شکر ادا کرتا ہوں۔

چنانچہ اگر انسان معاشرے میں رہتے ہوئے یہ سوچ بنا لے کہ میرا تعلق صرف اپنے سے اوپر والے سٹیٹس اور معاشرتی مرتبہ رکھنے والے شخص سے ہونا چاہیے تو پھر انسان کے اندر زندگی کے آخری لمحے تک اپنے پاس موجود چیزوں کے بارے میں شکر کے جذبات پیدا نہیں ہوتے۔ لیکن اگر کوئی انسان بیمار ہو جائے تو اپنے سے زیادہ بیمار شخص سے جا کر ملاقات کر لے اس کے دکھ سے تو اپنی بیماری ہلکی لگے گی اور جتنی صحت ہے اس پر شکر کے کلمات زبان پر جاری ہو جائیں گے اسی طرح اگر انسان اپنے ان عزیز و اقارب کی خبر گیری اور ان سے تعاون کرتا رہے جو اس سے معاشی طور پر کم ہوں تو پھر یہ انسان اپنے پاس موجود ہر نعمت کا شکر ادا کرتا رہے گا اور پھر جس انسان کی مدد کی جائے وہ مدد کرنے والے کا شکریہ ادا کرے اس لیے کہ بندوں کا شکریہ ادا کرنے سے انسان میں اللہ کا شکر ادا کرنے کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

﴿من لم يشكر الناس لا يشكر الله﴾

''یعنی جو لوگوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا۔''

اور لوگوں کا شکر ادا کرنے کا طریقہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سکھایا کہ جب تمہیں کوئی ہدیہ تحفہ دے یا تم سے اچھا سلوک کرے تو جواب میں کہنا چاہیے: **جزاك الله خيرا** یعنی اللہ تم کو بہتر بدلہ دے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص دوسرے کو جزاک اللہ خیرا کہہ دے تو اس نے اس بندے کے شکریہ کا حق ادا کر دیا۔

اور اللہ تعالیٰ نے اپنا شکر ادا کرنے کے طریقے قرآن مجید میں سکھائے ان کے تین

انداز ہیں دل سے شکر ادا کرنا، زبان سے شکر ادا کرنا اور اپنے عمل سے شکر ادا کرنا۔

دل سے شکر گزار بندہ بننے کا مطلب یہ ہے کہ دل میں اللہ کی نعمتوں کا احساس ہو اور اس بات کا دل سے اعتراف ہو کہ واقعی اللہ ہی نے مجھے یہ ساری نعمتیں عطا فرمائی ہیں مجھے ان کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

زبان سے شکر ادا کرنے کی دو صورتیں بتائی ہیں۔ ایک یہ کہ انسان ان نعمتوں کا زبان سے اظہار کرے۔ **واما بنعمة ربك فحدث** یعنی اپنے پروردگار کی نعمتوں کا ذکر کیا کرو۔

اس طرح انسان شکر ادا کرنے کے ساتھ ساتھ تکبر اور غرور سے بھی بچ جاتا ہے اس لیے کہ جب انسان زبان سے یہ کہے گا کہ اللہ نے مجھے یہ دیا وہ دیا تو پھر اپنی محنت، اپنی قوت، اپنی کوشش پر تکبر نہیں کرے گا۔ زبان سے شکر کا دوسرا طریقہ یہ سکھایا کہ نعمت دینے والے اللہ کی زبان سے تعریف کی جائے ارشاد فرمایا **الحمد راس الشکر** یعنی تعریف خداوندی شکر کا سرچشمہ ہے۔ اس لیے جب کوئی نعمت ملے، جب اچھی حالت نصیب ہو تو الحمدللہ زبان سے کہنا سکھایا گیا۔

اور انسان اپنے عمل سے کیسے شکر ادا کرے، اس کی ایک صورت تو یہ سکھائی گئی کہ انسان اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو اللہ کی مرضی کے مطابق استعمال کرے۔ پورے بدن کو وہاں استعمال کرے جہاں اس نے حکم دیا ہاتھ، پاؤں، آنکھیں، کان، زبان کو صرف اسی اللہ کی مرضی کے مطابق استعمال کرے۔

ہم عام زندگی میں دیکھتے ہیں کہ ہم کسی کو کوئی چیز تحفۃً دیں اور وہ اسے بے دردی سے بے ڈھنگے طریقے سے استعمال کرے تو ہمیں کتنا برا لگے گا۔ لہٰذا انسان کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ اللہ کے دیئے ہوئے مال کو فضول خرچی، ریاکاری اور عیاشی میں خرچ نہ کرے۔

اسی طرح اللہ کا شکر گزار بندہ بننے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی عطا

کردہ نعمتوں سے دوسرے انسانوں کو فائدہ پہنچائے اور جن لوگوں کے پاس وہ نعمتیں نہیں ہیں ان کو بھی ان نعمتوں میں شریک کرے۔ اپنے عزیز واقارب اپنے ملنے جلنے والے اپنے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں کی خبر گیری کرتا رہے اور ان کی ضرورت اور ان کی پریشانیوں میں مدد کرتا رہے۔ اس طرح یہ انسان دل سے زبان سے اور اپنے اعمال سے اللہ کا شکر گزار بندہ بن جائے گا۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ ہم سب کو اپنا شکر گزار بندہ بنا لے۔ آمین۔



دل کا سکون کیسے نصیب ہوتا ہے؟

﴿عن ابی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله عليه وسلم لا يقعد قوم يذكرون الله الا حفتهم الملئكة وغشيتهم الرحمة ونزلت عليهم السكينة وذكرهم الله فيمن عنده.﴾

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جہاں کہیں اللہ کے بندے اللہ کا ذکر کرتے ہیں تو لازمی طور پر فرشتے ہر طرف سے ان کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور ان کو گھیر لیتے ہیں اور رحمت الٰہی ان کو ڈھانپ لیتی ہے اور ان پر سکینہ کی کیفیت نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے معتبر ملائکہ میں ان کا ذکر فرماتا ہے۔''

دل کا سکون کون نہیں چاہتا ہر دور میں ہر انسان کی یہ چاہت رہی ہے کہ مجھے دل کا چین اور اطمینان مل جائے۔اس اطمینان کو انسان نے جگہ جگہ تلاش کیا۔کسی نے مختلف رسالوں اور کتابوں کے پڑھنے میں سکون پایا،کسی نے سیر و تفریح کے مقامات میں جا کر اطمینان پایا،کسی نے باغات میں جا کر درختوں اور پودوں کے درمیان گھوم پھر کر اور پھولوں کے رنگ و بو میں سکون تلاش کیا،کسی نے کھیل کود اور جدید تفریحی آلات کے ذریعہ سکون و اطمینان پانے کی کوشش کی۔

لیکن انسان نے خود سے جتنے راستے سکون حاصل کرنے کے لیے تلاش کیے ان میں کسی طریقے میں وقت برباد ہوا،کہیں پیسہ ضائع ہوا،کہیں ایمان و اخلاق کی خرابی آ گئی اور کبھی صحت کو بھی کھو دیا۔یہ درست ہے کہ ان چیزوں میں بھی وقتی طور پر سکون ملتا ہے۔لیکن خالق کائنات جس نے ہمارے جسم کی مشین کو بنایا اس ذات حکیم و خبیر نے ہمیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کے ذریعہ سکون حاصل کرنے کی بہترین تعلیم عطا فرمائی:

سورۂ رعد کی ۲۸ ویں آیت میں فرمایا:

﴿الا بذکر اللہ تطمئن القلوب﴾

''آ گا رہو اللہ کی یاد سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔''

اطمینان قلب ایک بہت بڑی نعمت ہے اسے دولت سے نہیں خریدا جا سکتا۔ مادیت پرستی کی دوڑ میں انسان سکون کے لیے بے قرار ہے۔ اس نعمت کو حاصل کرنے کا آسان طریقہ اللہ سے تعلق قائم کرنا اور اس کی یاد دل میں بسا لینا ہے۔

چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کبھی پریشانی آتی تو آپ نماز میں مشغول ہو جاتے۔ تیز آندھی آتی تو آپ نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ بارش نہ آتی، خشک سالی ہو جاتی تو صلوٰۃ الاستسقاء (بارش کے وقت کی نماز) ادا فرماتے سورج گرہن یا چاند گرہن لگتا تو نماز کسوف اور نماز خسوف ادا فرماتے۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں پر کسی قسم کی تنگی اور پریشانی آتی دل بے سکون ہوتا تو آپ ان کو نماز کا حکم فرمایا کرتے اور یہ آیت تلاوت فرماتے

﴿وامر اھلك بالصلوٰة واصطبر علیھا لا نسئلك رزقا﴾

یعنی آپ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کرتے رہیے اور اس کی پابندی فرماتے رہیے ہم آپ سے رزق کا مطالبہ کرنا نہیں چاہتے۔

یعنی رزق دینے والا اللہ ہے اور اس کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سیرت طیبہ کے ذریعہ یہ تعلیم دی کہ انسان اللہ سے غافل ہو کر دنیا کی دولت میں کبھی اطمینان وسکون نہیں پا سکتا۔ فرمایا:

﴿لو کان لابن ادم وادیان من مال لا بتغی ثالثا ولا یملأ جوف ابن ادم الا التراب ویتوب اللہ علی من تاب﴾

آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر آدمی کے پاس دو وادیاں مال کی بھری ہوئی ہوں تو وہ چاہے گا کہ میرے پاس تیسری وادی بھی مال سے بھری ہوئی ہو اور ابن آدم کا پیٹ تو صرف قبر کی مٹی بھر سکتی ہے۔ اور پھر فرمایا کہ جو لوگ اپنا رخ اللہ کی طرف کر لیں تو ان

پر اللہ کی خاص عنایت ہوتی ہے اور ان کو اللہ اس دنیا میں اطمینان قلب عطا فرما دیتا ہے پھر اس دنیا میں ان کی زندگی بڑے مزے کی اور بڑے سکون سے گزرتی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اپنی سیرت مبارکہ سے بہت واضح طور پر یہ سمجھایا کہ دل کا چین اور اطمینان قناعت سے حاصل ہوتا ہے۔ حرص اور لالچ سے کبھی سکون حاصل نہیں ہوتا۔ رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے ہر مرحلہ میں یہ تعلیم دی کہ دنیا کے ساز وسامان اور اس کی دولت میں سکون تلاش کرنا بے فائدہ ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ فرماتے ہیں

﴿من كانت نيته طلب الاخرة جعل الله غناه في قلبه﴾

یعنی ''جس کی نیت اور اس کا مقصد اپنی تمام تر کوشش سے طلب آخرت ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو دل کی بے نیازی یعنی مخلوق کا محتاج نہ ہونا اور دل کا اطمینان نصیب فرما دیتے ہیں۔''

جن چیزوں سے دل کا سکون رخصت ہو جاتا ہے ان میں ایک اہم چیز حسد ہے۔ یعنی دوسرے کے پاس نعمت دیکھ کر دل میں جلن محسوس کرنا دوسرے کی خوش حالی دیکھ کر دل میں کڑھنا اور یہ چاہنا کہ دوسرے انسان کو یہ چیز کیوں ملی۔ معاشرہ میں رہتے ہوئے آپس میں حسد کرنے سے ذہنی سکون ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سیرت پاک کے ذریعہ امت کو تعلیم دی کہ اگر دل کا سکون اور اطمینان چاہیے تو مثبت خیالات اور پاکیزہ سوچ کو اپنائیں۔ آپ نے ایسا معاشرہ ترتیب دیا جس میں خود کھا کر اتنا اطمینان نہیں ملتا جتنا دوسرے کو کھلا کر سکون نصیب ہوتا ہے۔ اپنی مرضی اپنی چاہت پوری کرنے کے بجائے ایثار کی تعلیم دی اور یہ سکھایا کہ نفسا نفسی کے عالم میں سکون نصیب نہیں ہوتا بلکہ احسان کر کے، خدمت کر کے، آپس کی ہمدردی اور غمخواری کے ذریعہ دل کا سکون نصیب ہوتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیرت طیبہ کے ذریعہ اس بات کی بھی تعلیم دی کہ دوسروں کے حقوق کو پورا کر کے سکون ملتا ہے۔ اپنے فرائض کو اچھے طریقے سے ادا کر کے

اپنے ضمیر کو مطمئن رکھا جائے تو یہی سکون کا ذریعہ ہے۔

اللہ رب العزت ہمیں سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کر کے زندگی کے ہر مرحلے میں سکون و اطمینان نصیب فرمائے۔ آمین۔



بغض وکینہ کی نحوست

﴿عن الزبیر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دب الیکم داء الامم قبلکم الحسد والبغضاء ھی الحالقۃ. لا اقول تحلق الشعر ولکن تحلق الدین.﴾ (رواہ الترمذی)

''حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گذشتہ امتوں کی بیماری تمہاری طرف چلی آ رہی ہے اور وہ ہے حسد اور بغض یہ مونڈنے والی ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ یہ بالوں کو مونڈنے والی ہے بلکہ یہ دین کو مونڈ دیتی ہے۔''

سورۂ حشر کی آیت نمبر ۱۰ میں اللہ رب العزت نے ان فلاح پانے والوں کا تذکرہ فرمایا کہ جو اپنے سے پہلے ایمان لانے والوں کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں اور یہ دعا مانگتے ہیں اے اللہ ہمارے دلوں میں ایمان والوں کے بارے میں بغض اور کینہ نہ آنے دے، بیشک تو بڑا شفیق، مہربان ہے۔

اسلام دین محبت ہے اس لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ محبت کا سبق فرماتے‘ محبت کرنے کے سلیقے سکھاتے، لیکن زندگی کے نشیب وفراز میں جب کسی کی طرف سے تکلیف پہنچے یا دوسرا شخص دکھ پہنچائے جانی یا مالی نقصان پہنچائے اور انسان اس پر اپنا ردعمل بھی ظاہر نہ کرے۔ اس سے انتقام لینے کی طاقت نہ ہو یا کسی وجہ سے بے بس ہو تو اس بات کو دل میں دبا لینے سے اس شخص کی طرف سے دل میں ایک بوجھ آ جاتا ہے دل میں غبار بھرا رہتا ہے بات بڑھتی ہے یہ انسان رنجیدہ رہتا ہے اسے بغض اور کینہ کہتے ہیں، جب یہی رنجیدگیاں دشمنی کے رنگ میں آنے لگتی ہیں تو عناد بھی بن جاتا ہے۔

لیکن اگر یہی بغض ذاتی مفادات اور ذاتی رنجشوں سے بالاتر ہو کر اللہ کی خاطر ہو تو یہی بغض جائز شمار ہوتا ہے بلکہ بہترین عمل شمار ہوتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿ان احب الاعمال الی اللہ تعالیٰ الحب فی اللہ والبغض فی اللہ﴾

''فرمایا کہ بندوں کے اعمال میں سے اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب وہ محبت ہے جو اللہ کے لیے ہو اور وہ بغض وعداوت ہے جو اللہ کے لیے ہو۔''

بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی خاطر محبت کرنے اور اللہ ہی کی خاطر بغض رکھنے کو ایمان کا کامل ہونا فرمایا ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے

﴿من احب للہ وابغض للہ واعطی للہ ومنع للہ فقد استکمل الایمان﴾

لیکن اگر بغض وعناد ذاتی مفادات اور ذاتی نقصان کی بنا پر ہو تو اس بغض وعناد سے منع فرمایا ارشاد نبوی ہے کہ کینہ پرور شخص کی بخشش نہیں ہوتی۔

لیکن بسا اوقات دوسرے شخص کی زیادتی اتنی بڑی اور اتنی تکلیف دہ ہوتی ہے کہ باوجود معاف کرنے کے اس کا بوجھ دل سے دور نہیں ہوتا۔ انسان اس شخص سے ملنا بھی نہیں چاہتا اس قلبی بوجھ کو کینہ نہیں کہتے اور نہ اس پر گناہ ہوتا ہے کیونکہ یہ ایک طبعی رکاوٹ ہے اس میں انسان کے اپنے ارادہ کا دخل نہیں ہوتا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں اس کی بھی وضاحت موجود ہے کہ ہندہ ابوسفیان کی بیوی نے غزوۂ احد کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ چبا لیا تھا، فتح مکہ کے موقع پر نقاب کر کے آنا ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہچان لیا اور اسے معاف فرما دیا۔ صرف اتنا فرمایا کہ تم میرے سامنے نہ آیا کرو تمہیں دیکھ کر چچا کی یاد آجاتی ہے۔

معلوم ہوا کہ اگر غیر ارادی بوجھ دل میں رہ جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بغض وکینہ رکھنے سے جہاں منع فرمایا وہاں بغض وکینہ کی بنیاد پر کیے جانے والے اعمال سے سختی سے منع فرمایا۔ چنانچہ کسی سے بغض ہو پھر اس کو کوئی نقصان یا مصیبت پہنچے تو انسان کو بالکل خوش نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿لاتظهر الشماتة لاخيك فيرحمه الله ويبتليك﴾

''فرمایا کہ تم اپنے کسی بھائی کی مصیبت پر خوشی کا اظہار مت کرو اگر ایسا کرو گے تو ہوسکتا ہے کہ اللہ اس کو مصیبت سے نجات دے دے اور تمہیں اس میں مبتلا کردے۔''

اس لیے اگر زندگی میں بھی دل کے اندر بغض وعناد آنے لگے تو پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے محبت پیدا کرنے کے جو طریقے سکھائے ہیں ان پر عمل کیا جائے۔ جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایسی بات نہ بتاؤں کہ اگر تم کرو تو تمہیں آپس میں محبت ہوجائے فرمایا''**افشوا السلام واطعمو الطعام**'' تم آپس میں سلام کیا کرو اور ایک دوسرے کو کھانا کھلایا کرو۔ لہٰذا انسان جب کسی کو سلام کرے گا تو اس کے لیے سلامتی کی دعاء کرے گا دل سے بغض کم ہوتا جائے گا۔ پھر ایک قدم آگے بڑھے اور اس کو کھانا بھی کھلا دے تو یقیناً بغض وعناد کی کیفیت ختم ہوجائے گی۔

اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بغض وعناد ختم کرنے کا یہ طریقہ بھی سکھایا کہ

﴿تهادوا فان الهدية تذهب الضغائن﴾

''تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو کیونکہ بے شک ہدیہ دل کے کینہ اور بغض کو ختم کردیتا ہے۔''

اللہ رب العزت ہمیں آپس میں قلبی محبت عطا فرمائے۔ آپس کی نفرت، بغض وعناد

اور کینہ اور دشمنی سے محفوظ فرمائے اور اگر زندگی کے اتار چڑھاؤ میں بھی بغض و عناد دل میں آ جائے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق اس بغض و کینہ سے دل کو صاف کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)



دلوں میں جوڑ پیدا کرنے کے لیے

سات سنہرے اصول

﴿عن ابی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث ولاتحسسوا ولا تجسسوا ولاتنا جشوا ولا تحاسدوا ولا تباغضوا ولا تدابروا وکونوا عبادالله اخوانا﴾ (متفق علیه)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم اپنے آپ کو بدگمانی سے بچاؤ کیونکہ بدگمانی سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے اور نہ کسی کا راز جاننے کی کوشش کرو اور نہ کسی کی ٹوہ میں رہو اور نہ قیمت بڑھانے کے لیے بولی دو اور نہ آپس میں حسد کرو اور نہ ایک دوسرے سے بغض رکھو اور نہ ایک دوسرے سے قطع تعلقی کرو اور تم بھائی بھائی بن کر اللہ کے بندے بن جاؤ۔''

اس ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسی سات باتوں سے منع کیا گیا ہے جن سے معاشرتی زندگی میں خرابی اور بے سکونی پیدا ہوتی ہے۔ اور دلوں میں جوڑ کے بجائے توڑ پیدا ہوتا ہے اور اگر ان سات برائیوں سے بچا جائے تو یقیناً ہماری معاشرتی زندگی محبت اور اخوت کا نمونہ بن جائے اور آپس کا قلبی تعلق خوب مضبوط ہو جائے۔

ان میں سے پہلی بات جس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا وہ یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو بدگمانی سے بچاؤ کیونکہ یہ سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے۔ ایسا شخص جو

دوسروں کے متعلق برے خیالات کو ذہن میں جمائے رکھتا ہے وہ زندگی میں کبھی ذہنی سکون نہیں پا سکتا بلکہ اسی سے باہمی نفرت اور دلوں کی دوری پیدا ہوتی ہے اور وہ شخص خود اپنی ذاتی زندگی تعمیری انداز میں نہیں گزار پاتا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرا اس بات سے روکا کہ تم کسی کے راز کی تلاش میں نہ رہو، کسی کی باتوں کی ٹوہ میں نہ رہو۔ معاشرے میں بعض لوگوں کی یہ عادت بن جاتی ہے کہ وہ دوسرے کے عیبوں کی تلاش میں رہتے ہیں نتیجۃً انہیں اپنے عیب نظر نہیں آتے اور وہ اپنی اصلاح نہیں کر پاتے۔ خود تو برے ہوئے لیکن دوسروں کے عیبوں پر نظر رکھنے کی وجہ سے خود بھی دوسروں کی نگاہوں میں گر گئے۔ جب بھی انسان کے مزاج میں یہ بات آنے لگے تو فوراً اپنے ذہن میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد لے آئے کہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کا عیب ڈھونڈتا ہے تو اللہ اس کے عیب کو ڈھونڈتا ہے اور جس کے عیب کو اللہ ڈھونڈنے لگ جائے تو وہ اگر اپنے گھر میں بھی چھپ کر کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے ذلیل و رسوا کر دے گا۔

تیسری بات جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا وہ یہ کہ تم کسی کی جاسوسی نہ کرو۔ جاسوسی کرنے اور ٹوہ لگانے میں فرق یہ ہے کہ ٹوہ لگانے میں انسان دوسرے کے عیب اور راز معلوم کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے اور جاسوسی میں ہر حالت پر نظر رکھتا ہے چھپ کر باتیں سنے گا۔ آنے جانے پر نظر رکھے گا۔ کیا پکا ہے کیا کھایا ہے، کہاں سے کتنا کماتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معاشرتی زندگی میں جاسوسی سے اس قدر نفرت تھی کہ جب ایک شخص نے دروازے کی جھری میں سے جھانکنے کی کوشش کی تو فرمایا کہ میرا جی یہ چاہا کہ سلاخ سے اس کی آنکھ پھوڑ دوں۔

چوتھی بات جس سے منع فرمایا وہ یہ کہ لاتنا جشوا تم ایک چیز کے خریدنے کا ارادہ نہیں رکھتے تو صرف قیمت بڑھانے کے لیے بولی مت لگاؤ۔ یہ دھوکہ دہی ہے اور ہمدردی اور خیر خواہی کے خلاف ہے۔

اور پانچواں حسد سے منع فرمایا ہے کہ کسی کے پاس نعمتیں دیکھ کر، اس کے فضل و کمال اور اس کی اچھی حالت کو دیکھ کر دل میں جلنا اور کڑھنا اور یہ چاہنا کہ اس سے یہ نعمت چھن جائے۔ یہ حسد کہلاتا ہے۔ یہ ایک ایسا اخلاقی مرض ہے جس کی وجہ سے انسان کی ذہنی اور جسمانی صلاحتیں مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک فرمایا کہ تم حسد سے بچو کیونکہ یہ نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے خشک لکڑی کو آگ کھا جاتی ہے۔

چھٹی بات جس سے منع فرمایا وہ بغض اور کینہ ہے۔ کسی کے خلاف نفرت اور دشمنی کو ذہن میں زیادہ دیر جگہ دینے کو بغض اور کینہ کہتے ہیں۔ یہی وہ دلوں میں سلگنے والی آگ ہے جس سے معاشرتی زندگی تباہ ہو کر رہ جاتی ہے۔

اور ساتویں بات قطع تعلقی ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا۔ رشتہ داریوں کو جوڑے رکھنا اور معاشرے کے افراد سے تعلق رکھنا اس کا اثر انسان کی زندگی پر بڑا گہرا ہوتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کے رزق اور اس کی عمر میں برکت ہو تو اسے چاہیے کہ وہ صلہ رحمی کرے یعنی رشتوں کو جوڑے رکھے۔

پھر آخر میں فرمایا کہ تم بھائی بھائی بن کر اللہ کے بندے بن جاؤ۔ لہٰذا اگر آج بھی انسان یہ چاہے کہ میں ایک گھر، ایک خاندان ایک ادارے میں ذہنی اور جسمانی سکون کے ساتھ خوشگوار زندگی گزاروں تو اسے ان سات باتوں پر بھی عمل کرنا ہوگا۔

اللہ رب العزت ہم سب کو بھائی بھائی بن کر اللہ کا بندہ بننے کی توفیق عطا فرمائے۔



ریا کاری سے بچیئے

اللہ کی رضاء کو مقصود بنایئے

﴿عن محمود بن لبید ان النبی صلی الله علیه وسلم قال ان اخوف ما اخاف علیکم الشرك الا صغر قالوا یا رسول الله وما الشرك الاصغر؟ قال الریاء﴾ (رواہ احمد)

''حضرت محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ خطرہ شرک اصغر کا ہے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ''شرک اصغر'' کیا ہے؟ فرمایا ''ریا'' (یعنی دکھاوے کے لیے کوئی کام کرنا)۔''

اللہ رب العزت نے انسان کی زندگی کا مقصد اللہ کی رضا حاصل کرنا قرار دیا ہے اس لیے کہ زندگی کا کوئی عمل بھی اللہ کے ہاں اس وقت قابل قبول ہوگا جو صرف اور صرف اس نیت سے کیا گیا ہو کہ اللہ اس سے راضی ہو جائے اس نیک نیتی کو اخلاص کہا گیا ہے۔

اخلاص وللّٰہیت کا مطلب یہی ہے کہ ہر اچھا کام یا کسی سے اچھا سلوک صرف اس نیت سے کیا جائے کہ ہمارا خالق اور ہمارا پروردگار ہم سے راضی ہو، ہم پر رحمت فرمائے۔ دین اسلام میں واضح طور پر اس کی تعلیم دی گئی کہ اعمال واخلاق صرف ظاہری طور پر مقصود نہیں بلکہ ان اعمال واخلاق کا اصل مقصد اللہ کی رضا جوئی ہے۔ اور اگر زندگی کے ان کاموں کا مقصد اللہ کی رضا نہ ہو بلکہ کوئی اور مقصد ہو، نام ونمود، ریا کاری، دوسروں کو دکھانا مقصود ہو تو اللہ کے نزدیک ان کاموں کی کوئی قیمت اور کوئی حیثیت نہیں۔

اور ایسا ہونا بھی چاہیے۔ انسان اپنے لیے بھی یہی اصول پسند کرتا ہے جیسے کوئی شخص آپ کی بڑی خدمت کرتا ہے آپ کو ہدیہ تحفہ دیتا ہے لیکن پھر کسی ذریعہ سے آپ کو معلوم ہو جائے کہ اسے آپ کے ساتھ کوئی خلوص نہیں بلکہ وہ تو یہ سب کچھ اپنے ذاتی مفاد کی وجہ سے یا اپنا کوئی کام نکلوانے کے لیے کر رہا ہے تو پھر آپ کے دل میں اس شخص کی اور اس کے اچھے کاموں کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی۔

اس میں فرق صرف اتنا ہے کہ ہم دوسروں کے دلوں کا حال نہیں جانتے لیکن اللہ سب کے دلوں کا حال اور ان کی نیتوں کی تفصیل جانتا ہے۔

اس لیے جو شخص اپنی زندگی کے تمام کاموں میں صرف یہ مقصد بنا لیتا ہے کہ اللہ میرے اعمال سے راضی اور خوش ہو جائے تو اللہ ان اعمال کو قبول کر کے راضی ہو جاتا ہے' دنیا میں اپنی رحمتیں نازل کرتا ہے اور آخرت میں پھر اس کا ثواب اور اجر عطا فرمائے گا لیکن اگر کسی دنیا کے مقصد کی خاطر کام کیا تو اللہ وہ دنیا کا مقصد تو پورا کر دیتا ہے لیکن آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں ہوتا۔

سورۂ شوریٰ کی بیسیویں آیت میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿من کان یرید حرث الآخرۃ نزدلہ فی حرثہ ومن کان یرید حرث الدنیا نؤتہ منھا وما لہ فی الآخرۃ من نصیب......الآیۃ﴾

''جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے تو ہم اس کو اس کے پھل میں اور اضافہ کر کے دیں گے اور جو کوئی دنیا کی کھیتی چاہے تو ہم اس کو اس میں سے کچھ دے دیں گے لیکن آخرت میں اس کے لیے کوئی حصہ نہ ہوگا۔''

معلوم ہوا کہ اگر زندگی کے اہم ترین کام بھی اخلاص نیت یعنی خالص اللہ کی رضا حاصل کرنے کے بجائے کسی اور مقصد کی خاطر کیے جائیں تو وہ بھی بے کار ہو جاتے ہیں وہ جان خرچ کر بیٹھے یا سارا مال خرچ کر ڈالے۔

چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے پہلے تین شخصوں کے متعلق اللہ کی عدالت سے جہنم کا فیصلہ سنایا جائے گا۔ سب سے پہلے ایسے شخص کی پیشی ہوگی جو جہاد میں شہید ہوا ہو گا۔ اللہ اسے اپنی نعمتیں یاد دلائے گا اور پوچھے گا کہ تو نے ان نعمتوں کا حق ادا کیا؟ وہ شہید کہے گا کہ میں نے تیری راہ میں جان قربان کر دی۔ اللہ فرمائے گا "**كذبت ولكنك قاتلت لان يقال جرى**" یعنی تو نے جھوٹ کہا تو نے صرف اس لیے جہاد کیا تھا کہ تجھے بہادر کہا جائے' سو وہ کہا جا چکا پس اس کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ پھر ایک عالم دین اور قرآن حکیم پڑھنے والے کو حاضر کیا جائے گا وہ کہے گا اے اللہ میں نے تیرے لیے، تیرے دین اور تیری کتاب کے علم کو پڑھا اور پڑھایا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے "**كذبت ولكنك تعلمت العلم ليقال انك عالم وقرأت القرآن ليقال هوقارى فقد قيل**" یعنی تو نے اس لیے علم پڑھا تا کہ عالم کہلایا جائے اور قرآن اس لیے پڑھا کہ تو قاری کہلایا جائے سو کہلایا جا چکا۔ پھر اسے بھی جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ پھر ایک ایسا شخص پیش ہوگا جس کو اللہ نے بہت مال دیا تھا۔ پوچھا جائے گا تو نے کیا کیا؟ وہ عرض کرے گا اللہ میں نے تیرے لیے زندگی کے ہر شعبہ میں خرچ کیا اللہ فرمائے گا "**كذبت ولكنك فعلت ليقال هو جواد**" یعنی تو نے جھوٹ کہا' تو نے تو یہ سب اس لیے خرچ کیا کہ کہا جائے کہ وہ شخص بڑا سخی ہے سو کہا جا چکا۔ پھر اسے بھی جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

دیکھا جائے کہ جان خرچ کر کے شہید ہو جانا، علم حاصل کرنا، قرآن کی تلاوت کرنا، مال خرچ کرنا، یہ سب کتنے اعلیٰ درجہ کے نیک کام ہیں لیکن جب یہ کام اللہ کی رضا کے بجائے کسی اور مقصد کی خاطر کیے جائیں تو بالکل بے کار ہو جاتے ہیں۔

اس لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام اعمال کا دارومدار نیتوں پر رکھا ہے "**انما الاعمال بالنيات**" اس لیے جو انسان زندگی کے ہر اچھے عمل میں اللہ کی رضا حاصل کرنے کی نیت کر لیتا ہے تو وہی عمل اس کے لیے عبادت اور نیکی بن جاتا ہے مال خرچ کرتا ہے تو وہ ارشاد باری تعالیٰ کے مطابق خوب اجر وثواب پاتا ہے اور جب جان خرچ کرتا

ہے تو جیسا جہاد کے دوران شہداء نے اللہ کی راہ میں جان قربان کر کے شہادت کا رتبہ پایا اور ایسی زندگی پا لی جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم اللہ کے راستہ میں جان قربان کرنے والوں کو مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں' ان کو اپنے رب کے پاس رزق دیا جاتا ہے۔ اور وہ اس نعمت خداوندی پر شکر اور فرحت محسوس کرتے ہیں۔

یہ بشارتیں یہ اللہ کا فضل صرف اس وقت نصیب ہوتا ہے جب انسان اعمال اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے کرے۔

اللہ رب العزت ہمیں زندگی کے تمام اعمال میں رضائے الٰہی حاصل کرنے والا بنا دے۔



تعلق مع اللہ، وقت کی اہم ضرورت

﴿عَن ابی هریرة رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اِذَا دَخَلَ رَمَضَانُ فُتِحَتُ اَبُوَابُ السَّمَاءِ وَفِیُ رِوَایَةٍ فُتِحَتُ اَبُوَابُ الُجَنَّةِ وَغلِّقَتُ اَبُوَابُ جَهَنَّمَ وَسُلُسِلَتِ الشَّیٰطِیُنُ وَفِیُ رِوَایَةٍ فُتِحَتُ اَبُوَابُ الرَّحُمَةِ﴾ (متفق علیه)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب رمضان کا مہینہ شروع ہوتا ہے تو آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور ایک روایت میں ہے کہ جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور شیاطین کو قید کر دیا جاتا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ رحمت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔''

اللہ رب العزت نے ہر سال رمضان المبارک میں روزہ رکھنے کا انتظام فرمایا تاکہ انسان کچھ وقت کے لیے اپنے اندر اخلاق الٰہی کا کچھ نقش اتار سکے جس سے بندہ اور خالق کے درمیان تعلق اور رابطہ پیدا ہو جائے۔

اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر خواہشات کو رکھا اور ان خواہشات کو پورا کرنے کا اختیار بھی دیا اب اگر بندے اور خالق کے درمیان رابطہ موجود ہو تو انسان پوری زندگی صراط مستقیم پر رہتے ہوئے گزار لیتا ہے لیکن اگر خالق سے تعلق میں کمی آ جائے تو پھر انسان زندگی کو بے لگام ہو کر گزارتا ہے، احساسات، جذبات اور اعصاب کو مکمل طور پر اپنی مرضی سے چلاتا ہے پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ سارا انسانی نظام معدہ کے اردگرد گھومنے لگتا

ہے اور انسان کی یہ سوچ بن جاتی ہے کہ پیٹ کے لیے تو سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔اس کے نتیجے میں انسان پرسکون زندگی، مطمئن دماغ اور زندہ ضمیر سے محروم ہو جاتا ہے۔عبادات بوجھ محسوس ہونے لگتی ہیں' انسان کے جسم اور عقل دونوں میں خرابی آجاتی ہے ایسا انسان صرف اپنی ذات میں نہیں بکھرتا بلکہ سوسائٹی کے لیے بھی نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔

یہ صرف اس لیے ہوا کہ انسان کا تعلق اور رابطہ اپنے خالق و مالک سے نہ رہا۔ چنانچہ اللہ رب العزت نے رمضان المبارک میں روزہ رکھنے کا حکم دیا تا کہ انسان کھانے پینے اور اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے ایک لگے بندھے نظام سے نکل کر بھوک اور پیاس کا مزہ چکھے اور انسان تعلق مع اللہ کی اس لذت سے آشناء ہو جائے جو طرح طرح کے لذیذ ترین کھانوں میں کبھی محسوس نہیں ہوتی۔

چنانچہ رمضان المبارک کے ہر مرحلے میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس تعلق اور رابطہ کا احساس اور یقین دلایا جو روزہ رکھنے سے انسان اور خالق کے درمیان پیدا ہو جاتا ہے۔

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے **ان اللہ وَملٰئکتہٗ یصلون علی المسحرین** ۔یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے سحری کھانے والوں پر رحمت نازل فرماتے ہیں اور فرمایا کہ سحری کھایا کرو سحری میں برکت ہے۔ پھر جب بندہ روزہ میں سارا دن خالی پیٹ رہتا ہے تو اس کی وجہ سے منہ سے بو آنے لگتی ہے۔اس کے بارے میں فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے کہ روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مُشک کی خوشبو سے زیادہ پاکیزہ ہے۔

غور کا مقام ہے کہ جب بندہ کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے تو پھر اس کی ہر کیفیت کی اللہ تعالیٰ کے ہاں قدر ہوتی ہے۔اس روزہ رکھنے کے درمیان کھانے سے روکنے کے ساتھ ان برائیوں سے بھی بچنے کا حکم دیا جس سے بندہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان تعلق میں کمی آجاتی ہے۔ چنانچہ فرمایا ''جو بندہ جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کو اس کے کھانا پینا چھوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' اسی طرح روزے میں لڑنے جھگڑنے سے

اورغیبت کرنے سے منع فرمایا۔

پھر جب روزہ دار روزہ افطار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے قائم ہونے والے تعلق کا اپنے ہاں سے خودسوال کرتا ہے:

﴿اللھم انی لك صمت وبك آمنت وعليك توكلت وعلى رزقك افطرت﴾

''اے اللہ میں نے تیرے ہی لیے روزہ رکھا اور تجھ پر ایمان لایا اور تجھ پر بھروسہ کیا اور تیرے ہی دیئے ہوئے رزق سے افطار کیا۔''

افطار کے وقت ایک خوشی کا احساس اور شکر کے جذبات موجزن ہوتے ہیں یہ صرف کھانا کھانے کی خوشی نہیں ہوتی بلکہ مومن کا اللہ تعالیٰ سے رابطہ ہونے کا ایک حسین نتیجہ ہے۔

صحیح مسلم میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿للصائم فرحتان فرحة عند فطره وفرحة عن لقاء ربه﴾

فرمایا کہ ''روزہ دار کے لیے دو فرحت، سرور اور خوشی کے لمحات ہوتے ہیں ایک خوشی افطار کے وقت ہوتی ہے اور ایک خوشی اللہ تعالیٰ سے آخرت میں ملاقات کے وقت ہوگی۔''

سبحان للہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے افطار کی خوشی کو کیسی عظیم خوشی کے ساتھ ذکر فرمایا کہ جنتیوں کو سب سے بڑی نعمت جو ملے گی وہ رب ذوالجلال کا دیدار ہوگا۔ گویا روزہ سے بندے اور خالق کے درمیان ایسا رابطہ پیدا ہوتا ہے جس کا نتیجہ آخرت میں رب سے ملاقات کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

رمضان المبارک کے درمیان پورے مہینے میں بندہ کا اللہ تعالیٰ سے رابطہ درجہ بدرجہ بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ بندہ جہنم کی آگ سے آزاد ہو جاتا ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿شَهْرٌ اَوَّلُه رَحْمَةٌ وَّاَوْسَطُه مَغْفِرَةٌ واٰخِرُه عِتْقٌ مِنَ النَّارِ﴾

"فرمایا کہ پہلا عشرہ رحمت خداوندی کا ہے اور دوسرا عشرہ مغفرت کا ہے اور تیسرا عشرہ جہنم کی آگ سے آزادی کا ہے۔"

رمضان المبارک کے روزوں کے درمیان اللہ تعالیٰ اور بندہ کے درمیان اتنا گہرا تعلق قائم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کے ہر عمل کا درجہ بہت زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا کہ جو شخص اس مہینے میں کوئی نیک کام کرتا ہے تو اس کا ثواب اتنا ہے جتنا اس کے علاوہ کسی اور وقت میں انسان فرض ادا کرتا ہے اور جو شخص رمضان میں ایک فرض ادا کرے تو اس کا ثواب اتنا ہے کہ جتنا عام دنوں میں ستر فرض ادا کرے۔"

روزے کے ذریعہ بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان جو تعلق پیدا ہوتا ہے اس کے اثرات صرف انسان کی اپنی زندگی تک محدود نہیں رہتے بلکہ اس کے اثرات تجاوز کر کے دوسرے لوگوں پر بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ یہ صبر کا مہینہ ہے' باہمی رواداری اور غمخواری کا مہینہ ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت دی کہ جو دوسرے لوگوں کا روزہ افطار کرائے گا اس کے گناہ بھی بخشے جائیں گے اور روزہ افطار کرانے والے کو ثواب بھی ہوگا اور افطار کرنے والے کے ثواب میں بھی کمی نہیں ہوگی۔

معلوم ہوا کہ جب بندہ کا اللہ تعالیٰ سے تعلق اور رابطہ قائم ہوتا ہے تو پھر بندہ اللہ تعالیٰ کے دوسرے بندوں کا بھی خیال رکھتا ہے اور ان کے حقوق ادا کرنے کی فکر کرتا ہے۔

روزہ کا عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک کس قدر محبوب ہے اس کا اندازہ اس ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتا ہے کہ:

﴿قال الله عزوجل كُلُّ عَمَلِ ابْنِ اٰدَمَ لَهٗ اِلَّا الصِّيَام لِیْ وَاَنَا اَجْزِبه﴾

یعنی "اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آدمی کا ہر عمل اس کا ہے لیکن روزہ کا عمل

میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔‘‘

اللہ رب العزت ہمیں روزے کے اس بابرکت عمل کے ذریعہ تعلق مع اللہ جیسی نعمت عطا فرما دے اس لیے کہ ہم نے دیکھا کہ جب کسی بندہ کا اللہ تعالیٰ سے رابطہ ہو جاتا ہے تو پھر بندہ کی روح پاکیزہ اور اس کا دل پرسکون ہو جاتا ہے۔ نیکی کا شوق پیدا ہو جاتا ہے اور گناہ نہ کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ زبان پاکیزہ اور کان پاکیزہ ہو جاتے ہیں اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ ہم سب کو اپنا یہ تعلق اور رابطہ پوری زندگی میں عطاء فرمائے تاکہ روزے کے ذریعہ جو رابطہ بندہ اور خالق کے درمیان پیدا ہوا ہے وہ زندگی کے آخری لمحے تک نصیب ہو جائے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

☆☆☆

دو خوفناک بیماریاں

خواہشات اور لمبی لمبی آرزوئیں

﴿عَنْ جابرؓ قَال قَال رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم اِنَّ اَخوفَ مَااَتَخَوَّفُ عَلیٰ اُمَّتِی الْھَوی وَطول الْاَ مَلِ فَاَ مَّا الْھَوٰی فَیَصُدُّ عَنِ الْحَقِّ وَاَمَّا طُوْلُ الْاَمَلِ فَیُنسِی الْاٰخِرَۃَ وَھٰذا الدُّنْیَاُمُرْ تَحِلَۃٌ قَادِمَۃٌ وَلِکُلِّ وَاحِدٍ مِنْھُمَا بَنُوْنَ فَاِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ لَا تَکُوْنُوْا من بَنی الدُّنْیَا فَافْعَلُوْا فَاِنَّکُمْ الْیَوْمَ فِی دَارِ الْعَمَلِ وَلَا حِسَابَ وَاَنْتُمْ غدًا فِی دَارِ الْاٰخِرَۃِ وَلَا عَمَلَ.﴾ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

’’حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں اپنی امت پر جن بلاؤں کے آنے سے ڈرتا ہوں ان میں سب سے زیادہ ڈر کی چیزیں (۱) ھوٰی اور (۲) طُولِ اَمَل ہیں (ھوی سے مراد یہاں یہ ہے کہ دین و مذہب کے بارے میں اپنے نفس کے رجحانات اور خیالات کی پیروی کی جائے اور طولِ امل یہ ہے کہ دنیوی زندگی کے بارہ میں لمبی لمبی آرزوئیں دل میں پرورش کی جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو بیماریوں کو بہت زیادہ خوفناک بتلایا اور آگے اس کی وجہ یہ ارشاد فرمائی) کہ ھوی تو آدمی کو قبول حق سے مانع ہوتی ہے (یعنی اپنے نفسانی خیالات ورجحانات کی پیروی کرنے والا قبول حق اور اتباع ہدایت سے محروم رہتا ہے) اور طول امل (یعنی لمبی لمبی آرزوؤں میں دل کا پھنس جانا) آخرت کو بھلا دیتا ہے اور اس کی فکر اور اس کے لیے تیاری سے غافل کر دیتا ہے۔ (اس کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا) یہ دنیا دم بدم چلی جا رہی ہے، گزر

رہی ہے (کہیں اس کا ٹھہراؤ اور مقام نہیں) اور آخرت (ادھر سے) چل پڑی ہے چلی آ رہی ہے اور ان دونوں میں سے ہر ایک کے کچھ بچے ہیں یعنی انسانوں میں کچھ وہ ہیں جو دنیا سے ایسی وابستگی رکھتے ہیں، جیسی وابستگی بچوں کو اپنی ماں سے ہوتی ہے اور کچھ وہ ہیں جن کی ایسی ہی وابستگی اور رغبت بجائے دنیا کے آخرت سے ہے۔ پس اے لوگو! اگر تم کرسکو تو ایسا کرو کہ دنیا سے چمٹنے والے اس کے بچے نہ ہو (بلکہ اس دنیا کو دارالعمل سمجھو) تم اس وقت دارالعمل میں ہو، (یہاں تمہیں صرف محنت اور کمائی کرنی ہے) اور یہاں حساب اور جزا سزا نہیں ہے اور کل تم یہاں سے کوچ کر کے دار آخرت میں پہنچ جانے والے ہو اور وہاں کوئی عمل نہ ہوگا (بلکہ یہاں کے اعمال کا حساب ہوگا اور ہر شخص اپنے کیے کا بدلہ پائے گا)۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں امت کے بارے میں دو (۲) بڑی بیماریوں کا خوف اور خطرہ ظاہر فرمایا ہے اور امت کو ان سے ڈرایا اور خبردار کیا ہے۔ ایک ہوی اور دوسرا طُولِ اَمَلُ۔ غور سے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان ہی دو بیماریوں نے امت کے بہت بڑے حصے کو برباد کیا ہے۔ جن لوگوں میں خیالات اور نظریات کی گمراہیاں ہیں وہ ھوی کے مریض ہیں اور جن کے اعمال خراب ہیں وہ طول امل اور حب دنیا کے مرض میں گرفتار اور آخرت کی فکر اور تیاری سے غافل ہیں جس کا علاج یہی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کے آخر میں بیان فرمایا۔ یعنی ان کے دلوں میں یہ یقین پیدا ہو کہ یہ دنیوی زندگی فانی اور صرف چندروزہ ہے اور آخرت ہی کی زندگی اصل زندگی ہے اور وہی ہمارا اصل مقام ہے۔ جب یہ یقین دلوں میں پیدا ہو جائے گا تو خیالات اور اعمال دونوں کی اصلاح آسان ہو جائے گی۔

انسان کی سب سے بڑی بدبختی اور سینکڑوں قسم کی بدکاریوں کی جڑ بنیاد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور آخرت کے انجام سے بےفکر اور بے پرواہ ہو کر زندگی گزارے اور اپنی نفسانی خواہشات اور اس دنیا کی فانی لذتوں کو اپنا مقصد اور مطمح نظر بنا لے۔ اور یہ اس وجہ سے

ہوتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے وہ آنکھوں کے سامنے ہے اور اللہ تعالیٰ اور آخرت آنکھوں سے اوجھل ہیں اس لیے انسانوں کو اس بربادی سے بچانے کا راستہ یہی ہے کہ ان کے سامنے دنیا کی بے حقیقی اور بے قیمتی کو اور آخرت کی اہمیت اور برتری کو قوت کے ساتھ پیش کیا جائے اور قیامت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی اور اعمال کی جزا و سزا کا اور جنت و دوزخ کے ثواب و عذاب کا یقین ان کے دلوں میں اتارنے کی کوشش کی جائے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خطبہ کا حاصل اور خلاصہ یہی ہے اور جیسا کہ عرض کیا گیا آپ کے اکثر خطبات اور مواعظ میں یہی بنیادی مضمون ہوتا تھا۔

تنبیہ: یہ بات بڑی خطرناک اور بہت تشویشناک ہے کہ دینی دعوت اور دینی وعظ و نصیحت میں دنیا کی بے ثباتی اور بے حقیقی اور آخرت کی اہمیت کا بیان اور جنت و دوزخ کا تذکرہ جس طرح اور جس ایمان و یقین اور قوت کے ساتھ ہونا چاہیے ہمارے اس زمانے میں اس کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔گویا نہیں رہا ہے اور دین کی تبلیغ و دعوت میں بھی اس طرح کی باتیں کرنے کا رواج بڑھتا جا رہا ہے جس قسم کی باتیں مادی تحریکوں اور دنیوی نظاموں کی دعوت و تبلیغ میں کی جاتی ہیں۔اللہ رب العزت ہم سب کی ان خوفناک بیماریوں سے حفاظت فرمائے۔(آمین یارب العالمین)



اِنسانی فطرت سے متعلق دس باتیں

﴿عن عائشة قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم عشر من الفطرة قص الشارب واعفاءُ اللحية والسواك واستنشاق الماءِ وقص الاظفار وغسل البراجم ونتفُ الابط وحلق العانة وانقاص الماءِ قال زكريا قال مصعب ونسيت العاشرة الا ان تكون المضمضة﴾ (رواہ مسلم)

''حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دس چیزیں ہیں جو امورفطرت میں سے ہیں، مونچھوں کا ترشوانا، داڑھی کا چھوڑنا، مسواک کرنا، ناک میں پانی بھر کر اس کی صفائی کرنا، ناخن ترشوانا، انگلیوں کے جوڑوں کو (جن میں اکثر میل کچیل رہ جاتا ہے اہتمام سے) دھونا، بغل کے بال کاٹنا، موئے زیرناف کی صفائی کرنا، اور پانی سے استنجا کرنا۔ حدیث کے راوی زکریا کہتے ہیں کہ ہمارے شیخ مصعب نے بس یہی نو چیزیں ذکر کی ہیں اور فرمایا کہ دسویں چیز بھول گیا ہوں اور میرا گمان یہی ہے کہ وہ کلی کرنا ہے۔''

اس حدیث میں دس چیزوں کو ''من الفطرۃ'' یعنی امورفطرۃ میں سے کہا گیا ہے۔ بعض شارحین حدیث کی رائے یہ ہے کہ الفطرۃ سے مراد یہاں سنت انبیاء یعنی پیغمبروں کا طریقہ ہے اوراس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اسی حدیث کی مستخرج ابی عوانہ کی روایت میں فطرۃ کی جگہ سنت کا لفظ ہے' اس میں عشر من الفطرۃ کی بجائے عشر من السنة کے الفاظ ہیں۔ان حضرات کا کہنا ہے کہ اس حدیث میں انبیاء علیہم السلام کے طریقہ کو الفطرۃ اس

لیے کہا گیا ہے کہ وہ فطرت کے عین مطابق ہوتا ہے۔اس تشریح کی بناء پر حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ انبیاءعلیہم السلام نے جس طریقہ پر خود زندگی گزاری اور اپنی اپنی امتوں کو جس پر چلنے کی ہدایت کی اس میں دس باتیں شامل تھیں۔گویا یہ دس چیزیں انبیاءعلیہم السلام کی متفقہ تعلیم اوران کے مشترکہ معمولات میں سے ہیں۔

بعض شارحین نے الفطرۃ سے دین فطرت یعنی دین اسلام مراد لیا ہے۔قرآن مجید میں دین کوفطرت کہا گیا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فاقم وجهك للدين حنيفًا فطرت الله التى فطر الناس عليها لا تبديل لخلق الله ذالك الدين القيم﴾

''پس سیدھا کرو اپنا رخ سب طرف سے یکسو ہوکر دین حق کی طرف اللہ کی بنائی فطرت جس پراس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اللہ کی بناوٹ میں تبدیلی نہیں، یہ دین ہے سیدھا پکا۔''

اس بناء پر حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ دس چیزیں دین فطرت یعنی اسلام کے اجزاء یا احکام میں سے ہیں۔اوربعض شارحین نے الفطرۃ سے انسان کی اصل فطرت و جبلت ہی مراد لی ہے۔اس تشریح کی بناء پر حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ دس چیزیں انسان کی فطرت کا تقاضا ہیں جواللہ تعالیٰ نے اس کی بنائی ہے۔گویا جس طرح انسان کی اصل فطرت یہ ہے کہ وہ ایمان اور نیکی اور طہارت و پاکیزگی کو پسند کرتا ہے، اورکفر وفواحش ومنکرات اور گندگی و ناپاکی کو ناپسند کرتا ہے اسی طرح مذکورہ بالا دس چیزیں ایسی ہیں کہ انسانی فطرت (اگر کسی خارجی اثر سے ماؤف اور فاسد نہ ہو چکی ہو) تو ان کو پسند ہی کرتی ہے اورحقیقت شناسوں کو یہ بات معلوم اورمسلم ہے کہ انبیاءعلیہم السلام جو دین اور زندگی کا طریقہ لے کر آتے ہیں وہ دراصل انسانی فطرت کے تقاضوں ہی کی مستنداور منضبط تشریح ہوتی ہے۔

اس تفصیل سے خود بخود معلوم ہو جاتا ہے کہ حدیث کے لفظ الفطرت کا مطلب خواہ سنت انبیاء ہوخواہ دین فطرت اسلام ہو، اورخواہ انسان کی اصل فطرت و جبلت ہو، حدیث کا

مدعا تینوں صورتوں میں ایک ہی ہوگا اور وہ یہ کہ دس چیزیں انبیاء علیہم السلام کے لائے ہوئے اس متفقہ طریقہ زندگی اور اس دین کے اجزاء و احکام میں سے ہیں، جو دراصل انسان کی فطرت و جبلت کا تقاضا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اپنے خاص حکیمانہ طرز پر اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے چند سطریں لکھی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ دس عملی باتیں جو دراصل طہارت و نظافت کے باب سے تعلق رکھتی ہیں، ملت حنفیہ کے مؤسس و مورث حضرت ابراہیم علیہ السلام سے منقول ہیں اور ابراہیمی طریقہ پر چلنے والی حنفی امتوں میں عام طور سے ان کا رواج رہا ہے، اور ان پر ان کا عقیدہ بھی رہا ہے۔ قرنہا قرن تک وہ ان اعمال کی پابندی کرتے ہوئے جیتے اور مرتے رہے ہیں۔ اسی لیے ان کو فطرت کہا گیا ہے۔ اور یہ ملت حنفی کے شعائر ہیں اور ہر ملت کے لیے ضروری ہے کہ اس کے کچھ مقرر و معلوم شعائر ہوں اور وہ ایسے علانیہ ہوں جن سے اس ملت والوں کو پہچانا جا سکے اور ان میں کوتاہی کرنے پر ان سے مواخذہ کیا جا سکے تا کہ اس ملت کی فرمانبرداری اور نافرمانی احساس اور مشاہدہ کی گرفت میں آ سکے اور یہ بھی قرین حکمت ہے کہ شعائر ایسی چیزیں ہوں جو نادر الوقوع نہ ہوں، اور ان میں معتدبہ فوائد ہوں اور لوگوں کے ذہن ان کو پوری طرح قبول کریں اور ان دس چیزوں میں یہ باتیں موجود ہیں۔ اس کو سمجھنے کے لیے ان چند باتوں پر غور کرنا چاہیے۔

جسم انسانی کے بعض حصوں میں پیدا ہونے والے بالوں کے بڑھنے سے پاکیزگی پسند اور لطیف مزاج آدمی کی سلیم فطرت منقبض اور مکدر ہوتی ہے جس طرح کہ حدث سے یعنی کسی گندگی کے جسم سے خارج ہونے سے ہوا کرتی ہے' بغل میں اور ناف کے نیچے پیدا ہونے والے بالوں کا حال یہی ہے اسی لیے ان کی صفائی سے سلیم الفطرت آدمی اپنے قلب و روح میں ایک نشاط اور انشراح کی کیفیت محسوس کرتا ہے جیسے کہ یہ اس کی فطرت کا خاص تقاضا ہے اور بالکل یہی حال ناخنوں کا بھی ہے۔ اور داڑھی کی نوعیت یہ ہے کہ اس سے چھوٹے اور بڑے کی تمیز ہوتی ہے اور وہ مردوں کے لیے شرف اور جمال ہے، اسی سے ان کی مردانہ ہیئت کی تکمیل ہوتی ہے اور سنت انبیاء ہے اس لیے اس کا رکھنا ضروری ہے۔

اور مونچھوں کے بڑھانے اور لمبا رکھنے میں کھلا ہوا ضرر یہ ہے کہ منہ تک بڑھی ہوئی مونچھوں میں کھانے پینے کی چیزیں لگ جاتی ہیں، اور ناک سے خارج ہونے والی رطوبت کا راستہ بھی وہی ہے اس لیے صفائی و پاکیزگی کا تقاضا یہی ہے کہ مونچھیں زیادہ بڑی نہ ہونے پائیں، اس واسطے مونچھوں کے ترشوانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور کلی اور پانی کے ذریعے ناک کی صفائی اور مسواک اور پانی سے استنجا اور اہتمام سے انگلیوں کے ان جوڑوں کو دھونا جن میں میل کچیل رہ جاتا ہے، صفائی اور پاکیزگی کے نقطۂ نظر سے ان سب چیزوں کی ضرورت و اہمیت کسی وضاحت کی محتاج نہیں۔

بعض اکابر علماء نے فرمایا کہ اس حدیث سے یہ اصول معلوم ہو گیا کہ جسم کی صفائی اور اپنی ہیئت اور صورت کی درستی اور ایسی ہر چیز کا ازالہ اور اس سے اجتناب جس سے گھن آئے اور کراہیت پیدا ہو احکام فطرت میں سے ہے، اور طریقۂ انبیاء علیہم السلام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صورت کی تحسین کو اپنا خاص انعام و احسان بتلایا ہے۔



ہدیہ اور تحفے کے ذریعہ آپس میں محبت والفت پیدا کیجیے

﴿عن ابی هريرة رضی الله عنه عن النبی صلی الله عليه وسلم قال تهادوا فان الهدية تذهب وحد الصدر ولا تحقرن جارة لجارتها ولو شق فرسن شاةٍ﴾ (رواہ الترمذی)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آپس میں ہدیئے تحفے دیا کرو، ہدیہ سینوں کی کدورت ورنجش کو دور کر دیتا ہے اور ایک پڑوسن دوسری پڑوسن کے ہدیہ کے لیے بکری کے کھر کے ایک ٹکڑے کو بھی حقیر اور کمتر نہ سمجھے''

زندگی میں لین دین کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ اپنی کوئی چیز ہدیہ اور تحفہ کے طور پر کسی کو پیش کر دی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں اس کی بڑی ترغیب دی ہے' اس کی یہ حکمت بھی بتلائی ہے کہ اس سے دلوں میں محبت والفت اور تعلقات میں خوشگواری پیدا ہوتی ہے۔ جو اس دنیا میں بڑی نعمت اور بہت سی آفتوں سے حفاظت اور عافیت وسکون حاصل ہونے کا وسیلہ ہے۔

ہدیہ وہ عطیہ ہے جو دوسرے کا دل خوش کرنے اور اس کے ساتھ اپنا تعلق خاطر ظاہر کرنے کے لیے دیا جائے اور اس کے ذریعے رضائے الٰہی مطلوب ہو۔ یہ عطیہ اور تحفہ اگر اپنے کسی چھوٹے کو دیا جائے تو اس کے ساتھ اپنی شفقت کا اظہار ہے، اگر کسی دوست کو دیا جائے تو یہ محبت زیادہ کرنے کا ذریعہ ہے۔ اگر کسی ایسے شخص کو دیا جائے جس کی حالت کمزور

ہے تو یہ اس کی خدمت کے ذریعہ اس کی دلجوئی کا ذریعہ ہے۔ اور اگر اپنے کسی بزرگ اور محترم کو پیش کیا جائے تو اُن کا اکرام ہے۔ اگر کسی کو ضرورت مند سمجھ کر اللہ کے واسطے اور ثواب کی نیت سے دیا جائے تو یہ ہدیہ نہ ہوگا صدقہ ہوگا، ہدیہ جب ہی ہوگا جب کہ اس کے ذریعہ اپنی محبت اور تعلق خاطر کا اظہار مقصود ہو اور اس کے ذریعہ رضائے الٰہی مطلوب ہو۔ ہدیہ اگر اخلاص کے ساتھ دیا جائے تو اس کا ثواب صدقہ سے کم نہیں بلکہ بعض اوقات زیادہ ہوگا۔ ہدیہ اور صدقہ کے اس فرق کے نتیجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ شکریہ اور دعا کے ساتھ قبول فرماتے اور اس کو خود بھی استعمال فرماتے تھے اور صدقہ کو بھی اگرچہ شکریہ کے ساتھ قبول فرماتے اور اس پر دعائیں بھی دیتے لیکن خود استعمال نہیں فرماتے تھے، دوسروں ہی کو مرحمت فرما دیتے تھے۔

افسوس ہے کہ امت میں باہم مخلصانہ ہدیوں کی لین دین کا رواج بہت ہی کم ہو گیا ہے۔ بعض خاص حلقوں میں بس اپنے بزرگوں، عالموں، مرشدوں کو ہدیہ پیش کرنے کا تو کچھ رواج ہے لیکن اپنے عزیزوں، قریبوں، پڑوسیوں وغیرہ کے ہاں ہدیہ بھیجنے کا رواج بہت ہی کم ہے حالانکہ قلوب میں محبت و الفت اور تعلقات میں خوشگواری اور زندگی میں چین وسکون پیدا کرنے اور اسی کے ساتھ رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لیے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بتلایا ہوا نسخہ کیمیاء ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”آپس میں ہدیے تحفے بھیجا کرو، ہدیئے تحفے دلوں کے کینے کو ختم کر دیتے ہیں۔“ (جامع ترمذی) ہدیئے تحفے دینے سے باہمی رنجشوں اور کدورتوں کا دور ہونا، دلوں میں جوڑ اور تعلقات میں خوشگواری پیدا ہونا بدیہی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سنہری ہدایت پر عمل کرنے کی توفیق عطاء فرمائیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جو یہ اضافہ ہے کہ ایک پڑوسن دوسری پڑوسن کے لیے بکری کے کھر کے ٹکڑے کے ہدیہ کو حقیر نہ سمجھے اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بظاہر یہ ہے کہ ہدیہ دینے کے لیے ضروری نہیں کہ بہت عمدہ ہی چیز ہو اگر اس کی پابندی اور اس کا اہتمام کیا جائے گا تو ہدیہ دینے کی

نوبت بہت کم آئے گی۔ اس لیے بالفرض اگر گھر میں بکری کے پائے پکے ہیں تو پڑوسن کو بھیجنے کے لیے اس کے ایک ٹکڑے کو بھی حقیر نہ سمجھا جائے وہی بھیج دیا جائے۔

واضح رہے کہ یہ ہدایت اس حالت میں ہے جب اطمینان ہو کہ پڑوسن خوشی کے ساتھ قبول کرے گی اور اس کو اپنی توہین وتذلیل نہ سمجھے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ماحول ایسا ہی تھا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول و دستور تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ تحفہ قبول فرماتے تھے،اور اس کے جواب میں خود بھی عطاء فرماتے تھے۔ (صحیح بخاری)

مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی محبّ ومخلص ہدیہ پیش کرتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم خوشی سے قبول فرماتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد **ھل جزاء الاحسان الا الا حسان** کے مطابق اس ہدیہ دینے والے کو خود بھی ہدیے اور تحفے سے نوازتے تھے۔ (خواہ اسی وقت عنایت فرماتے یا دوسرے وقت)۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو بھی اسی طرزِ عمل کی ہدایت فرمائی ہے اور بلاشبہ مکارم اخلاق کا تقاضا یہی ہے، لیکن افسوس ہے کہ امت میں بلکہ خواص امت میں بھی اس کریمانہ سنت کا اہتمام بہت کم نظر آتا ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو ہدیہ تحفہ دیا جائے تو اگر اس کے پاس ہدیہ میں دینے کے لیے کچھ موجود ہو تو اس کو دے دے اور جس کے پاس بدلہ میں دینے کے لیے کچھ نہ ہو تو وہ (بطور شکریہ کے) اس کی تعریف کرے اور اس کے حق میں کلمہ خیر کہے، جس نے ایسا کیا اس نے شکریہ ادا کر دیا' جس نے ایسا نہیں کیا اور احسان کے معاملہ کو چھپایا تو اس نے ناشکری کی۔ اور جو کوئی اپنے کو آراستہ دکھائے اس صفت سے جو اس کو عطا نہیں ہوئی تو وہ اس آدمی کی طرح ہے جو دھوکے فریب کے دو کپڑے پہنے۔ (ترمذی، ابی داؤد)

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے کہ جس کو کسی محبت کرنے والے کی طرف سے ہدیہ تحفہ دیا جائے تو اگر ہدیہ پانے والا اس حال میں ہو کہ اس کے جواب اور صلہ میں ہدیہ تحفہ دے سکے تو ایسا ہی کرے اور اگر اس کی مقدرت نہ ہو تو اس کے حق میں کلمۂ خیر کہے اور اس کے اس احسان کا دوسرے کے سامنے بھی تذکرہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کو بھی شکر سمجھا جائے گا۔

اور آگے درج ہونے والی ایک حدیث سے معلوم ہوگا کہ **جزاك الله** کہنے سے بھی یہ حق ادا ہو جاتا ہے۔ اور جو شخص ہدیہ تحفہ پانے کے بعد اس کا اخفاء کرے، زبان سے ذکر تک نہ کرے، **جزاك الله** جیسا کلمہ بھی نہ کہے تو وہ کفرانِ نعمت اور ناشکری کا مرتکب ہوگا۔ حدیث کے آخری جملے **ومن تحلی**......**الخ** کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ جو شخص اپنی زبان یا طرزِ عمل یا خاص قسم کے لباس وغیرہ کے ذریعے اپنے اندر وہ کمال (مثلاً عالمیت یا مشیخیت) ظاہر کرے جو اس میں نہیں ہے تو وہ اس دھوکہ باز اور فریبی بہروپیئے کی طرح ہے جو لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے باعزت اور باوقار لوگوں کا سا لباس پہنے۔ بعض شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ عرب میں کوئی شخص تھا جو نہایت گھٹیا اور ذلیل درجہ کا آدمی تھا، لیکن وہ باعزت اور باوقار لوگوں کے سے نفیس اور شاندار کپڑے پہنتا تھا تاکہ اس کو معززین میں سمجھا جائے اور اس کی گواہی پر اعتبار کیا جائے، حالانکہ وہ جھوٹی گواہیاں دیتا تھا اسی کو لابس ثوب زور کہا گیا ہے۔

ہدیہ تحفہ سے متعلق مذکورہ بالا ہدایات کے ساتھ اس آخری جملہ کے فرمانے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد غالباً یہ ہے کہ کوئی شخص جس میں وہ کمالات اور اوصاف نہ ہوں جن کی وجہ سے لوگ ہدیہ وغیرہ پیش کرنا سعادت سمجھتے ہیں، ایسا شخص اگر لوگوں کے ہدیے تحفے حاصل کرنے کے لیے اپنی باتوں اور اپنے لباس اور اپنے طرز زندگی سے وہ کمالات اور اوصاف اپنے لیے ظاہر کر دے تو یہ فریب اور بہروپیا پن ہوگا اور یہ آدمی اس روایتی لابس ثوب زور کی طرح مکار اور دھوکے باز ہوگا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

ارشاد فرمایا کہ جس نے احسان کرنے والے بندہ کا شکریہ ادا نہیں کیا اس نے اللہ تعالیٰ کا بھی شکریہ ادا نہیں کیا۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ جس بندے کے ہاتھ سے کوئی ہدیہ تحفہ کوئی نعمت ملے یا وہ کسی طرح کا بھی احسان کرے تو اس کا شکریہ ادا کیا جائے اور اس کے لیے کلمۂ خیر کہا جائے تو جس نے ایسا نہیں کیا اس نے اللہ تعالیٰ کی بھی ناشکری اور نافرمانی کی۔

اللہ رب العزت ہم سب کو آپس میں قلبی الفت ومحبت عطا فرمائے۔

(آمین یارب العلمین)



تم میں سے ہر ایک

مسلمان دوسرے مسلمان کے بارے میں جواب دہ ہے

عَنْ عبداللّٰہ بن عمرؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ أَلَا کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ وَقَالَ علیہ الصلوٰۃ والسلام وَالْمَرْءَۃُ رَاعِیَۃٌ عَلٰی بَیْتِ زَوْجِھَا وَوَلَدِہٖ وَھِیَ مَسْئُوْلَۃٌ عَنْھُمْ. (متفق علیہ)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا آ گاہ رہو تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور ہر شخص سے اس کی رعیت کے یعنی جس کا نگہبان اور ذمہ دار ہے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا اور آپ نے فرمایا کہ عورت اپنے خاوند کے گھر اور اس کی اولاد کی نگہبان ہے اور اس سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ (اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے)۔

انسانی معاشرے کی فطری ترتیب ہی کچھ اس طرح ہے کہ ہر انسان جس سطح پر بھی ہو اس پر چند انسانوں کو اختیار ہوتا ہے اور خود اس انسان کو بھی چند اور انسانوں پر اختیار ہوتا ہے۔ سربراہِ مملکت سے لے کر ایک چھوٹے سے گھرانے کے فرد تک یہی ترتیب موجود رہتی ہے۔ اسی طرح ہر انسان کو چند افراد پر اختیار حاصل رہتا ہے۔ اب یہ انسان اپنے اختیارات کو ان لوگوں پر استعمال کرتا ہے۔ بحیثیت انسان ہونے کے اس کے اندر فطری جذبات اور خواہشات بھی ہیں۔ ان جذبات اور خواہشات کو پورا کرنے کے لیے بھی انسان یہ اختیارات استعمال کرتا ہے۔

لہٰذا اس اختیار کو انسان صحیح بھی استعمال کرتا ہے اور غلط بھی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم نے واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا کہ خبردار تم میں سے ہر ایک راعی اور نگہبان محافظ اور حاکم ہے اور جس پر حاکم ہے جس کی نگہبانی اس کے ذمہ ہے اس کے بارے میں اس شخص سے اللہ ربّ العزت کے حضور میں پوچھا جائے گا کہ ہم نے تمہیں چند انسانوں پر اختیار دیا تھا، تم نے اس اختیار کو کیسے اور کس طرح استعمال کیا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عورت اپنے خاوند کے گھر اور اس کے بچوں کی راعیۃ ہے نگہبان' محافظ اور ذمہ دار ہے اور اس سے ان کے بارے میں پوچھا جائے گا اس حدیث مبارکہ میں عورت کو اپنے خاوند کے گھر اور اس کے بچوں کی راعیۃ قرار دیا ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ حاکم ہے یا محافظ ہے۔

بلکہ بڑا خوبصورت اور بلیغ عہدہ عطا فرمایا کہ وہ راعیۃ ہے راعی کے معنی ہیں چرواہا۔ یعنی جس طرح چرواہا اپنے جانوروں کے ریوڑ کی حفاظت کرتا ہے۔ ان کی دیکھ بھال ایک مخصوص تعلق کے ساتھ کرتا ہے۔ ان کے چارہ پانی کا خیال رکھتا ہے۔ اگر بکری بیماری ہو جائے اس کا علاج معالجہ کرتا ہے لیکن اگر کوئی بکری ریوڑ سے ہٹ کر چلنے لگے اسے ہانک کر واپس کرتا ہے۔ اگر ہانکنے سے واپس نہ آئے تو اس پر سختی کرتا ہے تا کہ وہ ریوڑ سے بچھڑ کر جدا نہ ہو جائے۔

بالکل یہی فرائض عورت کے لیے اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں کے بارے میں ہیں کیونکہ حکمرانی کرنا آسان کام ہے اسی طرح محافظ بن جانا مشکل کام نہیں۔ لیکن چرواہے کی طرح اپنے گھر اور اپنے بچوں کی نگہبانی اور پرورش کرنا اعلیٰ ترین ذمہ داری ہے۔ ہر معاشرہ میں عورت اپنے گھر اور اپنے بچوں کی پرورش اور نگہبانی کرتی رہی ہے اور یہ نگہبانی اکثر معاشرتی طور پر اسے کرنی پڑتی ہے۔ لیکن اگر ایک عورت اپنے گھر اور بچوں کا خیال اس لیے رکھتی ہے کہ خدا عزوجل نے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم دیا ہے۔ تو یہی نگہبانی اور پرورش عبادت بن جائے گی۔ اس نگہبانی کی ابتدا بچے کی پیدائش کے تھوڑی دیر بعد شروع ہو جاتی ہے۔ جب بچہ اس دنیا میں آئے۔ اس کے کانوں میں اذان اور اقامت کے ذریعے اللہ کا پیغام ڈالا جائے اگر استطاعت ہو تو شکرانے کے طور پر اس کی طرف سے

ایک جانور بطور عقیقہ کے ذبح کرے جب بچہ بولنے لگے' دنیا کی دوسری خرافات سکھانے کے بجائے کلمہ طیبہ سکھائے۔ اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **افتحوا علی صبیانکم اول کلمۃ بلا الہ الا اللہ** یعنی اپنے بچے کو سب سے پہلے لا الہ الا اللہ سکھاؤ۔ جب باتیں سمجھنے کے قابل ہو جائے تو اچھی تربیت کرے۔ اس لیے کہ آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ کسی باپ نے اپنی اولاد کو اچھی تربیت سے بہتر عطیہ اور تحفہ نہیں دیا۔ پھر آپ  نے فرمایا کہ بچہ سات برس کا ہو جائے تو نماز کی تاکید کرو اور جب دس سال کا ہو جائے تو نماز میں کوتاہی کرنے پر سزا دو اور پاکیزہ تعلیم دو جب بالغ ہو جائے اور شادی کی عمر کو پہنچ جائے تو اس کی شادی کر دو۔

بچوں کی پرورش کے بارے میں شفقت پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ یہ واقعی بہت اہم ہے لیکن شفقت کا مطلب یہ ہے اگر بچہ آپ کا کام کرے تو اس کی تعریف کی جائے اس کی حوصلہ افزائی کی جائے لیکن اگر بچہ غلط کام کرے غلط ماحول کو اپنانے کی کوشش کرے تو اب مناسب طریقے سے سختی کرنا شفقت میں شمار ہو گا۔

اگر بچہ غلط کاموں اور غلط ماحول کی دلدل میں دھنس رہا ہو اور والدین شفقت سے کام لے رہے ہوں تو یاد رکھیے گا یہ بچے پر شفقت نہیں بچے پر ظلم ہے۔

☆☆☆

دنیا میں دوسروں کے عیب چھپایئے

آخرت میں آپ کے عیب چھپائے جائیں گے

﴿عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ عنہ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قَالَ لَا یَسْتُرُ عَبْدٌ عَبْدًا فِی الدُّنْیَا اِلَّا سَتَرَہٗ اللّٰہُ یَوْمَ القِیٰمَۃِ﴾(رواہ مسلم)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو بندہ کسی دوسرے کے عیب کو دنیا میں چھپاتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کے عیب چھپائیں گے۔''

سَتَر کا معنی ہے چھپانا۔اسی سے لفظ الستار بنا۔جس کا معنی ہوا بہت زیادہ چھپانے والا بہت زیادہ پردہ کرنے والا۔''الستـــار''اللہ رب العزت کا اسم مبارک ہے جس کا مفہوم ہے عیبوں کو چھپانے والا۔

اسماء الحسنٰی میں الستار بہت مشہور نام ہے اور بہت سے مسلمان اپنا نام عبدالستار رکھتے ہیں یہ نام قرآن مجید میں موجود نہیں البتہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان لانے کی تعلیم دیتے ہوئے جن چھ کلمات کی تلقین فرمائی ان میں سے پانچواں کلمہ استغفار ہے اس کلمہ میں اللہ تعالیٰ کا یہ نام موجود ہے۔

﴿اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ اَذْنَبْتُہٗ عَمَدًا اَوْ خَطَاءً سِرًّا اَوْ عَلَانِیَۃً وَ اَتُوْبُ اِلَیْہِ مِنَ الذَّنْبِ الَّذِیْ اَعْلَمُ وَمِنَ الذَّنْبِ الَّذِیْ لَا اَعْلَمُ اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ وَسَتَّارُ الْعُیُوْبِ وَغَفَّارُ الذُّنُوْبِ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ﴾

''میں اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرتا ہوں ہر اس گناہ سے جو میں نے جان بوجھ کر کیا یا غلطی سے۔چھپ کر کیا ہو یا ظاہر کر کے۔میں اللہ ہی کی طرف رجوع کرتا ہوں اس گناہ سے جو میں نہیں جانتا۔اے اللہ بے

شک تو ہی غیب کی باتوں کو جاننے والا ہے اور تو ہی عیبوں کو چھپانے والا
ہے اور گناہوں کو بخشنے والا ہے اور گناہوں سے بچنے کی طاقت اور نیکی
کرنے کی قوت صرف اللہ ہی کی مدد کی وجہ سے ہوتی ہے جو بلند مرتبہ
اور بزرگی والا ہے۔''

یہ کلمہ استغفار اور اس کا ترجمہ اس لیے ذکر کیا کہ اس سے اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی الستار کے مفہوم کو سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی۔ پہلی بات تو یہ کہ اس کلمہ میں ایک لفظ آیا ستار العیوب یعنی اللہ تعالیٰ ہی عیبوں کو چھپانے والا اور ان پر پردہ ڈالنے والا ہے اور دوسری بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ بے عیب ذات صرف خدا تعالیٰ کی ہے باقی عام انسان عیبوں سے پاک نہیں۔ ہر انسان کے اندر کوئی نہ کوئی عیب موجود ہے۔ اگر کوئی انسان ہم میں سے یہ کہے کہ ''میرے اندر کوئی عیب نہیں۔'' تو یہ بات ہی کہنا انسان کے اندر بہت بڑا عیب ہے کیونکہ بے عیب ذات تو صرف اللہ کی ہے اور پھر اس کی مزید صفت یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کے عیبوں کو بھی چھپا دیتا ہے ان پر پردہ ڈال دیتا ہے اور اسی خوبی کی تعلیم اللہ تعالیٰ نے بندوں کو دی کہ وہ اپنے جیسے انسانوں کے عیب ظاہر نہ کریں اس کے لیے قرآن حکیم میں لفظ غیبت کا تذکرہ آیا۔ غیبت کہتے ہیں کسی کے عیب کو دوسرے انسان کے سامنے بیان کرنا اس کی غیر موجودگی میں۔ دوسرے انسانوں کی برائیوں کے ذکر کرنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضاً اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتاً فَكَرِهْتُمُوْهُ﴾

''اور تم ایک دوسرے کی غیبت نہ کیا کرو تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اپنے
مردار بھائی کا گوشت کھائے گیا؟ نہیں تم اسے ناپسند کرتے ہو۔''

اللہ تعالیٰ نے دوسرے انسانوں کے عیبوں کے تذکرہ سے اتنی سختی سے منع فرمایا لیکن ہم جب اپنے معاشرے پر نظر ڈالتے ہیں تو تقریباً ہر محفل اس گناہ سے آلودہ نظر آتی ہے۔ جہاں دو چار افراد مل کر بیٹھے وہاں کسی نہ کسی کی برائی ضرور ہوگی۔

آخر ایسا کیوں ہوتا ہے۔اس کی نفسیاتی وجہ یہ ہے جس سے آپ بھی اتفاق کریں گے کہ عام انسان کی فطرت اور طبیعت کچھ ایسی ہے کہ اسے دوسرے کی برائیاں بیان کر کے مزہ آتا ہے۔ایک عجیب سی لذت ملتی ہے، اور دوسری طرف سننے والے پر بھی یہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔کئی بار اس کا تجربہ ہوا کہ اگر محفل میں عام سی باتیں ہو رہی ہوں تو دل اُکتا جاتا ہے آدمی تھوڑی دیر بعد بور ہو جاتا ہے لیکن اگر اس محفل میں کسی کے عیب اور اس کی برائیاں بیان ہو رہی ہوں تو کئی گھنٹے گزر جائیں احساس ہی نہیں ہوتا۔ سننے والے بھی خوب کان لگا کر سنتے ہیں اور کئی دفعہ تو یہاں تک تجربہ ہوا کہ کسی شخص کو دوسرے کا عیب معلوم ہوا تو اب وہ بے چین ہو جاتا ہے کہ مجھے کوئی بھی ملے تو میں اس سے یہ بتاؤں کہ فلاں میں یہ عیب ہے حالانکہ ہم سب کا خالق و مالک جس کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہمارے عیبوں پر پردہ ڈالنے والا ہے۔اور پھر اس ذات نے ہمیں یہ تعلیم بھی دی کہ دوسرے کے عیوب کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ لیکن ہر محفل میں دوسرے لوگوں کی برائیاں کرنے والے آخر ان پر پردہ رکھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے تو اس کی چند وجہیں ہوتی ہیں۔ان میں سے ایک وجہ غصہ ہے۔کہ جب کوئی شخص کسی سے ناراض ہوتا ہے تو اس کی برائیاں بیان کرتا رہتا ہے اس لیے اسلام نے غصہ اور ناراضگی سے منع فرمایا۔ دوسری وجہ تکبر اور غرور ہے کہ انسان خود اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے تو دوسروں کو حقیر سمجھنے سے منع کیا تیسری وجہ اپنی عبادت اور نیکی پر ناز ہونا۔کئی لوگوں کو اپنی پرہیزگاری اور عبادات پر اتنا ناز ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کے گناہوں اور برائیوں کو ظاہر کرتے ہیں۔اس لیے اللہ رب العزت نے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پرہیزگاری پر ناز کرنے سے منع فرمایا۔

چوتھی وجہ محفل میں دوسروں کی برائیاں بیان کرنے کی یہ ہوتی ہے کہ آدمی جب دیکھتا ہے کہ دو چار دوست کسی آدمی کے عیب ظاہر کر رہے ہیں تو پھر اس آدمی کا بھی جی چاہتا ہے کہ میں اس شخص کا کوئی عیب ظاہر کروں چنانچہ اسلام نے بری محفل میں بیٹھنے سے منع کیا دوسروں کے عیب ذکر کرنے کی ایک وجہ حسد بھی ہوتی ہے۔کہ انسان کے دل میں اگر کسی شخص کے بارے میں حسد ہو تو انسان اس شخص کی برائیاں ظاہر کرتا ہے۔لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم نے حسد کرنے سے بھی منع فرمایا۔

اسی طرح اور بہت سی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے انسان دوسرے کے عیب کو ظاہر کرتا ہے۔اس لیے ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ جب محفل میں کسی کی برائی ہوتو ہم کہنے والے کی خدمت میں درخواست کریں کہ وہ برائی نہ کرے۔اگر اس کی طاقت نہ ہوتو محفل سے کنارہ کش ہو جایئے اور جب کسی کی برائی معلوم ہوتو اسے کسی کے سامنے ظاہر نہ کریں اس لیے کہ جو دوسروں کے عیب چھپاتا ہے اللہ اس کے عیب چھپاتا ہے۔اور پھر اپنے نفس کی طرف دیکھئے کہ ہم میں یہ برائی تو موجود نہیں۔اگر موجود نہیں تو اللہ کا شکر ادا کریں۔اگر موجود ہوتو پھر پہلے اپنے اندر اس برائی کو ختم کرنے کی کوشش کریں اور پھر دوسرے شخص کے بارے میں دعا کریں کہ اللہ اس برائی کو اس شخص سے ختم فرما دے جب دل میں یہ درد ہوتو پھر کبھی کسی کی برائی زبان پر نہیں آتی۔اے ستار العیوب۔عیبوں کو چھپانے والے ہم سب کے عیبوں پر پردہ ڈال دے اور پھر ان عیوب کو دور کرنے کی توفیق عطا فرما۔آمین۔



اتحاد و اتفاق کی اہمیت

وعن النعمان بن بشیر قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَرَی الْمُؤْمِنِیْنَ فِیْ تَرَاحُمِهِمْ وَتَوَادِّ هِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ اِذَا اشْتَکٰی عُضْوٌ تداعیٰ لَہٗ سَائِرُا لجَسَدِ بِالسَّهْرِ وَالْحُمّٰی.﴾(متفق علیہ)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آپ مومنوں کو آپس میں رحم کرنے، محبت رکھنے اور مہربانی کرنے میں ایسا پائیں گے جیسا کہ ایک بدن ہو، جب اس کے کسی عضو کو تکلیف پہنچتی ہے تو پورے جسم کے سارے اعضاء بے خوابی، بے تابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔'' (اس حدیث کو صحیح بخاری اور صحیح مسلم نے روایت کیا)

اس حدیث مبارک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلم معاشرے کی حقیقت بڑے عمدہ انداز میں بیان فرمائی ہے مل جل کر رہنے اور اکٹھے زندگی گزارنے کا نام معاشرہ ہے، اسلامی تعلیمات کے آنے سے پہلے بھی لوگ مل جل کر رہتے تھے۔ زمین کے مختلف حصوں میں لوگ مختلف طریقوں سے زندگی گزارا کرتے تھے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت مسلمہ کو مسلم معاشرہ کی ایسی خصوصیات عطا فرمائیں کہ جن سے انسان کو محض اپنے زندہ رہنے کے لیے ہی نہیں بلکہ اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ دوسروں کی زندگی میں مکمل طور پر شریک ہونے کی تعلیم ملتی ہے۔

زمانہ جاہلیت میں انسان تہذیب و اخلاق سے ناواقف ہونے کی وجہ سے انتہائی پستیوں میں گرے ہوئے تھے' اسلام کا ان پر احسانِ عظیم ہے کہ ایک مختصر عرصہ میں وہی لوگ تہذیب و تمدن کے بلند پایہ معیار پر نظر آنے لگے اور ان کا معاشرہ دنیا بھر کے لیے عملی نمونہ

بن گیا وہ مسلمان جس نئے ملک میں قدم رکھتے وہاں کے لوگ ان کی معاشرتی عملی زندگی سے اس قدر متاثر ہوتے کہ اسلام قبول کر لیتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے دین حق اسلام کی تعلیمات لے کر تشریف لائے جو لوگ آپ کی دعوت کو قبول کر لیتے ہیں وہ امت مسلمہ کے افراد بن جاتے ہیں اور یہی اسلامی برادری کا مفہوم اور اس کی حقیقت ہے۔جب انسان امت مسلمہ کا فرد بن جاتا ہے تو اس پر امت مسلمہ کے بارے میں مخصوص قسم کے حقوق عائد ہو جاتے ہیں۔ان حقوق میں سے بنیادی حق اور امت مسلمہ کی ایک اہم خصوصیت امت مسلمہ کا اتحاد و اتفاق ہے۔جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے خوبصورت اور حقیقی انداز میں بیان فرمایا کہ آپس کی محبت، آپس کے پیار اور مہربان ہونے میں مومنوں کی مثال ایک جسم جیسی ہے جو چند اعضاء سے مرکب ہوتا ہے جب کبھی ایک عضو کو تکلیف پہنچتی ہے تو سارے جسم کے اعضاء بے خوابی اور بے تابی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

گویا کہ آپ کے ارشاد کے مطابق پوری امت مسلمہ ایک جسم کی طرح ہے اور امت کے افراد اس جسم کے اعضاء ہیں اگر ایک عضو کو تکلیف ہو تو تمام اعضاء تکلیف کو محسوس کرتے ہیں اسی طرح پوری ملت اسلامیہ کے ہر فرد کو اپنے مسلمان بھائی کی تکلیف محسوس کرنی چاہیے اور ہر ایک کے دکھ درد میں سب کو شریک ہونا چاہیے اور یہ صرف ایک فرض ہی نہیں بلکہ اللہ رب العزت نے اس کا بہت بڑا اجر و ثواب بھی رکھا ہے۔

امت مسلمہ کے اسی اتحاد و اتفاق کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عمدہ انداز میں یوں بیان فرمایا:

﴿اَلْمُؤمِنُ لِلْمُؤمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُه، بَعْضًا ثُمَّ شَبَّكَ بَيْنَ اَصَابِعِهٖ﴾[1]

"یعنی ایک مسلمان کا تعلق دوسرے مسلمان کے ساتھ ایک مضبوط عمارت جیسا ہے اس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو مضبوط کرتا ہے پھر آپ

نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں پیوست کر کے دکھایا“

معلوم ہوا کہ جس طرح ایک ایک اینٹ جوڑ کر عمارت بنائی جاتی ہے اسی طرح ایک ایک فرد مل کر معاشرہ بنتا ہے اور جس طرح ہر اینٹ دوسری اینٹ کو سہارا دیتی ہے اور عمارت بلند اور مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے اسی طرح پورے اسلامی معاشرے میں ہر فرد کو وہی کردار ادا کرنا چاہیے جو ایک مضبوط عمارت کی ہر اینٹ اس عمارت کے استحکام اور اس کی بقا کے لیے اپنا فرض ادا کرتی ہے۔

اور یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ عمارت کی تعمیر میں بہت زیادہ وقت صرف ہوتا ہے۔ کئی ماہ کئی سال لگ جاتے ہیں لیکن عمارت گرتے وقت چند لمحے صرف ہوتے ہیں' تاریخ گواہ ہے کہ امت مسلمہ پر بڑے کٹھن مرحلے آئے لیکن جب تک اتحاد و اتفاق برقرار رہا امت مسلمہ کی طرف نگاہِ غلط کی کسی کو جسارت نہ تھی کیونکہ امت مسلمہ کو خدائی حکم یاد تھا۔

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾

”اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھو اور پھوٹ مت ڈالو۔“

لیکن جب بھی امت مسلمہ کے اندر انتشار نے سر اٹھایا امت مسلمہ کمزور ہوتی چلی گئی کیونکہ اس بارے میں بھی اللہ رب العزت واضح الفاظ میں آگاہ فرما چکے ہیں۔

﴿وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ﴾

”یعنی تم آپس میں مت جھگڑو ورنہ تم مفلوج ہو جاؤ گے بے جان ہو جاؤ گے اور انتہائی کمزور ہو جاؤ گے۔“

خدائے ذوالجلال کے احکامات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں امت مسلمہ پر یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ ہمارے اندر اتفاق و اتحاد کا پایا جانا کتنا ضروری ہے اور ایسا اتفاق ہو کہ ہم ایک بدن کی طرح ہو جائیں روئے زمین پر کسی بھی جگہ کسی مسلمان پر ظلم ہو رہا ہو یا اسے مصیبت پہنچ رہی ہو تو ہم مکمل طور پر اس کی مدد کریں اور اس سے مصیبت

اور تکلیف کو دور کرنے کی کوشش کریں۔

تاکہ اللہ رب العزت کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے، خیر خواہی، اعتماد و امن و سکون سے بھرپور معاشرہ قائم ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں باہمی اتحاد و اتفاق کی توفیق مرحمت فرمائے آمین۔

☆☆☆

آداب ضیافت

﴿عَنْ اَبِیْ شُرَیْحٍ ن الْکَعْبِیّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیُکْرِمْ ضَیْفَہٗ جَائِزَتُہٗ یَوْمٌ وَ لَیْلَۃٌ وَالضِّیَافَۃُ ثَلٰثَۃُ اَیَّامٍ فَمَا بَعْدَ ذٰلِکَ فَھُوَ صَدَقَۃٌ وَلَا یَحِلُّ لَہٗ اَنْ یَثْوِیَ عِنْدَہٗ حَتّٰی یُحْرِجَہٗ﴾ (متفق علیہ)

''حضرت ابوشریحؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو شخص خدا اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ وہ اپنے مہمان کی عزت کرے، اور خاطر و مدارت کا زمانہ ایک دن اور ایک رات ہے اور مہمان کی مہمان نوازی کی مدت تین دن اور تین رات ہے۔ اس کے بعد کی مہمان نوازی صدقہ و خیرات ہے اور مہمان کو چاہیے کہ وہ اپنے میزبان کے ہاں زیادہ عرصہ نہ ٹھہرے یہاں تک کہ وہ تنگ آ جائے۔''

(اس حدیث مبارکہ کو بخاری اور مسلم دونوں نے نقل کیا ہے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث مبارکہ میں مہمان نوازی کی تعلیم دی اور مہمان نوازی کی مدت بھی بیان فرمائی۔ مختلف احادیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مہمان نوازی کی تعلیم اور اُس کی فضیلت اُمت کو سکھائی۔ اور یہاں تک فرمایا کہ **لَا خَیْرَ لِمَنْ لَا یُضِیْفُ** اس شخص کے لیے کوئی بھلائی نہیں جو مہمان نوازی نہیں کرتا۔ بخاری اور مسلم کی ایک روایت میں فرمایا **کُلُّ بَیْتٍ لَا یَدْخُلُہٗ ضَیْفٌ لَا تَدْخُلُہٗ الْمَلَائِکَۃُ** ۔یعنی جس گھر میں مہمان داخل نہ ہوں اس گھر میں فرشتے بھی داخل نہیں ہوا کرتے۔ لیکن مہمان کے لیے اتنے زیادہ تکلفات بھی نہیں کرنے چاہئیں کہ طبیعت پر گراں گزرے اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا کہ مہمان کے لیے تکلف نہ کرو کہ تکلف کی وجہ سے تم مہمان کو برا جانو گے اور جو مہمان کو برا جانتا ہے وہ اللہ کو برا جانتا ہے اور اللہ اسے برا جانتا ہے۔''

امام غزالی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب احیاء العلوم میں تعلیمات اسلامیہ کی روشنی میں مہمان نوازی کے چند ایسے آداب بیان فرمائے ہیں جن کو مدنظر رکھنے کی وجہ سے انسان کو دنیا کی راحت بھی میسر ہو سکتی ہے اور آخرت میں ثواب بھی۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں آداب ضیافت اور مہمان نوازی میں سے پہلا ادب یہ ہے کہ متقی اور پرہیزگار لوگوں کی دعوت کریں، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی فرمایا ہے یہاں تک کہ جب ایک صحابی کی دعوت میں شریک ہوئے تو آپ نے ان کے لیے یہ دعا مانگی تھی کہ اللہ کرے تیرا کھانا متقی اور پرہیزگار لوگ کھائیں ایک اور جگہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے فرمایا کہ سوائے متقی کے کسی کا کھانا مت کھانا اور نہ متقی کے علاوہ تمہارا کھانا کوئی کھائے مہمان نوازی کا دوسرا ادب یہ ہے کہ دعوت میں صرف مالداروں کو نہ بلایا جائے بلکہ غرباء اور مستحق لوگوں کو بھی مدعو کیا جائے اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب کھانوں میں سے برا کھانا اس ولیمہ کا ہے جس میں مالداروں کو دعوت دی گئی ہو اور غرباء کو نہ بلایا گیا ہو۔ تیسرا ادب یہ ہے کہ دعوت میں اپنے اعزہ و اقرباء کو نہ چھوڑے اس سے دلوں میں دوری اور قرابت داری میں توڑ پیدا ہو گا جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلہ رحمی اور جوڑ کا حکم فرمایا۔ مہمان نوازی کے بارے میں چوتھا ادب یہ ہے کہ دعوت سے مقصود فخر اور ریا نہ ہو بلکہ اپنے اعزاء اقرباء اور اپنے دوستوں اور بھائیوں کے دلوں میں میلان پیدا کرنے اور سنت نبوی پر عمل کرنا اور اپنے ایماندار بھائیوں کو خوشی پہنچانی مقصود ہو پانچواں ادب یہ ہے کہ ایسے شخص کی دعوت نہ کرے جس کے بارے میں معلوم ہو کہ اُس کے آنے پر دشواری ہو گی اور جب آئے گا تو حاضرین سے اُسے تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ چھٹا ادب یہ ہے کہ دعوت اس شخص کی کرے جس کا دعوت قبول کرنا آپ کے لیے خوشی کا باعث ہو حضرت سفیانؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی کی دعوت کرے اور دل میں یہ ہو کہ وہ دعوت نہ قبول کرے تو اچھا ہے تو ایسی دعوت دینا بھی گناہ ہے۔ جب مہمان آجائے تو اس کی تعظیم کے بھی چند آداب

ہیں پہلا یہ کہ جب مہمان پہنچ جائے تو کھانا جلد از جلد پیش کیا جائے، دوسرا یہ کہ کھانوں کو ترتیب سے پیش کیا جائے اس طرح کہ پہلے کھانے والی پہلے اور بعد والی بعد میں۔ تیسرا یہ کہ کھانا اس طرح پیش کیا جائے کہ تمام مہمان اس سے لطف اندوز ہوں عمومی دعوت میں کسی کے سامنے خاص رکھنا باہمی رنجش کا سامان پیدا کرتا ہے۔ چوتھا یہ کہ اگر مختلف اقسام کے کھانے تیار کیے گئے ہوں تو پہلے لذیذ کھانے لا کر رکھ دیجئے ورنہ بعد میں عمدہ کھانا پیش کرنے کی وجہ سے مہمان تکلیف میں مبتلا ہوگا۔ پانچواں ادب یہ کہ میزبان کو چاہیے کہ سب سے آخر میں کھانا چھوڑے تاکہ مہمان خوب سیر ہو کر کھالے۔ اور جب مہمان کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر جانے کے لیے تیار ہو تو میزبان کے لیے سنت طریقہ یہ ہے کہ مکان کے دروازے تک اس کے ساتھ چلے۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مہمان کی پاسداری یہ ہے کہ گھر کے دروازے تک اس کے ہمراہ جائے۔ اللہ رب العزت ہمیں اسلامی طریقے سے مہمان نوازی کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔



رحم وشفقت

﴿عَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم لَايَرْحَمُ اللّٰهُ مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ﴾ (متفق علیه)

''حضرت جریر بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ رب العزت اس شخص پر رحم نہیں کرتے جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا۔''

رحم اتنی اعلیٰ صفت ہے کہ خالق کائنات کی دو صفات اسی لفظ سے بنی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایک رحمان دوسرے رحیم۔ ہم جب بھی کوئی کام شروع کریں تو ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی کہ پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ لیا کرو جس کا ترجمہ یہ ہے کہ شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان' نہایت رحم کرنے والا ہے معلوم ہوا کہ رحم کرنا خدائی صفت ہے۔ خدا تو انتہائی رحم وکرم کرنے والا ہے لیکن اس نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہی عہدہ عطا فرمایا۔

﴿وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ﴾

''اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔''

تمام جہانوں اور تمام مخلوق کے لیے آپ کیسے رحمت اور مہربانی والے بنے؟ جب ہم آپ کی حیات طیبہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی رحمت سے نباتات اور جمادات یعنی پودوں اور بے جان پتھروں نے بھی فیض حاصل کیا۔ چنانچہ جب بارش نہ ہوتی' زمین بیابان ہو جاتی آپ دعا فرماتے بارانِ رحمت کا نزول ہوتا' اس سے مردہ زمین زندہ ہو جاتی۔

حتیٰ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جانوروں پر بھی انتہائی رحم فرماتے۔ اسی وجہ سے آپ نے جانوروں کو باہم لڑا کر تماشا دیکھنے سے منع فرمایا۔ زمانہ جاہلیت میں شکاری جانوروں کو باندھ کر انہیں نشانہ بناتے اور تیراندازی کی مشق کرتے آپ نے اس سنگدلی سے منع فرمایا۔ ایک

دفعہ ایک صحابی حاضر ہوئے ان کے ہاتھ میں چادر کے اندر لپٹے ہوئے کسی پرندے کے بچے تھے آپ نے فرمایا جاؤ ان بچوں کو ان کے گھونسلوں میں رکھ آؤ۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کافروں کے لیے بھی خیر سگالی کے جذبات رکھتے تھے۔ آپ ان کی حالت کو دیکھ کر کڑھتے تھے کہ یہ لوگ کفر و شرک سے باز نہیں آتے۔ کاش یہ کسی طرح صراط مستقیم پر چل پڑیں حتیٰ کہ کافروں کی طرف سے بدسلوکی اور اذیت ناک تکالیف کے پہنچنے کے باوجود بھی آپ نے اُن کے حق میں بددعا نہ فرمائی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو رحم کی حقیقت اور فضیلت معلوم تھی۔ جب ہی آپ کی پوری حیات طیبہ رحم و کرم کی بلند پایہ مثالوں سے لبریز ہے اور رحم کی وہ فضیلت آپ نے اُمت تک پہنچائی اور ارشاد فرمایا:

﴿لَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ﴾

''یعنی جو شخص لوگوں پر رحم نہیں کرتا اللہ اُس پر رحم نہیں کرتا۔''

لوگوں پر رحم کا مفہوم اس حدیث قدسی سے بہت اچھی طرح سمجھ آجاتا ہے جسے صحیح مسلم میں کتاب البر والصلۃ میں روایت کیا گیا ہے۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ عزوجل قیامت کے دن ضرور فرمائیں گے اے بنی آدم میں بیمار ہوا تو نے میری عیادت نہ کی۔ بندہ عرض کرے گا میں تیری عیادت کس طرح کرتا تو تو خود سارے جہان کا پروردگار ہے۔ خدا فرمائے گا کیا تجھے نہیں معلوم میرا فلاں بندہ بیمار ہوا اور تو نے اس کی عیادت نہ کی اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے قریب پاتا۔ پھر ارشاد باری تعالیٰ ہوگا اے ابن آدم میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے نہیں کھلایا۔ بندہ عرض کرے گا اے رب العالمین تمام جہانوں کو پالنے والے میں تجھے کس طرح کھلاتا خدا فرمائے گا۔ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے اُسے نہیں کھلایا اگر تو اُسے کھلاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ پھر ارشاد باری ہوگا اے ابن آدم میں نے تجھ سے پانی مانگا تو نے نہیں پلایا۔ بندہ عرض کرے گا اے پروردگار میں تجھے کس طرح پلاتا تو تو رب

العالمین ہے خدا فرمائے گا میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا مگر تو نے نہیں پلایا اگر پلاتا تو میرے پاس موجود ہوتا۔‘‘

بچوں پر شفقت بھی رحم کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ ایک دیہاتی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا آپ بچوں کو پیار فرما رہے تھے اس دیہاتی نے عرض کیا کہ آپ بچوں کو پیار بھی کرتے ہیں ہم تو نہیں کرتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿اَوَ اَمْلِكُ ذٰلِكَ اِنْ نَزَعَ اللّٰهُ مِنْ قَلْبِكَ الرَّحْمَةَ﴾

’’یعنی کیا میں اس پر قادر ہوں کہ تیرے دل سے خدا نے جو رحم نکال لیا ہے وہ پھر رکھ دوں۔‘‘

حضرت نعمان بن بشیر سے ایک روایت بخاری اور مسلم میں موجود ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ رحم کا تعلق ایسا ہے کہ پوری اُمت مسلمہ یک جان و یک قالب نظر آتی ہے۔

فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ تو مومنوں کو آپس میں رحم کرنے، محبت رکھنے اور مہربانی کرنے میں ایسا پائے گا جیسا کہ ایک بدن ہو جب بدن کا کوئی عضو دُکھتا ہے تو سارے بدن کے اعضاء اس دُکھ میں شریک ہوتے ہیں اور سارا جسم بیداری اور بخار سے سارے جسم کا شریک ہوتا ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

﴿مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا فَلَيْسَ مِنَّا﴾

’’یعنی جو شخص چھوٹوں پر رحم اور بڑوں کی تعظیم نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں۔‘‘

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رحم کرنے کی جو فضیلتیں بیان فرمائی ہیں۔ ان میں سے ایک اہم فضیلت کسی یتیم بچے پر رحم کرنے کے بارے میں بیان فرمائی۔ آپ ارشاد فرماتے ہیں جو شخص خدا کی خوشی حاصل کرنے کی خاطر کسی یتیم بچے کے سر پر ہاتھ پھیرے تو یتیم بچے کے سر کے ہر بال کے عوض جس پر اس کا ہاتھ پھرے نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور سب سے بڑی

فضیلت اور قیمتی بات تو یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿اِرْحَمُوا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْکُمْ مَنْ فِی السَّمَاءِ﴾

''تم ان لوگوں پر رحم کرو جو زمین میں ہیں تم پر وہ رحم کرے گا جو آسمان میں ہے۔''

اسی حدیث کا مفہوم مولانا حالی نے بڑے خوبصورت انداز میں بیان فرمایا ؎

خدا رحم کرتا ہے نہیں اس بشر پر
نہ ہو درد کی چوٹ جس کے جگر پر
کرو مہربانی تم اہل زمین پر
خدا مہربان ہو گا عرش بریں پر



سلام کرنے کے آداب اور فضیلت

عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ رَضِی اللّٰه عنهَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حتّٰى تُؤْمِنُوْا وَلَا تُؤْمِنُوْا حتّٰى تَحَابُّوْا اَوَلَا اَدُلُّكُمْ عَلٰى شَيْئٍ اِذَا فَعَلْتُمُوْهُ تَحَابَبْتُمْ اَفْشُوا السَّلَامَ بَيْنَكُمْ.

(رواہ مسلم)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ جب تک تم ایمان نہ لاؤ جنت میں داخل نہیں ہو سکتے اور تم ایمان نہیں لاؤ گے جب تک کہ آپس میں محبت نہ کرو' کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتلاؤں کہ جب تم وہ کرو تو آپس میں محبت کرنے لگو' فرمایا کہ تم اپنے درمیان سلام کو پھیلاؤ۔''

(اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے)

شریعت اسلامی میں سلام سے مراد وہ کلمات ہیں جو دو مسلمان ملاقات کے وقت کہتے ہیں۔ ایک شخص السلام علیکم اور دوسرا وعلیکم السلام کہتا ہے۔ یعنی پہلا شخص کہتا ہے آپ پر سلامتی ہو اور دوسرا جواب میں کہتا ہے اور آپ پر بھی سلامتی ہو۔ اس دعائیہ کلمہ کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا۔ جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو آدم علیہ السلام کو حکم دیا کہ فرشتوں کو سلام کریں۔ پھر فرشتوں نے سلام کا جواب بھی دیا۔ اس کے بعد حضرت آدم علیہ السلام اللہ رب العزت کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہی تمہارا اور تمہاری اولاد کا سلام ہے۔ چنانچہ بعد میں تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا سلام یہی رہا۔

زمانہ اسلام سے پہلے عرب کے لوگ سلام کرنے کے لیے مختلف الفاظ استعمال کرتے تھے۔ کچھ لوگ حیاک اللہ کہتے، کچھ انعم صباحاً کہتے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے یہ الفاظ ختم کروا دیئے اور السلام علیکم کے وہ الفاظ جاری فرمائے جن کی تعلیم اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو دی تھی۔

اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ السلام علیکم کے الفاظ ملاقات کے وقت استعمال کرنا شعائر اسلام یعنی اسلام کی نشانیوں میں سے ہے۔ لہٰذا اگر کوئی ملاقات کے وقت صبح بخیر، شب بخیر یا گڈ مورننگ یا آداب وغیرہ کے الفاظ اختیار کرے تو اس سے سلام ادا نہیں ہوتا اور نہ اُسے سلام کہتے ہیں۔ چونکہ السلامُ علیکم کہنا اسلام کی نشانی ہے اس لیے کافر کو ملتے وقت السلامُ علیکم نہیں کہیں گے بلکہ اَلسَّلَامُ عَلٰی من اتَّبَعَ الْهُدٰی کہیں گے جس کا مطلب ہے کہ اُس شخص پر سلامتی ہو جو ہدایت کی پیروی کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کفار سے خط و کتابت کے وقت اسی انداز میں سلام لکھواتے تھے۔

سلام کرنے کے بارے میں یہ بات ضرور ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہر مسلمان سے ملاقات کے وقت سلام کرنا سنت ہے لیکن کوئی سلام کرے تو اس کا جواب دینا واجب ہے۔ عام طور پر معاشرہ میں یہ عادت نظر آتی ہے کہ جب ہم کسی کو سلام کریں السلام علیکم، تو جواب میں دوسرا شخص بھی یہی کہتا ہے السلام علیکم، اس طرح کرنے سے دوسرے شخص کے ذمہ سے واجب ادا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس نے بھی پہلے شخص کے انداز میں سلام کر دیا حالانکہ اسے سلام کا جواب اس طرح دینا چاہیے تھا وعلیکم السلام۔

ارشاد باری ہے:

﴿وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا اَوْ رُدُّوْهَا﴾

یعنی جب تمھیں سلام کیا جائے تو تم اس کا اس سے اچھا جواب دو یا کم از کم اس کا جواب ہی دے دو اچھا جواب دینے کا مطلب یہ ہے کہ اگر پہلا شخص صرف السلام علیکم کہے تو آپ جواب میں وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ کہہ دیجیے۔

سلام کے آداب بیان فرماتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سلام میں پہل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ سوار شخص پیدل چلنے والے کو سلام کرے، کھڑا ہوا بیٹھے

ہوئے کو اور گزرنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے چھوٹا بڑے کو سلام کرے اور جب کوئی شخص راستہ میں بیٹھا ہو تو اُسے چاہیے کہ ہر سلام کرنے والے کا جواب دے، جب کوئی شخص گھر میں داخل ہو تو سلام کرے اور جب باہر آئے تو سلام کر کے آئے، ہر واقف اور ناواقف کو سلام کریں۔ لیکن اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو یا تلاوت کر رہا ہو یا کھانے میں مشغول ہو یا قضائے حاجت کر رہا ہو یا نہا رہا ہو تو اُسے سلام نہ کرنا چاہیے۔ اگر آنے والا سلام کرے تو ایسے شخص کو جواب نہ دینا چاہیے۔

ایک اور بات عام طور پر دیکھنے میں آئی ہے کہ جب کوئی شخص کسی کمرہ میں داخل ہونا چاہتا ہے تو پہلے پوچھا جاتا ہے کہ کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟ پھر اندر آ کر سلام کرتے ہیں حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ تعلیم دی کہ جب کوئی شخص کسی کے ہاں جائے تو پہلے سلام کرے پھر پوچھے کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟ اگر ہم اس ہدایت پر تھوڑی سی توجہ کے ساتھ عمل کرنا شروع کر دیں تو ہمیں سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنے کا ثواب بھی مل جائے گا۔ اور ہمارا اسلامی طریقہ بھی رائج ہو جائے گا۔

اللہ رب العزت ہمیں ان تمام آداب کو مدِ نظر رکھ کر سلام کرنے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہمارے اندر آپس میں محبت پیدا ہو جائے اور ہم سچے مسلمان بن جائیں۔



بچوں کے لیے تعلیم قرآن اور والدین کی ذمہ داری

﴿من قرأ القرآن وعمل بما فيه البس والداه تاجا يوم القيمة ضوء ه احسن من ضوء الشمس فی بیوت الدنیا لو كانت فيكم فماظنكم بالذی عمل بهذا.﴾ (رواہ ابو داؤد)

''جو شخص قرآن حکیم پڑھے اور اس پر عمل کرے تو قیامت کے دن اس پڑھنے والے کے والدین کو ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی اس آفتاب کی روشنی سے بھی زیادہ اچھی ہوگی جو دنیاوی گھروں میں ہے۔ جب والدین کے لیے اتنا بڑا اجر وثواب ہے تو پھر خود پڑھنے والے کو کتنا بڑا انعام ملے گا۔''

کلام الٰہی (قرآن مجید) سب کلاموں سے افضل ہے لہٰذا اس کا پڑھنا اور اس کی تلاوت کرنا بھی سب سے زیادہ افضل ہے یہاں تک کہ اس کے ایک ایک حرف کی تلاوت پر دس دس نیکیوں کا اجر عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا گیا۔ ترمذی میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ارشاد نبوی منقول ہے فرمایا: ''جو شخص قرآن حکیم کا ایک حرف پڑھے اس کے لیے اس حرف کے بدلہ میں ایک نیکی ہے اور ایک نیکی کا اجر دس نیکیوں کے برابر ملتا ہے۔'' پھر آپ نے فرمایا: ''میں یہ نہیں کہتا کہ الٓمٓ ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف، لام دوسرا حرف اور میم تیسرا حرف ہے۔

کتاب اللہ کی تلاوت کرنے والوں کو جب ہم دیکھتے ہیں تو ہمارے سامنے عام تلاوت کرنے والوں کے علاوہ دو قسم کے پڑھنے والے بھی نظر آتے ہیں ایک تو بہت ہی عمدہ تلاوت کرنے والے اور کچھ اس قسم کے لوگ جو زبان میں لکنت یا کسی وجہ سے اٹک اٹک کر اور رُک رُک کر پڑھتے ہیں اور بڑی محنت و مشقت سے الفاظ کی تلاوت کر پاتے ہیں۔ ان

دونوں کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بخاری اور مسلم میں ارشاد نبوی منقول ہے فرمایا:

﴿الْمَاهِرُ بِالْقُرآنِ مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَرَةِ وَالَّذِيْنَ يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَيَتَتَعْتَعُ فِيْهِ وَهُوَ عَلَيْهِ شَاقٌّ لَهُ أَجْرَانِ﴾

''قرآن حکیم کا ماہران فرشتوں کے ساتھ ہے جو کہ معزز کاتب ہیں اور جو شخص قرآن حکیم کو اٹکتے ہوئے پڑھتا ہے (عذر کی وجہ سے) اور اس میں دقت اٹھاتا ہے تو اس کے لیے دوہرا اجر ہے۔''

قرآن مجید کا ماہر وہ ہوتا ہے جسے خوب یاد ہو اور پڑھتا بھی خوب ہو اس کا مرتبہ تو بڑے فرشتوں کے ساتھ ہو گا لیکن جو شخص قرآن مجید پڑھتے ہوئے اٹکتا ہو تو اسے صرف اس وجہ سے قرآن حکیم کی تلاوت نہیں چھوڑنی چاہیے بلکہ سخت کوشش کر کے تلاوت جاری رکھنی چاہیے کیونکہ اس کے لیے تو دوگنا اجر ہے۔

تلاوت قرآن حکیم کا اجر وثواب خود انسان کو تو ملتا ہی ہے لیکن تلاوت کرنے والے کے ماں باپ کو بھی ہوتا ہے جیسا کہ درسِ ہذا کے شروع میں بیان ہوا۔ عموماً کتاب اللہ کی تلاوت کرنا ہر شخص کو خود بخود نہیں آتا بلکہ اس میں ماں باپ کا اہم کردار ہوتا ہے جو بچہ کو مکتب' مدرسہ یا مسجد میں بھجواتے ہیں جہاں وہ کتاب اللہ کی تلاوت سیکھتا ہے یا نجی طور پر تلاوت سیکھنے کے لیے استاذ اور معلم کا انتظام کرتے ہیں۔ والدین کی اس کوشش اور توجہ کا عظیم صلہ جمع الفوائد کی اس روایت میں مذکور ہے جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''جو شخص اپنے بچہ کو ناظرہ قرآن مجید سکھا دے اس کے اگلے اور پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور جو شخص اپنے بچے کو قرآن حکیم حفظ کرائے اُسے قیامت میں چودھویں رات کے چاند کے مشابہہ اٹھایا جائے گا اور اس کے بیٹے سے کہا جائے گا کہ پڑھنا شروع کر جب بیٹا ایک آیت پڑھے گا تو باپ کا ایک درجہ بلند کر دیا جائے گا حتیٰ کہ اسی طرح قرآن حکیم مکمل ہو جائے گا۔

یہ فضیلت ان والدین کے لیے تھی جو بچہ کو تلاوت قرآن شریف کی تعلیم دیتے ہیں لیکن اگر کسی کو تلاوتِ قرآن مجید نہ آتی ہو تو اس میں بھی عموماً والدین کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ ایسے والدین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ضرور مدنظر رکھنا چاہیے۔

﴿اَلَا کُلُّکُمْ رَاعٍ وَ کُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رِعِیَّتِہٖ﴾

''آگاہ رہو ہر شخص سے اس کے ماتحتوں اور اس کی نگرانی میں دیئے ہوئے لوگوں کے بارے میں پوچھا جائے گا اور تم میں سے ہر ایک نگران ہے۔''

بچوں کی تربیت والدین کا فریضہ ہے اگر آج ان کی دینی تربیت کو نظر انداز کر دیا گیا تو خدا کے ہاں جواب دہ ہونا پڑے گا۔

قرآن حکیم کی اتنی مقدار یاد کرنا فرض ہے جس سے نماز میں قرأت کا رکن ادا ہو سکے لہٰذا بچوں کو کم از کم چھوٹی چھوٹی سورتیں تو ضرور یاد کرا دینی چاہئیں۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِی لَیْس فِیْ جَوْفِہٖ شَیْئٌ مِنَ الْقُرآنِ کَالْبَیْتِ الْخَرِبِ﴾

''یعنی جس شخص کے دل میں قرآن حکیم کا کوئی حصہ بھی محفوظ نہ ہو وہ ویران گھر کی طرح ہے۔''

کتاب اللہ کی تلاوت کا اثر خود انسان کی ذات پر بھی کس قدر ہوتا ہے اس کا اندازہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے ہوتا ہے جس میں یہ ارشاد نبوی منقول ہے:

﴿ان ھذہٖ القلوب تصد أُکمَا یصد ألحدیدُ اذا اصابہ الماءُ﴾

''بے شک دلوں کو بھی زنگ لگ جاتا ہے جیسے لوہے کو پانی سے زنگ لگ جاتا ہے۔''

عرض کیا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا کیا علاج ہے؟ فرمایا:

﴿کَثْرَۃُ ذِکْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَۃِ الْقُرآن﴾

''یعنی دلوں کا زنگ موت کو زیادہ یاد کرنے اور قرآن حکیم کی تلاوت کرنے سے صاف ہوجاتا ہے۔''

اللہ رب العزت ہمیں تلاوت کرنے اور اس کی برکات سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔



جھوٹ کی بدبو سے فرشتے بھی نفرت کرتے ہیں

﴿عن ابن عمر رضی اللّٰہ عنہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اِذَا کَذَبَ الْعَبْدُ تَبَاعَدَ عَنْہُ الْمَلَکُ مِیْلًا مِنْ نَتْنِ مَاجَاءَ بِہٖ﴾

(رواہ الترمذی)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی خوبیوں والی ہے اس لیے آپ کی زندگی کو اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے اور قرآنی اخلاق کا مجسمہ قرار دیا' ان تمام صفات میں سے بعض ایسی صفات بھی ہیں جنہیں اہل ایمان تو کیا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جانی دشمن بھی تسلیم کرتے تھے ان میں سے ایک سچائی ہے۔ جب آپ نے قریش کے سامنے دعوتِ اسلام کا آغاز فرمایا تو پوری تاریخ میں کہیں اس بات کا ثبوت نہیں ملے گا کہ آپ کے مخالف، آپ کے دشمن یا کسی اور کافر نے آپ کو جھوٹا کہا ہو حتیٰ کہ ابوجہل بھی آپ کی توحید کی تعلیم کے جواب میں یہ کہتا تھا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ کو جھوٹا تو نہیں کہوں گا لیکن آپ کو ہمارے دیوتاؤں کی بددعا لگ گئی ہے حتیٰ کہ آپ کے مخالفین آپ کو صادق اور امین کے لقب سے پکارتے تھے۔ اس عملی انداز سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ سکھایا کہ اگر ہم دنیا میں اسلام پھیلانا چاہتے ہیں اور یہ ہماری آرزو ہو کہ کفار بھی اسلامی تعلیمات کو سچ اور صحیح مان لیں تو اس کے لیے مجسمہ سچائی بن جانا ہوگا۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مومن کی فطرت میں اور اُس کی طبیعت میں ہر خصلت کی گنجائش ہے سوائے جھوٹ اور خیانت کے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿اِذَا کَذَبَ الْعَبْدُ تَبَاعَدَ عَنْہُ الْمَلَکُ مِیْلًا مِنْ نَتْنِ مَاجَاءَ بِہٖ﴾

''کہ جب بندہ جھوٹ بولتا ہے تو فرشتہ اس کے جھوٹ کی بدبو کی وجہ سے ایک میل دور چلا جاتا ہے۔''

معلوم ہوا کہ جس طرح اس مادی عالم میں مادی چیزوں کی خوشبو اور بدبو ہوتی ہے اسی طرح اچھے اور بُرے اعمال اور کلمات میں بھی خوشبو اور بدبو ہوتی ہے جس کو اللہ کے فرشتے اسی طرح محسوس کرتے ہیں جس طرح ہم یہاں کی مادی خوشبو اور بدبو محسوس کرتے ہیں ایسی مخصوص خوشبو اور بدبو کبھی کبھی اللہ کے وہ بندے بھی محسوس کر لیتے ہیں جن کی روحانیت ان کی مادیت پر غالب آ جاتی ہے۔

جھوٹ کی بعض قسمیں تو انتہائی سخت گناہ لازم کر دیتی ہیں کتب حدیث میں ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز سے فارغ ہوئے تو ایک دم کھڑے ہو گئے اور فرمایا جھوٹی گواہی کا اتنا ہی گناہ ہے جتنا اللہ کے ساتھ شرک کرنے کا اور پھر آپ ﷺ نے سورہ حج کی یہ آیت تین مرتبہ تلاوت فرمائی:

﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ﴾

''یعنی بت پرستی کی گندگی سے بچو اور جھوٹی بات کہنے سے بچتے رہو۔''

اس آیت میں خدائے عزوجل کے طرزِ کلام سے معلوم ہو رہا ہے کہ بت پرستی اور جھوٹ کہنا دونوں برابر ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دونوں کے لیے ''اجتنبوا'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ ''یعنی تم بچو'' اسی طرح جھوٹی قسم کھانا اور دوسرے کو جھوٹی قسم کھا کر مارے وہ اللہ کے سامنے کوڑھی ہو کر پیش ہوگا۔

یہ تو جھوٹ کی وہ شکلیں تھیں جنہیں ہمارے معاشرہ کے سمجھ دار افراد بھی بُرا سمجھتے ہیں لیکن یہاں جھوٹ کی ایک ایسی شکل بھی ہے، جسے اہل معاشرہ جھوٹ ہی نہیں سمجھتے بلکہ اسے مختلف نام دے کر اچھا سمجھتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بھی بچنے کی تاکید فرمائی چنانچہ عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر میں تشریف فرما تھے کہ میری والدہ نے مجھے پکارا **هاتعال اعطيتك**. جلدی سے آؤ میں تجھے کچھ دوں گی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً میری والدہ سے پوچھا تم اس بچے کو کیا چیز دینا

چاہتی ہو والدہ نے کہا میں اسے ایک کھجور دینا چاہتی ہوں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿اَمَا انَّكِ لَوْلَمْ تُعْطِهِ شيئًا كُتِبَت عَلَيْكِ كِذْبَةٌ﴾

''یاد رکھنا اگر اس کہنے کے بعد تم بچے کو کوئی چیز نہ دیتیں تو تمہارے نامۂ اعمال میں ایک جھوٹ لکھ دیا جاتا۔''

اس ارشاد سے آپ نے امت کو ایک اہم سبق سکھایا کہ بچوں کو بہلانے کے لیے بھی جھوٹ نہیں بولنا چاہیے اس کی بڑی اہم حکمت یہ ہے کہ ماں باپ اگر بچوں سے جھوٹ بولیں اگرچہ ان کا مقصد بہلانا ہی ہو پھر بھی بچے اس سے جھوٹ بولنا سیکھیں گے اور وہ بھی یہی سمجھیں گے کہ کبھی کبھار جھوٹ بولنے میں کوئی حرج نہیں اسی طرح سنی سنائی باتیں لوگوں تک بغیر تحقیق کے پھیلانا بھی جھوٹ میں داخل ہے معاشرہ میں افواہیں بھی اس طرح پھیلتی ہیں اور لوگ ذہنی کوفت اور پریشانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اس کا الگ گناہ ہوتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت مسلم شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ ما سَمع﴾

''یعنی آدمی کے لیے یہی جھوٹ کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے اُسے بیان کرتا پھرے۔''

بیہقی میں عبدالرحمٰن بن ابی قراد سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن وضو فرما رہے تھے صحابہ کرام آپ کے وضو کا پانی لے لے کر اپنے چہروں اور جسم پر مل لیتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا اس بات پر تمہیں کیا چیز آمادہ کرتی ہے اور تمہارے اندر کون سا ایسا جذبہ ہے جس کی وجہ سے یہ کر رہے ہو؟ صحابہ نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت۔ آپ نے یہ جواب سن کر فرمایا:

﴿مَنْ سَرَّہٗ ان يُحِبَّ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ اَوْيُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ فَلْيَصْدُقْ حَدِيثَهٗ اِذَا حَدَّثَ وَلْيُؤَدِّ اَمَانَتَهٗ اَذاؤتُمِنَ وليُحسِنْ

جَوَرَمن جَاوَرَہ‘﴾

یعنی جس شخص کی یہ خوشی ہو اور وہ یہ چاہے کہ اُسے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے حقیقی محبت ہو اور اللہ اور اس کے رسول بھی اُس سے محبت کریں تو اسے چاہیے کہ وہ بات کرے تو ہمیشہ سچ بولے اور جب کوئی امانت اُس کے سپرد کی جائے تو اسے ادا کر دے اور جس شخص کے ہمسائے میں رہے اس کے ساتھ بہتر سلوک کرے۔ سچ بولنے کی عادت انسان اپنے اندر پیدا کرے تو یہ خوبی آدمی کو زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں بھی نیک کردار اور صالح بنا کر دنیا کی زندگی کو پاکیزہ بنانے کے ساتھ ساتھ جنت کا مستحق بنا دیتی ہے اور سب سے بڑا انعام تو وہ ہے جسے عبداللہ بن مسعود روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿مَایَزَالُ الرَّجُلُ یَصْدُقُ وَیَتَحَرَّی الصِّدْقَ حَتّٰی یُکْتَبُ عِنْدَاللّٰہِ صِدّیْقًا﴾

''یعنی جو آدمی ہمیشہ سچ بولتا رہے اور صرف سچائی ہی کو اختیار کرے تو اللہ کے نزدیک وہ سچا لکھا جاتا ہے اور اسے صدیق کا مرتبہ عطا کر دیا جاتا ہے۔''

اللہ رب العزت ہمیں جھوٹ بولنے سے بچائے اور پوری زندگی سچ بولنے کی توفیق عطا فرمائے۔



ایک مسلمان دوسرے کی جان ومال اورعزت کی حفاظت کا ضامن ہے

عن ابی هريرة قال قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ دَمُهُ وَمَالُهُ وَعِرْضُهُ. (رواه مسلم)

''ارشادنبوی ہے فرمایا ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حرام ہے اس کا خون، اس کا مال اوراس کی آبرو۔''

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانہ اور علاقہ میں تشریف لائے ان میں ہر انسان کی یہی تین چیزیں غیر محفوظ تھیں نہ کسی کی جان محفوظ تھی' نہ کسی کا مال محفوظ تھا اور نہ کسی کی عزت کی قدر تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسروں کی ان تینوں چیزوں کے لیے حفاظت کرنے کا حکم فرمایا۔ یہاں تک کہ آپ نے خود اپنی ذات کے ذریعہ ان اصولوں کی اعلیٰ ترین مثالیں قائم فرمادیں۔

جنگ بدر میں فوج کی صف بندی ہورہی تھی ایک صحابی صف کے برابر نہ تھے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پتلی سی چھڑی کے ذریعہ انہیں ٹوک دیا' صحابی نے کہا یا رسول اللہ مجھے تو اس سے تکلیف ہوئی ہے میں تو بدلہ لوں گا فرمایا میں موجود ہوں وہ صحابی بولے میرے بدن پر کرتہ نہیں تھا آپؐ نے کرتا بھی اٹھالیا ان صحابی نے بڑھ کر جسد اطہر کو چوم لیا۔

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک بار غلام سے جھگڑتے ہوئے غصہ میں کہہ دیا۔ ''او حبشن کے بچے'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بس رہنے دو کسی سفید کھال والے کو کسی کالی چمڑی والے کے بچے پر کوئی فضیلت نہیں فضیلت تو عمل سے ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کی تربیت بھی اس انداز سے فرمائی کہ جب

یہی صحابہ مسلمانوں کے سربراہ بنے تو جب بھی جان ومال اورعزت کا خوب خیال رکھا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سفر شام کا واقعہ تاریخ میں بڑا نمایاں ہے کہ اونٹ پر غلام اور خلیفہ باری باری سوار ہوتے کیونکہ اونٹ کی پچھلی نشست پر زادراہ اور اونٹ کے لیے کھجور کی گٹھلیاں بطور چارہ لدی ہوئی تھیں جب منزل کا آخری حصہ آیا تو باری غلام کی آ گئی تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا استقبال اس علاقہ کے سپہ سالار اور تمام فوج نے اس انداز میں کیا کہ امیر المؤمنین اونٹ کی مہار پکڑے ہوئے اور ان کا غلام اونٹ پر سوار۔ الغرض اسلام نے مسلمانوں کو مکمل طور پر اس بات کی تعلیم دی اور پابند کردیا کہ ہر انداز سے دوسرے مسلمان کی جان ومال اور اس کی عزت کا تحفظ کیا جائے چنانچہ اسلام نے ایک دوسرے کو برے القاب سے پکارنے سے منع کیا اور مسلمان کی شان یہ بیان کی کہ ''مسلمان وہ شخص ہے جس کی زبان سے اور اس کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔'' اسی طرح اسلام نے یہ لازم کردیا کہ مسلمان اپنے قول اور عمل سے کسی کو تکلیف نہ پہنچنے دے اور اگر بالفرض دوسرا شخص عزت مال اور جان کی حفاظت نہ کرے تو پھر اسلام نے اس کے لیے بھی اخلاقی ضابطے مقرر فرمادیئے جن میں سے کچھ قوانین حاکم وقت کے حوالہ کردیئے کچھ خود اس انسان کے ذمہ لگادیئے اور اعلیٰ ترین اخلاقی خوبیوں صبر، تحمل اور عفوودرگذر کی تعلیم دی، اللہ تعالیٰ ہمیں احکام اسلام پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔



نوجوانوں کے لئے نقش سیرت النبی ﷺ

عن انسؓ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّم مَااَکْرَمَ شَابٌّ شَیۡخًامِّنۡ اَجَلِ سِنِّہٖ اِلَّا قَیَّضَ اللّٰہُ لَہٗ عِنۡدَسِنِّہٖ مَنۡ یُّکۡرِمُہٗ.

(رواہ الترمذی)

''حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس جوان نے کسی بوڑھے شخص کی اس کے بڑھاپے کی وجہ سے تعظیم وتکریم کی تو اللہ تعالیٰ اس کے بڑھاپے کے وقت ایسے شخص کو مقرر کرے گا جو اس کی تعظیم کرے گا۔''

زمانہ جوانی میں انسانی قوتیں بھی اپنے عروج پر ہوتی ہیں' سوچنے کی طاقت، عمل کی قوت' غصہ کی طاقت اور ہر قسم کی قوت پر اسے ناز بھی ہوتا ہے اس لیے جوانی میں انسان سرکشی کی طرف بھی زیادہ مائل ہوتا ہے لیکن اگر انسان زمانہ جوانی میں سنبھل جائے تو یہ واقعی ایک مثالی جوان ہوتا ہے غالبًا اسی لیے شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے فرمایا۔

درجوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری

جوانی میں پرہیز گاری کی زندگی گزارنا پیغمبروں کا طریقہ ہے اور واقعی بہت بڑا کمال ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور بہت سے کمالات میں سے ایک کمال اللہ تعالیٰ نے یہ بھی عطا فرمایا تھا کہ جوانی ہی میں آپ نے اپنی صلاحیتوں اور خوبیوں کا لوگوں سے اعتراف کروالیا' نبوت ملنے سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم چالیس سال تک کی جوانی کی زندگی اپنی قوم میں گزار چکے تھے اس زندگی کی پوری تصویر اور اس کا ہر رخ آج تک محفوظ ہے یہ چالیس سالہ زندگی سچائی، دیانت اور خدمت خلق جیسے اعلیٰ اوصاف سے بھرپور ہے جس کی بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دشمنوں نے بھی صادق اور امین کے لقب سے پکارا جب آپ کو نبوت ملی تو آپ نے اپنی سچائی کے ثبوت میں اپنی اسی چالیس سالہ زندگی کو پیش فرمایا آپ کی جان کے دشمن آپ کے دین اور دعوت کے دشمن کو بھی اس بات کی ہمت نہ ہوسکی کہ آپ کی سابقہ زندگی

پر انگلی اٹھا سکے۔ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت بڑا معجزہ آپ کی جوانی کی حالت میں پاکیزہ زندگی ہے ایسی صاف ستھری اور اخلاق سے آراستہ زندگی جس کے دوست و دشمن سب ہی معترف ہیں۔ آپ کے چچا ابوطالب کے الفاظ ہیں کہ میں نے اپنے بھتیجے کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں سنا اور اسے کبھی گلیوں میں لڑکوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے نہیں دیکھا۔

آج ہمارے معاشرہ میں نوجوان کے سب سے زیادہ عیب اس کے رشتہ داروں کو معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے معاشرے کے بزرگ آج کے نوجوان پر کوئی ذمہ ڈالنے سے گریز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جبکہ نبی کریم ﷺ نے اپنی جوانی کے زمانے میں حجر اسود کی تنصیب جیسے ذمہ دارانہ کارنامے انجام دیئے۔

جب بارشوں کی وجہ سے سیلاب آیا کعبہ کا کچھ حصہ گر گیا مختلف قبیلوں نے مل کر دوبارہ تعمیر کیا حجر اسود لگانے کا سوال اٹھا تو فساد کا خطرہ ہوا طے ہوا کہ جو سب سے پہلے کل صبح بیت اللہ میں داخل ہو وہ رکھے گا سب نے پہلے پہنچنے کی کوشش کی لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے موجود تھے آپ نے بڑی عمدہ تدبیر کے ساتھ حجر اسود رکھوایا اور ایک بہت بڑا مسئلہ آپ نے نوجوانی میں حل فرمایا۔ جوانی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم محبت اور رحمت کی مثال تھے' کسی کی تکلیف کو دیکھ کر مدد کے لیے تیار ہو جاتے' ایک بڑھیا کو دیکھا' بوجھ اٹھائے جا رہی تھی، کمر بوجھ تلے جھکی جا رہی تھی' پتھر دل لوگ ہنس رہے تھے' آپ نے آگے بڑھ کر بڑھیا کا بوجھ اپنے کندھے پر رکھا اور لوگوں سے کہا ایک کمزور بڑھیا کا مذاق اڑانا جوانی کا شیوہ نہیں مردانگی یہ ہے کہ اس کا بوجھ بٹا دو۔ جوانی میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وقت کا کافی حصہ بوڑھوں بیماروں اور معذور لوگوں کی دیکھ بھال پر صرف فرماتے تھے۔ ان کے چھوٹے بڑے کام کرتے ایک روز ایک قریشی سردار نے کہا کتنی شرم کی بات ہے تم اپنے خاندان کو بٹہ لگاتے ہو' تم اونچے گھرانے کے چشم و چراغ ہو اور اس طرح غریبوں کے کام کاج کرتے ہو۔

رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک میرا پردادا ہاشم قریش کا سردار تھا مگر وہ بھی سب کی خدمت کیا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یتیموں سے بھی بڑی محبت تھی' ایک بچے کو کمزور بے لباس دیکھا' اس سے وجہ پوچھی وہ رو پڑا اور بھوک کی شکایت کی' آپ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے' آپ لڑکے کو گھر لے گئے کھانا کھلایا اور کپڑے پہنائے۔

جوانی میں میں معاشرتی ذمہ داریاں پیش آئیں تو تجارت کو ذریعہ معاش بنایا تجارت کی کامیابی کا علم مکہ کی مالداری خاتون بی بی خدیجہ کو ہوا تو اپنے کارندوں کے ذریعہ شام کے سفر تجارت پر بھیجا اپنے معتبر غلام میسرہ کو بھی ساتھ کر دیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی دیانت اور محنت سے کام کیا کہ حضرت خدیجہ کو توقع سے زیادہ منافع ہوا۔ میسرہ کے ذریعہ نیکی اور دیانت کا معیار سنا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شادی کا پیغام بھیجا۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۲۵ سال اور حضرت خدیجہ کی عمر ۴۰ سال تھی۔ حضرت خدیجہؓ کی صورت میں ایک نیک اور خدمت گزار بیوی ملی ان کے ہمراہ بڑی پرسکون اور خوشگوار، جوانی میں خانگی زندگی گزاری۔ ان سے تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئیں بیٹے چھوٹی عمر میں وفات پا گئے باقی ان کی چاروں بیٹیوں کی شادیاں ہوئیں۔ کامیاب جوانی کی زندگی میں ایک کامیاب انسان، ایک کامیاب باپ، خاوند اور پھر کامیاب تاجر کی زندگی گزری، یہاں تک کہ چالیس سال کی عمر میں نبوت عطا ہوئی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس جوانی کی زندگی میں آج کے جوان کو جو نقوش ملتے ہیں ان میں بنیادی اور بہت گہرا نقش تو یہ ہے کہ آج کا جوان اپنی جوانی میں سچائی اور دیانت اور شرافت کا پیکر بن جائے اور اس کی خوبیوں کے معترف سب سے پہلے اس کے گھر والے ہوں جن کے ہمراہ وہ دن رات گزارتا ہے پھر اس کے رشتہ دار اس کی خوبیوں کے معترف ہوں اور آج کے نوجوان پر جب معاشی ذمہ داریاں آ جائیں تو یہ کامیابی سے ان ذمہ داریوں کو نبھائے اور یہی خوبیاں اس قدر کمال کی ہوں کہ وہی اس کی شادی کا سبب بن جائیں، اور اس کے بعد خاوند اور پھر باپ بننے کے بعد اپنی پوری زندگی میں ہر مرحلہ کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے رہنمائی حاصل کرتا رہے۔

اُمت مسلمہ کے مسائل کا واحد حل

خطبہ حجۃ الوداع پر عمل

عن جابر بن عبداللّٰہ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم مکث بالمدینۃ...... فَنَاوَلُوْہُ دَلْواً فَشَرِبَ مِنْہُ. (رواہ مسلم)

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر میدان عرفات میں جبل رحمت پر ایک لاکھ سے زائد صحابہ کرام کے سامنے عظیم الشان خطبہ ارشاد فرمایا یہ خطبہ اس ذات اقدس نے دیا جنہیں جوامع الکلم کی خصوصیت عطاء کی گئی تھی اس خطبہ کا ایک ایک جملہ امت مسلمہ کے منشور کی حیثیت رکھتا ہے آج اگر امت مسلمہ مصائب اضطراب اور پریشانیوں میں گھری ہوئی نظر آتی ہے تو صرف اس وجہ سے کہ جس اصول کو چھوڑا وہاں سے ایک عظیم فساد کا دروازہ کھل گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''لوگو میری بات سنو! میں نہیں سمجھتا کہ آئندہ کبھی ہم اس طرح کسی مجلس میں اکٹھے ہوسکیں گے لوگو! اللہ کا ارشاد ہے'' اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد وعورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں خاندانوں اور قبیلوں میں بانٹ دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو! تم میں سے زیادہ عزت والا اللہ کے نزدیک وہی ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیزگار ہے'' پس نہ کسی عربی کو عجمی پر کوئی فوقیت حاصل ہے نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر نہ کالا گورے سے افضل ہے نہ گورا کالے سے' ہاں بزرگی اور فضیلت کا کوئی معیار ہے تو وہ تقوی ہے انسان سب کے سب آدم کی اولاد ہیں......اور آدم مٹی سے بنائے گئے ہیں اب آرام سے بیٹھو۔

فضیلت و برتری کے سارے دعوے، خون و مال کے سارے مطالبے اور سارے انتقام میرے پاؤں تلے روندے جا چکے ہیں، پس بیت اللہ کی تولیت اور حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمات اپنے حال پر باقی رہیں گی۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا۔ قریش کے لوگو! ایسا نہ ہو کہ

تم خدا کے حضور اس طرح آ ؤ کہ تمہاری گردنوں پر دنیا کا بوجھ لدا ہوا اور دوسرے لوگ سامان آخرت لے کر پہنچیں اور اگر ایسا ہوا تو میں خدا کے سامنے تمہارے کچھ کام نہ آ سکوں گا۔

قریش کے لوگو! خدا نے تمہاری جھوٹی نخوت کو ختم کر ڈالا۔ اور باپ دادا کے کارناموں پر تمہارے فخر و مباہات کی اب کوئی گنجائش نہیں۔ تمہارے خون و مال اور عزتیں ایک دوسرے پر قطعاً حرام کر دی گئیں ہمیشہ کے لیے۔ ان چیزوں کی اہمیت ایسی ہی ہے۔ جیسے تمہارے اس دن کی اور اس ماہِ مبارک (ذوالحجۃ) کی تم سب خدا کے پاس جاؤ گے اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی باز پُرس فرمائے گا۔ دیکھو میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ آپس میں کشت و خون کرنے لگو۔ اگر کسی کے پاس امانت رکھوائی جائے تو وہ اس بات کا پابند ہے کہ امانت رکھوانے والے کو امانت پہنچا دے۔

لوگو ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ اور سارے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اپنے غلاموں کا خیال رکھو، ہاں غلاموں کا خیال رکھو انہیں وہی کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو ایسا ہی پہناؤ جیسا تم پہنتے ہو۔ دور جاہلیت کا سب کچھ میں نے اپنے پیروں سے روند دیا زمانۂ جاہلیت کے خون سارے انتقام اب کالعدم ہیں۔ پہلا انتقام جسے میں کالعدم قرار دیتا ہوں۔ میرے اپنے خاندان کا ہے۔ ربیعہ بن الحارث کے دودھ پیتے بیٹے کا خون جسے بنو ہذیل نے مار ڈالا تھا۔ اب میں معاف کرتا ہوں دورِ جاہلیت کا سود اب کوئی حیثیت نہیں رکھتا پہلا سود جسے میں چھوڑتا ہوں عباس بن عبدالمطلب کے خاندان کا سود ہے اب یہ ختم ہو گیا ہے۔ لوگو! خدا نے ہر حق دار کو اس کا حق کو دے دیا اب کوئی کسی وارث کے حق کے لیے وصیت نہ کرے۔ بچہ اسی کی طرف منسوب ہو گا۔ جس کے بستر پر وہ پیدا ہوا، جس پر حرام کاری ثابت ہو اس کی سزا پتھر ہے، حساب و کتاب خدا کے ہاں ہو گا۔ قرض قابل ادائیگی ہے۔ عاریۃً کی ہوئی چیز واپس کرنی چاہیے۔ تحفہ کا بدلہ دینا چاہیے اور جو کوئی کسی کا ضامن ہے وہ تاوان ادا کرے۔ کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے کچھ لے مگر جو وہ اپنی خوشی سے دے، پس تم اپنے آپ پر ظلم نہ کرو۔ آگاہ رہو عورت کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے شوہر کا مال اس کی اجازت کے بغیر کسی کو دے دو۔ اے لوگو! تم پر تمہاری عورتوں کے کچھ حقوق ہیں

عورتوں پر تمہارا یہ حق ہے کہ وہ اپنے پاس کسی ایسے شخص کو نہ بلائیں جسے تم پسند نہیں کرتے۔ اور وہ کوئی خیانت نہ کریں۔ اور کوئی کام کھلی بے حیائی کا نہ کریں۔ اگر وہ ایسا کریں تو خدا کی جانب سے اس کی اجازت ہے کہ ان کو اپنے بستروں سے الگ کر دو اور انہیں معمولی جسمانی سزا دو۔ اگر وہ باز آ جائیں تو انہیں اچھی طرح کھلاؤ پہناؤ۔ اور عورتوں سے بہتر سلوک کرو۔ کیونکہ وہ تمہاری مددگار ہیں اور خود وہ اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتیں۔ لہٰذا تم ان کے بارے میں خدا سے ڈرو۔ کہ تم نے انہیں خدا کے نام پر حاصل کیا اور اسی کے نام پر وہ تمہارے لیے حلال ہوئیں۔

لوگو! میں تمہارے درمیان ایک ایسی چیز چھوڑے جا تا ہوں۔ کہ تم کبھی گمراہ نہ ہو سکو گے۔ اگر اس پر قائم رہے۔ اور وہ خدا کی کتاب ہے۔ اور دیکھو دینی معاملات میں غلو سے بچنا کہ تم سے پہلے والے لوگ دینی اُمور میں غلو ہی کی وجہ سے ہلاک کر دیئے گئے۔

شیطان کو اب اس بات کی کوئی توقع نہیں رہی کہ اب اس کی اس شہر میں عبادت کی جائے گی۔ لیکن اس کا امکان ہے کہ ایسے معاملات میں جنہیں تم کم اہمیت دیتے ہو۔ اس کی بات مان لی جائے گی۔ اور وہ اس پر راضی ہے اس لیے تم اس سے اپنے دین و ایمان کی حفاظت کرنا۔



بُردباری غیر جذباتیت

﴿عن ابن عباسٍ رضی الله عنه ان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال لا شج عبدالقیس انّ فیك لخصلتین یحبهما اللّٰه الحلم والا ناةُ﴾

(رواہ مسلم)

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ عبدالقیس کے سردار کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہارے اندر دو ایسی خوبیاں پائی جاتی ہیں جو اللہ کو بہت پسند ہیں۔ ایک بردباری اور دوسری وقار اور سنجیدگی۔''

جب قبیلہ عبدالقیس کا وفد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے لیے مدینہ منورہ پہنچا چونکہ کافی دور سے آئے تھے گرد و غبار میں اٹے پڑے تھے۔ جب یہ وفد کے لوگ سواریوں سے اترے فوراً جلدی سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے نہ نہائے دھوئے نہ اپنے سامان کو قرینے سے رکھا' نہ سواریوں کو اچھی طرح باندھا' لیکن اس وفد کے سربراہ جن کا نام منذر بن عائذ تھا انہوں نے کسی قسم کی جلد بازی کا مظاہرہ نہ کیا بلکہ اطمینان سے اترے سامان کو قرینے سے رکھا۔ سواریوں کو دانہ پانی دیا پھر نہا دھو کر صاف ستھرے ہو کر وقار کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد کے سربراہ منذر بن عائذ کو مخاطب کرتے ہوئے ان کی تعریف کی اور فرمایا کہ بے شک تمہارے اندر دو ایسی خوبیاں پائی جاتی ہیں جو اللہ کو بہت پسند ہیں۔ ان میں سے ایک صفت بردباری اور دوسری صفت وقار اور سنجیدگی ہے۔

حلم اور بردباری کا مفہوم اچھی طرح جب سمجھ آ سکتا ہے' جب ہم اپنے اندر پائی جانے والی ایک مخصوص قوت کی پہچان اور اس قوت کے صحیح استعمال کا طریقہ معلوم کر لیں اور وہ غصہ کی قوت ہے۔ جس طرح اسلام نے باقی تمام قوتوں کے لیے اعتدال کا حکم دیا۔ یعنی

ان قوتوں کے استعمال میں نہ بالکل کمی کی جائے۔ نہ ان قوتوں کا بے جا استعمال کیا جائے۔ اس میں سے ایک قوت غصہ کی ہے۔

اگر اس غصہ کی قوت کو بالکل استعمال نہ کیا جائے۔تو یہ کیفیت بزدلی کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے اور اس سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پناہ مانگتے ہوئے خدائے عزوجل سے دعا فرمائی۔

اللھم انی اعوذ بك من الجبن اے اللہ مجھے بزدلی سے بچا۔لیکن اگر غصہ کی قوت کا ہر جگہ استعمال کیا جائے تو پھر ایک انسان اچھے بھلے معاشرے میں بے چینی پیدا کر دیتا ہے۔اور اہل معاشرہ کی زندگیوں سے سکون رخصت ہو جاتا ہے۔دوسری طرف وہ شخص آخرت میں اپنے لیے سزاؤں کے انبار تیار کر لیتا ہے' پھر آخر اس قوت کو کس طرح استعمال کیا جائے جب ہم اس کے استعمال کے بارے میں قرآنی تعلیمات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں سورۂ آل عمران میں جہاں خدائے عزوجل اپنے محبوب بندوں کا تذکرہ فرماتے ہیں ارشاد باری ملتا ہے:

والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس.

اور غصہ کو ضبط کر جانے والے لوگ اور لوگوں کو معاف کرنے والے لوگ اللہ کے محبوب ہیں۔یعنی جس کسی شخص کو تکلیف پہنچائی جائے یا مشقت پیش آئے تو وہ اشتعال انگیزی اور انتقام کے بجائے فراخ دلی اور اعلیٰ ظرفی سے برداشت کرے۔اور درگزر کر دے پھر اپنی ذات سے یہ تاثر پیش کرے گویا مجھے کوئی مشقت تکلیف نہیں اس صفت کو حلم اور بردباری کہتے ہیں۔

حلم اور بردباری انسان کے اندر سب سے پہلے قوت برداشت پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ جب ہم اپنے اردگرد کے ماحول ہی دیکھتے ہیں تو ہمیں بہت سے جھگڑے فساد صرف اسی صفت کے نہ ہونے کی بنا پر نظر آتے ہیں کہ ہمارے اندر حلم اور بردباری نہ ہونے کی وجہ سے قوت برداشت نہیں ہوتی یہاں تک کہ مار پیٹ اور قتل و غارت تک نوبت پہنچ جاتی ہے حلم و بردباری سے جو دوسری دولت ہمیں حاصل ہوتی ہے وہ خود اعتمادی اور عزم کی دولت ہے۔

اوراس کا تذکرہ قرآن حکیم میں بھی ہے فرمایا:

﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَالِكَ لَمِنْ عَزْمِ الأُمُوْر﴾

''یعنی جو کوئی صبر کرے اور معاف کر دے تو یہ بڑی عزم و ہمت کے کاموں میں سے ہے۔''

معلوم ہوا کہ جو شخص حلم و بردباری کی صفت رکھتا ہو وہ ایک باہمت اور عزم و حوصلہ والا انسان ہوتا ہے۔ زندگی کی دن رات آنے والی مشکلات اور مصیبتیں جھیلنے کی اس کے اندر ایک مخصوص قوت پیدا ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں مصیبتیں اور پریشانیاں اس کے لیے زندگی کو مزید مشکل نہیں بناتیں۔ کیونکہ وہ ان تمام چیزوں کو برداشت کر کے اپنے چہرے پر اطمینان کی ایک لہر پیدا کر لیتا ہے۔

یہاں ایک بات ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ حلم و درگزر کی تعلیم کا تعلق معاشرتی امور سے ہے۔ لیکن اگر کوئی فرد یا معاشرہ دنیا میں فساد اور گمراہی پھیلا رہا ہے یا اللہ کی مقرر کردہ حدود کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے تو ایسا شخص قطعاً حلم و درگذر کا مستحق نہیں۔ اس کے ساتھ نرمی کرنا بزدلی ہوگی اور خدائی قوانین کی حق تلفی ہوگی لہٰذا ان مواقع میں حلم و بردباری کو استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

دوسری صفت جس کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خدائے عزوجل کی پسندیدگی ظاہر فرمائی وہ سنجیدگی اور وقار ہے۔ یعنی خوب سوچ و بچار کے بعد کام کرنا' جلد بازی سے کام نہ لینا اس لیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿الَانَاۃُ مِنَ اللّٰہِ و العَجَلَۃُ مِنَ الشَّیْطانَ﴾

یعنی وقار اور سنجیدگی اللہ کی طرف سے ہے اور جلد بازی شیطان کی طرف سے ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جب انسان ہر کام سوچ و بچار کے بعد تحمل سے کرتا ہے وہ اکثر مکمل کام کرتا ہے اور بہت کم نقصان اٹھاتا ہے۔ جب کہ جلد بازی کا مظاہرہ کرنے والے ایک عجیب قسم کے ذہنی خلجان کے ساتھ کام کرتے ہیں اور پھر اپنی جلد بازی کی بدولت اکثر

شرمندگی اور نقصان کا سامنا کرتے ہیں۔

خدائے عزوجل ہمارے اندر اپنی پسندیدہ صفات پیدا فرما دے تاکہ ہم معاشرہ کے افراد کے لیے باعث رحمت وسکون بن جائیں اور آخرت میں بھی کامیابی سے ہمکنار ہوں۔



اسراف اور فضول خرچی سے پرہیز

﴿عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلتَصَدَّقُوْا وَلْبَسُوْا مَالَمْ يُخَالِطُ اِسْرَافٌ وَلَا مَخِيْلَةٌ﴾

''حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے فرمایا جو چاہو کھاؤ، پیو، خیرات کرو، اور پہنو جب تک اس میں دو چیزیں نہ ہوں ایک اسراف دوسرے تکبر۔''

خالق کائنات نے ہمارے لیے دنیا کی تمام نعمتیں پیدا کیں۔ انسان اس کے ذریعہ اپنے جسم کی نشو ونما کرتا ہے' کھانے اور پینے کے ذریعہ انسان اپنے جسم کو طاقت وقوت پہنچاتا ہے' لباس کے ذریعہ انسان اپنے بدن کو ڈھانپتا ہے موسموں کے اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے بدن کو آراستہ اور خوشنما بھی بناتا ہے۔ لباس کا یہی قصہ قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا۔

﴿یبنی آدم قد انزلنا علیکم لباساً یواری سو آتکم وریشا﴾

''اے بنی آدم تحقیق ہم نے تم پر لباس اتارا تاکہ وہ تمہیں ڈھانپ دے اور موجب زینت ہو۔''

جب ہم ان احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لباس کے بارے میں منقول ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح کے کپڑے پہنتے تھے جس طرح اور جس وضع کے کپڑوں کا رواج اس زمانے میں تھا۔ یہ کپڑے عموماً سوتی قسم کے معمولی کپڑے ہوتے تھے کبھی دوسرے ملکوں اور دوسرے علاقوں کے بنے ہوئے قیمتی لباس بھی پہنلیتے تھے اس طرح بسا اوقات بہت خوشنما یعنی چادریں بھی زیب تن فرماتے تھے۔

جب ہم ان احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کھانے پینے کے بارے میں ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اکثر اوقات آپ کے دولت کدہ میں کئی کئی وقت

فاقہ تک نوبت آجاتی تھی اور کبھی اتنا کھانا ہوتا کہ کئی کئی لوگوں کو پیٹ بھر کر کھانا کھلایا جاتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز زندگی سے ہمیں یہ بات معلوم ہوئی کہ انسان کو اپنی زندگی کی ضروریات خدا کی مقررہ حدود میں رہ کر پوری کرنے کی مکمل اجازت ہے۔ انہی حدود کو اللہ رب العزت نے قرآن حکیم میں یوں بیان فرمایا:

﴿کلوا واشربوا ولا تسرفوا ان اللّٰہ لا یحب المسرفین﴾

''یعنی کھاؤ پیو لیکن اسراف نہ کرو، بے شک اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

اسراف کا معنی یہ ہے کہ انسان اپنی استطاعت اور ضرورت سے زائد خرچ کرے جسے ہم فضول خرچی بھی کہتے ہیں، یعنی وہ چیز ہے جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد گرامی میں منع فرمایا، کہ تم جو چاہو کھاؤ اور جو چاہو پہنو لیکن ان میں دو باتیں نہ ہوں ایک اسراف یعنی فضول خرچی اور دوسری تکبر۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے فضول خرچی کرنے والوں کے بارے میں فرمایا، ان اللہ لا یحب المسرفین بالکل اس طرح اللہ تعالیٰ نے تکبر کرنے والوں کے بارے میں فرمایا انہ لا یحب المستکبرین.

اللہ تعالیٰ نے انسان کو نعمتیں عطا فرمائیں انسان کا فرض ہے کہ اسے دینے والے کی حدود کی پابندی کرے۔ اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اگر انسان کے پاس اچھے کپڑے پہننے کی گنجائش ہو تو پھر بھی اسے معمولی گھٹیا قسم ہی کے کپڑے پہننے چاہئیں اس غلط فہمی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت دور فرما دیا جب ایک صحابی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تشریف لائے اس حال میں انہوں نے بہت معمولی گھٹیا قسم کے کپڑے پہنے ہوئے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس کچھ مال و دولت ہے؟ صحابی نے عرض کی ہاں آپ نے فرمایا کس قسم کا مال ہے صحابی نے عرض کیا کہ مجھے اللہ نے ہر قسم کا مال دیا ہے اونٹ بھی ہیں گائے بیل بھیڑ بکریاں گھوڑے غلام باندیاں سبھی کچھ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

﴿فاذا آتاك اللّٰہُ ما لًا فَلْيُرىٰ اثر نعمة اللّٰہ عليك و كرامته﴾

''جب اللہ نے تمہیں مال دولت سے نوازا ہے تو پھر اللہ کے انعام و احسان اوراس کے فضل وکرم کا اثر تمہارے اوپر نظر آنا چاہیے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو اپنے کھانے .... اور اپنے لباس کا معیار اپنی استطاعتکے مطابق رکھنا چاہیے۔اس میں بیجا اسراف اورفضول خرچی نہ ہو۔اوربخل بھی نہ کرے اچھے لباس اچھے کھانے پرتکبر نہ کرے بلکہ اللہ کا شکرادا کرے۔اس سے انسان کے اندرتکبر ختم ہوجائے گا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی عطا کردہ نعمتوں کا صحیح استعمال اوران کا شکرادا کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔



مُصافحہ باعث مغفرت ہے

﴿عن البراء بن عازب قال قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم مامن مسلمین یلتقیان فیتصافحان الّا غُفِرلھما قبل أنْ یّتَفَرّقَا﴾

(رواہ احمد والترمذی وابن ماجۃ)

''حضرت برا ابن عازب فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب دو مسلمان آپس میں ملتے ہیں اور مصافحہ کرتے ہیں تو اُن کے تمام گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں قبل اس کے کہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہوں۔''

اسلام کے عالمگیر مذہب ہونے کی یہی سب سے بڑی دلیل ہے کہ اس نے زندگی میں پیش آنے والے ہر مسئلہ کو بطریق احسن حل فرمایا ہے اور اس کے بارے میں پوری طرح رہنمائی فرمائی ہے۔

شریعت اسلامیہ نے ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حق رکھے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں:

(۱) جب بیمار ہو تو اس کی عیادت کرے۔

(۲) اگر اس کا انتقال ہو جائے تو اس کی نماز جنازہ پڑھے۔

(۳) اگر وہ کھانے کی دعوت دے تو قبول کرے۔

(۴) اور جب اس سے ملے تو السلام علیکم کہے۔

(۵) اور جب اسے چھینک آئے تو الحمدللّٰہ سن کر یرحمك اللّٰہ کہے۔

(۶) دینی و دنیاوی امور میں اس کے لیے خیر خواہ رہے اس کی موجودگی میں بھی اور اس کی غیر موجودگی میں بھی۔

ان ہی چھ حقوق میں سے ایک حق اس حدیث شریف میں یہ بھی بیان فرمایا گیا کہ

جب ایک مسلمان سے ملے تو اس کو سلام کرے اور پھر مصافحہ اور معانقہ کرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لوگو آپس میں ایک دوسرے کو سلام کرو اُسے بھی سلام کرو جسے تم جانتے ہو اور اسے بھی سلام کرو جسے تم نہیں جانتے آج کل کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت مبارکہ سے محروم ہیں وہ اس طرح کہ سلام صرف اس کو کرتے ہیں جس کو جانتے ہوں' یہ تو تقریباً ختم ہی ہوتا جا رہا ہے کہ اجنبی کو سلام کیا جائے حالانکہ شریعت کی طرف سے بڑی تاکید کے ساتھ ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم اجنبی اور غیر اجنبی یعنی ناواقف کو بلا امتیاز سلام کریں۔ سلام کے متعلق اتنی سخت تاکید کیوں فرمائی گئی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ دراصل سلام ایک خیر و برکت کی دعا ہے جو ایک بھائی دوسرے بھائی کے لیے ملاقات کے وقت خلوص ومحبت کے جذبہ کے ساتھ زبان سے نکالتا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک بھائی دوسرے کو سلام کرتے وقت یہ کہتا ہے کہ تم ہر قسم کی تکلیف، مصیبت، درد، رنج، مرض وغم، فکر و بلا اور آفات و حادثات سے سالم رہو' اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر و برکت کا تم پر نزول ہو، اور اس کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ سلام کرنے والا اپنے دوسرے بھائی کے لیے ان جذبات کا اظہار کرتا ہے کہ میرا بھائی سلامتی میں ہے یعنی میری طرف سے ہر قسم کی دشمنی، حسد، بغض و کینہ شرارت، غیبت، بہتان، بدخواہی، دھوکہ فریب نفاق اور ایذائے قول وفعل سے اپنے آپ کو سالم و مامون سمجھ۔ جبکہ غیر اسلامی طریقوں سے سلام کے تمام طریقوں میں یہ بات موجود نہیں لہٰذا علماء نے لکھا ہے کہ ''آداب'' یا ''تسلیم'' کہنے سے سلام کی سنت ادا نہیں ہوتی۔



رسول اللہ ﷺ کی پانچ خصوصیات جو اور کسی نبی کو عطا نہیں کی گئیں

﴿عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ قال رَسُوْلُ اللّٰه صلى الله عليه وسلم اُعْطِيْتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ اَحَدٌ قَبْلِيْ نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيْرَةَ شَهْرٍ وَجُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَّطَهُوْرًا فَاَيُّمَا رَجُلٍ مِنْ اُمَّتِيْ اَدْرَكَتْهُ الصَّلٰوةُ فَلْيُصَلِّ وَاُحِلَّتْ لِيَ الْمَغَانِمُ وَلا تَحِلَّ لِاَحَدٍ مِّنْ قَبْلِيْ وَاُعْطِيْتُ الشَّفَاعَةَ وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَّبُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ عَامَّةً﴾

(رواه البخاری ومسلم)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں ملیں۔

(۱) ابھی ایک ماہ کی مسافت ہو کہ دشمن پر میرا رعب طاری ہو جاتا ہے۔ (۲) ساری زمین میرے لیے مسجد اور پاکیزہ بنادی گئی ہے۔ میری امت میں سے ہر شخص جہاں چاہے نماز پڑھ سکتا ہے۔ (۳) غنیمت کا مال میرے لیے حلال کر دیا گیا ہے جو پہلے کسی پر حلال نہیں تھا۔ (۴) مجھے شفاعت کا حق دیا گیا ہے۔ (۵) پہلے نبی اپنی قوم کے لیے مخصوص ہوا کرتے تھے، مگر مجھے ساری دنیا کے انسانوں کے لیے نبی بنا کر بھیجا گیا ہے۔

اب سیرت طیبہ اور تاریخ کے حوالہ سے ان خصوصیات کا تفصیلی مطالعہ پیش ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ۲۳ سالہ عہد نبوت پر نظر ڈالیں تو دن رات کی تبلیغ اور دعوت میں تکالیف تو آئیں لیکن آپ کے رعب کے منافی کوئی چیز نہیں آتی۔ سفر ہجرت کے آغاز سے تین روز پہلے مانے ہوئے بہادر دشمنوں نے محاصرہ کر لیا، پوری رات انتظار میں گزار

دی، حملہ کی جرات نہ ہوئی جب آپ تن تنہا باہر تشریف لائے تو شَاهَتِ الْوُجُوْهُ لَا یُنْصَرُوْنَ کے کلام سے غصہ بھی دلایا، مٹھی بھر خاک اٹھا کر ان کے سروں پر پھینکی لیکن کسی نے سر نہ اٹھایا، طائف کا حکمران اور وہاں کے تمام باشندے خلاف تھے پتھر برسائے آوازیں کسیں، محض اس لیے کہ آپؐ تقریر نہ فرماسکیں لیکن آخر میں اہل طائف اور ان کا وہی حکمران ہے کہ مدینہ آ کر اسلام قبول کرتا ہے، شمالی عرب سلطنت روما کے اقتدار سے نکل جاتا ہے، روما کا بادشاہ حملہ آوری کا حکم بھی دیتا ہے، اس کی مدافعت کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم عرب کی سرحد تبوک تک شریف لے جاتے ہیں مگر ایک ماہ کی مسافت پر (یروشلم میں) میں بیٹھا ہوا یمپر رخوف زدہ ہوجاتا ہے اور احکام جنگ منسوخ کردیتا ہے۔ یہود اپنے کینسہ اور عیسائی اپنے کلیسا کے بغیر نماز نہیں پڑھ سکتے تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تمام روئے زمین مسجد بنادی گئی۔

حضرت موسیٰ اور حضرت یوشع بن نون علیہما السلام کی فتوحات میں جس قدر مال غنیمت حاصل ہوتا وہ نذر آتش کردیا جاتا، تو رات میں جانوروں اور بستیوں کو آگ لگادینے کا حکم ملتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلے غزوۂ بدر میں مال غنیمت حاصل ہوا۔ قیامت کے روز شفاعت کا حق بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوگا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے روز اللہ تعالیٰ فرمائیں گے یَا مُحَمَّدُ اِرْفَعْ رَأسَكَ قُلْ تُسْمَعْ، سَلْ تُعْطَه اِشْفَعْ تُشَفَّعْ "اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ سر اٹھائیں، آپ کہیں وہ سنا جائے گا، مانگیں وہ دیا جائے گا، شفاعت کیجئے شفاعت قبول کی جائے گی۔

اللہ رب العزت ہمیں اس روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت نصیب فرمائے۔



نافرمانیوں کے باوجود دنیا میں نعمتوں کا ملنا استدراج ہے

﴿عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ عَنِ النَّبِي صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم قَالَ اِذَا رَأَيْتَ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يُعْطِي الْعَبْدَ عَلٰى مَعَاصِيْهِ مَايُحِبُّ فَاِنَّمَا هُوَ اسْتِدْرَاجٌ ثُمَّ تَلَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم فَلَمَّا نَسُوْا مَاذُكِّرُوا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِم اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰى اِذَا فَرِحُوْا بِمَا اُوْتُوْا اَخَذْنَا هُمْ بَغْتَةً فَاِذَاهُمْ مُبْلِسُوْنَ.﴾

''حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو اس کی نافرمانیوں (گناہوں) کے باوجود دنیا میں اس کی پسندیدہ نعمتیں دے رہا ہے تو پھر (سمجھ لو کہ اس کے حق میں) وہ استدراج ہے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (بطور دلیل) قرآن مجید کی ایک آیت تلاوت فرمائی۔(جس کا ترجمہ یہ ہے) جب انہوں نے بھلادیا اُن باتوں کو جن کی انہیں نصیحت کی گئی تھی،تو ہم نے کھول دیے ان پر دنیا کی سب نعمتوں کے دروازے یہاں تک کہ جب وہ ان نعمتوں کے ملنے پر خوب خوش ہو چکے(اسی خوشی میں مست ہو کر اترانے لگے) تو ہم نے ایک دم انہیں اپنی سخت پکڑ میں لے لیا پس وہ حیرت زدہ رہ گئے۔''

پوری کائنات کا خالق اور رازق اس دنیا کے نظام کو بڑی حکمت اور قدرت کے ساتھ چلا رہا ہے کہیں نیک شخص کو غربت وافلاس اور مصیبتوں سے دو چار کر دیا اور کہیں گناہوں

کی دلدل میں دھنسے ہوئے کو خوشحال اور نعمتوں سے مالا مال کر دیا اور کہیں نیک کا اچھا اور بدکار کا برا حال رکھا۔ یہ تمام باتیں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں خوب واضح کر کے بتادی ہیں کہ میں یہ سب کچھ کرتا ہوں کسی کو عزت کسی کی ذلت، کسی کو غربت کسی کو مالداری لیکن میرے نزدیک قابل قدر شخص وہ ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیزگار ہو۔

اللہ تعالیٰ کے قوانین قدرت ہیں جن کے مطابق وہ کسی شخص یا کسی قوم کے ساتھ معاملہ فرماتا ہے ان میں سے ایک ''استدراج'' ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ کا نافرمان، مجرم احکام الٰہیہ کا باغی اپنی سرکشی اور گناہوں میں حد سے بڑھ جاتا ہے باوجودیکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے توبہ کا دروازہ کھول رکھا تھا لیکن یہ اس زندگی سے واپس آنا ہی نہیں چاہتا تو اللہ تعالیٰ اس سے سخت ناراض ہو کر کبھی کبھی ایسا کرتے ہیں کہ اس کی رسی اور ڈھیلی کر کے کچھ اور مدت کے لیے نعمتوں کے دروازے اس پر کھول دیتے ہیں تاکہ وہ اور زیادہ مست ہو کر نافرمانی اور سرکشی میں بڑھ جائے اور سخت سزا پائے ایسے معاملہ کو ''استدراج'' کہتے ہیں۔

چنانچہ اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جب کسی گنہگار بندہ یا کسی گنہگار قوم یا گروہ کو مجرمانہ اور باغیانہ زندگی گزارنے کے باوجود خوب خوشحالی اور نعمتیں مل رہی ہوں اور عیش وعشرت سے زندگی گزار رہے ہوں تو سمجھ لینا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ان کی رسی کو مزید ڈھیل دے رہے ہیں اور ان کا آخرت میں انجام اچھا نہ ہوگا۔

امام بغوی شرح السنہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''تم کسی بدکار پر کسی نعمت اور خوشحالی کی وجہ سے ہرگز رشک نہ کرنا تمہیں معلوم نہیں کہ مرنے کے بعد اس پر کیا کیا مصیبتیں پڑنے والی ہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے لیے ایک ایسا قاتل ہے جسے کبھی موت نہیں آئے گی۔'' اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرنے والے راوی عبداللہ بن ابی مریم کہتے ہیں کہ رسول اللہ کی مراد اس قاتل سے دوزخ کی آگ ہے بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک نیک، شریف، پابند صلوٰۃ وصوم

بندہ تنگی اور تکلیف میں زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے جب وہ ایسے شخص کو دیکھتا ہے جو بدکار بھی ہو، نماز روزے سے اسے کوئی سروکار نہ ہو لیکن وہ عیش وآرام کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوتا ہے تو اب شیطان اس نیک شخص کے دل میں طرح طرح کے وسوسے ڈالتا ہے اور کچھ نہیں تو کم ازکم اس کے دل میں اس کے بارے میں رشک پیدا ہوجاتا ہے تو اس پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوب اچھی طرح خبردار کیا ایسے گنہگار آرام وراحت میں زندگی بسر کرنے والے کی حالت تو اس طرح ہے جیسے پھانسی پانے والے مجرم کو دو چار دن پہلے اس کے آرام کا خاص خیال رکھا جائے۔اس کی خواہشات کو حتی المقدور پورا کرنے کی کوشش کی جائے اگر اس حقیقت کی سمجھ اس نیک شخص کے دل میں پیدا ہوجائے تو کبھی اس قسم کے خیالات قریب بھی نہ آئیں۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگر نیک شخص کو نعمتیں مل جائیں تو یہ اس کے لیے آزمائش ہیں،اگر برے شخص کو نعمتیں ملیں تو یہ اس کے لیے استدراج اور ڈھیل ہے اس طرح اگر نیک شخص کو تکالیف آئیں تو یہ اس کے لیے گناہوں کا کفارہ ہے اور برے شخص کے لیے تکالیف آئیں تو یہ اس کے لیے تنبیہہ ہے، عزت وذلت کا معیار دولت وآرام نہیں بلکہ اللہ کے نزدیک نجات وعزت وذلت کا معیار صرف اور صرف تقویٰ ہے۔



اُمت مسلمہ پر مصائب ومشکلات کی وجہ

﴿عن ام سلمة رضی اللّٰه تعالٰی عنها قالت سمعت رسول اللّٰه صلی الله علیه وسلم یقول اذا ظهرت المعاصی فی امتی عمهم اللّٰه بعذاب من عنده﴾ (رواہ احمد)

''حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جب میری امت میں گناہوں کی کثرت ہوجائے گی تو اللہ تعالیٰ خواص وعوام سب پر اپنا عذاب اتارے گا۔''

اس کے بعد روایت میں ہے کہ حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں یہ سن کر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، یارسول اللہ! کیا اس وقت صالح اور نیک بندے نہیں ہونگے ؟ آپ نے فرمایا ہاں ہونگے، میں نے کہا پھر ان لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا؟ آپ نے فرمایا جو مصیبت اور لوگوں پر آئے گی وہی ان پر بھی آئے گی، پھر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کو مغفرت اور رضامندی ملے گی۔

علامہ ابن قیم جوزیؒ ''الجواب الکافی لمن سأل عن دواء الشافی'' میں فرماتے ہیں مراسیل حسن میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' میری امت ہمیشہ اللہ کی تائید اور اس کے رحمت کے سایہ میں رہے گی جب تک کہ اس امت کے علماء امراء کی بے جا حمایت نہیں کریں گے' نیک لوگ، فاسقوں ، فاجروں کی بے جا صفائی پیش نہیں کریں گے اور شریر لوگ نیک لوگوں کی توہین اور بے عزتی نہیں کریں گے۔لیکن جب لوگ یہ کام کرنے لگیں گے تو اللہ تعالیٰ اپنی تائید ان سے اٹھالے گا اور جابر وظالم لوگوں کو ان پر مسلط کردے گا جو ان پر بدترین عذاب کے پہاڑ توڑیں گے پھر اللہ تعالیٰ ان کو فقر وفاقہ میں مبتلا

کردے گا۔

مسند ہی میں حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' آدمی اپنے گناہوں کی وجہ سے رزق سے محروم ہوجاتا ہے۔'' ارشاد نبوی ہے فرمایا ڈر ہے کہ دنیا کی قومیں ہر طرف سے تم پر ٹوٹ پڑیں گی جس طرح بھوکے کھانے کے پیالے پر ٹوٹ پڑتے ہیں صحابہؓ نے عرض کیا، کیا اس وقت ہماری تعداد کم ہوگی؟ آپ نے فرمایا، اس وقت تمہاری تعداد بہت زیادہ ہوگی لیکن تمہاری حالت اس وقت سیلاب کے خس وخاشاک کی طرح ہوگی' تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہارا رعب اٹھ جائے گا اور تمہارے دلوں میں بزدلی پیدا ہوجائے گی صحابہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ بزدلی کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ''حُبُّ الْحَیٰوۃِ وَکَرَاھِیَّۃُ الْمَوْتِ'' (زندگی سے محبت اور موت سے نفرت)

جامع ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا آخر زمانہ میں ایسے لوگ نکل کھڑے ہونگے جو دین کو فریب کا ذریعہ بنا کر دنیا کمائیں گے' لوگوں کو دکھانے کی خاطر بکریوں کی نرم کھال اوڑھ لیں گے، ان کی زبانیں شکر سے بھی زیادہ شیریں ہونگی لیکن ان کے دل بھیڑیوں جیسے ہونگے اللہ تعالیٰ انہیں کہے گا کیا تم میرے نام پر اکڑ رہے ہو، کیا تم نے میرے خلاف جرات کی میں اپنی ذات کی قسم کھا کر کہتا ہوں ان لوگوں کو ایسے فتنہ اور عذاب میں ڈالوں گا کہ بردبار لوگ بھی حیران رہ جائیں گے۔

سنن ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دس افراد کی ایک جماعت بیٹھی ہوئی تھی ان میں سے ایک میں بھی تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطاب فرمایا۔

'' اے مہاجرین کے گروہ! میں پانچ چیزوں سے تمہارے حق میں بارگاہ الٰہی سے پناہ مانگتا ہوں۔ (۱) جس قوم میں بے حیائی پھیل جائے اور کھلم کھلا بدکاری ہونے لگے تو اللہ تعالیٰ ان میں طاعون اور دوسری قسم کی بیماریاں بھیج دیتا ہے جو ان سے پہلے لوگوں میں نہیں تھیں۔ (۲) جو لوگ ناپ تول میں خیانت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان میں قحط سالی اور تنگی معاش

کی مصیبت بھیج دیتا ہے اور ظالم بادشاہ ان پر مسلط کر دیتا ہے۔(۳) جولوگ مال کی زکوٰۃ دینا بند کر دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ آسمان سے بارش روک دیتا ہے اور اگر چوپائے نہ ہوتے تو ان لوگوں کے لیے کبھی پانی نہ برستا۔(۴) جولوگ عہد توڑتے ہیں اللہ تعالیٰ ان پر ان کے علاوہ سے کسی کو دشمن بنا کر مسلط کر دیتا ہے جو ان کے قبضہ سے چیزوں کو چھین لیتا ہے۔(۵) جب ان مسلمانوں کے راہنما اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کی کتاب پر عمل کرنا چھوڑ دیتے ہیں تو ان کے درمیان پھوٹ ڈال دیتا ہے۔

آج ہر طرف مصائب ومشکلات کے پہاڑ دیکھتے ہوئے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ گناہوں سے باز آجائے اور سابقہ گناہوں کی معافی حضرت آدم علیہ السلام کی دعا کے ذریعہ مانگتا رہے۔

﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَاوَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ﴾

”اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اگر تو ہمیں معاف نہیں کرے گا اور تو ہم پر رحم نہیں کرے گا تو ہم یقیناً خسارے میں رہیں گے۔“



ہماری دعائیں کیوں قبول نہیں ہوتیں؟

عَنْ اَبِی ھریرۃ رَضِی اللّٰہُ تعالٰی عَنہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُسْتَجَابُ لِلْعَبْدِ مَالَمْ یَدْعُ بِاِثْمٍ اَوْقَطِیْعَۃِ رَحْمٍ مَالَمْ یَسْتَعْجِلُ قِیْلَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ مَاالْاِسْتِعْجَالُ قَالَ یَقُوْلُ قَدْدَعَوْتُ وَقَدْدَعَوْتُ فَلَمْ اَرَیُسْتَجَابُ لِیْ فَیَسْتَحْسِرُ عِنْدَ ذَالِکَ وَیَدْعُ الدُّعَاءَ.

(رواہ مسلم)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بندہ کی دعا قبول کی جاتی ہے جب تک کہ وہ کسی گناہ یا رشتہ کے ٹوٹنے کی دعا نہ مانگے اور جب تک کہ وہ جلد بازی نہ کرے عرض کیا گیا یارسول اللہ! جلد بازی سے کیا مراد ہے؟ فرمایا کہ جلد بازی یہ ہے کہ انسان یوں کہے میں نے دعا مانگی پھر میں نے دعا مانگی لیکن دعا مجھے قبول ہوتی نظر نہیں آئی، پھر وہ مایوس ہوکر بیٹھ جائے اور دعا کو چھوڑ دے''۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا'' دعا مؤمن کا ہتھیار ہے'' ظاہر ہے کہ ہتھیار اس وقت صحیح کام کرے گا جب ہتھیار خوب کام کرنے والا ہو' ہتھیار چلانے والا طاقتور ہو اور نشانہ بھی خوب ہو۔اسی طرح دعا کا محل اور وقت بھی قبولیت کا ہو۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے'' **احکام الرجأ فی احکام الدعا**'' میں وہ آداب دعا بیان فرمائے ہیں جو معتبر احادیث سے ماخوذ ہیں۔لیکن اگر کوئی شخص کسی وقت ان تمام آداب کو یا بعض آداب کو جمع نہ کرسکے تو پھر بھی دعا ضرور مانگے دعا کو کسی بھی حالت میں نہ چھوڑ ے آداب کے ساتھ اس حدیث کی کتاب کا حوالہ بھی دیا جارہا ہے۔

(۱) کھانے پینے ، پہننے اور کمانے میں حرام سے بچنا۔(مسلم و بخاری)

(۲) اخلاص کے ساتھ دعا کرنا یعنی دل میں یقین رکھنا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی ہمارا مقصد پورا نہیں کرسکتا۔ (حاکم فی المستدرک)

(۳) دعا سے پہلے کوئی نیک کام کرنا۔ (مسلم)

(۴) پاک وصاف ہوکر دعا کرنا۔ (ابن حبان)

(۵) وضو کرنا۔ (صحاح ستہ)

(۶) دعا کے وقت قبلہ رخ ہونا۔ (صحاح ستہ)

(۷) دوزانو ہوکر بیٹھنا۔ (ابوعوانہ)

(۸) دعا کے اول وآخر میں حق تعالیٰ کی حمد وثنا کرنا۔ (صحاح ستہ)

(۹) دعا کے اول وآخر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا۔ (ابوداؤد)

(۱۰) دعا کے لیے دونوں ہاتھ پھیلانا۔ (ترمذی)

(۱۱) دونوں ہاتھوں کو کندھوں کے برابر اٹھانا (ابوداؤد)

(۱۲) ادب وتواضع کے ساتھ بیٹھنا۔ (مسلم)

(۱۳) اپنی محتاجی اور عاجزی کا ذکر کرنا (ترمذی)

(۱۴) دعا کے وقت آسمان کی طرف نظر نہ اٹھانا۔ (مسلم)

(۱۵) اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور صفات عالیہ ذکر کرکے دعا کرنا (ابن حبان)

(۱۶) الفاظ دعا میں قافیہ بندی کے تکلف سے بچنا۔ (بخاری)

(۱۷) دعا اگر نظم میں ہوتو گانے کی صورت سے بچنا۔ (حصن)

(۱۸) دعا کے وقت انبیاء علیہم السلام اور دوسرے مقبول اور صالح بندوں کو وسیلہ بنانا (یعنی یہ کہنا اے اللہ ان بزرگوں کے طفیل سے میری دعا قبول فرما)۔

(بخاری)

(۱۹) دعا میں آواز پست کرنا۔ (صحاح ستہ)

(۲۰) ان دعاؤں کے ساتھ دعا کرنا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں کیونکہ آپ نے دین ودنیا کی کوئی حاجت نہیں چھوڑی جس کی دعا تعلیم نہ فرمائی ہو۔

(ابوداؤد)

(۲۱) ایسی دعا کرنا جو اکثر دینی و دنیوی حاجت کو شامل ہو۔ (ابوداؤد)

(۲۲) دعا میں پہلے اپنے لیے دعا کرنا پھر اپنے والدین اور دوسرے مسلمان بھائیوں کو شریک کرنا۔ (مسلم)

(۲۳) اگر امام ہو تو تنہا اپنے لیے دعا نہ کرے بلکہ سب شرکائے جماعت کو دعا میں شریک کرے۔ (ابوداؤد)

(۲۴) عزم کے ساتھ دعا کرے (یعنی یوں نہ کہے اے اللہ اگر تو چاہے تو میرا کام کردے) (صحاح ستہ)

(۲۵) رغبت اور شوق سے دعا کرے۔ (ابن حبان)

(۲۶) جس قدر ممکن ہو دل کو متوجہ رکھنے کی کوشش کرے اور دعا کے قبول ہونے کی قوی امید رکھے۔ (مستدرک)

(۲۷) دعا میں تکرار کرنا یعنی بار بار دعا کرنا (بخاری و مسلم)

(۲۸) دعا میں الحاح یعنی اصرار کرے (نسائی)

(۲۹) ایسی چیز کی دعا نہ کرے جو طے ہو چکی ہو (مثلاً عورت یہ دعا نہ کرے کہ میں مرد ہو جاؤں یا طویل آدمی یہ دعا نہ کرے کہ میرا قد چھوٹا ہو جائے وغیرہ)
(نسائی)

(۳۰) کسی گناہ یا قطع تعلقی کی دعا نہ کرے (مسلم)

(۳۱) کسی ناممکن چیز کی دعا نہ کرے (بخاری)

(۳۲) اللہ تعالیٰ کی رحمت کو صرف اپنے لیے مخصوص کرنے کی دعا نہ کرے۔
(بخاری)

(۳۳) اپنی تمام حاجات صرف اللہ تعالیٰ سے طلب کرے (مخلوق پر بھروسہ نہ کرے)
(ترمذی)

(۳۴) دعا کرنے والا بھی آخر میں آمین کہے اور سننے والا بھی آمین کہے (بخاری) (آمین کا مطلب ہے اے اللہ میری دعا قبول فرما)

(۳۵) دعا کے بعد دونوں ہاتھ اپنے چہرہ پر پھیرے (ابوداؤد)

(۳۶) دعا کی قبولیت میں جلد بازی نہ کرے یعنی یہ نہ کہے میں نے دعا کی ابھی تک قبول کیوں نہیں ہوئی۔ (بخاری)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد فرمودہ ان آداب کا خیال رکھ کر دعا مانگی جائے تو وہ ضرور قبول ہوگی۔ قبولیت کی شکل کیا ہوگی اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی جب دعا کرے تو بسا اوقات بالکل وہی دعا قبول ہوکر مقصود مل جاتا ہے یا اللہ تعالیٰ وہ مقصود اس بندہ کے لیے خیر نہیں سمجھتے تو اس کا بدل عطا فرمادیتے ہیں اور اگر نہ اصل مقصود عطا فرمائیں نہ بدل عطا فرمائیں تو پھر اللہ تعالیٰ اس دعا کو قبول فرماتے ہوئے اس کے بدلے میں اس کے گناہ معاف فرمادیتے ہیں اور اگر بندے کے ذمہ گناہ نہ رہیں تو پھر دعاؤں کے بدلے اللہ تعالیٰ اسے اجروثواب عطا فرماتے ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ بندہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان فرمودہ آداب کا خیال رکھ کر دعا مانگے تو وہ دعا ہر صورت میں قبول ہوتی ہے قبولیت کی شکلیں مختلف ہوسکتی ہیں لیکن دعا رائیگاں نہیں جائے گی۔



تعصب کی وجہ سے لڑنا، مرنا مسلمانوں کا شیوہ نہیں

﴿عَـن جُبَیرِ بُنِ مُطْعِمؓ اَنَّ رَسُولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قَالَ لَیْسَ مِـنَّا مَنْ دَعَااِلٰی عَصَبِیَّۃٍ وَلَیْسَ مِنّا من قَاتَلَ عَصَبِیَّۃً وَلَیْسَ مِنَّامَنْ مَاتَ عَلٰی عَصَبِیَّۃٍ.﴾ (رواہ ابوداؤد)

''حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ شخص ہم میں سے نہیں جو عصبیت کی طرف بلائے اور وہ شخص ہم میں سے نہیں جو عصبیت کی وجہ سے ایک دوسرے سے لڑے اور وہ شخص ہم میں سے نہیں جو عصبیت کی بناء پر مرے۔''

عصب کا لفظی معنی ہے ''بدن کا پٹھہ'' اور عصبہ عربی زبان میں والد کی طرف کے رشتہ داروں کو کہتے ہیں کیونکہ معاشرہ میں عموماً دادھیال (باپ کے رشتہ دار) ہی کی وجہ سے خاندان کی تقویت کا معیار سمجھا جاتا ہے اور انہی رشتہ داروں کی طاقت کو اگلی نسل اپنی طاقت سمجھتی ہے اس لیے عصبیت اور تعصب کا مفہوم اہل لغت نے یہ بیان کیا کہ'' اپنے آباؤ واجداد اور اپنی قوم پر فخر کرنا، ان کی حمایت کرنا'' لیکن اسلامی اصطلاح میں تعصب کا مفہوم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح الفاظ میں بیان فرمایا، جب واثلۃ بن الاسقع رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا یارسول اللہ! مَاالعصبیۃ (عصبیت کیا ہے) فرمایا اَنْ تُـعِینَ قَوْمَكَ عَلَى الظُّلْم (عصبیت یہ ہے کہ تو ظلم پر اپنی قوم کی حمایت کرے)۔

اسلامی احکام کے مطابق خاندان، قبیلوں، برادریوں، ذاتوں، علاقوں، صوبوں اور شہروں کی تقسیم اور ان کی بناء پر انسانوں کی تقسیم خلاف فطرت نہیں، بلکہ فطرت کے عین مطابق ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو، اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا وہ شخص ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔ (الحجرات:۱۳)

تفسیر مظہری میں امام بغوی سے روایت ہے کہ یہ آیت فتح مکہ کے موقع پر اس وقت نازل ہوئی جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اذان دینے کا حکم فرمایا۔ قریش مکہ جو ابھی تک مسلمان نہ ہوئے تھے ان میں سے ایک شخص نے کہا" خدا کا شکر ہے کہ میرے والد پہلے ہی وفات پا گئے ہیں ان کو یہ برا دن نہ دیکھنا پڑا اور حارث بن ہشام نے حضرت بلالؓ کے رنگ کے حوالے سے سخت کلمات کہے ابوسفیان بولے میں کچھ نہیں کہتا کیونکہ مجھے خطرہ ہے کہ میں کچھ کہوں گا تو آسمان کا مالک ان کو خبر کر دے گا" چنانچہ جبرئیل امین تشریف لائے اور یہ آیت نازل ہوئی۔

بہرحال یہ بات واضح ہوئی کہ خاندان ، برادری اور وطنی ولسانی تقسیم خلاف فطرت اور خلاف اسلام نہیں لیکن آج اس کا غلط استعمال ہو رہا ہے۔ اس تقسیم کا مقصد اللہ تعالیٰ نے "لِتَعَارَفُوا" بتایا یعنی اس تقسیم کے ذریعہ لوگ ایک دوسرے کی شناخت کر سکیں ایک دوسرے سے تعارف ہو سکے کہ یہ شخص فلاں ملک میں سے فلاں صوبہ کے فلاں شہر کے فلاں قبیلہ اور برادری کے فلاں خاندان سے ہے لیکن اب یہ تقسیم تعصب کے لیے استعمال ہونے لگی ہے یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اپنے خاندان یا اپنی قوم سے محبت رکھنا عصبیت میں داخل نہیں۔ مسند احمد اور ابن ماجہ میں عبادۃ بن کثیر شامی سے ایک فلسطینی عورت فسیلہ نامی کی اپنے والد سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آدمی اپنی قوم سے محبت کرے تو کیا یہ عصبیت میں داخل ہے آپ نے فرمایا نہیں لیکن عصبیت یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی قوم کی حمایت کرے حالانکہ وہ قوم ظلم کر رہی ہو۔"

اگر اپنی قوم پر ظلم ہو رہا ہو تو اپنی قوم کی طرف سے ایک حد تک دفاع کرنا بھی جائز ہے ابوداؤد میں سراقہ بن مالک بن جعشمؓ روایت ہے کہ "ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

خطبہ دیتے ہوئے فرمایا تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنے خاندان کی طرف سے (ظلم کی) مدافعت کرے جب تک وہ اس دفاع میں گناہ کا مرتکب نہ ہو" یعنی اپنی قوم، اپنے خاندان پر ہونے والے ظلم کا دفاع کرسکتا ہے لیکن اس میں بھی اپنی طرف سے ظلم نہ ہونے دے۔

اسلام میں ایک خاندان کو دوسرے خاندان کے نسب کی وجہ سے برا نہیں کہا جاسکتا ارشاد نبوی ہے۔"انساب ایسی چیز نہیں کہ تم ان کی وجہ سے کسی کو برا کہو" (رواہ احمد) اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آباؤ اجداد پر فخر کرنے سے بھی منع فرمایا قومی، نسلی اور علاقائی تعصب آج جس تیزی سے آگ کی طرح پھیل رہا ہے یہ محض اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا نہ ہونے کی وجہ سے ہو رہا ہے اللہ رب العزت نے قوم اور خاندان اور قبیلوں کی تقسیم کا مقصد محض تعارف بتایا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد فوراً یہ ارشاد فرمایا۔

﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ﴾

"بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا...... وہ شخص ہے
جو تم میں سے زیادہ پرہیز گار ہو۔"

لہٰذا آج وقت کی اہم ضرورت ہے کہ ہر قسم کے تعصب سے ذہنوں کو پاک کر کے صرف یہ بات ذہن نشین کی جائے کہ عزت وذلت کا معیار تقویٰ ہے اللہ رب العزت ہمیں ہر طرح کے تعصب سے اور اس کے بھیانک نتائج سے محفوظ فرمائے۔



جنریشن گیپ کا علاج

(دونسلوں کے درمیان بڑھتا ہوا فاصلہ کیوں پیدا ہوا؟)

﴿عن ابن عباس رضی اللّٰہ عنہما قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا وَلَمْ یُوَقِّرْ کَبِیْرَنَا﴾

(رواہ الترمذی)

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم میں سے نہیں ہے وہ شخص جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی عزت نہ کرے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات حکمت سے آراستہ ہوتے ہیں' علماء فرماتے ہیں کہ اس ارشاد مبارک میں پہلے چھوٹوں پر شفقت کا ذکر ہے پھر بڑوں کی عزت کا تذکرہ ہے معلوم ہوا کہ چھوٹوں پر شفقت ، بڑوں کی عزت کا سبب ہے' پہلے بڑے چھوٹوں پر شفقت کریں تو نتیجتاً چھوٹے بڑوں کی عزت کریں گے اور یہ بات انسانی نفسیات کے عین مطابق ہے لیکن اگر بزرگوں کی طرف سے شفقت نہ بھی ہو تب بھی چھوٹوں کو تعظیم وتکریم اور اچھے سلوک کا دامن نہ چھوڑنے کی نصیحت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ میرے کچھ رشتہ دار ایسے ہیں کہ میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہوں لیکن وہ قطع تعلق کرتے ہیں' میں ان کے ساتھ بھلائی کرتا ہوں وہ مجھ سے برا پیش آتے ہیں' میں درگذر سے کام لیتا ہوں اور وہ نادانی کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' تم ایسا ہی کرتے رہو اور جب تک تم ایسا کرتے رہو گے اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ رہے گا اور تم سے تکلیفوں کو دور کرتا رہے گا۔ بزرگوں کی تعظیم وتکریم کی اہمیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور انداز سے یوں بیان

فرمائی کہ

﴿اِنَّ مِنْ اِجْلَالِ اللّٰہِ اِکْرَامُ ذِی الشَّیْبَۃِ الْمُسْلِمِ﴾

''یعنی بوڑھے مسلمان کی عزت واکرام کرنا اللہ کی تعظیم میں سے ہے۔''

بزرگی مختلف انداز کی ہوتی ہے عمر میں بڑا ہونا، علم میں بڑا ہونا، مرتبہ اور مقام میں بڑا ہونا چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے بھائی کے حق کو اس طرح بیان فرمایا:

﴿حق کبیر الاخوۃ علٰی صغیر ھم کحق الوالد علی ولدہ﴾

''فرمایا کہ بڑے بھائی کا حق چھوٹے بھائی پر ایسا ہے جیسا کہ باپ کا حق بیٹے پر''

ماں باپ انتقال کرجائیں تو ان کے دوستوں اور ان کے رشتہ داروں سے بھی اچھے سلوک کا حکم فرمایا۔قبیلہ بنوسلمہ کا ایک شخص حاضر ہوا عرض کیا میں اپنے ماں باپ کے انتقال کے بعد ان کے لیے نیکی کیسے کروں؟ آپ نے فرمایا ان کے لیے دعا کرنا اور ان کی مغفرت طلب کرنا اور ان کے رشتہ داروں سے اور ان کے دوستوں سے اچھا سلوک کرنا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ میں ہمیشہ بزرگوں کی عزت کی اور ان سے اداب واحترام کا معاملہ فرمایا۔ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مقام جعرانہ میں گوشت تقسیم فرمارہے تھے کہ ایک عورت آئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے اپنے قریب چادر بچھائی اور ادب واحترام سے بٹھایا صحابہ نے ایک دوسرے سے پوچھا کہ یہ عورت کون ہے؟ معلوم ہوا کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی والدہ ہیں' جوانی کے زمانے میں ایک روز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بوڑھی عورت کو دیکھا جو بوجھ اٹھائے جارہی تھی اور بوجھ کی وجہ سے اس کی کمر دوہری ہورہی تھی نزدیک کھڑے لوگ دیکھ کر ہنس رہے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے بڑھ کر بڑھیا کا بوجھ اپنے کندھے پر رکھ لیا اور لوگوں سے فرمایا ایک کمزور بوڑھی عورت کا مذاق اڑانا مردانگی نہیں' مردانگی یہ ہے کہ اس کا بوجھ بٹاؤ۔''

جس طرح رشتہ داری اور عمر کی وجہ سے بزرگ ہونے کی بناء پر تعظیم وتکریم کی تعلیم

دی گئی اسی طرح درس وتدریس میں بھی استاذ اور شاگرد کے درمیان احترام کی تعلیم دی گئی استاذ کو روحانی باپ کا درجہ حاصل ہے استاذ کی ہر جائز بات پر سر تسلیم خم کرنا' اس کی عزت اور اکرام ہی شاگرد کو علم کی برکتوں سے فیضیاب کرتا ہے لیکن یہاں بھی جس سطح پر اساتذہ کی تعظیم میں کمی نظر آئے گی وہاں اور وجوہات میں سے ایک وجہ لازماً یہ ہوگی کہ اساتذہ کی طرف سے شفقت کم ہوئی اور دوسری طرف سے شاگردوں میں عزت واکرام میں کمی آ گئی۔ تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اساتذہ نے جب شاگردوں پر شفقت کی مثالیں قائم کیں تو پھر شاگردوں کی طرف سے بھی تعظیم وتکریم کی لازوال مثالیں قائم ہوگئیں۔

جب معاشرہ میں بزرگوں کی تعظیم وتکریم نہ رہے تو پھر سب سے بڑے دو نقصان سامنے آتے ہیں ایک چھوٹوں اور بڑوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا چلا جاتا ہے جسے جنریشن گیپ کا نام دیا جاتا ہے یہ نقصان آج ہمارے معاشرے کے بعض حصوں میں بہت زیادہ محسوس کیا جانے لگا ہے لیکن یہ فاصلہ ابھی مکمل طور پر اخلاقی اقدار سے باہر نہیں نکلا جب بزرگوں اور چھوٹوں کے درمیان یہ فاصلہ آخری حدوں کو چھونے لگتا ہے تو پھر دوسرا نقصان یہ سامنے آتا ہے کہ اہل معاشرہ اپنے بزرگوں کو اپنے گھروں میں بوجھ سمجھنے لگتے ہیں اور ان بزرگوں کو معاشرہ میں اپنا مقام باقی رکھنے کے لیے ''اولڈ ہاؤس'' کا سہارا لینا پڑتا ہے جیسا کہ مغربی ممالک میں ہوا وہاں بزرگوں کے رہنے کے لیے الگ گھر بنادیئے گئے تاکہ ایک جگہ تمام بزرگ اکٹھے ہوکر زندگی گزاریں لیکن اسلام نے چھوٹوں اور بڑوں کے درمیان عزت واحترام کی اس قدر تعلیم دی ہے کہ اگر ان اصولوں پر مکمل طور پر عمل کیا جائے تو یقینی طور پر معاشرے میں یہ فاصلہ اور یہ دوری ختم ہوجائے بلکہ بزرگوں کو معاشرے میں عزت کا مقام مل جائے۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بزرگوں کے بارے میں تعلیم دیتے ہوئے فرمایا:

﴿ما اکرم شاب شیخاً من اجل سنه الا قیض اللّٰه له عند سنه من یکرمه.﴾

''کہ جس جوان نے کسی بوڑھے شخص کی اس کے بڑھاپے کی وجہ سے تعظیم وتکریم کی تو اللہ تعالیٰ اس کے بڑھاپے میں ایسے شخص کو مقرر

فرمادے گا جو اس کی تعظیم وتکریم کرے گا''

والدین جب بوڑھے ہوجاتے ہیں' ان کی جسمانی قوتیں کمزور پڑجاتی ہیں اس موقعہ پر ان کو اولاد کی خدمت کی ضرورت ہوتی ہے' اس وقت اولاد کی ذرا سی بے رخی بھی محسوس ہوتو وہ ان کے دل پر زخم سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے' اس لیے اللہ رب العزت نے سورۂ بنی اسرائیل میں والدین سے اچھا سلوک کرنے کا حکم فرمایا تو وہاں ان کی بزرگی کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا جب وہ بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انہیں اُف بھی نہ کہنا اور نہ ان کو جھڑکنا' اور ادب سے بات کرنا۔ پھر آخر میں والدین کے لیے جو دعا کرنے کا حکم فرمایا اس دعا کے الفاظ توجہ کے قابل ہیں وہاں یہ نہیں فرمایا اے اللہ ان بزرگوں کو ہدایت دے یہ ہمارے لیے بوجھ ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یوں دعا کرو رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيرًا اے ہمارے پروردگار ان پر رحم فرما جس طرح کہ انہوں نے ہمیں بچپن میں پالا بچپن میں ہم ان بزرگوں کے محتاج تھے نہ کھاسکتے تھے نہ پی سکتے تھے' اپنی صفائی بھی نہ کرسکتے تھے واقعی ہماری حالت قابل رحم تھی ان بزرگوں نے اس وقت ہم پر رحم فرمایا اے اللہ اب ان پر محتاجی کا وقت ہے آپ ان پر رحم فرمایئے۔''

اس طرح اللہ تعالیٰ نے چھوٹوں کو اپنے بزرگوں کی تعظیم وتکریم کا طریقہ سمجھایا اللہ رب العزت ہمیں معاشرے میں اپنے گھروں اور خاندانوں میں اور درسگاہوں میں اپنے بزرگوں کی تعظیم و تکریم کی توفیق عطا فرمائے تاکہ ہم اس عظمت واکرام کی برکتوں سے فیضیاب ہوسکیں۔

اخلاص کی حقیقت، اہمیت اور ریاکاری کی نحوست وفضیحت

﴿عن ابی هریرة رضی اللّٰه عنه قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ان اللّٰه لا ینظر الی صورکم واموالکم ولکن ینظر إلٰی قلوبکم﴾ (رواہ مسلم)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا اور لیکن وہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔''

اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ ہر اچھا کام یا کسی کے ساتھ اچھا سلوک صرف اس لیے اور اس نیت سے کیا جائے کہ ہمارا خالق و پروردگار ہم سے راضی ہو، ہم پر رحمت فرمائے اور اس کی ناراضگی اور غضب سے ہم محفوظ رہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ تمام اچھے اعمال واخلاق کی روح یہی اخلاص نیت ہے اگر اچھے سے اچھے اعمال واخلاق اخلاص سے خالی ہوں اور ان کا مقصد رضاء الٰہی نہ ہو بلکہ نام ونمود ریا اور دکھلاوا اور کوئی ایسا ہی جذبہ ان کا محرک اور باعث ہو تو اللہ کے نزدیک ان کی کوئی قیمت نہیں اور ثواب بھی نہیں ملتا لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت کا ثواب، جو اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ کا اصل صلہ اور نتیجہ ہے وہ صرف اعمال واخلاق پر نہیں ملتا بلکہ یہ جب ملتا ہے جبکہ ان اعمال واخلاق میں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور اُخروی ثواب کا ارادہ بھی کیا گیا ہو۔ اپنے معاملات میں خود ہمارا بھی یہی اصول ہے فرض کیجئے کوئی شخص آپ کی بڑی خدمت کرتا ہے' آپ کو ہر طرح آرام پہنچانے اور خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن پھر کسی ذریعہ سے آپ کو معلوم ہو جائے کہ اسے آپ کے ساتھ کوئی خلوص نہیں بلکہ اس نے یہ سب کچھ اپنی ذاتی غرض کے لیے کیا ہے یا آپ

کے کسی دوست یا رشتہ دار سے اپنا کوئی کام نکلوانا چاہتا ہے تو پھر آپ کے دل میں اس شخص کی اوراس کے برتاؤ کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی۔

بس یہی معاملہ اللہ تعالیٰ کا ہے' فرق اتنا ہے کہ ہم دوسروں کے دلوں کا حال نہیں جانتے اور اللہ تعالیٰ سب کے دلوں اوران کی نیتوں کا حال جانتا ہے پس اس کے جن بندوں کا یہ حال ہے کہ وہ اس کی خوشنودی اور رحمت کی طلب میں اچھے کام کرتے ہیں وہ ان کے اعمال کو قبول کر کے ان سے راضی ہوتا ہے اوران پر رحمتیں نازل کرتا ہے اور دارالجزاء یعنی آخرت میں اس کا بدلہ عطا فرمائے گا۔

اخلاص کی ضد ریاء اور دکھلاوا ہے' اس کے بارے میں ارشاد نبوی ہے'' جس نے دکھلاوے کے لیے نماز پڑھی اس نے شرک کیا اور جس نے دکھلاوے کے لیے روزہ رکھا اس نے شرک کیا اور جس نے صدقہ وخیرات دکھاوے کے لیے کیا اس نے شرک کیا۔''

حقیقی شرک تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات یا اس کے افعال یا اس کے خاص حقوق میں کسی دوسرے کو شریک کیا جائے یا اللہ کے علاوہ کسی اور کی بھی عبادت کی جائے' اسے شرک حقیقی ،شرک جلی اور شرک اکبر کہتے ہیں ایسے شرک کرنے والوں کی ہرگز بخشش نہیں ہوگی لیکن بعض اعمال واخلاق ایسے بھی ہیں جو شرک حقیقی میں شامل نہیں لیکن ان میں شرک کا تھوڑا بہت شائبہ ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کوئی شخص عبادت یا کوئی اور نیک کام لوگوں کو دکھانے کے لیے کرے تاکہ لوگ اسے عبادت گزار نیکوکار سمجھیں اسی کو ریاء کہا جاتا ہے۔

سنن ابن ماجہ میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجرۂ مبارک سے نکل کر ہمارے پاس تشریف لائے تو آپ نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں وہ چیز بتادوں جو میرے نزدیک تمہارے لیے دجال سے بھی زیادہ خطرناک ہے؟ ہم نے عرض کیا بتائیے! آپ نے فرمایا وہ شرک خفی ہے اور وہ یہ کہ آدمی نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہو پھر اپنی نماز کو اس لیے لمبا کردے کہ کوئی آدمی اس کو نماز پڑھتا دیکھ رہا ہے۔''

مسند احمد میں محمود بن لبیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ خطرہ ''شرک اصغر'' کا ہے، صحابہؓ نے عرض کیا شرک اصغر کیا ہے؟ فرمایا ریا''۔

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت جندبؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو شخص کوئی عمل سنانے اور شہرت کے لیے کرے گا اللہ تعالیٰ اسے شہرت دے گا اور جو کوئی عمل دکھادے کے لیے کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور دکھا دے گا۔''

بسا اوقات بعض دیندار بھی دین کے نام پر دنیا کما کر ریا کاروں میں شامل ہوجاتے ہیں جیسا کہ ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آخری زمانہ میں کچھ ایسے مکار لوگ پیدا ہوں گے جو دین کی آڑ میں دنیا کا شکار کریں گے وہ لوگ اپنی درویشی اور مسکینی ظاہر کرنے اور ان کو متاثر کرنے کے لیے بھیڑوں کی کھال کا لباس پہنیں گے ان کی زبانیں شکر سے زیادہ میٹھی ہوں گی مگر ان کے سینوں میں بھیڑیوں کے سے دل ہوں گے ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ میرے ڈھیل دینے سے دھوکہ کھارہے ہیں یا مجھ سے نڈر ہوکر میرے مقابلہ میں جرات کررہے ہیں پس مجھے اپنی قسم ہے کہ میں ان مکاروں پر انہی میں سے ایسا فتنہ کھڑا کروں گا جو ان کے عقلمندوں اور داناؤں کو بھی حیران کردے گا۔''

ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ سے ایک روایت یہ بھی منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم لوگ ''جُبُّ الْحَزَنِ ''(غم کے کنواں) سے پناہ مانگو۔ بعض صحابہ نے عرض کیا جُبُّ الْحَزَنَ کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا جہنم میں ایک وادی ہے(اس کا حال اتنا برا ہے کہ) خود جہنم ہر دن میں چار سو مرتبہ اس سے پناہ مانگتی ہے۔ عرض کیا گیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں کون لوگ جائیں گے؟ آپ نے فرمایا وہ بڑے عبادت گزار اور زیادہ قرآن پڑھنے والے جو دوسروں کو دکھانے کے لیے اچھے اعمال کرتے ہیں۔''

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کی طویل روایت ہے جس میں ریاء کار عالم، ریاء کار مجاہد اور ریاء کار سخی کے بارے میں بتایا گیا کہ ان کے اعمال کو ضائع قرار دے کر جہنم میں ڈالا جائے

گا۔اس روایت کو بیان کرتے ہوئے حضرت ابوہریرہؓ کبھی کبھی بے ہوش ہوجاتے تھے اور حضرت معاویہؓ کے بارے میں مشہور ہے کہ جب ان کے سامنے یہ حدیث بیان کی گئی تو وہ بہت روئے اور روتے روتے بے حال ہوگئے۔

لیکن ایک بات یہ بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ بہت دفعہ لوگ کسی شخص کے اعمال کو دیکھ کر اس سے محبت کرتے ہیں اس کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں اور اس طرح اس شخص کی شہرت ہوجاتی ہے تو یہ بات اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے، بشرطیکہ خود اس کے اندر ریاء کاری موجود نہ ہو۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ایسے شخص کے بارے میں کیا ارشاد ہے جو کوئی اچھا عمل کرتا ہے اس کی وجہ سے لوگ اس کی تعریف کرتے ہوں ایک روایت میں ہے کہ جو کوئی اچھا عمل کرتا ہو اور اس کی وجہ سے لوگ اس سے محبت کرتے ہوں تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ تو مومن بندے کے لیے نقد بشارت ہے۔

دراصل صحابہ کرامؓ کے ذہن میں ریاء کا اتنا خوف تھا کہ ان میں سے بعض کو شبہ ہونے لگا کہ لوگ ان کے نیک اعمال کی تعریف کرنے لگے تو کہیں یہ ریاء میں داخل نہ ہوجائے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لیا۔اس سے معلوم ہوا کہ عمل کرنے والے کے ارادہ اور کوشش کے بغیر اگر دوسرے لوگوں کو اس کے اعمال کا علم ہوجائے پھر ان کو اس سے خوشی اور محبت ہوجائے تو یہ اخلاص کے منافی نہیں۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو اخلاص کی حقیقت نصیب فرمائے۔

افواہیں پھیلانا

(شرعاً، اخلاقاً وقانوناً جُرم ہے)

﴿عن ابی هريرة رضی اللّٰه عنه قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم كَفٰی بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَاسَمِعَ﴾ (رواه مسلم)

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات (بلاتحقیق) بیان کردے۔"

آج کل معاشرہ میں بےچینی اور بےسکونی کا بہت بڑا سبب افواہیں ہیں۔عربی زبان میں "افواہ" فوہ کی جمع ہے یعنی "کئی منہ" چنانچہ افواہ میں بھی یہی ہوتا ہے کہ جتنے منہ اتنی باتیں اس لیے اردو میں بے بنیاد بات کو افواہ کہتے ہیں اور عربی زبان میں افواہ کو "شائِعةٌ" کہتے ہیں۔

اسلام نے ایک مومن کی شان یہ بیان کی کہ "مسلمان نہ دھوکہ دیتا ہے اور نہ دھوکہ کھاتا ہے" لہٰذا ایمان والے کی شان یہ ہے کہ وہ غلط بات کہہ کر دوسرے کو دھوکہ نہیں دیتا یہ اس کی شرافت کی علامت ہے اور کسی سے دھوکہ نہیں کھاتا یہ اس کے سمجھدار اور ہوشیار ہونے کی نشانی ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کفار کا ایک شاعر ابوعزہ مسلمانوں کے خلاف اشعار کہہ کر کفار کو جنگ میں بھڑکاتا تھا جنگ بدر میں یہ شاعر گرفتار ہوا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے وعدہ کیا کہ اگر اس مرتبہ چھوڑ دیا جائے تو وہ آئندہ مسلمانوں کے خلاف اشعار نہیں کہے گا آپ نے اسے چھوڑ دیا لیکن اس نے رہائی کے بعد دوبارہ مسلمانوں کے خلاف کفار کو اکسانا شروع کر دیا۔غزوۂ احد میں دوبارہ گرفتار ہوا پھر معافی مانگنے لگا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل کا حکم جاری فرما دیا اور ساتھ یہ فرمایا "کہ مومن کو ایک سوراخ سے دو دفعہ نہیں ڈسا جا سکتا۔" اور یہ بات ایمان والے کی ہوشیاری اور سمجھداری کی

دلیل ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لیس الخبر کالمعاینة" سنی ہوئی بات دیکھی ہوئی بات کی طرح نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے بھی سورۂ حجرات کی آیت ٦ میں ارشاد فرمایا:

"اے ایمان والو، اگر تمہارے پاس کوئی گنہگار خبر لے کر آئے تو تحقیق کرلو، کہیں تم کسی قوم پر نادانی میں نہ جا پڑو پھر تم بعد میں اپنے کیے پر پشیمان ہونے لگو" حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اکثر لڑائی جھگڑوں کی ابتداء جھوٹی خبروں سے ہوتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اختلاف کے اسی سرچشمہ کو بند کرنے کی تعلیم دی اور یہ ہدایت کی کہ بلاتحقیق کسی خبر کو قبول نہیں کرنا چاہیے۔

لہٰذا جب تک کسی بُری خبر کی تصدیق نہ ہو جائے یا اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لے دوسرے کو وہ نہیں بتانی چاہیے یہ بات درست ہے کہ سورۂ بقرہ کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے متقین کی یہ صفت بیان فرمائی ہے "کہ وہ اَن دیکھی بات یعنی غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔" ظاہر ہے کہ مسلمان کو ہر ان دیکھی بات پر یقین کرنے کا حکم نہیں اگر وہ خبر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے تو بے چون و چرا اس پر ایمان لانے کا حکم ہے لیکن اس کے علاوہ خبر کے جو عام ذرائع ہیں ان میں جھوٹ کا احتمال موجود ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "کہ کسی شخص کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بیان کرتا پھرے۔" لہٰذا افواہیں پھیلانے میں ایک تو جھوٹ بولنے کا گناہ ہوا اور پھر اگر خود جھوٹ بول رہا ہے دوسرا اسے سچا سمجھ رہا ہے تو یہ ایک اور بددیانتی ہے۔ ابوداؤد میں حضرت سفیان رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ بہت بڑی خیانت ہے کہ تو اپنے بھائی سے کوئی بات کہے اور وہ تجھے سچا سمجھ رہا ہو حالانکہ تو اس سے جھوٹ بول رہا ہے۔"

اب سوال یہ ہے کہ آخر افواہیں پھیلانے والوں کو ملتا کیا ہے؟ جب ماہرین نفسیات نے اس بارے میں انسانی ذہنوں اور طبیعتوں کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ انسانی طبیعت میں یہ

بات شامل ہے کہ وہ دوسرے کے دکھ کو بیان کر کے لذت وسرور محسوس کرتا ہے لیکن یہ جب ہی ہوتا ہے کہ جب ان دونوں کے درمیان محبت کے بجائے دشمنی، بغض اور نفرت موجود ہو۔ اگر دونوں کے درمیان محبت موجود ہو تو کبھی اس کے دکھ کو بیان کر کے لذت محسوس نہیں کرے گا۔

اسلامی تعلیمات میں مسلمانوں کو خصوصی طور پر یہ سبق دیا گیا ہے کہ اپنے بھائی کو مصیبت اور تکلیف میں دیکھ کر کبھی خوش نہ ہونا ورنہ اس کا انجام بہت بُرا ہے اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اپنے بھائی کو کسی مصیبت میں مبتلا دیکھ کر خوشی ظاہر نہ کرنا ورنہ اللہ تعالیٰ اس مصیبت زدہ پر رحم کرے گا اور تجھے اس مصیبت میں مبتلا کر دے گا۔''

ماہرین نفسیات کے تجزیہ کے مطابق افواہیں پھیلانے کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ دوسرے لوگوں کو خوف میں مبتلا کیا جائے کیونکہ یہ چیز بھی انسانی طبیعت میں ہے کہ دوسرے کو ڈرا کر خوف زدہ کر کے لذت محسوس ہوتی ہے یا دوسرے کو خوف زدہ کر کے اپنا مقصد پورا کر لیا جاتا ہے اسلام نے اس چیز کا بھی خاتمہ کیا۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سفر میں تھے ایک شخص سو رہا تھا، ایک صاحب اٹھے اور سونے والے کے قریب جا کر اس کے پاس پڑی ہوئی رسی اٹھالی، سونے والا اس سے ڈر گیا، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی مسلمان کو ڈرائے'' اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ افواہیں پھیلانے کا سبب شیطان بھی ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول منقول ہے فرماتے ہیں کہ بسا اوقات شیطان کسی آدمی کی صورت اختیار کر کے ایک جماعت کے پاس آتا ہے اور اس سے جھوٹی باتیں کہتا ہے پھر یہ جماعت منتشر ہو جاتی ہے۔

اور ان میں سے ایک آدمی کہتا ہے میں نے ایک شخص کو یہ بات بتاتے ہوئے سنا، میں اسے چہرے سے پہچانتا ہوں لیکن میں اس کا نام نہیں جانتا۔

اس لیے ایک مسلمان کی شان یہی ہے کہ وہ سنی سنائی بات بغیر تحقیق اور اعتماد کے بیان نہ کرے۔ بخاری اور مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول روایت میں ایک یہ بھی ارشاد نبوی ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ بھلائی کی بات کہے یا خاموش رہے۔''

اور اگر کوئی بُری بات سنے تو دوسرے لوگوں کو نہ بتائے۔ بُرائی کو ڈھانپ دینا ہی اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور اگر دوسرا شخص افواہیں پھیلاتے ہوئے کوئی بات کہے تو اسے منع کر دیا جائے کہ بغیر تحقیق کے بات نہ کرو، اگر وہ اپنی بات پر پختگی ظاہر کرے، اپنی معلومات کو یقینی ظاہر کرے تو پھر اس کے سامنے ان مصیبت زدہ اور پریشانی میں مبتلا لوگوں کے لیے دعائے خیر کر دے' اپنے آپ کو افواہوں کی لذت میں مبتلا ہونے سے ہر صورت بچائے اور اگر افواہیں سنا کر کوئی خوف پھیلانا چاہتا ہے تو ایمان کو پختہ رکھ کر کہنے والے کے سامنے ظاہر کر دے کہ انسان کو صرف اللہ ہی سے ڈرنا چاہیے' مخلوق سے ڈرنے کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور جو لوگ افواہوں کی وجہ سے خوف میں مبتلا ہوں انہیں بھی صبر و تحمل کرنا چاہیے۔ خوف الٰہی سے آشنا کیا جائے اور دلوں کو ذکر الٰہی میں مصروف کر لیا جائے اسی سے دلوں میں اطمینان وسکون آئے گا۔ اللہ تعالیٰ ہر طرح کے افواہیں پھیلانے والوں کو ہدایت نصیب فرمائے اور اہل معاشرہ کو خوف و ہراس سے نجات دے کر قلبی سکون نصیب فرمائے۔



ماحول کی آلودگی کا سبب بننے والا ہر شخص "ایذاءِ مسلم" کا مرتکب ہے

﴿عن عبداللّٰہ بن عمر رضی اللّٰہ عنہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْن مِنْ لِسَانِہٖ وَیَدِہٖ﴾

(رواہ البخاری ومسلم)

دورِ جدید کے معاشرتی مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ ماحول کی آلودگی ہے، اس مسئلہ کے حل کے لیے تحفظ ماحولیات کے شعبے قائم کیے جا رہے ہیں زبان وقلم اور دیگر ذرائع ابلاغ کے ذریعہ ماحول کے تحفظ کے لیے کوششیں کی جارہی ہیں ماحول کی آلودگی، کثافت کا فضا اور خلا میں پیدا ہونے والی خطرناک تبدیلیوں کی بنا پر مستقبل میں انسانیت کے لیے شدید خطرات سے آگاہ کیا جارہا ہے۔

یہ تمام اجتماعی اور محکمانہ کوششیں قابل ستائش ہیں لیکن ان کوششوں سے ماحول درست نہ ہوگا بلکہ ہر انسان اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داری پوری کرے تو پھر اس مسئلہ پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

لفظ "ماحول" عربی زبان میں دولفظوں کا مجموعہ ہے "ما" بمعنی جو کچھ اور "حول" بمعنی اردگرد۔ لہٰذا ماحول کا معنی ہوا جو کچھ ہمارے ادرگرد ہے یہ فضاء یہ جگہ، گھر' ساتھ رہنے والے انسان، دیواریں، راستے، درخت، پودے، پانی یہ سب ہمارے ماحول کا حصہ ہیں۔

لیکن جب اس فضا میں لاؤڈ سپیکروں کی بلند آوازیں' کاروں اور گاڑیوں کا شور اور ان کا دھواں، فیکٹریوں کا زہریلا دھواں اور دریاؤں اور نہروں میں فیکٹریوں کے زہریلے مادے بہانا اور کیمیائی مادوں کا بے انتہا استعمال، یہ سب کچھ ہمارے ماحول کو تباہ کر رہا ہے اور انسانیت کے لیے بیماریوں اور تکالیف کا باعث بن رہا ہے اور مستقبل میں یہ بھیانک خطرات

کی صورت میں سامنے آ رہا ہے۔

اسلام نے زندگی کے ہر پہلو میں مسلمانوں کو آداب واحکام سکھائے زندگی کے ہر مرحلہ میں پاکیزگی کا حکم فرمایا' ہر اس چیز سے بچنے کا حکم دیا جس سے دوسرے مسلمان کو تکلیف پہنچے' ہر تکلیف دہ چیز کو دور کرنے کا حکم دیا اور مسلمان کی شان یہ بیان کی کہ اس کی زبان اور ہاتھ یعنی قول وعمل سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

آج کے ماحول میں مسلمان کی زبان سے دوسرے مسلمان انتہائی تکلیف میں مبتلا ہیں، اور اس کی دوصورتیں عام ہیں ایک مساجد میں کانوں کے پردے پھاڑ دینے والے لاؤڈ سپیکروں کا شور اور دوسری طرف شادیوں اور دیگر تقریبات میں استعمال ہونے والے آلات موسیقی۔

لاؤڈ سپیکر ایک مفید ایجاد، لیکن اس کے غلط استعمال نے آج لوگوں کو مساجد سے دور کر دیا ہے' آج کا مسلمان مسجد کے قریب گھر بنانے یا کرایہ پر لینے کے لیے تیار نہیں' آبادی کی تعمیر کے وقت خالی پلاٹوں کی تقسیم کے دوران مسجد کی جگہ نقشہ میں ظاہر کرنے سے گریز کیا جاتا ہے کہ لوگ مسجد کے قریب کے پلاٹوں کو خریدنے سے گریز کرتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اجازت لیا کرتے تھے کہ ہم مسجد کے قریب گھر لینا چاہتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے کہ جتنی دور سے مجاہدہ کر کے آؤ گے ثواب ملے گا لیکن صرف لاؤڈ سپیکر کے غلط استعمال نے آج مسلمانوں کو مساجد سے دور کر دیا ہے۔ نہ دن کا آرام نہ رات کا چین کوئی بیمار ہو' طالب علم پڑھ رہا ہو' بچے گھروں میں رو رہے ہوں مساجد سے تقاریر اور دیگر بلند شور وغوغا نے سکون غارت کر دیا۔ اگر صرف اذان کے لیے استعمال کیا جاتا یا زیادہ سے زیادہ جمعہ کی تقریر کے لیے تو یقیناً اس کا استعمال درست ہوتا۔ سورۂ لقمان میں ارشاد باری ہے: وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَ صْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ۔ (اور اپنی آواز کو پست رکھو بے شک ناپسندیدہ آواز گدھے کی آواز ہے) لیکن اب گدھے کی آواز کی بلندی تو بہت پیچھے رہ گئی۔ اللہ تعالیٰ اس بارے میں دین کے ذمہ داروں کو اور ان شادی بیاہ کی تقریبات کے ذمہ دار لوگوں کو ہدایت عطا فرمائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل منقول ہے آپ ساز کی آواز سن کر کانوں میں انگلیاں

رکھ لیتے تھے۔ اب تو کانوں میں انگلیاں رکھنے سے بھی کام نہیں چلتا' درودیوار جھنجھنا اٹھتے ہیں' حالانکہ ارشاد نبوی کے مطابق مومن کا ایمان ہی جب مکمل ہوتا ہے جب اس کی تکلیف دہ باتوں سے اس کے ہمسائے محفوظ رہیں اور دوسرے مسلمان اس کے قول و عمل سے محفوظ رہیں' لیکن آج کے انسان اپنے عمل سے بھی ماحول کی لطافت کو کثافت اور پاکیزگی کو گندگی سے تباہ کر کے رکھ دیا۔

حالانکہ اسلام نے مسلمان کو واضح ہدایت دی کہ ''الطھور شطرالایمان'' طہارت و پاکیزگی ایمان کا حصہ ہے۔ ایک شخص پیشاب کی چھینٹوں سے نہیں بچتا تھا اسے قبر کا عذاب ہوا۔ (عن ابن عباس، بخاری و مسلم) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دولعنت والوں سے بچو، عرض کیا گیا، وہ کون ہیں؟ فرمایا ایک وہ شخص جو لوگوں کے راستہ میں قضائے حاجت کرے اور دوسرا وہ شخص جو لوگوں کے سایہ کی جگہ گندگی پھیلائے۔'' (رواہ مسلم) ابوداؤد کی روایت میں (جو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے) ایک اور شخص کو لعنت کا سبب قرار دیا جو دریا کے گھاٹوں (پانی پینے کی جگہ) پر گندگی کرے، جب آدمی سو کر اٹھے تو اسے ہدایت دی گئی کہ تین دفعہ ہاتھ دھو کر پھر پانی کے برتن میں ڈالے (عن ابی ہریرہ، متفق علیہ) کھڑے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا۔ (عن ابی ہریرہ، متفق علیہ) غور فرمایئے اب نہروں اور جوہڑوں میں گندگی پھیلانے اور فیکٹریوں کے کیمیکلز کو نہروں میں بہانے اور اسی طرح آبی جانوروں کو نقصان پہنچانا اور پینے کے پانی کو آلودہ کرنا شرعی طور پر بھی جائز نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فضاء کی لطافت اور پاکیزگی کے بارے میں انتہائی حساس رہنے کا حکم فرمایا جمعہ کے روز مسجد نبوی میں لوگ جمع ہوتے، مسجد میں پسینہ کی بو پھیلنے لگتی، آپ نے جمعہ کے روز خوشبو لگانے کا حکم دیا' مسجد میں کچا لہسن اور پیاز کھا کر آنے سے منع فرمایا۔ (عن معاویہ، ابوداؤد) ایک روایت میں فرمایا کہ جن چیزوں سے انسانوں کو گھن آتی ہے ان سے فرشتوں کو بھی گھن آتی ہے لہٰذا بدبودار چیزیں کھا کر مسجد میں نہ آیا کرو، سبحان

اللہ مسلمان کو اتنا لطیف اور پاکیزہ رہنے کا حکم فرمایا کہ فضا میں مسلمان کے عمل کی وجہ سے آلودگی نہ آنے پائے جو دوسروں کے لیے تکلیف دہ ہو۔ لہٰذا موٹر سائیکل رکشا اور کار اور ویگن والے مشینوں کو درست نہ رکھ کر فضا کو آلودہ کرنے پر شرعی طور پر مسلمانوں کو تکلیف دینے کا سبب بن رہے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے پینے کی چیزوں کو بھی ماحول کی آلودگی سے بچانے کا حکم دیا مشکوٰۃ شریف میں برتن کو ڈھانکنے کے حکم پر مشتمل احادیث ایک تفصیلی باب میں جمع کی گئی ہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''رات کو برتنوں کو ڈھانک دیا کرو۔'' ایک مرتبہ ایک انصاری صحابی ابوحمید رضی اللہ عنہ مقام نقیع سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دودھ لائے آپ نے فرمایا تم اس دودھ کو ڈھانک کر کیوں نہیں لائے اور کچھ نہیں تو اس پر ایک لکڑی ہی رکھ لی ہوتی۔'' (عن جابرؓ بخاری و مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بخاری اور مسلم میں روایت منقول ہے کہ تُمِیْطُ الأَذی عَنِ الطَّرِیْقِ صَدَقَةٌ (راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا صدقہ ہے) لہٰذا آج کے دور میں ماحولیات کی آلودگی کا باعث بننے والی اشیاء کو روکنا بھی ثواب کا باعث ہے۔



(اسلامی معاشرہ)

ہر فرد کی ذمہ داریاں

﴿عن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم المسلم اخو المسلم لا یَظْلِمُہٗ وَلَا یَخْذُلُہٗ وَلَا یُحَقِّرُہٗ اَلتَّقْویٰ ھٰھُنَا (وَیُشِیْرُ اِلٰی صَدْرِہٖ ثَلٰثَ مِرَارٍ) بِحَسْبِ امْرِءٍ مِنَ الشَّرِّ اَنْ یُحَقِّرَ اخاہ الْمُسْلِمَ کُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ حَرَامٌ دَمُہٗ وَمَا لُہٗ وعِرْضُہٗ﴾(رواہ مسلم)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے لہٰذا نہ خود اس پر ظلم و زیادتی کرے نہ دوسروں کو ظالم بننے کے لیے اس کو بے یارو مددگار چھوڑے نہ اس کی تحقیر کرے (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ سینے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا) ''تقویٰ یہاں ہوتا ہے'' کسی شخص کے لیے یہی برائی کافی ہے کہ وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے اور اس کی تحقیر کرے ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان کے لیے حرام ہے اس کا خون، اس کا مال اور اس کی آبرو۔''

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا فرما کر مختلف قبیلوں اور خاندانوں میں تقسیم فرما دیا پھر یہ انسان مل جل کر زندگی گزارنے لگا یہی معاشرہ کہلانے لگا اور اس میں رہنے والے انسان معاشرہ کے افراد کہلانے لگے لفظ معاشرہ کا مطلب ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر زندگی گزارنا ہے لیکن اصطلاح میں معاشرہ سے مراد وہ انسانی اجتماعی زندگی ہے جو کسی خاص فکر و عمل کے نظام پر چل رہی ہو' اگر کچھ انسان ایک جگہ جمع ہو کر بے مقصد زندگی گزاریں تو اسے معاشرہ نہیں کہا جائے گا۔

لہٰذا اسلامی معاشرہ ایسا معاشرہ کہلائے گا جو خالص اسلامی فکر و عمل کے نظام پر قائم

ہوٗ احکام اسلام پر عمل کرنے والا معاشرہ ہوٗ یہ تب ہوگا جبکہ ہر فرد ان ذمہ داریوں کو پورا کر رہا ہو جو اسلام نے اس پر فرض کی ہیں لیکن جب معاشرہ کے افراد یہ کہنے لگیں کہ جناب! معاشرہ ہی خراب ہے ہم کیا کریں یا یہ کہا جائے دوسرے افراد تو فرائض انجام نہیں دیتے ہمارے کرنے سے کیا ہوگا یعنی معاشرہ کا ہر فرد یہی سوچ کر فرائض کی طرف سے آنکھ بند کر لے تو پھر یقیناً پورا معاشرہ بے سکون ہو جائے گا کیونکہ انہی افراد کا نام معاشرہ تھا۔ اگر ہر شخص کی سوچ یہ بن جائے کہ میں اپنا فرض ادا کروں گا چاہے اور کوئی کرے یا نہ کرے دوسروں کو فرائض ادا کرنے کی ترغیب بھی دوں گا چاہے کوئی مانے یا نہ مانے تو پھر وہ معاشرہ ایک کامیاب معاشرہ کہلائے گا اس لیے کہ معاشرہ کے ہر فرد نے اپنا پہلا فرض یہ ادا کیا کہ ایمان قبول کیا اور بالکل ایک جیسا عقیدہ کہ میں اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، اور قیامت کے دن پر ایمان لایا لہٰذا تمام افراد کی فکر ایک ہوئی، پھر نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کے ارکان پر ہر مسلمان عمل کرتا ہے تو اس سے وحدتِ عمل پیدا ہوئی ہر ایک کا عمل اور سوچ جب ایک جیسی ہوگی تو یہ کسی معاشرہ کے مستحکم ہونے کی پہلی شرط ہے۔

اب یہ افراد زندگی گزارنے لگے تو قدرتی تقسیم کے مطابق خاندانوں، ذاتوں، برادریوں اور قبیلوں میں بٹ کر زندگی گزارنے لگے۔ یہ ایک قدرتی اور فطرتی تقسیم ہے لیکن انسان سے یہاں ایک غلطی ہوگئی، وہ اس تقسیم کو باہمی تعارف کے بجائے عزت و ذلت کا معیار سمجھنے لگا جبکہ اللہ رب العزت نے فرمایا۔ **ان اکرمکم عنداللّٰہ اتقٰکم** ۔ اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا وہ شخص ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے۔'' اسلام نے عزت و ذلت کا معیار خاندانی تعلق نہیں بنایا بلکہ ہر فرد کے ذاتی اخلاق اور اچھے اعمال کو عزت کا معیار بنایا اور ہر فرد پر تقویٰ اختیار کرنا فرض قرار دیا۔

پھر یہ افراد معاشرتی زندگی میں مختلف معاملات انجام دیتے ہیں ان میں عدل و انصاف کو فرض قرار دیا' گھریلو زندگی میں عدل کا حکم دیا' یتیموں کے ساتھ عدل کا حکم دیا' ناپ تول میں انصاف کا حکم دیا' لین دین میں' عدالتی امور میں، دستاویزات لکھنے میں، گواہی دینے

میں، فیصلہ کرنے میں حتیٰ کہ اپنی ذات سے بھی انصاف کرنے کا حکم دیا گیا۔ سورۂ شوریٰ کی پندرہویں آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غیر مسلموں سے بھی انصاف کرنے کا حکم دیا گیا۔ وَاُمِرۡتُ لِاَعۡدِلَ بَیۡنَکُمۡ غیر مسلم جو مسلمانوں کے ملک میں رہتے ہوں اور اس مسلمان ملک کے قوانین پر عمل کرتے ہوں انہیں اقلیت کہا جاتا ہے اسلام نے معاشرے کے ہر فرد پر ان اقلیتوں کے مال ان کی جان ان کی عزت و آبرو کی حفاظت فرض قرار دی ہے۔ ایک اسلامی معاشرہ میں ہر فرد کو رواداری کا مظاہرہ کرنے کا پابند کیا گیا ہے اسی چیز سے کسی معاشرہ میں باہمی احترام پیدا ہوتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا باہمی شفقت، محبت اور مہربانی میں تم ایمان والوں کو ایک جسم کی طرح پاؤ گے' اگر جسم کا ایک عضو تکلیف میں مبتلا ہو جائے تو سارا جسم بیداری اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اگر ایک گھر میں ایک خاندان میں ایک شہر میں کسی فرد کو تکلیف پہنچے باقی افراد اس تکلیف اور دُکھ کو محسوس کر کے ہمدردی اور بھائی چارے کے جذبات کے ساتھ اس مصیبت اور دکھ کو دور کرنے کا فریضہ انجام دیں تو یہی معاشرہ فلاحی معاشرہ بن جائے گا۔

بسا اوقات معاشرہ کے افراد میں ایک دوسرے سے دوری اور فاصلہ بڑھ جاتا ہے جب وہ افراد سادگی کا فرض ادا کرنے کی بجائے نام اونچا کرنے اور نمائش کرنے میں مبتلا ہو جائیں اس لیے کہ نمائش کرنے والا اپنے کو برتر اور دوسرے کو حقیر سمجھے گا اور جس کو حقیر سمجھا گیا وہ اپنے آپ کو بے بسی اور دوسرے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھے گا اس طرح معاشرہ کے افراد کے دلوں میں دوریاں پیدا ہوں گی۔ اس لیے اسلام نے معاشرتی زندگی میں فضول خرچی سے منع کیا' نمائش کو ممنوع قرار دیا اور سادگی اختیار کرنے کی تلقین کی۔ اس کے ساتھ ساتھ ظاہری اور باطنی پاکیزگی بھی ہر فرد پر فرض قرار دی ہر فرد اپنے اندر سے حسد، بغض، کینہ، نفرت، جھوٹ، منافقت نکال دے اور محبت' سچائی اور ہمدردی کے ذریعہ پاکیزہ بنے، اسی طرح ظاہری طہارت اور پاکیزگی کو بھی فرض قرار دیا۔ اپنے جسم کو پاک رکھے اپنے کپڑوں کو پاکیزہ رکھے جہاں رہتا ہو، صاف ستھرا ہو، جہاں سے گزرتا ہو اس کی صفائی کا خیال رکھتا ہو۔ رسول

اکرم ﷺ نے تو راستے سے گندگی اور تکلیف دہ چیز ہٹانے کو صدقہ قرار دیا۔

اس لیے ایک مسلمان فرد کی یہ ذمہ داری بھی ہو گی کہ وہ اپنے اردگرد یعنی اپنے ماحول کو آلودہ ہونے سے محفوظ رکھے۔ مشینی سواری چلا رہا ہے تو دوسرے افراد کو دھوئیں سے بچائے۔ یہ فرد فیکٹری چلا رہا ہے تو اپنے معاشرے کے باقی افراد کو زہریلے دھوئیں سے بچائے اور فیکٹری سے نکلنے والے زائد کیمیکلز کو محفوظ طریقے سے ضائع کرے تاکہ باقی افراد کو اس کے ذریعہ کسی قسم کا نقصان نہ پہنچنے پائے اس لیے کہ مسلمان کی شان ہی یہی ہے۔ **المسلم من سلم المسلمون من لسانہٖ ویدہ،** مسلمان وہ شخص ہے جس کے قول و فعل سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں،اسلام نے ہر فرد کو مکمل آداب و اطوار کے ساتھ زندگی گزارنے کا پابند کیا ہے کھانے پینے، اٹھنے، بیٹھنے،سونے جاگنے، چلنے پھرنے غرض زندگی کے ہر مرحلے کے لیے آداب سکھائے، اس لیے اسلامی معاشرہ ایک منظّم معاشرہ ہوتا ہے۔ اس کے ہر فرد کا عمل تعمیری ہوتا ہے اسلام نے کسی فرد کو وقت کے کسی لمحہ کو ضائع کرنے سے منع کیا اور واضح کر دیا کہ آخرت میں وقت کے بارے میں باقاعدہ پوچھا جائے گا کہ تم نے وقت کہاں کہاں صرف کیا پھر جب یہ فرد بے کار کاموں سے بچے گا تو یہ اس کی خوبی ہو گی۔ ارشاد نبوی ہے:

﴿من حسن اسلام المرءِ ترکہ' مالا یعنیہٖ﴾

''کسی شخص کے اسلام کی یہ خوبی ہے کہ وہ بے مقصد کاموں کو چھوڑ دے، اور بامقصد کام کرنے میں یہ فرد اپنا پورا وقت صرف کر دے اور وہ کام جو ہر وقت کرنا ہے وہ ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔''

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر﴾

''لہٰذا نیکی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا یہ معاشرہ کے ہر فرد کا فرض

ہے۔‘‘

ارشاد نبوی ہے:’’ جو تم میں سے کسی برائی کو دیکھے تو اسے چاہیے کہ ہاتھ سے روکے اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے روکے اگر اس کی بھی ہمت نہ ہو تو اس برائی کو دل میں بُرا سمجھے اور فرمایا کہ یہ آخری درجہ کمزور ترین ایمان کا ہے۔‘‘ لہٰذا معاشرہ کا ہر فرد جب خود اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کی فکر کرے گا اور دوسرے کے حقوق کا خیال رکھتے ہوئے نیکی کی تلقین اور برائیوں سے روکنے کی کوشش کرتا رہے گا تو پھر یقیناً اسلامی معاشرہ کا ہر فرد خود بھی ایک پرسکون اور مطمئن زندگی گزار سکے گا اس کے اردگرد رہنے والے اس کے ہمدرد اور دکھ درد میں شریک رہیں گے‘ ایک ایسا معاشرہ نصیب ہوگا جسے ہر فرد سکون کا گہوارہ محسوس کرے گا۔



اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ

﴿عن صفوان بن سلیم عن عدة من ابناء اصحاب رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم عن آبائهم عن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال الا من ظلم معاهداً او انتقصه و کلفه فوق طاقتهٖ اَو اخذمنه شیئاً بغیر طیب نفسهٖ فانا حجیجه یوم القیمةِ﴾(رواہ ابوداؤد)

''حضرت صفوان بن سلیم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے............رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خبردار! جس شخص نے اس شخص سے ظلم کیا جس سے اس کا معاہدہ ہو چکا ہے یا اس کے حق کو ضرر پہنچایا یا اس کی طاقت سے زیادہ اسے تکلیف دی یا اس کی رضا مندی کے بغیر اس سے کوئی چیز لی تو میں ان سے قیامت کے دن جھگڑوں گا۔''

اللہ تعالیٰ نے سورۂ حج کی اکتالیسویں آیت میں مہاجرین صحابہ کی ایک خوبی بیان فرمائی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ان کو زمین میں حکومت و اقتدار دے دیا جائے تو یہ لوگ اپنے اقتدار کو ان کاموں میں صرف کریں گے کہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کاموں کی طرف لوگوں کو دعوت دیں اور برے کاموں سے روکیں۔

یہ آیت ہجرت مدینہ کے فوراً بعد اس وقت نازل ہوئی جبکہ مسلمانوں کو زمین کے کسی بھی حصہ پر حکومت و اقتدار حاصل نہ تھا مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں پہلے ہی خبر دے دی کہ جب ان کو اقتدار حکومت ملے گا تو یہ دین کی اہم خدمات انجام دیں گے اور مکمل نفاذِ شریعت کا فریضہ انجام دیں گے۔ اللہ رب العزت کی یہ قبل از وقت خوشخبری اسی طرح پوری ہوئی کہ چاروں خلفائے راشدین جو کہ مہاجرین میں سے تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ان کو زمین کی حکومت اور سلطنت عطا فرمائی اور اولین دور،

دورِ خلفائے راشدین تاریخ کا روشن حصہ بنا۔

خلافت کا لفظی مطلب نیابت اور جانشینی ہے اور اسلامی اصطلاح میں خلافت اس حکومت کو کہتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین اسلام کو مضبوط اور مستحکم کرے اور دینی احکام کو عوام میں نافذ اور جاری کرے اور جو شخص یہ ذمہ داری انجام دے اسے خلیفہ کہتے ہیں جس کا تمام ملکی اور قومی نظم ونسق طریقہ نبوت کے مطابق ہو۔ آج تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ خلفائے راشدین کا دور تاریخ اسلام کا ایک سنہری دور ہے مسلمان مؤرخین نے اس دور کے ایک ایک پہلو کو اُجاگر کیا ہی ہے لیکن غیر مسلم مورخین کو بھی یہ لکھنا پڑا کہ خلفائے راشدین کا دور نہایت شاندار تھا اوران کا عہد خلافت دنیا بھر کی حکومتوں کے لیے ایک مثالی حقیقت رکھتا ہے' اس دور میں جہاں تمام مسلمانوں کے ہر طرح کے حقوق کا خیال رکھا جاتا وہاں ذمیوں کے حقوق کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔

لفظ ذمی ذمۃ سے بنا ہے ہم اردو میں بھی یہ لفظ استعمال کرتے ہیں۔ کام فلاں کے ذمہ ہے یا یہ میری ذمہ داری ہے۔ ذمہ کا مطلب ہوتا ہے، عہد و پیمان، ضمانت، نگرانی، لہٰذا ذمی کا مطلب ہوا ذمہ والا۔ اسلامی اصلاح میں ذمی کا مفہوم یہ ہے کہ وہ غیر مسلم جو اسلامی ریاست میں رہتے ہوں اور اسلامی حکومت نے ان کے مال و جان اوران کی آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کر لی ہو۔ آج کل شہریت اور علم سیاسیات میں ان کو اقلیت کہا جاتا ہے۔

جس طرح مسلمان رعایا کی عزت وآبرو اور جان و مال کی حفاظت اوران کی خوشحالی اسلامی حکومت کا فریضہ ہے اس طرح غیر مسلم اقلیت کا تحفظ اور خوشحالی بھی اسلامی حکومت کا فرض ہے۔ غیر اقلیت معاشی طور پر بھی آزاد ہوتے ہیں جو پیشہ چاہے اختیار کریں، اقلیتوں کو ہر طرح مذہبی آزادی حاصل ہوتی ہے بشرطیکہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو اس سے ٹھیس نہ لگتی ہو، اقلیتوں کو مسلمانوں کے ساتھ معاشرتی مساوات بھی حاصل ہوتی ہے۔

اولین دور میں ذمیوں یعنی اقلیتوں کے مال و جان کی حفاظت کے بدلے انہیں ایک معمولی سا ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا جسے جزیہ کہا جاتا ہے بچے، بوڑھے، اور معذور افراد اس ٹیکس سے مستثنٰی ہوتے ہیں اور جو ذمی معذور یا محتاج ہوتا اسے قومی بیت المال سے وظیفہ ملتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری وقت میں ذمیوں یعنی اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کی بڑی تاکید فرمائی تھی اسی لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کا خصوصی خیال رکھتے تھے۔ عہد رسالت میں اقلیتوں کے حقوق متعین ہو چکے تھے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی ان کو وہی حقوق حاصل رہے اور نئے ذمیوں کو بھی وہی حقوق عطا کیے چنانچہ حیرہ کے عیسائیوں سے ذمہ داری کا معاہدہ کرتے ہوئے طے پایا کہ ان کی خانقاہیں اور گرجے منہدم نہیں کیے جائیں گے اور نہ کوئی ایسا محل گرایا جائے گا جو ان کے دشمنوں سے بچاؤ کے کام آتا ہو، ناقوس بجانے کی ممانعت نہ ہو گی اور نہ تہوار کے موقع پر صلیب نکالنے سے روکا جائے گا۔

اقلیتوں کے لیے جزیہ کی صورت کا ٹیکس بھی نہایت آسان تھا اور بہت سے ذمی اس سے مستثنٰی کر دیئے جاتے تھے چنانچہ حیرہ کے سات ہزار باشندوں میں سے ایک ہزار بالکل مستثنٰی تھے اور باقی اقلیتی افراد سے دس دس درہم سالانہ لیا جاتا تھا اور اپاہج اور نادار ذمیوں سے مخصوص ٹیکس نہیں لیا جاتا تھا اور ان کی کفالت کا بیت المال ذمہ دار تھا۔ یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے کہ کسی حکومت کے عدل و انصاف اور مساوات کو جانچنے کا سب سے بڑا معیار یہ ہے کہ اس حکومت کا طرز عمل غیر قوموں کے ساتھ کیسا ہے اور اس حکومت میں اقلیتوں کو کیا حقوق حاصل ہیں اور ریاست اقلیتوں کی خوشحالی کے لیے کیا کردار ادا کر رہی ہے اس معیار کے اعتبار سے عہد فاروقی عدل و مساوات کا نمونہ تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں عرب کی دو ہمسایہ حکومتیں تھیں ایک روم اور دوسری فارس یہ دونوں حکومتیں عہد فاروقی میں اسلام کے زیر سایہ آئیں ان دونوں حکومتوں کا طرز عمل خود اپنی قوم کی رعایا کے ساتھ غلاموں سے بھی بدتر تھا تو دوسری ماتحت قوموں کا حال خود ہی سوچ لیجیے کیا ہو گا؟ لیکن جب یہی قومیں اسلام کے زیر نگیں ہوئیں تو ان کی حالت ہی بدل گئی ہر طرح کے جائز حقوق اور جائز آزادی دی گئی اور اقلیتوں کو خوشحالی نصیب ہوئی۔

کسی قوم کے حقوق بنیادی طور پر تین چیزوں سے متعلق ہوتے ہیں جان، مال اور مذہب ان کے علاوہ باقی حقوق ان کے تحت آ جاتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تمام

منقوحہ قوموں کے ان تینوں بنیادی حقوق کا ذکر کیا' اس دستاویز کا آغاز ان کلمات سے ہوتا ہے "یہ وہ امان ہے جو خدا کے غلام امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہل ایلیا کو دی یہ امان جاں و مال، گرجا، صلیب، تندرست، بیمار اور ان کے تمام اہل مذہب کے لیے ہے۔" مستند تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اقلیتوں کے ساتھ یہ حسن سلوک صرف چند مقامات کے لیے نہیں تھا بلکہ اہل جرجان کے لیے مراعات کے الفاظ گواہ ہیں۔ آذر بائیجان کا معاہدہ، موقان کا معاہدہ اور پھر خلفائے راشدین کے وہ خطوط موجود ہیں جن میں تمام فاتح جرنیلوں کو اور تمام حکومت کے ذمہ دار افراد کو تاکید کی جاتی تھی کہ اقلیتوں کا خصوصی خیال رکھا جائے۔

یہاں تک کہ اگر کوئی مسلمان اقلیتوں میں سے کسی ذمی کو قتل کر دیتا تو خلفائے راشدین اس سے قصاص لیتے۔ چنانچہ الدرایہ فی تخریج الھدایہ میں ہے کہ قبیلہ بکر بن وائل کے ایک شخص نے حیرہ کے عیسائی کو قتل کر دیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قاتل کو مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دیا انہوں نے قتل کا بدلہ لیتے ہوئے اسے قتل کر دیا" اسی طرح اقلیتوں کی املاک کو کوئی نقصان پہنچتا تو اس کو معاوضہ دلایا جاتا۔ ایک مرتبہ فوج نے شام کے ایک ذمی کے کھیت کو روند ڈالا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو بیت المال سے دس ہزار کا معاوضہ دلایا۔"

پھر ذمیوں سے جزیہ کی شکل میں جو ٹیکس لیا جاتا تھا اس کی حیثیت خلفائے راشدین کے معاہدوں میں موجود ہے کہ یہ صرف ذمہ داری اور حفاظت کے لیے ٹیکس تھا۔ اور اس ٹیکس کی وصولی میں انتہائی احتیاط کی جاتی اور اس بات کا بڑا اہتمام کیا جاتا کہ ٹیکس کی کوئی رقم جبراً اور ظلم سے وصول نہ کی جائے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں ذمیوں نے شکایت کی کہ ہمارے عامل عمرو بن مسلمہ رضی اللہ عنہ سختی کر رہے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو فوراً تحریری ہدایات روانہ کیں۔ ایک مرتبہ جس علاقہ میں اقلیتی رہتے تھے وہاں کی نہر میں مٹی زیادہ ہونے کی وجہ سے

آبپاشی میں رکاوٹ پیدا ہوئی تو وہاں کے حاکم حضرت قرضہ بن کعب انصاری رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو الفاظ لکھے وہ ایک روشن مثال ہے کہ خلفائے راشدین نے اقلیتوں کی خوشحالی کا کسی قدر فکر کیا فرمایا کہ تمہارے علاقہ کے اقلیتوں نے درخواست دی ہے کہ ان کی ایک نہر مٹی آنے کی وجہ سے بند ہوگئی ہے اس کا بسانا مسلمانوں کا فرض ہے تم اسے دیکھ کر درست کرا کے آباد کردو میری عمر کی قسم! مجھے اس کا آباد رہنا زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ اقلیتی لوگ ملک سے نکل جائیں یا وہ عاجز اور درماندہ ہو جائیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور ہے ایک مرتبہ ایک ضعیف شخص کو بھیک مانگتے دیکھا۔ پوچھا'' بھیک کیوں مانگتا ہے'' اس نے کہا میں اقلیت سے تعلق رکھتا ہوں مجھ پر جزیہ لگا ہوا ہے اور میں جزیہ ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس اقلیتی کو اپنے گھر لے گئے اور کچھ نقد دیا اور پھر داروغہ سے کہلا بھیجا کہ اس قسم کے لوگوں سے جزیہ نہ لیا جائے اور بیت المال سے وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔ غیر مسلم اقلیتوں سے خلفائے راشدین کا طرز عمل ان کے حقوق کا تحفظ اور ان کی خوشحالی کی فکر، یقیناً سب کچھ شریعت اسلامیہ کے نفاذ کے ثمرات تھے۔



قومی مفادات کا تحفظ

اصلاحِ معاشرہ میں ہر فرد کا فرض ہے

﴿عن ثوبان رضی اللّٰہ تعالیٰ عنه قال قال النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم یوشك الامَمُ اَن تداعیٰ عَلَیۡکُمۡ کَمَاتَدَاعیٰ الْاٰ کِلَةُ اِلیٰ قَصۡعَتِهَا فَقَالَ قائلٌ وَمِنۡ قلَّةٍ نَحۡنُ یَوۡمَئِذٍ قَالَ بَلۡ اَنۡتُمۡ یَوۡمَئِذٍ کثِیۡرٌ وَلٰکِنَّکُمۡ غُثَاءٌ کَغُثَاءِ السَّیۡلِ وَلَیَنۡزِعَنَّ اللّٰهُ مِنۡ صُدُوۡرِ عَدُوِّکُمۡ الۡمَهَابَةَ مِنۡکُمۡ وَلَیَقۡذِ فَنَّ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ اَلۡوَهۡنَ قَالَ قَائِلٌ یَارَسُوۡلَ اللّٰهِ مَا الۡوَهۡنُ قَالَ حُبُّ الدُّنۡیَا وَکَرَاهِیَةُ الۡمَوۡتِ﴾ (رواہ ابوداؤد)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قریب ہے کہ بعض امتیں تمہارے خلاف آپس میں ایک دوسرے کو اس طرح دعوت دیں گی جس طرح ایک پیالہ کی طرف کھانے والی دعوت دیتی ہے، عرض کیا گیا کہ کیا ہم اس وقت تعداد میں کم ہوں گے؟ فرمایا نہیں بلکہ تمہاری تعداد بہت ہو گی لیکن تم سیلاب کے جھاگ کی طرح ہو گے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے سینوں سے تمہاری ہیبت اور رعب نکال دے گا اور تمہارے دلوں میں کمزوری پیدا ہو جائے گی۔ عرض کیا یا رسول اللہ کمزوری سے کیا مراد ہے؟ فرمایا دنیا کی محبت اور موت کی ناپسندیدگی۔

اللہ رب العزت نے پوری انسانیت کو پیدا فرمایا تمام لوگوں اللہ کی مخلوق ہونے میں برابر ہیں لیکن قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو حصوں میں تقسیم فرمایا فَمِنۡکُمۡ کَافِرٌ

وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ ایک کافر اور ایک ایمان والے۔ ایمان وکفر کی بنیاد پر انسان دو قوموں میں تقسیم کر دیا گیا ایک مومن قوم اور دوسری کافر قوم۔ اسی دو قومی نظریہ کی بنا پر پاکستان وجود میں آیا۔ مسلمان اور کافر دو الگ الگ قومیں ہیں دونوں کی تہذیب الگ دونوں کا تمدن الگ، دونوں کی معاشرت الگ، نظریات الگ، اسی لیے مسلمانوں کے لیے علیحدہ مملکت کا مطالبہ کیا گیا۔ اب جبکہ مسلمان قوم کو الگ وطن مل چکا تو اسلامی معاشرہ کے ہر فرد کے فرائض میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ قومی مفادات کا تحفظ کرے۔

لیکن اسلام نے رنگ، نسل، علاقائی تعصب، لسانی تعصب، خاندان اور برادری کا تعصب ختم کر کے ایک مسلمان قوم کا تصور دیا۔ اب اسلامی معاشرے کے ہر فرد کا یہ فرض قرار دیا گیا کہ قومی مفاد کی حفاظت کرے، ہر شخص کو اپنی ذمہ داری سمجھنے کا اصول سکھایا گیا۔ ارشاد نبوی ہے:

﴿تَرَى الْمُؤْمِنِينَ فِيْ تراحمهم وَتوَادِّ هِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجسدِ اِذَا اشْتَكىٰ عُضْوٌ تَداعىٰ لَه، سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهْرِ وَالْحُمّٰى﴾

”فرمایا تم مسلمانوں کو آپس میں رحم کرنے، شفقت اور محبت کرنے میں ایک جسم کی طرح دیکھو گے کہ جب کوئی تکلیف کی شکایت کرے تو سارا بدن بیداری اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔“

واقعی اگر انگلی میں زخم آ جائے تو پورا بدن تکلیف محسوس کرتا ہے اور اس کا علاج کرنے کی فکر کرتا ہے۔ دماغ کہتا ہے کہ ڈاکٹر کے پاس چلیں، ٹانگیں ڈاکٹر صاحب تک پہنچاتی ہیں۔ تکلیف انگلی میں ہے لیکن زبان تکلیف بتا رہی ہے کہ ڈاکٹر صاحب انگلی میں تکلیف ہے کان سننے کا کام کر رہے ہیں، آنکھیں راستہ دکھا رہی ہیں دوسرا ہاتھ دوائی سنبھال رہا ہے اور پیسے دے رہا ہے پورا بدن اس تکلیف کو دور کرنے میں مصروف ہوا، تکلیف دور ہو گئی۔ اس طرح جب قوم کا ہر فرد ذاتی مفاد کی سوچ ختم کر کے قومی مفاد کی سوچ پیدا کر لے تو پھر اس

کے ذاتی مفادات بھی حل ہوتے چلے جائیں گے اور ہر فرد دوسرے فرد کے لیے سہارا بنتا چلا جائے گا۔ارشادنبوی ہے:

﴿اَلْـمـؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ کَالْبُنْیانِ یَشُدُّ بَعْضُه، بَعْضًا ثُمَّ شَبّك بَیْنَ اصابِعِهٖ﴾

''فرمایا ہر مومن دوسرے کے لیے ایک دیوار کی طرح ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو مضبوط کرتا ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں پھنسا کر فرمایا کہ اس طرح۔''

لہٰذا قومی مفاد کی حفاظت کے لیے اتفاق و اتحاد ایک بنیادی شرط ہے چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے ساتھ ساتھ امیر کی اطاعت کا بھی حکم دیا لہٰذا اسلامی معاشرہ میں ہر فرد کے فرائض میں یہ بات بھی شامل ہوگئی اور پھر جب اس فرد کو کوئی منصب یا عہدہ دیا جائے' مشیر بنایا جائے تو اب قومی مفاد کے تحفظ کی خاطر اسے مکمل راز داری اختیار کرنا ہوگی۔ارشادنبوی ہے:

﴿المستشار مؤتمن﴾

''یعنی جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ امانت والا ہو جاتا ہے۔''

اسی طرح اپنے فرائض اور واجبات کی ادائیگی بھی قومی تحفظ کا ایک اہم حصہ ہے حتیٰ کہ پانی اور بجلی کا بل، سوئی گیس وغیرہ کا بل ادا کرنا بھی چونکہ قومی مفادات میں شامل ہے لہٰذا اسلامی نقطہ نظر سے ان کا صحیح طریقے سے ادا کرنا بھی ایک فرد کے فرائض میں شامل ہوا۔

نیک کاموں میں تعاون اور برے کاموں سے کنارہ کشی بھی ایک قومی فریضہ ہے۔ اس لیے ارشاد باری تعالیٰ میں اس بارے میں حکم دیتے ہوئے جمع کا لفظ استعمال فرمایا۔

﴿وتعـاونـوا عـلـى البـر والتـقـوىٰ ولا تـعـاونوا على الاثمِ والعدوان﴾

حلال کمانے کی فکر اور جائز طریقے سے خرچ کرنے کو بھی اللہ کے نیک

بندوں کے اوصاف میں شامل کیا گیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذالك قواماً﴾

یعنی ''اللہ کے بندے جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل کرتے ہیں بلکہ ان کا خرچ اعتدال سے ہوتا ہے۔''

چنانچہ بے جا خرچ بھی قومی مفادات کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے اس لیے کہ افراطِ زر کسی بھی قوم کی معاشی حالت کو تباہ کر دیتا ہے لہٰذا حرام مال سے پرہیز کرنا بھی قومی مفادات کے تحفظ کے لیے ضروری ہے۔

مسند احمد میں روایت منقول ہے ارشاد ہوتا ہے:

﴿مَامِنْ قَومٍ یَّظْهَرُ فیهِمُ الرِّبٰوا اِلا اُخِذُوا بِالسِّنةِ وَمَا مِنْ قَوْمٍ تَظْهَرُ فِیهِمُ الرَّشَااِلَّا اُخِذُوا بِالرُّعْبِ﴾

فرمایا ''جس قوم میں سود پھیل جائے وہ قوم قحط اور مہنگائی میں مبتلا ہو جاتی ہے اور جس قوم میں رشوتیں پھیل جائیں' اس قوم پر ہیبت بٹھا دی جاتی ہے۔''

معلوم ہوا کہ رشوت لینے اور دینے سے بچنا بھی قومی مفادات کے تحفظ میں شامل ہے۔ اس طرح رواداری دوسروں کے مذہب اور جذبات کا خیال رکھنا، امن و امان قائم رکھنے میں مدد کرنا بھی قومی مفادات میں شامل ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تنازعوا فتفشلوا وتذهب ریحکم﴾

فرمایا ''کہ تم آپس میں نہ جھگڑو ورنہ تم مفلوج ہو جاؤ گے اور ثابت قدمی ختم ہو جائے گی۔''

قومی مفاد کی خاطر جہاں کمزوریاں دور کرنے کا حکم دیا وہاں اپنے آپ کو طاقتور بنانا بھی ہر فرد کا فرض ہے۔ حفظان صحت کے اصولوں کا خیال رکھنا اور صحت کو نقصان پہنچانے والے ہر کام کو چھوڑ دینا بھی قومی مفاد میں داخل ہے لہٰذا منشیات سے پرہیز کرنا اور اس وبا کا ہر سطح پر خاتمہ کرنے میں تعاون کرنا بھی ایک اسلامی معاشرہ کے ہر فرد کا فرض ہے۔

بسا اوقات معاشرہ کے افراد کے ذہن میں قومی مفادات کی اہمیت نہیں ہوتی اور یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر کوئی ایک فرد قومی مفادات کا خیال نہ رکھے تو اس سے کیا فرق پڑے گا۔ اس بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مثال سے خوب اچھی طرح سمجھایا۔ یہ روایت حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری میں منقول ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر ایک کشتی میں کچھ لوگ سفر کر رہے ہوں اور ہر ایک کی اپنی اپنی جگہ مقرر ہو اب ایک شخص کشتی میں اپنی نشست کے نیچے سوراخ کرنے لگ جائے سوراخ کرنے والا یہ سوچے کہ میں اپنی نشست کے نیچے ہی سوراخ کر رہا ہوں دوسروں کو تو کچھ نہیں کہہ رہا تو اب باقی لوگوں نے اس کو اس کام سے روکا تو سب بچ جائیں گے اور سب نے بے توجہی کی تو سب کے سب ڈوب جائیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمدہ مثال سے یہ بات بالکل واضح فرما دی کہ ایک شخص بھی اگر دوسرے کے مفاد کے بجائے اپنا مفاد مدنظر رکھے گا تو یہ سب کے لیے ہلاکت کا سبب بن جائے گا۔ جب قومی مفادات کا خیال رکھنا چھوڑ دیا جائے اور ہر شخص دنیا کی محبت میں مبتلا ہو جائے تو اس قوم کا کیا حال ہوتا ہے اس کا اندازہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتا ہے جو سنن ابوداؤد میں موجود ہے۔

صحابہ کرام موجود تھے آپ نے فرمایا تم پر ایسا وقت بھی آ سکتا ہے کہ تم پر غیروں کو اس طرح دعوت دی جائے گی جیسے کسی کو کھانے کے پیالے کی طرف دعوت دی جاتی ہے ایک صحابی نے عرض کیا کہ اس وقت ہماری تعداد کم ہو گی؟ آپ نے فرمایا نہیں بلکہ تمہاری تعداد زیادہ ہو گی لیکن تم سمندر کے جھاگ کی طرح ہو گے اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں

میں سے تمہارا رعب اور دبدبہ نکال دے گا اور تمہارے دلوں میں کمزوری ڈال دے گا۔عرض کیا گیا کہ وہ کمزوری کیا ہوگی؟ فرمایا دنیا سے محبت اور موت کو ناپسند کرنا۔

لہٰذا جب کسی قوم کے افراد دنیا کی محبت کی خاطر قوم کے مفادات کو بھول جائیں تو وہ قوم دنیا کی غیر معتبر ترین قوم بن جاتی ہے اس لیے اسلام نے ہر فرد کو ایسے احکامات دیئے جس سے قومی مفادات کا تحفظ ہو سکے اور ہر اس چیز سے روکا گیا جس سے اس تحفظ کو ٹھیس پہنچے۔

اللہ رب العزت ہم سب کو ذاتی مفادات سے بالا تر ہو کر قومی مفادات کا تحفظ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔



اسلامی مملکت میں

شہریوں کا بنیادی حق جان کا تحفظ

﴿عن ابن عمر رضی الله عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم قال من حمل علینا السلاح فلیس منا﴾(رواه البخاری)

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص ہم پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں۔''

احادیث نبویہ اور آیات قرآنیہ میں ہر شہری کو جان کے تحفظ کا حق عطا کیا گیا ہے۔

اللہ رب العزت نے سورۂ مائدہ کی ۳۲ ویں آیت میں جان کے تحفظ کے بارے میں ارشاد فرمایا اس میں خطاب تو بنی اسرائیل کو ہے لیکن جو ہدایت ارشاد فرمائی وہ پوری انسانیت کے لیے ہے اور فرمایا کہ کوئی شخص کسی کو دوسرے کے قتل کے بدلہ کے علاوہ یا زمین میں فساد پھیلانے والے کے علاوہ کسی کو قتل کر دے تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جو شخص کسی کی جان کو بچائے تو گویا اس نے تمام لوگوں کو بچا لیا۔ اسلام نے شہریوں کے حقوق کو مکمل تحفظ دیا ہے۔ شہری سے مراد کسی ملک یا ریاست میں رہنے والا ہر وہ شخص ہے جسے اس ملک میں رہائش کے حقوق قانونی طور پر حاصل ہوں۔ اگرچہ شہری کا لفظی مطلب شہر کا رہنے والا ہے لیکن اصطلاح میں شہری کسی ملک میں رہنے والے ہر شخص کو کہا جاتا ہے۔ چاہے وہ شہر میں رہتا ہو یا قصبے اور دیہات میں، یا خانہ بدوش ہو، یہ تمام شہری کہلاتے ہیں اس میں نہ رنگ اور نسل کا فرق ہے نہ مذہب اور عقیدہ کا، بلکہ ہر وہ شخص جو ایک ملک یا ریاست کی حدود میں

رہتا ہو اور حکومت کے قوانین کو تسلیم کرتا ہو وہ اس ملک کا شہری ہے اگر وہ حکومت کی اجازت سے عارضی طور پر کسی دوسرے ملک میں چلا جائے تب بھی وہ اپنے ملک کا شہری ہے۔ یہ وضاحت اس لیے کرنا پڑی کہ جب یہ کہا جائے کہ اسلام نے شہریوں کے حقوق کا تحفظ کیا ہے۔تو کہیں ذہن میں نہ آ جائے کہ پھر دیہاتی لوگوں کے حقوق کا تذکرہ کیوں نہ ہوا۔لہٰذا لفظ شہری کا مفہوم خوب واضح کر دیا گیا۔

اسلام نے ہر شہری کے ہر طرح کے حق کا تحفظ کیا ہے۔شہریوں کے حقوق کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: (۱) مذہبی حقوق ، (۲) سیاسی حقوق، (۳) معاشی حقوق، (۴) معاشرتی حقوق۔

جس حق کے بارے میں ہم یہاں بات کر رہے ہیں یعنی کسی شہری کی جان کے تحفظ کا حق تو اس حق کا تعلق معاشرتی حقوق ہے' بلکہ معاشرتی حقوق میں سب سے اہم حق ہے۔ ایک اسلامی ریاست، ایک اسلامی ملک اپنے ہر شہری کی جان کی حفاظت کا ذمہ دار ہے اور جان کی حفاظت ہر شہری کا حق ہے اسلام نے جان کے تحفظ کے لیے باقاعدہ قوانین بنانے کے لیے سخت سزائیں مقرر فرمائی۔

لیکن یہ بات واضح ہے کہ محض قوانین اور محض سزائیں مقرر کرنا اس سے جان کی حفاظت نہیں ہوتی بلکہ ان قوانین کو نافذ کرنے اور ان سزاؤں پر عمل کرنے سے جان کا تحفظ ملے گا۔ دوسری طرف اسلام نے شہریوں پر بھی کچھ فرائض عائد کیے ہیں کہ وہ خود بھی اپنی جان کی حفاظت کریں اور دوسرے کی جان اور اس کی زندگی کا بھی تحفظ کریں اگر کوئی شہری خود اپنی زندگی کی حفاظت نہیں کرتا تو وہ بھی اسلامی تعلیمات کے مطابق سخت گنہگار ہے۔صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم منقول ہے فرمایا، جس شخص نے اپنے آپ کو پہاڑ سے گرا کر مار ڈالا اس کو دوزخ میں بھی گرایا جاتا رہے گا اور جس شخص نے زہر کھا کر اپنی جان ختم کر لی تو پھر دوزخ کے اندر زہر کا پیالہ اس شخص کے ہاتھ میں ہوگا اور وہ اسے پیتا رہے گا اور فرمایا کہ جو شخص کسی ہتھیار سے اپنے آپ کو مار ڈالے اس کا ہتھیار دوزخ کے اندر اس کے ہاتھ میں ہوگا اور وہ اسے اپنے پیٹ میں گھونپتا رہے گا۔ بخاری اور مسلم کی ایک اور

روایت میں ہے کہ خودکشی کرنے والے پر اللہ تعالیٰ جنت حرام کر دیتے ہیں۔ لہٰذا ہر شہری پر خود اپنی جان کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ اب مثال کے طور پر دیکھئے سڑکوں پر ٹریفک کے اشارے موجود ہیں یہ تمام ٹریفک کے قوانین شہریوں کی حفاظت کے لیے بنائے گئے ہیں تیز رفتاری پر پابندی بھی جان کے تحفظ کے لیے ہے اب ایک شہری ٹریفک اشارے کی خلاف ورزی کرے تو یہ خودکشی کے مترادف ہے یہ شخص خود اپنی زندگی کی حفاظت نہیں کر رہا اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی یہ مجرم ہے۔ اس طرح تمام ملکی قوانین اور احکامات جو شہریوں کی جان کی حفاظت کے لیے بنائے گئے ہیں ان پر خود شہریوں کو عمل کرنا لازمی ہے۔

اسی طرح اسلام نے ہر شہری کیلئے دوسرے شہری کی جان کی بھی حفاظت ضروری قرار دی اور کسی جان کو معمولی نقصان پہنچانے سے بھی منع فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن مغفلؓ کی روایت میں ارشاد نبوی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکریاں اور چھوٹے چھوٹے پتھر مارنے سے بھی منع فرمایا۔

﴿قد تکسر السن وتفقاء العین﴾

''کبھی اس سے دانت ٹوٹ جاتا ہے کبھی آنکھ پھوٹ جاتی ہے۔''

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے متفق علیہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص تم میں سے ہماری مسجدوں میں آئے یا بازار سے گزرے اور اس کے پاس تیر ہوں تو وہ تیروں کے پھل پر ہاتھ رکھ لے تا کہ کسی مسلمان کو تکلیف نہ پہنچے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شہری کی طرف اسلحہ سے اشارہ کرنے کو بھی منع فرمایا۔ فرمایا:

﴿لا یشیر احدکم علی اخیہ بالسلاح فانہ لا یدری لعل الشیطن ینزع فی یدہ فیقع فی حضرۃ من النار﴾

''یعنی تم میں سے کوئی شخص کسی مسلمان بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ نہ کرے اس لیے کہ وہ نہیں جانتا کہ شاید شیطان اس کے ہاتھ سے ہتھیار کو کھینچ لے اور وہ اس کے بھائی کو لگ جائے اور پھر یہ مارنے والا جہنم کے گڑھے میں جا پڑے۔''

بخاری شریف میں ارشاد نبوی ہے:

﴿**من اشار الی اخیه بحدید فان الملئکة تلعنه حتی یضعها وان کان اخاه لا بیه وامه**﴾

''فرمایا کہ جو شخص کسی مسلمان کی طرف تیز دھار والی چیز سے اشارہ کرے تو فرشتے اس پر لعنت کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ اس چیز کو رکھ دے اگرچہ اشارہ کرنے والے کا حقیقی بھائی کیوں نہ ہو۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے مسلمان پر ہتھیار اٹھانے والے کو مسلمانوں کے دائرہ سے خارج فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿**من حمل علینا السلاح فلیس منا**﴾

''جو شخص ہم پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں۔''

اسلام نے ہر مسلمان کی جان دوسرے مسلمان کے لیے قابل احترام قرار دی دوسرے کی زندگی کو نقصان پہنچانا حرام قرار دیا ہے۔ فرمایا:

﴿**کل المسلم علی المسلم حرام دمه وماله وعرضه**﴾

''ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حرام ہے اس کا خون اس کا مال اور اس کی عزت۔''

اللہ رب العزت نے جان کی حفاظت کے لیے قانون ارشاد فرمایا: **ومن یقتل مؤمنا متعمدا فجزاؤہ جهنم خالدا فیها وغضب الله علیه ولعنه واعدله عذابا عظیما**. یعنی جو شخص جان بوجھ کر کسی ایمان والے کو قتل کرے تو اس پر لعنت ہوگی اور اس کے لیے بڑا عذاب تیار کیا گیا ہے اور دنیا میں قاتل کے لیے قصاص کا قانون عطا فرمایا کہ جان کے بدلے جان لی جائے۔ اگر قاتل کے ورثاء مالی معاوضہ لینا چاہیں تو دیت کا قانون رکھا اور یہ بھی اجازت دی کہ اگر ورثاء قاتل کو دنیوی سزا معاف کر دیں تو یہ بھی ان کا حق ہے وہ معاف کر سکتے ہیں لیکن جان کے تحفظ کے سلسلے میں اسلام نے جتنے بھی قوانین عطا کیے ہیں ان قوانین کو ہر آدمی نافذ نہیں کر سکتا اور کوئی شخص جوش انتقام اور غصہ میں کسی بھی شخص کو سزا

دینے کے لیے قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا۔ بلکہ ان سزاؤں کا نفاذ صرف اور صرف حکومت اور عدلیہ کر سکتی ہے یا ان کی طرف سے مقرر کردہ ادارے سزا دے سکتے ہیں۔ البتہ اپنی جان کے تحفظ کے لیے اسلام نے ہر شخص کو حق دیا ہے کہ وہ اپنے اور اپنے گھر والوں کی جان بچانے کے لیے مقابلہ کرے اگر وہ مارا جائے تو اسے شہید قرار دیا گیا۔ ترمذی اور ابوداؤد میں سعید بن زیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿ومن قتل دون دمه فهو شهيد ومن قتل دون اهله فهو شهيد﴾

"یعنی جو شخص اپنی جان کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جائے تو وہ شہید ہے اور جو اپنے گھر والوں کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جائے تو وہ بھی شہید ہے۔"

لہٰذا اسلام نے جہاں حکومت کے ذمہ شہریوں کی جان کی حفاظت کرنا لازم کیا وہاں خود شہریوں پر بھی ایک دوسرے کی جان کی حفاظت کا فرض عائد کیا۔ جان کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ اسلام نے زندگی کے تحفظ کے لیے جو قوانین مقرر فرمائے اور خود حکومت جان کے تحفظ کے لیے جو اصول وضوابط مقرر کرتی ہے ان پر بلا امتیاز عمل کیا جائے خصوصاً اسلامی حدود اور سزاؤں میں سفارش کا خاتمہ کر دیا جائے اور سختی سے مقررہ سزاؤں پر عمل درآمد ہو تو پھر **ولكم فى القصاص حياة يا اولى الالباب** قرآنی فلسفہ بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ اے اہل عقل قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے۔

اسلامی فلاحی مملکت کے تقاضے

﴿عَنْ ابی الشماخ الازری............ سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یَقُوْلُ مَنْ وُلِیَ مِنْ اَمْرِ النَّاسِ شَیْئًا ثُمَّ اَغْلَقَ بَابَہٗ دُوْنَ الْمُسْلِمِیْنَ اَوِالْمَظْلُوْمِ اَوْذِی الحَاجَۃِ اَغْلَقَ اَبْوَابَ رَحْمَتِہٖ عِنْدَ حَاجَتِہٖ وَفَقْرِہٖ اَفْقَرَ مَایَکُوْنُ عَلَیْہِ﴾(رواہ البیھقی، مشکوٰۃ)

''حضرت شماخ ازدی رضی اللہ عنہ اپنے چچا اور بھائی سے روایت کرتے ہیں (جو صحابی ہیں) انہوں نے بیان کیا کہ وہ حضرت معاویہؓ کے پاس گئے اور کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا، جس شخص کو لوگوں کے کسی کام پر مامور کیا گیا پھر اس نے اپنے دروازے مسلمانوں کے لیے یا مظلوم یا حاجتمندوں کے لیے بند کر دیئے ہوں تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے دروازے اس کی ضرورت اور مفلسی کے وقت بند کر لے گا خصوصاً جبکہ وہ بہت زیادہ محتاج ہو گا۔''

اللہ تعالیٰ نے سورۂ حج کی اکتالیسویں آیت میں ارشاد فرمایا، وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار دیں تو وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور بھلائی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں اور تمام کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔

اس ارشاد ربانی میں اسلامی مملکت کے چار بنیادی اصول ذکر کیے گئے اس کے نافذ ہونے کے بعد باقی تقاضے سامنے آتے ہیں۔

دراصل اسلامی مملکت سے مراد کسی زمین کا وہ حصہ ہے جہاں اسلامی قوانین نافذ ہوں اور مسلمان ان قوانین کے تحت زندگی بسر کرتے ہوں لوگوں کو اختیار صرف اسلامی قوانین

نافذ کرنے کا ہو ایسی اسلامی مملکت صرف حکومت یا ملک ہی نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ کی نیابت اور خلافت بھی ہوتی ہے اس لیے کہ قانون تو صرف وہاں اللہ ہی کا ہو گا دوسرے الفاظ میں اقتدار اللہ تعالیٰ کا ہوگا اور انسان کا کام صرف اللہ تعالیٰ کے احکام کو نافذ کرنا ہے اس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ انسان اللہ کا خلیفہ کیسے ہے۔

اس لیے اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ سے اسلامی فلاحی مملکت کے دو بنیادی تقاضے معلوم ہوئے فرمایا ''اگر ہم ان لوگوں کو اقتدار زمین میں دیں'' لہٰذا اقتدار اعلیٰ تو اللہ تعالیٰ کے لیے ہوا اور دوسرا بنیادی تقاضا یہ ہوا کہ انسان اللہ تعالیٰ کا نائب ہے احکام کو نافذ کرنے میں۔

پھر اس اسلامی مملکت کا تقاضا یہ ہے کہ عبادات بدنیہ اور عبادات مالیہ' حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کو یقینی بنانے کے لیے شرعی قوانین کا نفاذ کیا جائے، اسلامی مملکت میں اسلام کا اپنا قانون نافذ نہ ہو تو اس ریاست کا وجود ہی اپنے ''اسلامی مملکت'' ہونے کی نفی کرت دیتا ہے کیونکہ اسلام کا اپنا قانون شہادت ہے فوجداری اور دیوانی قانون ہے تعزیرات اور حدود ہیں، خرید وفروخت، نکاح وطلاق ضمانت وکفالت، ہبہ اور وراثت کے لیے قوانین موجود ہیں تجارت اور کاروباری امور کے لیے اسلام میں تفصیلی قانون موجود ہے زمین اور دیگر جائیداد غیر منقولہ کی خرید وفروخت کے لیے مستقل ضابطے موجود ہیں اگر مسلمان اقتدار ملنے کے باوجود اسلامی مملکت کے اس تقاضے کو پورا نہ کریں تو یقیناً اللہ کے ہاں جواب دہ ہوں گے۔

اسی طرح اسلامی فلاحی مملکت کے لیے یہ بھی ایک اہم تقاضا ہے کہ اسلامی مملکت کا دستور اور آئین کتاب وسنت کے نظام کے مطابق ہوں اسلامی مملکت کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکتی جو کتاب وسنت کے احکام کے خلاف ہو نہ وہ شریعت کا کوئی حکم منسوخ کر سکتی ہے اور نہ کسی حکم میں کمی بیشی کرنے کی جرأت کر سکتی ہے۔

فلاحی مملکت کا ایک اور اہم تقاضا یہ ہے کہ مملکت کے ہر شہری کے حقوق کی حفاظت اور ان کی نگہداشت مملکت کے ذمہ ہے ان حقوق میں عزت وآبرو اور جان و مال کی حفاظت

بنیادی تقاضا ہے ذمہ داران مملکت کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ خود بھی بنیادی حقوق کو سلب نہ کریں اور کوئی دوسرا ان حقوق کو سلب کرے تو اس کے لیے سخت سزائیں دی جائیں تا کہ شہری زندگی میں امن وسکون ہو۔

اسلامی فلاحی مملکت کا ایک اور اہم تقاضا سورۂ انفال کی آیت نمبر ساٹھ میں موجود ہے جس میں مسلمان کو اپنی حفاظت کے لیے اتنی تیاری کا حکم دیا گیا ہے کہ بیرونی دشمن اسلامی مملکت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی جرأت نہ کرے اور اس دفاعی نظام کو مضبوط ترین بنانے کے لیے عمدہ فوجی تربیت اور طاقتور جدید اسلحہ کی فراہمی کا انتظام کرنا بھی اسلامی مملکت کے تقاضوں میں شامل ہے۔ اسلام نے بیرونی اور اندرونی معاملات کے لیے صحابہ کرام کے عمل کو بڑے واضح الفاظ میں بیان فرمایا:

﴿اشِدَّا ءِ عَلَى الْكُفَارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾

''کفار کے لیے انتہائی سخت آپس میں انتہائی مہربان۔''

اس لیے اسلامی مملکت فلاحی مملکت اس وقت کہلائے گی جب وہاں کے شہریوں میں محبت و الفت کی فضا موجود ہو اور ذمہ دارانِ مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ ان تمام امور کی نگرانی کریں جن سے تعصب کی آگ بھڑکتی ہو اور قومی وحدت ٹکڑے ٹکڑے ہوتی ہو اس لیے کہ قومی وحدت کے بغیر کوئی مملکت فلاحی مملکت نہیں کہلا سکتی۔

جب قومی وحدت موجود ہو تو امن وسکون ہو گا اور پھر مملکت میں معاشی اصلاح کی کوششیں کامیاب ہوں گی، ملک خود کفیل ہوگا اور دوسرے ممالک اسلامی مملکت کی کمزور معیشت کو دیکھ کر اصولوں کی سودے بازی پر مجبور نہ کر سکیں گے اور اس اسلامی مملکت میں معاشرتی اصلاح پر بھی بھر پور توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے رسم و رواج کا خاتمہ، جہالت کا خاتمہ اور تعلیمی سہولتیں عام کرنا، ایک بہترین معاشرہ قائم کرنے کی ضامن ہوتی ہیں۔

اسلامی تعلیمات میں اسلامی فلاحی مملکت کا ایک یہ تقاضا بھی واضح کیا گیا کہ سرکاری عہدوں پر ان لوگوں کو مقرر کیا جائے جو اس عہدہ کے اہل ہوں، امانت و دیانت کے اصولوں پر پورے اترتے ہوں ورنہ یہی نااہل افراد اسلامی مملکت کو فلاحی مملکت نہیں بننے دیں گے۔

ایک اور اہم تقاضا یہ بھی ہے کہ اسلامی مملکت میں ذمیوں کو مکمل تحفظ ہو، ذمی اس غیر مسلم کو کہتے ہیں جو اسلامی مملکت میں باقاعدہ قوانین پر عمل کرتے ہوئے مملکت کے حقوق ادا کریں اور آجکل کی اصطلاح میں انہیں اقلیت کہتے ہیں ان کے حقوق کی حفاظت کرنا ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت اور ان کے جان و مال کی حفاظت اسلامی مملکت کی ذمہ داریوں میں شامل ہے اسلامی مملکت صرف مسلمانوں ہی کے لیے فلاحی نہیں بلکہ غیر مسلموں کے لیے بھی فلاحی مملکت ہوتی ہے اور اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کا ایک مستقل تشخص ہوتا ہے۔

ہر شہری کو عدل و انصاف مہیا کرنا اسلامی مملکت کا ایک انتہائی اہم تقاضا ہے اس کے بغیر کسی بھی ملک میں فلاح و بہبود کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، عدل و انصاف قائم کرنے میں وحدت انسانیت اور احترام آدمیت پر نظر رکھی جاتی ہے قانون مساوات کے ذریعہ امیر و غریب، خاص و عام کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ حکومت کا محاسبہ ہوتا ہے عدلیہ اتنی آزاد ہو کہ جیسے خلافت راشدہ کے دور میں خلیفہ وقت کو بھی عدالت میں جواب دینا پڑتا تھا۔

عوام کی بنیادی ضروریات کی کفالت بھی فلاحی مملکت کا ایک تقاضا ہے جن کے لیے پہلے زکوٰۃ اور دیگر مالی واجبات کی ادائیگی کو یقینی بنایا جائے پھر اس کو بیت المال کے ذریعہ موثر طریقے سے خرچ کیا جائے۔ ضعیف، معذور، اپاہج اور بوڑھے افراد کے وظائف مقرر کر دیئے جائیں۔

عوام کے لیے رفاہ عامہ کے کام، ہسپتال بنانا، سڑکیں، پل تعمیر کرنا، ذرائع مواصلات کو جدید دور کے تقاضوں کے مطابق بنانا۔

جب ان تقاضوں کو پورا کر دیا جائے تو یقیناً اسلامی فلاحی مملکت کے نتائج اور ثمرات پوری دنیا کے لیے قابل تقلید نمونہ بن جائیں گے۔

اسلامی مملکت کے اخبارات ورسائل کے لیے شرعی دستورالعمل اور مذہبی تقاضے

﴿عن سفیان بن اسیدالحضرمی قال سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول کبرت خیانۃً ان تحدِّث اخاك حدیثاً ھولك بہ مصدّقٌ وانت بہ کاذبٌ﴾ (رواہ ابوداؤد)

''حضرت سفیان بن اسید حضرمی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا، بہت بڑی خیانت ہے کہ تو اپنے بھائی سے کوئی بات کہے۔وہ تیری خاطر اس بات کو درست سمجھے حالانکہ حقیقت میں تو اس سے جھوٹ بول رہا ہو۔''

دورجدید میں اخبارات اور رسائل نہایت مفید اور کارآمد ذریعہ ابلاغ ہیں بلکہ آج کل کی زندگی کا جزء بن گئے ہیں اور اگر صرف دنیوی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اخبارات ورسائل دور حاضر کا ایک رکن اعظم ہیں لیکن اسلامی دستورالعمل سامنے نہ ہونے کی وجہ سے بہت سی دینی اور دنیوی مضرتوں کا سامان بن گیا ہے۔

آج کل اخبارات اور رسائل عموماً ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں جن کو دین ومذہب سے کوئی سرورکارنہیں، اتحاد اسلامی باہمی یک جہتی محبت اور اخلاص کو فنا کرنے میں اخبارات ورسائل کا بڑا حصہ ہے کسی کا عیب معلوم ہوتو اسے بڑھا چڑھا کر پیش کیاجائے گا اپنے قارئین کی خیانت طبع کیلئے جو کچھ اہتمام کے ساتھ چھاپا جاتا ہے۔اس میں مسلمان بھائی کا گوشت (عیب جوئی غیبت) کوئی جھوٹا پروپیگنڈہ ، دلخراش استہزا اور تمسخر کو جدید ترین تہذیب کا لبادہ اوڑھا کر پیش کردیا جاتا ہے۔

موجودہ دور کے اخبارات ورسائل کی خرابیوں پر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف

علی صاحب تھانویؒ نے ایک مقالہ ''اخبار بین'' کے نام سے تحریر فرمایا تھا اور حضرت تھانویؒ نے ایسے شرعی اصول وضوابط جمع فرمادیئے جن کی پابندی کرکے اخبارات ورسائل سے یہ خرابیاں دور ہوسکتی ہیں۔ ان اصول وضوابط کو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اپنی عبارات میں ضبط کرکے ایک رسالہ تحریر فرمایا جس کا نام ''آداب الاخبار'' ہے۔ حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اس پر نظر ثانی بھی فرمائی تھی۔ (یہ رسالہ آجکل حضرت مفتی صاحبؒ کی کتاب جواہر الفقہ جلد دوم ص ۴۶۵ میں موجود ہے) حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

اس باب میں سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ کسی بات کا قلم سے لکھنا بعینہ وہی حکم رکھتا ہے جو زبان سے بولنے کا ہے جس کام کا زبان سے ادا کرنا ثواب ہے اس کا قلم سے لکھنا بھی ثواب ہے اور جس کا بولنا گناہ ہے اس کا قلم سے لکھنا بھی گناہ ہے بلکہ لکھنے کی صورت میں ثواب اور گناہ دونوں میں ایک زیادتی ہوجاتی ہے کیونکہ تحریر ایک قائم رہنے والی چیز ہے مدتوں تک لوگوں کی نظر سے گزرتی رہتی ہے اس لیے جب تک وہ دنیا میں موجود رہے گی اور لوگ اس کے اچھے یا برے اثر سے متاثر ہوتے رہیں گے اُس وقت تک کاتب کے لیے اس کا ثواب یا عذاب برابر جاری رہے گا جیسا کہ بعض روایات میں تبصریح مذکور ہے کہ جو شخص کاغذ میں درود شریف لکھتا ہے تو جب تک یہ تحریر باقی رہے گی اس وقت تک اس کو ثواب پہنچتا رہے گا اس طرح ناجائز کلام کے نتائج بد کا کاتب کے لیے پہنچتے رہنا بھی دوسری احادیث میں صاف مذکور ہے اس لیے ہر مضمون نگار کا فرض ہے کہ کسی بھی مضمون پر قلم اٹھانے سے پہلے اس کو مندرجہ ذیل معیار پر جانچ لے اور درحقیقت یہی معیار تمام ان آداب کی مجمل تصویر ہے جنکی تفصیل ہم ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

مضمون نگاری اور اخبار نویسی میں مذہبی جرائم اور شرعی گرفت سے بچنے کا سب سے بہتر ذریعہ اور جامع مانع اصول یہ ہے کہ جس وقت کسی چیز کے لکھنے کا ارادہ کرے پہلے اپنے ذہن سے استفتاء کرلے کہ اس کا لکھنا میرے لیے جائز ہے یا نہیں اگر جائز ثابت ہوتو قدم آگے بڑھایئے ورنہ محض لوگوں کو خوش کرنے کے لیے گناہ میں ہاتھ رنگ کر بدشگونی کے لیے

اپنی ناک نہ کاٹے اور اگر خود احکام شرعیہ میں ماہر نہ ہو تو کسی ماہر سے استفتاء کرنا ضروری ہے ۔ یہ ایک شرعی اجمالی قانون ہے جو فقط اخبار نویسی میں ہی نہیں بلکہ ہر قسم کی تحریر میں ہر مسلمان کا مطمح نظر ہونا چاہئے اس کے بعد ہم اس کی تفصیل پیش کرتے ہیں ۔

(۱) جو واقعہ کسی شخص کی مذمت اور معائب پر مشتمل ہو اس کو اس وقت تک ہرگز شائع نہ کیا جائے جب تک حجت شرعیہ سے اس کا کافی ثبوت نہ مل جائے کیونکہ جھوٹا الزام لگانا یا افتراء باندھنا کسی کافر پر بھی جائز نہیں لیکن آہ! کہ آج اہل قلم اس سے غافل ہیں اور اخبار کا شاید کوئی صفحہ اس سے خالی ہوتا ہو۔

(۲) یہ بات بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس معاملہ میں حجت شرعیہ کے لیے کسی افواہ کا عام ہونا یا کسی اخبار کا لکھ دینا ہرگز کافی نہیں بلکہ شہادت شرعیہ ضروری ہے کیونکہ دور حاضر کے موجودہ تمام اخبارات کے صدہا تجربات نے اس بات کو ناقابل انکار کر دیا ہے کہ بہت سے مضامین اور واقعات اخبارات میں شائع ہوتے ہیں اور جس شخص کی طرف سے شائع کئے جاتے ہیں اس غریب کو خبر تک نہیں ہوتی اور یہ صورت کبھی تو قصداً کی جاتی ہے اور کبھی سہواً خطاء ہو جاتی ہے اس لیے اگر کسی اخبار میں کسی شخص کے حوالہ سے کوئی مضمون یا واقعہ نقل کر دیا جائے تو شرعاً اس کو ثابت نہیں کیا جا سکتا البتہ اگر یہ واقعہ کسی کی مذمت یا مضرت وعیب جوئی پر مشتمل نہ ہو تو پھر یہ ضعیف ثبوت بھی کافی ہے اور اس کو نقل کر کے شائع کر دیا جائے۔

(۳) کسی شخص کے عیب یا گناہ کا واقعہ اگر حجت شرعیہ سے بھی ثابت ہو جائے تب بھی اس کی اشاعت اور درج اخبار کرنا جائز نہیں بلکہ اس وقت بھی اسلامی فرض یہ ہے کہ خیر خواہی سے تنہائی میں اس کو سمجھایا جائے اگر سمجھانے کو نہ مانے اور آپ کو قدرت ہو تو بجبر اس کو روک دیں ورنہ کلمہ حق پہنچا کر آپ اپنے فریضہ سے سبکدوش ہو جائیں اس کی اشاعت کرنا اور رسوا کرنا علاوہ نہی شرعی کے تجربہ سے ثابت ہے کہ بجائے مفید ہونے کے ہمیشہ مضر ہوتا ہے اور اس لیے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں اس کی تاکید فرمائی ہے کہ اگر اپنے بھائی مسلمان کا کوئی عیب یا گناہ ثابت ہو تو اس کو رسوا نہ کرے بلکہ پردہ پوشی سے

کام لے۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک محرر نے ایک روز ان سے بیان کیا کہ ہمارے بعض پڑوسی شراب پیتے ہیں میرا خیال ہے کہ میں محکمہ احتساب (پولیس) میں اس کی اطلاع کر دوں۔ حضرت عقبہؓ نے فرمایا کہ ایسا مت کرو بلکہ ان کو سمجھاؤ اور ڈراؤ۔ محرر نے عرض کیا کہ میں یہ سب کچھ کر چکا ہوں وہ باز نہیں آتے اس لیے میں تو اب پولیس میں اطلاع کروں گا حضرت عقبہ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔

''جو شخص کسی کا عیب چھپاتا ہے وہ اتنا ثواب پاتا ہے جیسے کوئی زندہ درگور کی ہوئی لڑکی کو دوبارہ زندہ کر دے۔'' (ترغیب وترہیب ص۱۰۳ج۴)

حضرت مخلد بن مسلمہؓ فرماتے ہیں کہ جب میں والی مصر تھا تو ایک روز دربان نے مجھے اطلاع دی کہ ایک اعرابی دروازہ پر حاضر ہے اور آپ سے ملنے کی اجازت چاہتا ہے میں نے آواز دے کر دریافت کیا کہ تم کون ہو تو آنے والے نے جواب دیا کہ ''جابر بن عبداللہ'' میں نے حضرت جابرؓ کا نام سنن کر بالا خانہ سے نیچے دیکھ کر کہا کہ یا تو آپ اوپر آجائیں یا میں نیچے آتا ہوں۔ حضرت جابرؓ نے فرمایا کہ دونوں باتوں کی ضرورت نہیں میں تو صرف ایک حدیث کے متعلق آپ سے تحقیق کرنے آیا ہوں وہ یہ ہے کہ میں نے سنا ہے کہ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث مسلمان بھائی کی پردہ پوشی کے متعلق روایت کرتے ہیں مخلد بن مسلمہؓ نے فرمایا ہاں! میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو شخص کسی مسلمان بھائی کے عیب پر پردہ ڈالتا ہے تو گویا وہ ایک زندہ درگور کو اس کی قبر سے نکالتا ہے حضرت جابرؓ یہ سنتے ہی اونٹ پر سوار ہوئے اور رخصت ہو گئے۔ (رواہ الطبرانی فی الاوسط)

اور حضرت ابن عباسؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں۔

''جو شخص اپنے بھائی کا عیب چھپائے اللہ تعالیٰ اس کے عیوب قیامت کے دن چھپائیں گے اور جو شخص اپنے بھائی کے عیب کھولتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے عیب کھول دیتے ہیں

یہاں تک کہ اس کو گھر کے اندر بیٹھے ہوئے رسوا کر دیتے ہیں۔(ترغیب وترہیب ص۱۰۴)

الغرض کسی مسلمان کا کوئی عیب یا گناہ مشاہدہ یا حجت شرعیہ سے ثابت بھی جائے تب بھی پردہ پوشی سے کام لے اور خفیہ اس کو سمجھائے کیونکہ یہی طرز زیادہ موثر اور مفید ثابت ہوا ہے۔

(۴) البتہ اگر کسی مسلمان کا ایسا عیب یا گناہ حجت شرعیہ سے ثابت ہوا کہ جس کا نقصان اپنی ذات کو پہنچتا ہے اور یہ اس سے مظلوم ٹھہرتا ہے تو پھر اس کی برائی کو اعلانیہ شائع کرسکتا ہے اسی کے متعلق حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:۔

﴿**لایحب اللّٰہ الجھر بالسوء من القول الامن ظلم**﴾

"اللہ تعالیٰ برائی کے اعلان کو پسند نہیں فرماتے مگر جس پر ظلم کیا گیا وہ ظالم کے ظلم کا اعلان کرسکتا ہے۔"

امام تفسیر مجاہد کہتے ہیں کہ اس آیت کی مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو پسند نہیں فرماتے کہ کوئی شخص کسی کی مذمت یا شکایت کرے لیکن اگر کسی پر ظلم ہو تو اس کے لیے جائز ہے کہ ظالم کی شکایت کرے اور اپنے معاملہ کا اعلان کرے اور اس کے ظلم کو لوگوں پر ظاہر کرے۔(روح المعانی) لیکن اس صورت میں بہتر یہ ہے کہ عام اعلان واشاعت کے بجائے صرف ان لوگوں کے سامنے بیان کرے جو اس کی دادرسی کرسکیں۔

(۵) اگر کسی اخبار میں کوئی قابل تردید غلط مضمون کسی شخص کے نام سے طبع ہوا ہو تو اس کے جواب میں صرف اس پر اکتفا کیا جائے کہ فلاں اخبار نے ایسا لکھا ہے اس کا جواب یہ ہے اس شخص کی ذات پر کوئی حملہ نہ کیا جائے کیونکہ ابھی تک کسی حجت شرعیہ سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ واقع میں یہ مضمون اسی شخص کا ہے۔

(٦) جو خبر کسی شخص کی مذمت اور ضرر پر مشتمل نہ ہو اس کی اشاعت جائز ہے مگر اس شرط سے کہ اس کی اشاعت کسی مسلمان کی خاص مصلحت یا عام مصلحت کے خلاف نہ ہو اور جس میں ایسا احتمال ضعیف بھی ہو تو بجز ان لوگوں کے جو عقل اور شرع کے موافق اس معاملہ کو

ہاتھ میں لیے ہوئے ہوں عام لوگوں پر اس کو ظاہر نہ کرنا چاہئے کیونکہ ممکن ہے کہ اس کے نقصانات کی طرف اس شخص کی نگاہ نہ پہنچی ہو۔ آیت وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ میں ایسے ہی اخباروں اور جلسوں کی مضرت اور مذمت کو بیان فرمایا ہے لیکن مسلمان کے لیے مناسب ہے کہ اس کو بھی محض خبر کی حیثیت سے نقل نہ کرے بلکہ اس سے کوئی دینی یا دینوی فائدہ پیدا کرے کیونکہ حدیث میں ہے کہ:

﴿من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه﴾

''انسان کے اچھا مسلمان ہونے کی علامت یہ ہے کہ بے فائدہ کاموں کو چھوڑ دے۔''

کوئی خبر خود مقصود نہیں ہوتی: ادھر یہ بھی عقلاً ثابت ہے کہ کوئی خبر خود مقصود ومطلوب نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ کسی انشا کا ذریعہ ہوکر مقصود کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور دراصل مقصود کوئی دوسرا کام ہوتا ہے جو اس خبر سے متعلق ہو اس لیے بہتر ہے کہ نتائج اخبار کو بھی ذکر کر کے اس کے افادہ میں اضافہ کر دیا جائے مثلاً آپ کسی شخص کے متعلق یہ خبر درج کرتے ہیں کہ اس نے چند ہزار روپیہ کسی مدرسہ یا مسجد یا کسی دوسرے نیک کام میں صرف کیا تو اس کے بعد اس شخص کے لیے دعائے ترقی اور دوسرے مسلمانوں کے لیے اس کی ترغیب ذکر کر دی جائے، یا مسلمانوں کی کسی جماعت یا کسی ایک شخص کی مصیبت کا ذکر آیا تو خود بھی دعا کرے اور مسلمانوں کو بھی اس کی طرف متوجہ کرے نیز یہ کہ جس سے ہو سکے اس کی مالی امداد بھی کرے، کسی کی موت کا ذکر کیا ہے تو لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کرے کہ عبرت حاصل کریں اور اپنے لیے اسی وقت کے واسطے سامان تیار کر لیں۔

الغرض روزمرہ کے واقعات وحوادث چشم بینا کے لیے بہترین وعظ ہیں لیکن اس کی ضرورت ہے کہ لوگوں کو اس پر متنبہ کیا جائے۔ حضرت شیخ العرب والعجم مولانا محمود حسنؒ صاحب محدث دیوبندی نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

انقلابات جہاں واعظ رب ہیں دیکھو

ہر تغیر سے صدا آتی ہے فافہم فافہم

اول تو کوئی واقعہ اور کوئی خبر دنیا میں ایسی کم ہوتی ہے جو نتیجہ خیز نہ ہو یا جس سے کوئی دینی یا دنیوی فائدہ مقصود نہ ہو لیکن اگر کوئی خبر ایسی بھی ہو تب بھی اس کو محض تفریح طبع کی مد میں ذکر کر دینے میں مضائقہ نہیں بلکہ یہ بھی ایک درجہ میں شرعاً مطلوب ہے اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بعض اوقات مزاح (خوش طبعی) فرمانا اسی حکمت پر مبنی تھا اور ایک حدیث میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

''ان قلوب کو بھی تھوڑی دیر (غور وفکر) سے مہلت دیا کرو اس طرح کہ ان کیلئے حکمت کی لطیف وعجیب باتیں تلاش کرلو (جن سے قلبی تکان رفع ہو) اس لیے کہ قلوب بھی ایسے تھک جاتے ہیں جیسے بدن تھکتے ہیں۔'' (کنز العمال ص۱۳۶ ج۲)

(۷) خلاف شرع مضامین اور ملحدین کے عقائد باطلہ اول تو شائع نہ کئے جائیں اور اگر کسی ضرورت سے اشاعت کی نوبت آئے تو جس پرچہ میں وہ شائع ہوں اسی میں ان کی تردید اور شافی جواب بھی ضرور شائع کر دیئے جائیں آئندہ پرچہ پر اس کو حوالہ نہ کیا جائے کیونکہ بہت سے آدمی وہ ہوتے ہیں جن کی نظر سے آئندہ پرچے نہیں گزرے گا خدانخواستہ اگر وہ اس سے کسی شبہ میں گرفتار ہو گئے تو اس کا سبب' شائع کرنے والا ہوگا۔

(۸) اگر مسلمانوں پر کافروں کے ظلم کی خبر شائع کرنا ہو تو جب تک اس ظلم کی نسبت کافروں کی طرف حجت شرعیہ سے ثابت نہ ہو اس طرح شائع کیا جائے کہ فلاں مقام کے مسلمانوں پر مظالم ہو رہے ہیں مسلمان ان مظالم کا انسداد کریں اور جائز طریق پر ان کی جانی ومالی امداد کریں۔

(۹) اخبار کا ایڈیٹر ہمیشہ ایسا شخص بنے جو تمام علوم اسلامیہ پر عبور رکھتا ہو یا کم ازکم علماء سے رجوع کرنے کا پابند ہو اور مذہب سے ہمدردی رکھنے والا ہو ورنہ ظاہر ہے کہ اخبارات اشاعت بے دینی وبے قیدی کا ایک کامیاب آلہ ہے۔

(۱۰) کسی ایسی کتاب کا جو دین کو مضر ہو یا ایسی دوا کا جو شرعاً حرام ہو یا کسی ایسے معاملہ کا جو شرعاً فاسد ہو، اشتہار نہ دیا جائے۔

یہ مختصر گذارش ہے جو محض دلسوزی اور ہمدردی پر مبنی ہے اگرچہ زمانہ کی مسموم ہوا میں کارگر ہونے کی توقع نہیں لیکن بایں امید کہ شاید خدا تعالیٰ کسی نیک بندے کو عمل اور اصلاح کی توفیق عطا فرمائیں۔



سماجی تحفظ یعنی سوشل سیکورٹی کا مکمل نظام اسلام نے عطا کیا

﴿عن النعمان بن بشیر رضی الله عنهما قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم مثل المؤمنین فی توادهم و تراحمهم و تعا طفهم مثل الجسد اذاشتکی منه عضو تداعی له سائر الجسد بالسهر والحمی.﴾ (متفق علیه)

''حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسلمانوں کی مثال باہم محبت کرنے، آپس میں رحم دل ہونے میں اور ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی سے پیش آنے میں ایسی ہے جیسے ایک جسم کہ جب اس کے کسی ایک حصے کو تکلیف ہوتی ہے تو باقی سارا جسم بھی بیداری اور بخار میں اس کے ساتھ شریک ہونے کو پکار اٹھتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا فرما کر مختلف قبیلوں اور خاندانوں میں تقسیم فرما دیا پھر یہ انسان مل جل کر زندگی گزارنے لگا، یہاں سے سماجی زندگی کا آغاز ہوا۔ یہی سماج معاشرہ اور سوسائٹی کہلاتا ہے، اس میں رہنے والے افراد فطری طور پر ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہوئے زندگی گزارنے لگے، اب انسان میں جہاں تعاون کے مثبت جذبات ہیں جیسے ہمدردی، محبت، بھائی چارہ، ایثار و قربانی وغیرہ اسی طرح انسان میں منفی جذبات بھی ہیں جیسے نفرت، خود غرضی، لالچ، نفرت، حسد، کینہ و بغض اور دشمنی وغیرہ ان آپس میں ٹکرانے والے جذبات کے نتیجہ میں انسانوں کو ایسے اصولوں پر عمل کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی جس کے نتیجہ میں انسانوں کو سماجی تحفظ یعنی سوشل سیکورٹی حاصل ہو۔

چنانچہ دور جدید میں جہاں اور علوم نے ترقی حاصل کی وہاں عمرانیات یعنی سوشیالوجی

بھی ایک مستقل علم اور سائنس بن کر سامنے آ چکا ہے اور اس پر جدید ترین تحقیقات سامنے آ رہی ہیں لیکن ایک حقیقت بہرحال قابل توجہ ہے کہ خالق کائنات اللہ رب العزت جو انسانوں کا بھی خالق و مالک ہے اس ذات نے اسلامی تعلیمات کے ذریعہ انسانوں کو سماجی تحفظ حاصل کرنے کے جو بنیادی اصول عطا فرمائے وہی اصول آج بھی مکمل طور پر قابل عمل اور مسلم ہیں اور انشاء اللہ قیامت تک رہیں گے۔ سماجی تحفظ سے مراد یہ ہے کہ ہر انسان کو جان، مال اور عزت کا تحفظ حاصل ہو۔ اسلامی معاشرہ ایسا معاشرہ کہلائے گا جو خالص اسلامی فکر و عمل کے نظام پر قائم ہو۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں سماجی تحفظ کا اصول امت مسلمہ کو عطا فرمایا۔

﴿ایھا الناس ان دماء کم واموالکم واعراضکم علیکم حرام الی ان تلقوا ربکم کحرمة یومکم ھذا وکحرمة شھرکم ھذا فی بلدکم ھذا﴾

”اے لوگو! تمہاری جانیں، تمہارے مال اور تمہاری عزتیں ایک دوسرے پر اس طرح حرام ہیں جیسے اس ذی الحج کے ماہ میں اس حج کے دن کی تمہارے اس شہر میں۔“

اسلام نے سماجی تحفظ فراہم کرنے کے لیے ہر انسان پر کچھ ذمہ داریاں لازم کر دی ہیں۔ یہ ذمہ داری جو ایک انسان پر فرض ہے وہی ذمہ داری دوسرے انسان کا حق ہے گویا کہ حقوق و فرائض کی ادائیگی سماجی تحفظ کی ضمانت ہے۔

جدید دور میں انسانی زندگی وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی ہے چنانچہ ہر کام کے لیے مستقل ادارے بننے شروع ہو گئے، تعلیم کے لیے تعلیمی ادارے بن گئے۔ تفریح کے لیے تفریحی ادارے وجود میں آ گئے، پھر ایک وقت آیا کہ سماجی تحفظ کے لیے سوشل سیکورٹی کے مستقل ادارے بن گئے۔ یہ سماج اور سوسائٹی کے انسانوں کے لیے یقیناً انتہائی مفید ہیں لیکن ایک قابل توجہ پہلو یہ سامنے آنے لگا کہ لوگوں نے اپنے فرائض کی فکر اب ان اداروں کے سپرد کر دی۔

چنانچہ معاشرے کے انسانوں نے سماجی تحفظ کی ذمہ داری بھی اداروں کی ذمہ داری سمجھنی شروع کر دی جس سے سماجی ڈھانچہ متاثر ہونے لگتا ہے اس لیے کہ انسان کے لیے سماجی تحفظ کے آغاز کو دیکھا جائے تو سب سے پہلے بچے کو اپنے ماں باپ سے سماجی تحفظ کا احساس ملتا ہے اور یہیں سے وہ یہ درس بھی لیتا ہے کہ مجھے بھی اپنی ذمہ داریاں پوری کرتے ہوئے دوسرے کی جان اور اس کے مال اور اس کی عزت کی حفاظت کرنا ہے۔ اگر بچوں کو ماں باپ سے اور نوجوان کو خاندان سے سماجی تحفظ نہ ملے تو پھر نئی نسل بے راہ روی کا شکار بنتی ہے نفسیاتی امراض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح میاں بیوی کو اگر ایک دوسرے سے ذاتی طور پر اور خاندانی طور پر سماجی تحفظ نہ ملے تو یہی گھرانہ بے شمار مسائل کا شکار ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف اگر بزرگوں کو سماجی تحفظ اہل معاشرہ فراہم نہ کریں تو پھر یہی اہل معاشرہ اپنے بزرگوں کو معاشرت سے کاٹ کر اولڈ ہاؤس میں پہنچا دیتے ہیں جیسے یورپ میں ہو رہا ہے۔

لیکن اسلام چونکہ ایک مکمل ترین ضابطہ حیات ہے اس لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم ایمان والوں کو باہمی شفقت، محبت اور مہربانی میں ایک جسم کی طرح پاؤ گے اگر جسم کا ایک عضو تکلیف میں مبتلا ہو جائے تو سارا جسم بیداری اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

چنانچہ اگر ایک گھر میں، ایک خاندان میں یا ایک شہر میں کسی فرد کو تکلیف پہنچے اور باقی افراد اس کی تکلیف اور دکھ کو محسوس کر کے ہمدردی اور بھائی چارے کے جذبات کے ساتھ اس مصیبت اور دکھ کو دور کرنے کا فریضہ انجام دیں تو پھر یقیناً وہ معاشرہ ایسا معاشرہ ہوگا جس میں ہر فرد کو سماجی تحفظ حاصل ہوگا۔

اسلام نے افراد معاشرہ کو جو سماجی تحفظ فراہم کیا اس میں خاندان، برادریوں، قبیلوں کو بنیاد نہیں بنایا اور نہ رنگ نسل اور زبان کو بنیاد بنایا۔ جس طرح مسلمان رعایا کی عزت و آبرو اور جان و مال کی حفاظت اور ان کی خوشحالی کو اسلامی حکومت کا فریضہ قرار دیا اسی طرح غیر مسلم اقلیت کا سماجی تحفظ اور ان کی خوشحالی بھی اسلامی حکومت کا فرض ہے اسلام نے سماجی تحفظ کے

بارے میں جو اصول عطا فرمائے ان سے پرسکون اور پاکیزہ معاشرہ نصیب ہوتا ہے اسلام نے بظاہر ان معمولی باتوں پر بھی توجہ رکھنے کی تعلیم دی جن کی وجہ سے کسی کے تحفظ میں خلل آنے کا امکان ہو۔

جیسا کہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ جو شخص تم میں سے ہماری مسجدوں میں آئے یا بازار سے گزرے تو وہ تیروں کے تیز حصے پر ہاتھ رکھ لے تا کہ کسی مسلمان کو تکلیف نہ پہنچے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:

﴿لا یشیر احدکم علی اخیه بالسلاح﴾

یعنی ''تم میں سے کوئی شخص کسی مسلمان بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ نہ کرے کہیں اچانک اس سے کسی کو نقصان نہ پہنچ جائے۔''

اسلام نے سماجی تحفظ کے ضمن میں ماحول کو بھی پاکیزہ بنانے کی تلقین کی یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے راستہ سے گندگی اور تکلیف دہ چیز ہٹانے کو صدقہ قرار دیا۔

اس طرح زندگی کے مختلف شعبوں میں معاشرے کا ہر فرد جب اپنے فرائض ادا کرنے کی فکر کرے گا اور دوسروں کے حقوق کا خیال رکھتے ہوئے ایک دوسرے کو جان مال اور عزت کا تحفظ فراہم کرنے کی کوشش کرے گا تو یقیناً ایک پرسکون اور مطمئن معاشرہ نصیب ہو گا۔



اسلامی آداب کے مطابق دوستی کیسے نبھائیں؟

﴿عن ابی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله عليه وسلم المرء علی دين خليله فلينظر احد كم من يخالل﴾

(رواہ احمد والترمذی)

”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے (یعنی اس کے مذہب یا اس کی سیرت پر) پس انسان کو دوست بناتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ وہ کس کو دوست بنا رہا ہے؟“

انسان جب ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر زندگی گزارتے ہیں تو پھر ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے جاتے ہیں کچھ لوگوں کے ذہن اور خیالات ملتے جلتے ہیں تو ان میں ایک تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور کبھی ایک دوسرے پر احسان کرنے کی وجہ سے آپس میں محبت اور تعلق پیدا ہو جاتا ہے بس یہیں سے دوستی کا آغاز ہوتا ہے، دوستی کی بنیاد ہمیشہ آسانی سے قائم ہو جاتی ہے لیکن اصل کام اس رشتہ کو نبھانا ہوتا ہے، دوستی کے رشتہ میں سب سے زیادہ نازک چیز دوست کی عزت نفس ہے۔ اگر اس کی عزت کو ٹھیس پہنچ جائے تو پھر دوستی قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے اس لیے سب سے اہم بات اسلام نے یہ سکھائی کہ دوستی کا مقصد صرف اللہ ہی کی خاطر دوستی رکھنا ہو۔ کوئی دنیا کا مقصد، کوئی کام نکلوانا، اور کوئی مطلب پورا کرنا نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿ان احب الاعمال الی الله تعالیٰ الحب فی الله والبغض فی الله﴾

”یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ عمل اللہ کی خاطر محبت رکھنا اور اللہ ہی کی خاطر دشمنی رکھنا ہے۔“

جب انسان پرخلوص دوستی رکھے تو اس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہاں ہیں وہ لوگ جو میری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے آپس میں محبت اور دوستی رکھتے تھے۔ آج میں ان کو اپنے سائے میں جگہ دوں گا اور آج میرے سائے کے سواء کوئی سایہ نہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عام مومن کے بارے میں یہ ارشاد ہے ''ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حرام ہے اس کی جان، اس کی عزت اور اس کا مال۔'' ایک عام مسلمان کی عزت کا احترام کرنا بھی ضروری ہے تو پھر جس سے انسان خصوصی تعلق رکھتا ہے اس کی عزت کا احترام کتنا ضروری ہوگا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان بندے کو کسی ایسے موقعہ پر بے یارو مددگار چھوڑ دے گا جس وقت اس کی بے عزتی ہو رہی ہو اور اس کی آبرو کو نقصان پہنچایا جا رہا ہو تو اللہ تعالیٰ بھی مدد نہ کرنے والے شخص کو ایسی جگہ اپنی مدد سے محروم رکھے گا جہاں وہ اللہ تعالیٰ کی مدد کا خواہش مند ہوگا اور جو کسی مسلمان کی ایسے موقع پر مدد کرے گا جہاں اس کی بے عزتی ہو رہی ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی ایسے موقع پر مدد فرمائے گا جب وہ مدد کا طلب گار ہوگا۔''

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کے اندر مختلف مقامات میں ان چیزوں سے منع فرمایا جو تعلقات کے ٹوٹنے کا سبب بنتی ہیں۔ خصوصاً سورۂ حجرات میں تفصیل سے ان چیزوں کا ذکر فرمایا جن سے دوسرے کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے۔

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے آپس میں ایک دوسرے کا مذاق اڑانے سے منع فرمایا۔ ظرافت اور مزاح بھی انسانی زندگی کا ایک حصہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے جان نثار صحابہ کرام سے مزاح فرماتے تھے۔ لیکن اس کے بھی آداب سکھائے۔ مزاح اس انداز میں ہو کہ دوسرے کی عزت نفس مجروح نہ ہو اور اس مزاح سے منع فرمایا جو ناگواری اور اذیت کا باعث بنے۔ اللہ تعالیٰ نے آپس کے تعلقات کے لیے دوسری نقصان دہ چیز یہ بیان فرمائی کہ **ولا تنابزوا بالالقاب** (تم آپس میں ایک دوسرے کو چڑانے کے لیے نام نہ

ڈالو)۔آج کے معاشرہ میں یہ بات بہت عام ہو رہی ہے کہ کسی کے رنگ یا شکل یا کسی خاص عادت کی بنا پر دوسرے انسان کا نام ڈال دیا جاتا ہے۔ یا کسی کے نام یا ذات کو بگاڑ کر نام ڈال دیا جاتا ہے۔قرآن حکیم نے اس بات سے خصوصی طور پر منع فرمایا اس میں دوسرے انسان کا دل دکھانا بھی لازم آتا ہے اور اگر اس نام میں دوسرے کی کمزوری کا ذکر ہو تو اس میں طعنہ دینے کا بھی گناہ ہوگا لہٰذا ایک انسان کا کوئی نام صرف اسے چڑانے کے لیے ڈال دیا جائے تو اس میں کئی گناہ اکٹھے ہو جاتے ہیں اور پھر جب سو لوگ اس کو پکاریں گے تو ہر ایک کا گناہ اس نام رکھنے والے کے ذمہ بھی آئے گا اور اگر دوسرا انسان دوست ہو تو یقیناً اس کی عزت نفس مجروح ہوتی رہے گی تیسرا اصول یہ بیان فرمایا کہ **ولا تلمزوا انفسکم**۔(تم آپس میں عیب جوئی نہ کیا کرو)۔ واقعی یہ عادت آپس کے نقصان اور دوسرے کی عزت نفس کو بگاڑنے میں بڑا اثر رکھتی ہے کہ ایک انسان دوسرے کے عیب اور اس کی برائی کی جستجو میں لگا رہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم** ۔ (یعنی بہت زیادہ گمان کرنے سے بچو کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں)۔اس ارشاد باری کی بنا پر آپس میں بدگمانی نہیں رکھنی چاہیے۔ پھر فرمایا **ولا یغتب بعضکم بعضا** ۔(اور آپس میں ایک دوسرے کی غیبت نہ کیا کرو) یعنی دوسرے کی غیر موجودگی میں اس کے عیب نہ بیان کیا کرو۔ یہ وہ سنہری اصول ہیں جن سے ایک اسلامی فلاحی معاشرہ وجود میں آتا ہے۔جس میں صرف دوست ہی نہیں بلکہ ہر مسلمان کی عزت کا احساس رکھنا ہوتا ہے۔

احکام اسلام میں دوسرے انسان کی عزت نفس کا اس طرح خیال رکھنے کا حکم ہے کہ سورۂ بقرہ میں جہاں محتاجوں کی امداد کا ذکر ہے وہاں ارشاد فرمایا کہ تم ان لوگوں کی بھی مدد کرو جو لوگوں سے لپٹ لپٹ کر نہیں مانگتے آپ ان کی پیشانیوں سے پہچان سکتے ہیں حالانکہ لوگ انہیں مالدار سمجھتے ہیں۔معلوم ہوا کہ ایسے سفید پوش اور عزت کا خیال رکھنے والے لوگوں کی مدد کرنے میں خاص ثواب ہے یہاں مفسرین نے لکھا کہ جب یہ لوگ خود اپنی عزت کا اس قدر خیال کرتے ہیں تو پھر زکوۃ صدقات کے ذریعہ ایسے لوگوں کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے یہ

بتانا بھی ضروری نہیں کہ یہ زکوٰۃ یا صدقہ کا پیسہ ہے بلکہ ہدیہ اور تحفہ کہہ کر ان کی مدد کر دی جائے۔ جب انسان کسی سے دوستی کرتا ہے تو پھر اس انسان پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے ذاتی اور نجی مسائل کا تذکرہ بھی کرتا ہے اور ان مسائل کے بارے میں اس سے مشورہ بھی طلب کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا **المستشار مؤتمن،** "جس سے مشورہ طلب کیا جائے تو وہ بات اس کے پاس بطور امانت رکھی گئی ہے۔" معلوم ہوا کہ جب کوئی کسی سے مشورہ طلب کرے تو اب اس کے نجی مسائل اس کے پاس بطور امانت محفوظ ہیں اور اگر دوسروں کے سامنے ان باتوں کا تذکرہ کیا جائے گا تو اس سے دوسرے کی عزت نفس مجروح ہوگی۔

ان اسلامی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ عام انسان کی بھی عزت نفس کا خیال رکھنا ضروری ہے تو پھر دوست کی عزت نفس کا خیال رکھنا تو اس سے بھی زیادہ اہم ہوا اگر معاشرہ میں ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں ایک دوسرے کی عزت کا خیال رکھنا شروع کر دیا جائے یقیناً ایسا معاشرہ رہنے کے لیے مل جائے گا جب کہ تمام افراد ایک جسم کے اعضاء کی طرح ایک دوسرے کے ہمدرد اور ایک دوسرے کے دکھ درد کو محسوس کرنے والے ہوں گے اللہ رب العزت ہمیں پرخلوص دوستی نبھانے اور اس کی برکتوں سے فیض یاب ہونے کی توفیق دے۔



دورِ حاضر کی جدید زحمت کا حل

اسلامی آداب اختیار کر کے

ٹیلیفون کو باعث رحمت بنایئے

﴿عن عبدالله بن عمرو رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَیَدِهٖ﴾

(رواه البخاری ومسلم)

''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔''

دورِ جدید میں انسانی ایجادات میں سے ایک اہم ایجاد ٹیلیفون ہے۔ یقیناً یہ ایک مفید ترین ایجاد ہے جس نے میلوں کے فاصلے سمیٹ کر رکھ دیئے اور تجارت و معاشرت میں ایک انقلاب برپا کر کے رکھ دیا ہے۔

لیکن ہر چیز کے مفید اور غیر مفید ہونے کا تجزیہ اس پر مرتب ہونے والے نتائج سے کیا جاتا ہے آج کے دور میں جہاں ٹیلی فون کے بہت سے فوائد ہیں وہاں بعض حالات میں یہ ایک تکلیف دہ چیز بن چکا ہے اس کی وجہ صرف اس مفید ایجاد کا غلط استعمال ہے۔ اسلام ایک مکمل دین ہے آخری دین ہونے کی بنا پر قیامت تک آنے والے مسائل کا حل بھی پیش کرتا ہے آج اگر ان اسلامی آداب پر عمل کیا جائے تو یقیناً ٹیلیفون ایک مفید چیز ثابت ہوگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان کی شان ہی یہ ارشاد فرمائی کہ'' مسلمان وہ شخص ہے جس کی زبان اور اس کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ اب ٹیلی فون کے ساتھ ان دو ہی چیزوں کا گہرا تعلق ہے ایک ہاتھ اور دوسری زبان لہٰذا ٹیلفون کو باعث رحمت

بنانے کے لیے سب سے پہلے قرآن حکیم کا یہ جامع اصول اپنانا لازمی ہے۔ ”ولا تسرفوا“ (اور فضول خرچی نہ کرو) ٹیلی فون سے متعلق ایک تکلیف دہ بات اس کے اخراجات کا حد سے بڑھ جانا ہے اور یہ صرف اس قرآنی اصول پر عمل کرنے سے ہی ممکن ہوگا۔ پھر جب ٹیلی فون کیا جائے تو ان تمام آداب معاشرت کا خیال رکھا جائے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی سورۃ النور میں ارشاد فرمائے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سورۂ نور کی آیت ۲۷ تا ۲۹ میں مذکورہ آدابِ ملاقات کے ضمن میں ٹیلیفون سے متعلق بعض مسائل بھی ذکر فرمائے ہیں موصوف تحریر فرماتے ہیں کہ:

مسئلہ: کسی شخص کو ایسے وقت ٹیلیفون پر مخاطب کرنا جو عادۃً اس کے سونے یا دوسری ضروریات میں یا نماز میں مشغول ہونے کا وقت ہو، بلاضرورت شدیدہ جائز نہیں کیونکہ اس میں بھی وہی ایذارسانی ہے جو کسی کے گھر میں بغیر اجازت داخل ہونے اور اس کی آزادی میں خلل ڈالنے سے ہوتی ہے۔

مسئلہ: جس شخص سے ٹیلیفون پر بات چیت اکثر کرنا ہو؟ تو مناسب یہ ہے کہ اس سے دریافت کرلیا جائے کہ آپ کو ٹیلیفون پر بات کرنے میں کس وقت سہولت ہوتی ہے پھر اس کی پابندی کرے۔

مسئلہ: ٹیلیفون پر اگر کوئی طویل بات کرنا ہو تو پہلے مخاطب سے دریافت کرلیا جائے کہ آپ کو ذرا سی فرصت ہو تو میں اپنی بات عرض کروں۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے پر آدمی طبعاً مجبور ہوتا ہے کہ فوراً معلوم کرے کہ کون کیا کہنا چاہتا ہے اور اس ضرورت سے وہ کسی بھی حال میں ہو اور کسی بھی اہم ضرورت میں مشغول ہو اسے چھوڑ کر ٹیلی فون اٹھاتا ہے کوئی بے رحم آدمی اس وقت لمبی بات کرنے لگے تو سخت تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

مسئلہ: بعض لوگ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی رہتی ہے اور کوئی پروانہیں کرتے نہ پوچھتے ہیں کہ

کون ہے کیا کہنا چاہتا ہے یہ اسلامی اخلاق کے خلاف ہے اور بات کرنے والے کی حق تلفی ہے جیسے حدیث میں آیا ہے: اِنَّ لِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَقًّا یعنی ''جو شخص تمہاری ملاقات کو آئے اس کا تم پر حق ہے'' کہ اس سے بات کرو اور بلا ضرورت ملاقات سے انکار نہ کرو۔ اسی طرح جو آدمی ٹیلی فون پر آپ سے بات کرنا چاہتا ہے اس کا حق ہے کہ آپ اس کا جواب دیں۔

(معارف القرآن جلد ۶ صفحہ ۳۹۴)

ارشادات نبویہ سے ملاقات کا مسنون طریقہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سلام کیا جائے پھر آنے والا شخص اپنا نام لے کر کہے کہ فلاں شخص ملنا چاہتا ہے۔ لہٰذا ٹیلیفون پر بھی ملاقات کا یہی طریقہ اپنانا چاہیے۔ عام مروجہ لفظ ''ہیلو'' ہے۔ لیکن مسلمانوں کا اپنا ایک تشخص اور مسنون طریقہ موجود ہے۔ لہٰذا فون کرتے وقت ''ہیلو'' کے بجائے السلام علیکم کہنا چاہیے اور فون کرنے والے کو پہلے اپنا واضح تعارف پیش کرنا چاہیے تاکہ مخاطب کو خوب اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ کون فون پر ملاقت کرنا چاہتا ہے جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اَنا اَنا (میں، میں) کہنے پر نصیحت فرمائی۔

سورۂ نور کی آیت ۲۸ میں ملاقات کا یہ ادب بھی بتایا گیا۔ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۔یعنی اگر ملاقاتی کو کہا جائے کہ ملاقات نہیں ہوسکتی لوٹ جایئے تو اسے لوٹ جانا چاہیے یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ لہٰذا اگر ٹیلی فون پر کہا جائے کہ اس وقت ملاقات نہیں ہوسکتی تو ٹیلی فون کرنے والے کو خوشدلی سے عذر قبول کر لینا چاہیے بُرا نہ ماننا چاہیے اور عذر کرنے والے کو بھی اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ واقعی شدید عذر ہو تو معذرت کرے کیونکہ ملاقاتی کا بھی ایک حق ہے۔

اگر ملاقاتی نہیں مل سکتا تو پھر موقع کی مناسبت سے پیغام بھی دیا جا سکتا ہے لیکن اس بارے میں تکلیف دہ بات یہ ہوتی ہے کہ رسمی طور پر پیغام پہنچانے کا وعدہ کر لیا جاتا ہے لیکن ذمہ داری پوری نہیں کی جاتی لہٰذا وعدہ خلافی کا گناہ ہوتا ہے اس لیے اگر مخاطب پیغام پہنچا سکتا ہے تو وہ وعدہ کر کے ذمہ داری پوری کرے ورنہ معذرت کر لے۔

عام زندگی میں خصوصاً ٹیلیفون پر بے جا اور فضول باتیں کرنے سے بچنا چاہیے۔
ارشادنبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: قیامت کے دن مجھے ناپسندیدہ ترین اور مجھ سے بہت دُور وہ لوگ ہوں گے جو زیادہ باتیں بنانے والے اور بے احتیاطی سے فضول باتیں کرنے والے ہیں۔ (رواہ البیہقی)

ٹیلیفون کے ذریعہ ایک اور عام تکلیف بے ہودہ اور بے حیائی سے آلودہ کالیں ہیں۔ ارشادنبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: حیا اور پاکیزہ زبان ایمان کی دو شاخیں ہیں اور دل آزار گفتگو اور بے ہودہ باتیں نفاق کی دوشاخیں ہیں۔ (عن ابی امامہ۔ترمذی)

لہٰذا فون پر بے حیائی کی اور بے ہودہ باتیں کرنا کسی بھی طرح مسلمان کی شان نہیں ہے۔ ارشادنبوی ہے:

''مومن بے حیائی کی باتیں کرنے والا نہیں ہوتا۔'' (عن ابن مسعود، ترمذی)

ٹیلیفون کا ایک غلط استعمال مخاطب کو جھوٹی باتیں سنا کر تنگ کرنا بھی ہے ارشادنبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ''سب سے بڑی خیانت یہ ہے کہ تو اپنے مسلمان بھائی سے کوئی بات کہے اور وہ تجھے سچا سمجھ رہا ہو حالانکہ تو اس سے جھوٹ بول رہا ہو'' لہٰذا یہ دل آزاری بھی ہے اور بڑی بددیانتی بھی۔

عموماً بلا اجازت کسی کے ہاں جا کر ٹیلیفون کر لیا جاتا ہے حالانکہ ارشادنبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''خبردار! کسی پر ظلم نہ کرنا کسی کا مال اس کی خوشی اور اجازت کے بغیر نہ لینا۔''

(عن ابی حرۃ رواہ البیہقی)

ارشادنبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''کوئی شخص کسی جانور کا دودھ مالک کی اجازت کے بغیر نہ دوہے۔''

(عن ابن عمر رواہ مسلم)

لہٰذا کسی کے ٹیلی فون سے بھی بلا اجازت فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

عموماً یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ مالک سے ''کال'' کرنے کی اجازت طلب کی اور

''لوکل'' کے بجائے بیرونی کال کر لی۔ یہ صریح دھوکہ اور ظلم ہے۔ جب تک اس کی رقم مالک کو ادا نہ کر لے یا معافی نہ مانگ لے یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابل مؤاخذہ جرم رہے گا۔

اسی طرح دفاتر کے ٹیلی فون کو بھی ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کرنا صریح خیانت ہے اگر اب تک یہ فعل حرام ہوتا رہا ہے تو اندازہ کر کے اتنی رقم دفتری کھاتے میں جمع کرانا ضروری ہے۔

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ''بعض بیان جادو کا اثر رکھتے ہیں'' (عن ابن عمر، رواہ البخاری) اور بہت سے ارشادات نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اچھے اخلاق اپنانے کا حکم دیا گیا۔ لہٰذا ٹیلی فون پر سلیقہ، تہذیب اور شائستگی سے شیریں کلام سے گفتگو کرنا بھی یقیناً اجر و ثواب کا باعث ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''اپنے بھائی سے خوش روئی سے ملنا بھی نیکی ہے۔''

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''بدخلق، بدخو، سخت گو آدمی جنت میں داخل نہ ہوگا۔'' (عن حارثہ رواہ ابوداؤد)

اللہ تعالیٰ ہمیں ان اسلامی آداب پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ ٹیلی فون جیسی نعمت جو آج کل ایک تکلیف دہ چیز بن چکی ہے وہ ایک مفید نعمت اور راحت کا سبب بن جائے۔



توہم پرستی اور چھوت چھات اسلامی تعلیمات کے منافی ہیں

﴿عن ابی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله عليه وسلم لا عدوىٰ ولا هامة ولا صفر فقال اعرابی یا رسول الله فما بال الابل تكون فی الرمل لكانها الظباءُ فيخا لطها البعير الاجرب فيجربها فقال رسول الله صلی الله عليه وسلم فمن اعدی الاول﴾

(رواه البخاری)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چھوت چھات (بیماری کا ایک دوسرے سے لگنے کا وہم) اور اُلو (کو منحوس سمجھنا) اور صفر (کے مہینہ کو منحوس سمجھنا) کوئی چیز نہیں ایک اعرابی نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اونٹوں کو کیا ہوتا ہے جو ریگستان میں رہتے ہیں کہ اچانک ان میں خارش زدہ اونٹ آ جاتا ہے تو دوسرے اونٹوں کو بھی خارش زدہ بنا دیتا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے پہلے اونٹ (جس کی وجہ سے باقی اونٹوں میں خارش لگی) کو کس سے خارش لگی (یعنی جس طرح پہلے اونٹ کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے خارش لگی اسی طرح دوسروں کو بھی حکم الٰہی ہی سے خارش لگی)۔''

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے واضح انداز میں توہم پرستی اور چھوت چھات کی نفی فرمائی۔

آج کل مسلمانوں میں بھی اسلامی تعلیمات کی کمی کی وجہ سے توہم پرستی بہت زیادہ ذہنوں میں راسخ ہو چکی ہے۔ بعض لوگوں نے صفر کے مہینہ کا نام تیرہ تیزی رکھ دیا۔ بعض

مقامات میں اس مہینہ کی تیرہ تاریخ کو چنے ابال کر تقسیم کیے جاتے ہیں اور عام طور پر اس مہینہ کے آخری بدھ کو متبرک سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ اسلامی شریعت میں ایسی کوئی بات نہیں۔ صفر اسلامی سال کا دوسرا مہینہ ہے۔ صفر کا معنی ہے خالی ہونا۔ صفر کے مہینے میں چونکہ جنگ کی ممانعت تھی جس کی وجہ سے اہل عرب یا تو گھروں میں بیٹھے رہتے یا سامان تجارت کی خریداری کے لیے اپنے گھروں سے باہر چلے جاتے۔ جن کی وجہ سے گھر خالی ہو جاتے۔ لہٰذا اس ماہ کا نام صفر پڑ گیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ صفر کا معنی ہے زرد ہونا۔ چونکہ اس ماہ میں خزاں کا موسم آ گیا اور پتے زرد ہو گئے لہٰذا اس ماہ کا نام صفر ہو گیا۔

صفر کے مہینہ کو منحوس سمجھنا یا اس میں مختلف باتوں کا وہم کرنا آج کے معاشرہ کی خصوصیت نہیں بلکہ قبل از سلام اہل عرب کے تصورات بھی اس ماہ میں اس طرح کے تھے، اہل عرب صفر کے مہینہ میں کاروبار نہیں کرتے تھے کہ اس سے خسارہ ہوتا تھا۔ اسی طرح شوال کے مہینہ میں شادی کرنے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے حالانکہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میرا نکاح شوال ہی کے مہینہ میں ہوا تھا۔ اہل عرب میں اس کے علاوہ اور بھی بہت سے توہمات عام تھے۔ بدھ کے دن کو منحوس سمجھتے اور یہ بھی عقیدہ تھا کہ اگر کسی کے گھر پر اُلو بیٹھ جائے تو وہ گھر اجاڑ ہو جاتا ہے۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک چڑیا اڑتی ہوئی چہچہاتی ہوئی سامنے سے گزری تو ایک شخص نے کہا ''خیر خیر، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا چڑیوں کا بولنا نہ بھلائی کی علامت ہے اور نہ مصیبت کی، یہ صرف وہم ہے۔''

ہمارے معاشرے میں بھی بہت سے توہمات عام ہیں۔ مثلاً کالی بلی سامنے سے گزر جائے تو راستہ بدل لینا چاہیے ورنہ اسی راستے پر چلنے سے نقصان ہو سکتا ہے۔ چھری گرے تو لڑائی ہو جاتی ہے۔ کوا بولے تو مہمان آ جاتا ہے۔ آنکھ پھڑکے تو بُری خبر ملتی ہے۔ ہتھیلی میں کھجلی ہو تو دولت آتی ہے۔ جوتی پر جوتی چڑھ جائے تو سفر پیش آتا ہے اور اسی قسم کی بہت سی نیک اور بدشگونیاں دیکھنے اور سننے میں آتی ہیں۔ ان تمام باتوں سے رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿لاطیرۃ وخیرھا الفال قالوا وماالفال قال الکلمۃ الصالحۃ یسمعھا احدکُم﴾ (بخاری)

یعنی "بدشگونی کوئی چیز نہیں اور بہترین چیز نیک فال ہے لوگوں نے عرض کیا فال کیا چیز ہے؟ فرمایا کہ وہ اچھا کلمہ جو تم میں سے کوئی کسی سے سنے۔"

توہمات کے ضمن میں ایک وہم کی صورت چھوت چھات کا نظریہ بھی ہے، یعنی ایک دوسرے سے بیماری لگنے کا وہم، اسے عربی میں عَدْویٰ کہتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صحابہ کرامؓ کے سامنے "لَاعَدْویٰ" ارشاد فرما کر چھوت چھات کی نفی فرمائی (یعنی ایک دوسرے سے بیماری لگنے کا وہم کوئی حقیقت نہیں رکھتا) تو صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے تندرست اونٹ ریگستانوں میں چل رہے ہوتے ہیں کہ ایک خارش زدہ اونٹ آ کر باقی اونٹوں کو بھی خارش میں مبتلا کر دیتا ہے۔ (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیماری ایک دوسرے سے لگتی ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ پہلے اونٹ کو کس سے خارش لگی۔

اس ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے بیماری لگنے کی کوئی حقیقت نہیں۔ لیکن صحیح بخاری ہی کی روایت میں ہے: **"لایوردن الممرض علی المصح"**، یعنی "بیمار اونٹ تندرست اونٹ کے پاس نہ اتارا جائے۔" اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بخاری شریف میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم منقول ہے:

﴿فر من المجذوم کما تفر من الاسد﴾

"جذام میں مبتلا شخص سے اس طرح بھاگو جس طرح شیر سے ڈر کر بھاگتے ہو۔"

لیکن ایک رُخ یہ بھی ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ابن ماجہ میں روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جذام میں مبتلا شخص کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے ہمراہ

پیالے میں (کھانے کے لیے) شریک کرلیا۔ اور فرمایا تو کھا، اللہ پر اعتماد اور اسی پر بھروسہ کرتے ہوئے۔''

دونوں طرح کی روایات سامنے آنے کے بعد شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے ''ماثبت بالسنۃ'' میں ''چھوت کی کوئی حقیقت نہیں'' کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ طبیعت و خلقت کے لحاظ سے کوئی بیماری دوسرے کو نہیں لگتی اور جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ دراصل اللہ کے حکم اور منشا سے ہوتا ہے اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیمار اونٹ کو تندرست اونٹ کے پاس لے جانے سے منع فرمایا اور جذامی سے دور رہنے کو فرمایا۔ پھر شیخ عبدالحقؒ ''جذامی سے دور بھاگو'' کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جذامی کے جسم سے ایک خاص قسم کی بدبودار گیس نکلتی ہے جو جذامی کے پاس زیادہ نشست و برخاست کرنے والے اور ایک ساتھ کھانے اور سونے والے پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور یہ بات ''چھوت'' نہیں بلکہ فن طب کا ایک اصول اور ضابطہ ہے اور اطباء کا تجربہ ہے لہٰذا اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ہر ایماندار مسلمان سمجھتا ہے کہ ہر کام صرف اللہ کے حکم سے ہوتا ہے اور کوئی چیز بغیر خدا کے حکم سے نہ نفع پہنچا سکتی ہے اور نہ نقصان، اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ محض وہم کی بنا پر یہ سمجھنا کہ ایک دوسرے سے بیماری لگ جاتی ہے یا لگ گئی ہے اور ایسے خیالات رکھنا جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں یہ چھوت اور توہم پرستی ہے البتہ طبی تحقیق و تجربہ سے جو امور ثابت ہو جائیں ان کو ذہن میں رکھنا اور ان اصولوں پر عمل کرنا چھوت چھات، یا توہم پرستی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہر مسلمان کو یہ پختہ اعتقاد رکھنا چاہیے کہ حقیقت میں نہ جراثیم بیمار کرتے ہیں اور نہ دواء شفاء دیتی ہے بلکہ بیماری بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے آتی ہے اگرچہ جراثیم واسطہ بن جاتے ہیں اور شفاء بھی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی عطا فرماتے ہیں اگرچہ دواء ذریعہ شفاء بن جاتی ہے۔

اسلامی معاشرہ کے عابد و مجاہد

﴿عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الساعی علی الارملة والمسكين كالمجاهد فی سبيل الله واحسبه قال كالقائم لايفتر وكالصائم لا يفطر﴾ (رواه البخاری و مسلم)

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی بیوہ یا کسی مسکین حاجت مند کے لیے مدد اور تعاون اور کوشش کرنے والا بندہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اجر وثواب میں راہ خدا میں جہاد کرنے والے بندے کی طرح ہے۔“

راوی فرماتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ یہ بھی فرمایا کہ ایسے بندے کی مثال شب بیدار بندے کی طرح ہے جو شب بیداری میں سستی نہ کرتا ہو اور اس ہمیشہ روزہ رکھنے والے کی طرح ہے جو کبھی ناغہ نہ کرتا ہو۔ اس حدیث کو صحیح بخاری اور صحیح مسلم نے روایت کیا ہے۔

ہر شخص جو دین کی واقفیت رکھتا ہو وہ جانتا ہے کہ راہ خدا میں جہاد اور جانبازی بلند ترین عمل ہے اسی طرح کسی بندے کا یہ حال کہ اس کی راتیں عبادت میں کٹتی ہوں اور دن کو ہمیشہ روزہ رکھتا ہو، بڑا ہی قابل رشک اس کا حال ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہی درجہ ان لوگوں کا بھی ہے جو کسی حاجت مند مسکین یا کسی بیوہ کی مدد اور اس کی خدمت کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں تمام مسلمانوں کو آپس میں ایک دوسرے سے ہمدردی کرنے کا حکم فرمایا وہاں خصوصی طور پر ان افراد کے بارے میں ہدایات عطا فرمائیں جو معاشرے کے دوسرے افراد سے زیادہ توجہ کے قابل ہوتے ہیں ہمدردی کیا ہوتی ہے؟ اس کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم مسلمانوں کو آپس میں ہمدردی کرنے، محبت کرنے اور آپس میں مہربانی کرنے میں ایک جسم کی طرح پاؤ گے‘ اگر جسم کے کسی حصے کو تکلیف کی شکایت ہوتی ہے تو پورا جسم اس کے دکھ اور درد کو محسوس کر کے بیداری اور بخار میں

مبتلا ہو جاتا ہے۔'' اگر خدانخواستہ انگلی میں تکلیف ہو جائے اور زخم تکلیف دینے لگے تو پورا جسم اس کے علاج اور اس کی تکلیف کو دور کرنے میں لگ جاتا ہے۔ اعصاب فوراً دماغ کو اطلاع دیتے ہیں کہ فلاں حصے میں تکلیف ہے اور پھر ٹانگیں ڈاکٹر صاحب کی طرف چل پڑتی ہیں، آنکھیں راستہ دکھاتی ہیں، ڈاکٹر تک پہنچ گئے تو زبان نے اپنا کام شروع کر دیا ''ڈاکٹر صاحب انگلی میں تکلیف ہے'' اور پھر کانوں نے ڈاکٹر کی ہدایات کو سننا شروع کر دیا۔ دوسرا ہاتھ جیب میں گیا اور پیسے نکال کر دیئے دوا سنبھالی اور یوں ایک انگلی کی تکلیف کو دور کرنے میں پورا جسم مصروف ہو گیا اور تکلیف دور ہو گئی۔ اگر آج معاشرے کے کسی انسان کو تکلیف پہنچے اور معاشرے کے کچھ افراد مل کر اس کی تکلیف دور کرنے میں لگ جائیں بالکل اسی طرح جس طرح ایک جسم کے مختلف اعضاء نے مدد اور تعاون کیا تھا تو پھر معاشرے میں ہمدردی کا ثمرہ نظر آئے گا اور دوسری طرف یہ بھی ہے کہ اگر انسان کے کسی جسم کے حصہ پر فالج کا حملہ ہو جائے تو وہ بے حس ہو جاتا ہے اسے نہ اپنی تکلیف کا احساس ہوتا ہے نہ دوسرے اعضاء کی تکلیف کا احساس رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح اگر معاشرے کے افراد میں آپس کی ہمدردی نہ رہے، خود غرضی اور نفسانفسی پیدا ہو جائے تو پھر وہ افراد معاشرہ بھی بے حس ہو کر دوسروں کی تکلیف کا احساس نہیں کر سکیں گے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لیے تمام مسلمانوں کے لیے ایک جسم کی طرح ہمدردی اور تعاون کرنے کا تذکرہ فرمایا۔

محتاجوں، بیماروں، بیواؤں اور غریبوں کی مدد اور ان کے تعاون سے جہاں دنیا کی نعمتیں اور راحتیں نصیب ہوئی ہیں وہاں آخرت میں بھی اتنا ہی بڑا اجر و ثواب ہے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: فرمایا ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اس لیے نہ خود اس پر ظلم کرے اور نہ دوسروں کا مظلوم بننے کے لیے اسے بے یارو مددگار چھوڑے اور فرمایا جو کوئی اپنے بھائی کی ضرورت کو پورا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی ضرورتوں کو پورا فرمائیں گے اور جو کسی مسلمان کی تکلیف اور مصیبتوں کو دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کی مصیبتوں میں اس کی مصیبتوں کو دور کرے گا اور فرمایا جو کسی مسلمان کے عیبوں کو چھپائے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ داری فرمائے گا۔

معاشرے میں جن افراد کے ساتھ خصوصی تعاون کی ضرورت ہوتی ہے ان میں

بیواؤں کے ساتھ یتیموں کا تذکرہ بھی آیا ہے چنانچہ ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شہادت کی انگلی اور اس کے برابر کی بیچ والی انگلی کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رکھ کر فرمایا کہ جتنا تھوڑا سا فاصلہ اور فرق تم میری ان دو انگلیوں کے درمیان دیکھتے ہو بس اتنا ہی فاصلہ اور فرق جنت میں میرے اور اس مومن کے مقام میں ہوگا جو اس دنیا میں کسی یتیم کی کفالت اور پرورش کا بوجھ اٹھائے خواہ وہ یتیم اس کا اپنا عزیز ہو یا اجنبی ہو، حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے کسی یتیم کے سر پر صرف اللہ کے لیے ہاتھ پھیرا تو سر کے جتنے بالوں پر اس کا ہاتھ پھرا، تو ہر ہر بال کے حساب سے اس کی نیکیاں ثابت ہوں گی۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا مسلمانوں کے گھرانوں میں بہترین وہ گھرانہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا ہو اور مسلمانوں کے گھروں میں بدترین گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ برا سلوک کیا جائے۔

غریبوں، بیواؤں اور یتیموں کے ساتھ ہمدردی اور تعاون اور ان کے اخراجات کی فکر رکھنا، دراصل یہ وہ اعمال ہیں جو دل کی دردمندی اور رحم کے جذبہ سے انسان کرسکتا ہے اور اگر کوئی انسان محسوس کرے کہ میرے اندر کچھ بے حسی اور سخت دلی پائی جاتی ہے تو اس کا علاج بھی یہی ہے جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت مسند احمد میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی سخت دلی کی شکایت کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یتیموں کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا کرو اور مسکینوں اور حاجت مندوں کو کھانا کھلایا کرو۔

آج کل کے معاشرہ میں اللہ تعالیٰ کے ایک ارشاد گرامی کا خیال رکھنا بہت ضروری ہوگیا ہے فرمایا:

﴿لاتبطلوا صدقاتکم بالمن والاذی﴾

”اے ایمان والو! تم اپنے صدقہ و خیرات کو تکلیف اور اذیت دے کر اور احسان جتلا کر ضائع نہ کرو۔“

لہٰذا آج کے ماحول میں کسی غریب کی مدد کی جائے تو اس کی عزت نفس کا خاص

خیال رکھا جائے اورخصوصاً سفید پوش محتاجوں تک مدد پہنچانا اور باعزت محتاج بیواؤں کی مدد کرتے وقت ان کی خودداری مجروح ہونے سے خوب بچنے کی ضرورت ہے اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی خوددار محتاجوں کے بارے میں فرمایا:

﴿یحسبهم الجاهل اغنیاء من التعفف تعرفهم بسیماهم لایسألون الناس الحافا﴾

”فرمایا کہ لوگ ایسے لوگوں کو نہ مانگنے کی وجہ سے مالدار سمجھتے ہیں لیکن آپ ان کو ان کے چہروں سے پہچان سکتے ہیں اور وہ لوگوں سے لپٹ لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔“

واقعی ایسے خوددار محتاجوں تک مدد کا پہنچانا بہت بڑا کام ہے لیکن ان تمام تعاون اور مدد کی صورتوں میں صرف اس بات کا خیال خاص طور پر رہے کہ جن کی مدد کی جائے انہیں ذہنی اذیت اور تکلیف کسی صورت میں نہ پہنچے اور پھر تعاون کرنے والا کبھی بھی احسان نہ جتلائے۔

اللہ رب العزت ہمیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین۔

☆☆☆

ملکی وسائل کے بارے میں

حفاظت ودیانت کا اصول اختیار کیے بغیر بحالی معیشت وترقی ممکن نہیں

﴿عن معقل بن یسار قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول مامن وال یلی رعیة من المسلمین فیموت وهو غاش لهم الا حرم الله علیه الجنة و عنه قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول ما من عبد یسترعیه الله رعیة فلم یعطها بنصیحة لم یجد رائحة الجنة﴾ (متفق علیه)

''حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے جس حاکم یا ذمہ دار کے ہاتھ میں مسلمانوں کی سرداری آئے اور اس حالت میں مرے کہ وہ خائن و ظالم ہوتو اللہ تعالیٰ اس پر جنت حرام کر دے گا۔ اور حضرت معقل رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس بندے کو اللہ تعالیٰ رعیت کی نگہبانی سپرد کرے اور وہ بھلائی اور خیر خواہی کے ساتھ نگہبانی نہ کرے وہ جنت کی بو بھی نہیں پائے گا۔''

اللہ رب العزت نے قرآن مجید کو ہمارے لیے کتاب ہدایت یعنی راہنما کتاب قرار دیا اور عملی زندگی کے لیے باقاعدہ قرآن مجید ہی کی مثالیں دے کر راہنمائی فرمائی کہ دیکھ میں نے جو زندگی گزاری تو کامیاب گزری اور فلاں قوم نے اس کی خلاف ورزی کی تو اس کا انجام کیا ہے؟

اسی طرح معاشی بدحالی میں کیا طریقے اختیار کرنے چاہئیں؟ اس کی ایک مثال حضرت یوسف علیہ السلام نے ہمیں سکھلائی کہ کس طرح اس ملک کے سربراہ نے خواب دیکھا' حضرت یوسف علیہ السلام سے تعبیر پوچھی تو حضرت یوسف علیہ السلام نے تعبیر بتائی کہ دیکھو اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے سات سال اچھی پیداوار ہوگی پھر سات سال قحط پڑے گا' قحط کے بعد پھر ایک سال خوب بارش ہوگی اور معاشی بدحالی کا خاتمہ ہوگا۔

لیکن معاشی بدحالی میں معیشت کو سہارا دینے کا طریقہ اختیار کرو' پہلے سات سال جو زیادہ پیداوار ہو اسے گندم کے خوشوں میں محفوظ رکھو کیونکہ گندم کو خوشہ میں رکھنے سے کیڑا نہیں لگتا اس طرح گندم کو بڑا ہونے کے بعد کیڑا نہیں لگے گا اور قحط سالی کے وقت میں یہ گندم کام آئے گی۔

معلوم ہوا کہ معاشی بدحالی سے بچنے کے لیے معاشی منصوبہ بندی ضروری ہے اور اس سے دوسرا اصول یہ معلوم ہوا کہ معاشی بدحالی سے بچنے کے لیے بچت کا راستہ اختیار کرنا بھی ضروری ہے۔

چنانچہ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کے ذریعے صرف توکل نہیں سکھایا بلکہ معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے تدابیر اختیار کر کے پھر اللہ پر توکل کرنا سکھایا۔

جب معاشی طور پر خوشحالی ہوتی ہو تو پھر انسان فضول خرچیوں میں اسراف میں نہ پڑے بلکہ معاشی امور کی حفاظت کرے۔ چنانچہ ملک مصر میں جب ضرورت کا وقت آیا اور معاشی بدحالی کے خطرات منڈلانے لگے تو اب ایسے بندے کی ضرورت تھی جو کہ ایسی خوبیوں کا مالک ہو جن کے ذریعہ وہ حالات کو کنٹرول کر سکے۔ جتنے وسائل ہوں انہی کے ذریعے سب کی حفاظت بھی کر سکے اور ڈھنگ سے ان کو خرچ کر کے عوام کو معاشی بدحالی کے برے اور تکلیف دہ اثرات سے محفوظ بھی کر سکے۔

اب یوسف علیہ السلام نے سربراہ مملکت کو کہا:

"**قال اجعلنی علی خزائن الارض انی حفیظ علیم**" یعنی معاشی بدحالی

کے حالات کا اندازہ ہوا تو یوسف علیہ السلام نے کہا کہ ملکی خزانوں پر مجھے مقرر کر دیں میں ان کی حفاظت بھی کروں گا اور آمدن وخرچ اور اس کے اصول وضوابط کا بھی خوب علم رکھتا ہوں۔ اس مختصر سے جملہ میں حضرت یوسف علیہ السلام نے ان تمام اوصاف کو جمع کر دیا جو کسی بھی مملکت میں معیشت کے لیے بحالی اور اس کی ترقی کے لیے کسی ذمہ دار بندے میں ہونے ضروری ہیں۔ یعنی کسی بھی ملک کی معاشی بحالی اور اس کی ترقی کے لیے بنیادی طور پر یہ دو خوبیاں اپنائی جائیں تو پھر ہمارے خالق نے بتایا کہ سخت سے سخت حالات میں بھی پھر اس ملک کے عوام مشکلات میں مبتلا نہیں ہوتے۔

اس لیے کسی بھی محکمہ کے ذمہ دار افراد کا یہ فرض ہے کہ وہ ان دو خوبیوں کو اپنائیں۔ سرکاری اموال کی خوب حفاظت کریں ان کو ضائع نہ ہونے دیں اور ہر مرحلے پر حفاظتی نظر رکھیں۔ غلط جگہ، غلط مصارف پر اخراجات نہ ہونے دیں اور پھر جس قدر ضرورت ہے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے جہاں جہاں خرچ کرنے کی ضرورت ہو اس میں کوتاہی نہ کی جائے۔

چنانچہ ذمہ دار افراد حفاظت و دیانت کے دو اوصاف اپنے اندر پیدا کر لیں تو جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے زمانہ حکومت میں عوام کی فلاح و بہبود اور ان کو راحت و آرام پہنچانے میں کامیابی حاصل کی۔ انشاء اللہ ملک پاکستان میں موجود معاشی وسائل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ہمارے معاشی حالات کو بھی بدل کر رکھ دے گا اور انشاء اللہ پوری دنیا میں اس ملک کی معاشی ترقی سامنے آئے گی۔

معاشرہ کی اصلاح کیسے ممکن ہے؟

﴿عن ابی سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من رأی منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ وذالک اضعف الایمان﴾(رواہ مسلم)

''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے اگر کوئی شخص برائی ہوتے دیکھے تو اسے اپنے ہاتھوں سے دور کر دے، اگر یہ نہ کر سکے تو زبان سے منع کر دے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل میں اسے برا سمجھے اور یہ کمزور ترین ایمان ہے۔''

اللہ رب العزت نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی اصلاح و ہدایت کے لیے بھیجا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اللہ رب العزت نے ایمان والوں پر بڑا احسان کیا کہ ان میں انہی میں سے ایک پیغمبر بھیجے جو ان کو اللہ کی آیات پڑھ پڑھ کر سناتے اور ان کو پاک کرتے اور اللہ کی کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں اور پہلے تو یہ کھلی گمراہی میں تھے۔''

اور گمراہیاں بھی اس قدر کہ زندگی کے ہر موڑ میں لوگ بھٹکے ہوئے تھے' معمولی معمولی باتوں پر طویل لڑائیاں تھیں جس میں ناحق خون بہتا رہتا تھا' عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہوتے رہتے تھے، بدکاری عام تھی' شراب نوشی کے رسیا تھے' قمار بازی اور جوئے کی لعنت میں مبتلا تھے۔ سود خوری سے لوگوں کا استحصال کرتے، دوسری طرف لوگ غربت کی وجہ سے بچوں کو قتل کر ڈالتے اور بچیوں کو عار سمجھتے ہوئے زندہ دفن کر دیتے، انسانوں کو غلام بنا کر بیچا

اورخرید اجاتا، سفا کی اور بے رحمی پرفخر کیا جاتا، بے حیائی عام تھی، مذہبی گمراہی میں مبتلا تھے‘ معاشی اورمعاشرتی برائیاں عام تھیں۔

ایسے معاشرے میں رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ رب العزت نے مصلح اعظم بنا کر بھیجا آپ ﷺ نے ان کی اصلاح کے کیا طریقے اپنائے؟ کیسی کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟ سیرت طیبہ کے مطالعہ سے یہ سب باتیں واضح ہوجاتی ہیں۔

حکم الٰہی ”**وانذر عشیرتك الاقربین**“ آیا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کی اصلاح سے آغاز فرمایئے تو سب سے پہلے کوہ صفا کے دامن میں اہل مکہ کو اکٹھا کیا، پیغام اصلاح و ایمان دیا، اللہ کی وحدانیت کا اعلان کیا۔ لوگوں نے قبول نہ کیا پھر ایک دن خاندان کے تمام افراد ایک دعوت میں اکٹھے تھے وہاں پیغام اصلاح دیا۔ آہستہ آہستہ لوگ قبول کرتے چلے گئے۔ لیکن کچھ لوگوں کو اپنے باپ داد کے دین سے محبت تھی‘ کچھ لوگوں کو اپنی سرداری خطرے میں پڑتی نظر آئی‘ بداخلاقیوں پرتنقید برداشت نہ ہوئی‘ مساوات قائم ہونے سے اندیشے آنے لگے‘ بنو ہاشم سے دشمنی پر اتر آئے۔ پھر کفار مکہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جس قدر تکلیفیں پہنچا سکتے تھے پہنچائیں۔

مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ شریف تشریف لے گئے اور پھر امت کے سامنے ایک ایسی اسلامی ریاست قائم فرما گئے جس کا ہر ہر فرد اصلاح یافتہ تھا رضی اللہ عنہم اجمعین۔

اس اعلیٰ درجے کی اصلاح کیسے ممکن ہوئی اس کے لیے اللہ رب العزت نے مصلح اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو راہنما اصول عطا فرمائے۔

﴿ادع الی سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن﴾

”فرمایا اپنے رب کے راستے کی طرف دانائی اورعمدہ نصیحت سے بلایئے اور اچھے طریقے سے مناظرہ کیجیے۔“

لہٰذا مصلح اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کی اصلاح کے لیے تاقیامت اسوہ حسنہ

کے ذریعہ دینی اصول قائم کر دیئے کہ حکمت وتدبر سے اصلاح کی جائے، عمدہ نصیحت کے ذریعہ اوراصلاح کرتے ہوئے دلائل کی روشنی میں اپنی بات واضح کرتے جائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے امت کے لیے نمونہ زندگی عطا فرمایا کہ اصلاح کے لیے نرم طبیعت، نرم دل انتہائی موثر ہوتے ہیں۔سورۃ آل عمران میں فرمایا:

﴿ولو كنت فظا غليظ القلب لا نفضوا من حولك﴾

"اگر آپ سخت خو، اور سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کے پاس سے بھاگ جاتے۔"

اصلاح فرماتے ہوئے لوگوں کو ہمدردی اور محبت سے ان کے برے اعمال کے برے انجام سے آ گاہ فرماتے' اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم اوراس کی محبت سے لوگوں کے لوگوں کو پُرامید بناتے۔

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے اصلاح کے لیے رواداری کا اصول بھی سکھایا۔ دوسروں کے راہنماؤں اور پیشواؤں کو برا کہنے سے جو رنجیدگی اور بے چینی پیدا ہوتی ہے وہ عموماً اصلاح میں بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کے لیے روانہ کرتے ہوئے نصیحت فرمائی لوگوں کو خوشخبری سنانا' نفرت نہ دلانا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصلاح کرتے ہوئے لوگوں کے دلوں کو جوڑا' مواخات قائم فرمائی، بھائی بھائی بنایا اور خود عملی نمونہ بن کر دکھایا۔

انفرادی اصلاح بھی فرمائی اوراجتماعی اصلاح کا انتظام بھی فرمایا۔

لیکن اصلاح تو وہ کرے جس کی خود اپنی اصلاح ہو چکی ہو ورنہ وہ خود تو یہی کہے گا "انما نحن مصلحون" ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا "الا انهم هم المفسدون ولكن لا يشعرون" یعنی یہ تو اصلاح کرنے کے بجائے فساد کرنے والے ہیں لیکن انہیں شعور نہیں۔

اسی لیے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مصلح اعظم بنا کر بھیجا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصلاح کے لیے یہ اصول سکھائے۔

کہ اصلاح کرنے والے کو سب سے پہلے اپنے اندر اخلاص پیدا کرنا چاہیے۔ ریا کاری، نمائش مقصود نہ ہو' لوگوں سے ہمدردی ہو' اصلاح کرنے والا لوگوں کو حقیر نہ سمجھ رہا ہو' اصلاح کرنے والے کے لیے اخلاق حسنہ سے آراستہ ہونا انتہائی ضروری ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اصلاح کے لیے آمادہ کرتے ہوئے اپنی ذاتی زندگی کو لوگوں کے سامنے دلیل کے طور پر پیش کیا۔ مصلح اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کی اصلاح کرتے ہوئے ہمیشہ لوگوں کی نفسیات کا خیال رکھا۔ کسی اجنبی بدو کی اصلاح کا طریقہ کچھ اور تھا لیکن تربیت یافتہ صحابہؓ کی اصلاح کا طریقہ اس سے بالکل مختلف ہوتا۔

آج اگر کوئی انسان اصلاح کرنے چلے اور نتائج مثبت نظر نہ آئیں تو پھر اسے مصلح اعظم صلی اللہ علیہ وسلم سے طائف کی وادی والا صبر اور تحمل سیکھنا ہوگا۔ اصلاح کرنے پر لوگوں کے منفی ردعمل کے باوجود ان کے لیے بارگاہ الٰہی میں ان کی ہدایت کے لیے دعائیں کرنا ہوں گی اور یہ اصلاح کا عمل مسلسل جاری رکھنا ہوگا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر ہوگا تو یقیناً اصلاح کے نتائج ظاہر ہوں گے۔ اللہ رب العزت ہم سب کو اپنی اصلاح کرنے اور دوسروں کی اصلاح مصلح اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے سے کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔۔



خدمت خلق کے ذریعہ مؤمن ایک جسم کی طرح متحد ہوسکتے ہیں

﴿عن النعمان بن بشیر رضی اللہ عنه قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم تری المؤمنین فی تراحمهم وتوادهم وتعاطفهم کمثل الجسد اذا اشتکی عضوا تداعی له سائر الجسد بالسهر والحمی......﴾(متفق علیه)

''حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم مومنین کو آپس میں رحم کرنے ،محبت رکھنے اور مہربانی کرنے میں ایسا پاؤ گے جیسا کہ ایک بدن' جب بدن کا کوئی عضو دکھتا ہے تو سارا جسم درد اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔''

ہم اپنے معاشرے میں غور کریں تو خدمت خلق کی سینکڑوں صورتیں نظر آتی ہیں' رفاہِ عامہ کے کام خدمت خلق کی اہم صورت ہیں۔ اسلام نے خدمت خلق کو صدقۂ جاریہ کہا ہے یعنی یہ وہ کام ہیں جن کا اثر اور فیض مدتوں جاری رہنے والا ہے۔ان کا ثواب ان کے قائم کرنے والوں کو اس وقت تک ملتا رہے گا جب تک یہ قائم اور جاری رہیں گے۔مثال کے طور پر مساجد کی تعمیر، شفا خانے قائم کرنا، مکتب اور مدرسے قائم کرنا، سرائے تعمیر کرانا، کنویں کھدوانا، پل بنوانا، یتیم خانے اور محتاج خانے قائم کرنا اور ایسے اداروں کا قیام جہاں سے نادار لوگوں کی ضروریات پوری ہوسکیں۔

ضرورت مند انسانوں کی ہر قسم کی ضروریات کو پورا کرنا خدمت خلق کی اہم ترین صورت ہے۔ بھوکوں کو کھانا کھلانا اور ضرورت مندوں کو کپڑا پہنانا، مریضوں کو دوائیاں مہیا کرنا، لاوارث لڑکیوں کی شادی کا اہتمام کرنا اور ایسے نیک کام کرنا جن کی تلقین اسلام بار بار

کرتا ہے۔

خدمت خلق کا تقاضا یہ ہے کہ یتیموں کی کفالت کی جائے۔ یتیم کی کفالت کرنے والے کے لیے یہ خوشخبری ہے کہ جنت میں اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب نصیب ہو گا۔ یتیموں کے حقوق قرآن کریم میں بڑی تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ چونکہ یہ کمزور اور بے بس ہوتے ہیں اس لیے ان کے حقوق کی حفاظت اور کفالت کے سلسلے میں تفصیلی احکامات دیئے گئے ہیں یہاں تک کہ ان کی مدد میں کوشاں رہنے والے کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں مجاہد کی طرح قرار دیا گیا ہے۔

بیوہ کا عام طور پر کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ ایسے حالات میں وہ ضروریات زندگی کے لیے محتاج ہوتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خبر گیری کو جہاد کے برابر قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان سے بڑھ کر اور کون ہماری خدمت کا مستحق ہو سکتا ہے۔

بیمار کی عیادت کرنا ایک بہت بڑی نیکی ہے۔ مریض کو زبانی تسلی اور تشفی سے ڈھارس بندھ جاتی ہے اور مریض کی یہ دلجوئی اللہ تعالیٰ کو بڑی پسند ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب ایک مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کے لیے جاتا ہے تو وہ جنت کے میوے کھاتا رہتا ہے جب تک لوٹ کر نہیں آتا۔''

حدیث میں مسلمان کے مسلمان پر چھ حق بیان ہوئے ہیں، جن میں ایک مریض کی عیادت کرنا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کمزوروں کی مدد اور مظلوموں کی فریاد رسی کو فرض قرار دیا ہے۔ اور اپنے خادموں کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تلقین فرمائی کہ جو کچھ تم خود کھاؤ وہی اپنے غلاموں اور خادموں کو کھلاؤ اور جو کچھ خود پہنو وہی اپنے غلاموں اور خادموں کو پہناؤ۔

بنی نوع انسان کی بھلائی اور اس کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اس کی توجہ راہ نجات کی طرف دلا دی جائے چنانچہ نیکی کی تلقین اور برائی سے منع کرنا (امر بالمعروف و نہی

عن المنکر) ہر مسلمان پر فرض ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام کائنات کے لیے رحمت بن کر تشریف لائے۔ آپ کی یہ رحمت صرف انسانوں تک ہی محدود نہیں تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جانوروں کے بھی سچے ہمدرد اور محسن تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے دلوں میں یہ احساس پیدا فرمایا کہ حیوانات بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔ انہیں بھی تمہاری طرح تکلیف ہوتی ہے اور یہ بتایا کہ بھوکے جانور کو کھلانا اور پیاسے کو پلانا بھی بہت بڑی نیکی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تم سبز خطے کے زمانے میں سفر کرو تو اونٹوں کو ان کا حصہ زمین میں سے دو یعنی انہیں چرنے دو اور جب تم قحط کے زمانے میں سفر کرو تو انہیں تیز چلاؤ۔'' اسی طرح جانور کو غلط طریقے سے ذبح کرنے سے منع فرمایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا ''کیا چوپایوں پر رحم کرنے سے بھی ثواب ملتا ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہاں۔''

حدیث شریف میں ایک واقعہ بیان ہوا ہے کہ ایک شخص نے پیاسے کتے کو پانی پلایا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مغفرت کی خبر دی۔ اسی طرح ایک عورت کے متعلق حدیث شریف میں بیان ہوا کہ وہ محض اس وجہ سے جہنم کی سزاوار ٹھہرے گی کہ اس نے بلی کو باندھ کر مار دیا تھا۔

کسی ایک انسان کے بس میں نہیں کہ خود ہی تمام ضرورت مندوں کی ضروریات کو پورا کر دے۔ ایسے موقع پر جب وہ خود اس قابل نہ ہو کہ کسی کی خدمت کر سکے تو اسے دوسروں سے حاجت مند کی ضرورت کو پورا کرنے کی سفارش کر دینی چاہیے۔ یہ بھی خدمت خلق کی ایک صورت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''اگر خود نیکی نہ کر سکو تو کسی اور ہی کی سفارش کر دو یہ بھی نیکی ہے۔''

سماجی بہبود آج ایک سائنس بن گئی ہے‘ اس کی تہہ میں انسانوں کی بہتری اور فلاح و بہبود کا جذبہ کارفرما ہے جسے ہم خدمت خلق کہتے ہیں اس کے بنیادی اصول اسلام کے جذبہ خدمت خلق سے کچھ مختلف نہیں اگرچہ طریقہ کار ضرور مختلف ہے۔

ان سماجی بہبود کے کاموں کی طرف ہمیں بھرپور توجہ دینی چاہیے اور ان کے طریق کار کو بھی اسلام کی روح کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

خدمت خلق کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ پڑوسیوں سے اچھا سلوک کیا جائے' ان کے دکھ درد میں شریک ہوا جائے، انہیں اذیت نہ پہنچائی جائے، ان کے گھر تحفے بھیجے جائیں اور ان کے بچوں کے ساتھ محبت وشفقت سے پیش آیا جائے۔

مہمان نوازی بھی خدمت خلق کی ایک صورت ہے' حدیث میں اس کی تاکید اس طرح فرمائی گئی ہے۔''جو شخص اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ مہمان کی عزت کرے۔''

کوئی شخص زیادہ استطاعت نہ رکھتا ہو تو اس کے لیے بھی خدمت خلق کے دروازے کھلے ہیں' اس کے لیے بے شمار دوسری صورتوں کے علاوہ راستے کی کسی تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا بھی خدمت خلق اور صدقہ ہے۔

اللہ رب العزت تمام مؤمنین کو ایک جسم کی طرح احساس، ہمدردی اور محبت کرنے والا بنا دے۔آمین



اہل معاشرہ کے لیے خیر خواہی کا طریقہ

حکمت سے نصیحت

﴿عن ابی سعید الخدریؓ عن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال من رای منکم منکرا فلیغیره بیده فان لم یستطع فبلسانه فان لم یستطع فبقلبه وذالك اضعف الایمان﴾(رواہ مسلم)

”حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص خلاف شرع بات دیکھے اسے زور بازو سے تبدیل کرے اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے کرے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو دل سے اسے برا جانے اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے۔“

اللہ رب العزت نے سورۃ العصر میں فرمایا: ”زمانے کی قسم! انسان بڑے خسارے میں ہے مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے اور ایک دوسرے کو حق بات کی وصیت کرتے رہے اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کرتے رہے۔“

عربی زبان میں لفظ وصیت دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے، ایک معنی تو یہ لیا جاتا ہے کہ زندگی آخری لمحات میں ہدایت دینا کہ میرے مرنے کے بعد ایسا کرنا یا ایسا نہ کرنا عموماً اس کو وصیت کہتے ہیں۔ اور دوسرا مفہوم وصیت کا یہ ہے کہ کسی شخص کو تاکید کے ساتھ مؤثر انداز میں نصیحت کرنا اور نیک کام کی ہدایت کرنا۔

قرآن مجید میں لفظ وصیت ان دونوں معنوں میں آیا ہے۔ لیکن ہم اس وقت وصیت بمعنی نصیحت کے لے رہے ہیں اس لیے سورۃ العصر میں اللہ رب العزت نے انسان کو خسارے اور گھاٹے میں سے نکلنے کے جو طریقے بتائے ہیں ان میں ایمان اور عمل صالح کے بعد ایک دوسرے کو حق بات اور صبر کی وصیت یعنی نصیحت کرنا ہے۔ معلوم ہوا کہ انسان اگر خود تو قرآن و سنت پر عمل کر رہا ہو، خود اعمال صالحہ کا پابند ہو تو اس کے لیے ایک فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ دوسرے

لوگوں کو بھی ایمان اور اعمال صالحہ کی طرف آنے کی نصیحت کرتا رہے۔ خصوصاً اپنے اہل و عیال اور دوست احباب کے برے اعمال کی طرف توجہ نہ دیتے ہوئے نصیحت کرنے سے غافل ہونا خسارے کا راستہ ہے۔ بسا اوقات انسان یہ سمجھتا ہے کہ بس ٹھیک ہے میں خود اپنے اعمال کا جواب دہ ہوں۔ میں خود نیک کام کر رہا ہوں دوسرا کیا کر رہا ہے مجھے غرض نہیں یا یہ جملے منہ سے نکل جاتے ہیں کہ میں نے اپنی قبر میں جانا ہے اس نے اپنی قبر میں جانا ہے لہٰذا یہ جملے کہہ کر انسان وصیت یعنی نصیحت سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ اس بات کا جواب اور نصیحت کا فلسفہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خوبصورت مثال کے ذریعہ سمجھایا فرمایا کہ ایک کشتی میں کچھ لوگ سوار ہیں۔ منزل کی طرف رواں دواں ہیں کچھ لوگ کشتی کی اوپر والی منزل میں ہیں اور کچھ لوگ نچلی منزل میں ہیں۔ جب نچلی منزل والے اوپر پانی لینے کے لیے جاتے تو اوپر والوں کو تکلیف ہوتی۔ چنانچہ ایک شخص نے کشتی کے پیندے میں سوراخ کرنا شروع کر دیا۔ لوگوں نے کہا یہ کیا کر رہا ہے؟ اس نے جواب دیا تمہیں کیا، میں اپنی سیٹ کے نیچے سوراخ کر کے پانی حاصل کر رہا ہوں تمہیں تو کوئی تکلیف نہیں دے رہا ہوں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿فان اخذوہ علی یدیہ نجوہ ونجوا انفسھم وان ترکوہ اھلکوہ واھلکوا انفسھم﴾

”فرمایا کہ اگر وہ لوگ اس شخص کو کشتی میں سوراخ کرنے سے روک لیں تو وہ اس شخص کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بھی ڈوبنے سے بچا لیں گے اور اگر وہ اس کو اس کے اپنے حال پر چھوڑ دیں گے کہ ٹھیک ہے وہ اپنی نشست کی جگہ سوراخ کر رہا ہے ہمیں کیا تو پھر وہ شخص بھی ڈوبے گا اور باقی کشتی والے بھی ڈوب جائیں گے۔“

بالکل اسی طرح ہم بھی معاشرے کی ایک ہی کشتی کے سوار ہیں لہٰذا اگر ہم اپنی جگہ نیک ہوں، با عمل ہوں لیکن دوسرا شخص برائی میں مبتلا ہو تو اب اس انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ وصیت یعنی نصیحت کر کے اسے برائی سے روکے۔ ورنہ اس کے برے اعمال اس نیک تک بھی

پہنچیں گے اس لیے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿والذی نفسی بیدہ لتامرن بالمعروف ولتنھون عن المنکر اولیوشکن اللہ ان یبعث علیکم عذابا من عندہ ثم لتدعنہ ولایستجاب لکم﴾

''فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم نیک باتوں کا حکم کرتے رہو اور بری باتوں سے روکتے رہو ورنہ عنقریب اللہ تعالیٰ تم پر اپنا عذاب نازل کر دے گا پھر تم اللہ سے دعاء کرو گے اور تمہاری دعاء قبول نہیں کی جائے گی۔''

باقی رہی یہ بات کہ اب نصیحت کا دور کہاں، تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اسوۂ حسنہ سے وصیت یعنی نصیحت کے آداب اور سلیقے سکھائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ادع الی سبیل ربك بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ﴾

''بڑی سمجھدار اور عمدہ نصیحت کے ذریعہ اپنے رب کے راستے کی طرف بلاؤ۔''

لہٰذا جب بھی نصیحت کرتے ہوئے سمجھداری کے تقاضے پورے نہ کیے جائیں تو پھر نصیحت کے انتہائی برے اثرات سامنے آتے ہیں جیسے نصیحت کرتے ہوئے اپنے آپ کو نیک پارسا ظاہر کرنا' دوسرے کو گنہگار ہونے کا احساس دلانا' نصیحت کرتے ہوئے تمسخر کا انداز اور دوسرے کی تحقیر کا لہجہ اپنانا چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے شخص کے جذبات و احساسات کا خوب خیال فرماتے تھے۔ آپ کے قریبی صحابہ سے کوئی نامناسب بات سامنے آتی تو ناراضگی کا اظہار فرماتے تھے، ایک صحابی نے پکا مکان بنا لیا تو ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ دوسری طرف دیہاتی نے آ کر مسجد میں پیشاب کرنا شروع کر دیا تو فرمایا اسے ذرا فارغ ہونے دو ابھی نہ روکو پھر بعد میں اسے بلایا، فرمایا کہ یہ مسجدیں اللہ کی عبادت کے لیے ہوتی

ہیں ان کو پاک رکھنا چاہیے پھر دوسرے صحابی سے فرمایا کہ جاؤ اس جگہ کو پاک کردو۔

جب کہنے والے کے دل میں دوسرے کے بارے میں ہمدردی اور درد ہو تو اسے نصیحت کرتے ہوئے اس کے اپنے لہجے میں اعلیٰ درجہ کی رقت اور اثر انگیزی آجاتی ہے۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دن کو لوگوں کو نصیحت فرماتے تو راتوں کو اللہ کے حضور گڑگڑاتے امت کے لیے دعائیں مانگتے اور امت کے گناہوں کی مغفرت مانگتے امت کے لیے اتنے فکرمند اور مہربان کہ ارشاد باری ہوا:

﴿حریص علیکم بالمؤمنین رؤف رحیم﴾

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے بہت سے مراحل میں کئی نصائح ارشاد فرمائی ہیں پیدائش سے لے کر مرنے تک کے مرحلے کے لیے وصیتیں فرمائیں اور پھر موت کے بعد دائمی زندگی کے لیے بھی خوب نصیحتیں فرمائیں۔ کبھی کبھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نصیحت فرماتے ہوئے یہ بھی فرماتے کہ میں تمہیں وصیت کرتا ہوں جیسے ایک مرتبہ فرمایا:

﴿اوصیکم بتقوی اللہ﴾

''میں تمہیں اللہ سے ڈرنے کی نصیحت کرتا ہوں۔''

پھر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی بسا اوقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے رہنمائی طلب کرنے کی خاطر وصیت یعنی نصیحت کا لفظ استعمال کرتے جیسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا اوصنی۔ مجھے نصیحت کیجیے تو آپ نے فرمایا ''**لاتغضب**'' تو غصہ مت کر یہ سن کر اس شخص نے پھر بار بار یہ جملہ دہرایا تو آپ نے ہر بار فرمایا ''**لاتغضب**'' تو غصہ مت کر۔ معلوم ہوا کہ کسی بات کی اہمیت کے پیش نظر بار بار ایک ہی نصیحت کو دہرانا چاہیے عربی میں ایک محاورہ ہے۔ ''**اذاتکرر الکلام علی السمع تقرر فی القلب**''۔ اگر کانوں پر کسی بات کو بار بار دہرایا جائے تو وہ دل میں بس جاتی ہے اس لیے دوسرے کی اکتاہٹ کا لحاظ کرتے ہوئے سلیقے سے بات کو دہرانا یقیناً عمل کے لیے مفید ثابت ہوتا ہے۔ اللہ رب العزت ہم سب کو آپس میں سمجھداری اور سلیقے سے حق بات کی وصیت و نصیحت کرنے کی

توفیق عطا فرمائے۔(آمین)



مسلمان معاشرے کی تشکیل مساجد کے ذریعہ

﴿وعن عثمان رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من بنی لله مسجدًا بنی الله له بیتًا فی الجنة﴾ (متفق علیه)

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اللہ کے لیے مسجد بنائے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں گھر بناتا ہے۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد مدینہ میں جو سب سے پہلی تعمیر کی وہ مسجد نبوی تھی جو چودہ سو سال سے قائم ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک قائم رہے گی۔

تاریخ شاہد ہے کہ جہاں کہیں مسلمانوں نے نئے شہر آباد کیے یا چھاؤنیاں قائم کیں، وہاں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا گھر یعنی مسجد تعمیر کی کیونکہ مسجد کو مسلمان شعار ملی سمجھتے تھے اس لیے وہ انہیں تمام عمارتوں سے زیادہ خوبصورت اور عالیشان بناتے تھے۔ آج تک پرانے زمانے کی ہزار ہا مساجد اس بات کا ثبوت ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ مسجد وہ مقام ہے جہاں اسلامی معاشرت نشوونما پاتی ہے۔ علم دین کی اشاعت کا بہترین مرکز ہمیشہ مسجد ہی رہی ہے۔ عبادات کے علاوہ مسلمان مساجد میں اخوت، مساوات، ایثار و ہمدردی کے قیمتی جوہر حاصل کرتے ہیں۔ آدابِ مجلس اور آدابِ معاشرت کے اصولوں کی عملی تربیت بھی مساجد میں سرانجام پاتی ہے اس لیے اسلامی معاشرت کی تعمیر و ترقی کے لیے مساجد کا وجود نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر عامۃ المسلمین کی تربیت مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ نماز کے متعلق ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے فرض نماز مسجد کے بغیر ہوتی ہی نہیں۔ بعض جگہ ارشاد ہے جو شخص مسجد کی اذان سنے اور مسجد میں نہ آئے وہ منافق ہے۔ نیز مسلمانوں کی تنظیم اور اصلاح کے لیے مساجد نہایت ضروری ہیں۔

معاشرے کی اصلاح اور تعمیر و ترقی میں مسجد نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے' ابتدائے

اسلام میں مسلمانوں کی درسگاہ اور تربیت کا مرکز صرف مساجد تھیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لاکھوں صحابہؓ کی تربیت مسجد نبوی ہی میں کی تھی۔ جو لوگ اونٹ چرانا بھی نہ جانتے تھے، وہ تربیت رسول اللہ سے قوموں کے امام بن گئے۔ مسجد اصلاح معاشرہ میں درج ذیل مقاصد پورے کرتی ہے۔

مسجد میں آ کر تمام نسلی، خاندانی اور مالی امتیازات ختم ہو جاتے ہیں، تمام مسلمان ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر مساوات اور اسلام کا عملی ثبوت پیش کرتے ہیں' یہاں آ کر امیر و غریب ، کالے اور گورے کی کوئی تمیز باقی نہیں رہتی، مسجد ہمیں اخوت و بھائی چارہ اور ہمدردی کا درس دیتی ہے۔ آپس میں میل جول سے اخوت، تعاون اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں آ کر محلّہ کے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ کون غریب ہے اور امداد کا مستحق ہے؟ ایک دوسرے کے دکھ درد کا احساس ہوتا ہے اور دل میں دوسروں کے دکھ درد کو ختم کرنے کے احساسات ابھرتے ہیں۔

مسجد میں اجتماعی عبادت کرنے سے مسلمانوں میں تنظیم کا اعلیٰ جوہر پیدا ہوتا ہے۔ نیز اطاعت امیر کی مشق بھی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ نماز باجماعت میں ہر نماز میں سجدہ' رکوع اور اٹھنا بیٹھنا سب امام کی تکبیر کے ساتھ کرنا پڑتا ہے۔ اگر امام کی ذرا بھی پیروی نہ کرے تو نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ مسجد کو اسلام میں عظیم اہمیت حاصل رہی ہے۔ مکہ میں نبوت کے بارہویں سال اگرچہ نماز فرض ہو گئی تھی، مگر مسلمانوں کی عسکری قوت کی کمزوری کے باعث مکی زندگی میں باجماعت نماز کا اہتمام نہ کیا جا سکا، جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے مسجد تعمیر کی۔

محبت، شفقت، ایثار و ہمدردی کے اعلیٰ جوہر مسجد میں خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسلامی تہذیب و ثقافت کی نشوونما بھی مسجد میں پروان چڑھتی ہے مسجد میں روزانہ کی وعظ و نصیحت سے عوام کے اخلاق و عادات کو درست کیا جاتا ہے، برائیوں کو مٹانے اور نیکیوں کو پھیلانے میں مسجد نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے، مسجد کے ذریعے عوام کے شعور کو بیدار کیا جا

سکتا ہے، قانون کا احترام اور معاشرتی ذمہ داری کا احساس مسجد کے ذریعے باآسانی دلایا جا سکتا ہے۔

مسجد مسلمان بچوں کی درسگاہ بھی ہے جہاں انہیں قرآن و حدیث کی تعلیم دی جاتی ہے قرون اولیٰ میں تمام بڑے بڑے مدارس مسجدوں ہی میں قائم تھے اب بھی اگر مسجد کو درسگاہ کا درجہ دے دیا جائے تو یہ بات اس کی عظمت کو بحال کرنے میں مددگار ثابت ہوگی۔

قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ صحابہ کرامؓ سے مشورہ لے لیا کریں۔ اسی طرح صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے بارے میں قرآن مجید ناطق ہے کہ وہ اپنے معاملات مشورے سے طے کیا کرتے تھے۔ عہد نبوی اور خلفائے راشدین کے ادوار میں مسجد نبوی میں کئی مرتبہ شوریٰ کے اجلاس منعقد ہوئے۔ چنانچہ مؤرخین نے تصریح کی ہے کہ جنگ بدر کے قیدیوں کے بارے میں سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے مسجد نبوی ہی میں مشورہ لیا۔

مسجد کی عظمت رفتہ کو بحال کرنے کے عملی اقدامات:

مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بحالی مساجد کی عظمت کی بحالی سے وابستہ ہے اس لیے جب ہم مساجد کی حیثیت کی بحالی کی بات کرتے ہیں تو حقیقت میں مسلمانوں کی کھوئی ہوئی عظمت کو بحال کرنے کی فکر کرتے ہیں۔ یہ اتنا اہم مسئلہ ہے کہ اس پر مفکرین اور اہل بصیرت کو غور وفکر کرنا چاہیے۔

حسب ذیل اقدامات سے اس مقصد کا حصول ممکن ہوسکتا ہے:

(۱) ہر مسجد کو مکتب کی حیثیت دی جائے۔

(۲) ہر جامع مسجد کے ساتھ لائبریری قائم کی جائے۔

(۳) ہر مرکزی مسجد کے ساتھ مہمان خانے تعمیر کیے جائیں۔

(۴) مساجد کے ساتھ شفا خانے قائم کیے جائیں۔

(۵) مساجد کی امامت وخطابت کے لیے قابل اور باعمل علماء کا انتخاب کیا جائے۔

(٦) ہر مسجد کے ساتھ بیت المال کا قیام ہو۔

(٧) مسجد کو اہل محلّہ یا بستی کی جملہ سرگرمیوں کا مرکز بنایا جائے۔



رہنا سہنا بھائیوں کی طرح
معاملہ کرنا اجنبیوں کی طرح

﴿عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال تعاشروا کالاخوان وتعاملو اکالا جانب﴾(مشکوٰۃ)

''فرمایا کہ تم لوگ رہو سہو بھائیوں کی طرح اور معاملہ کرو اجنبیوں کی طرح۔''

اللہ تعالیٰ نے ہمیں باہمی معاملات کے آداب قرآن مجید میں سکھائے ہیں باہمی معاملات میں باہمی رضا مندی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ باہمی رضا مندی جتنی گرمجوشی، دیانتداری اور خلوص پر مبنی ہو گی۔ لین دین کے معاملات اتنے زیادہ مضبوط قابل اعتماد اور منافع بخش ہوں گے اس لیے کہ باہمی رضا مندی تمام تجارتی امور کی پہلی بنیادی اینٹ ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اے ایمان والو! تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ باہمی رضا مندی سے تجارت ہو۔'' اس ارشاد باری تعالیٰ سے معلوم ہوا کہ دوسرے انسان کو تکلیف پہنچا کر مال کمایا اور کھایا تو یہ جائز نہ ہوگا۔ اس آیت سے ایک یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ دونوں فریق اگر باہمی رضا مندی سے مال کمانے کے کسی باطل طریقے کو اختیار کریں تو پھر محض باہمی رضا مندی سے وہ باطل طریقہ جائز نہیں ہوگا کبھی کبھی رضا مندی درحقیقت مجبوری کی رضا مندی ہوتی ہے۔

یہ بات درست ہے کہ دور جدید کی تجارت کا ایک بڑا حصہ اشیاء ضروریہ کو ذخیرہ کرنے کی بناء پر چلتا ہے لیکن اسلام نے ہر طرح کے ذخیرہ کو ممنوع قرار نہیں دیا بلکہ شریعت اسلامیہ میں اس کے لیے لفظ احتکار آیا ہے۔ اس لفظ کی وضاحت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے ہوتی ہے:

﴿من احتکر حکرۃ یرید ان یغلی بھا علی المسلمین فھو

خاطئی﴾ (مشکوٰۃ باب الاحتکار)

''جس تاجر نے ذخیرہ اندوزی کی اس ارادہ سے کہ وہ اس طرح مسلمانوں پر اس چیز کو مہنگا کرے تو وہ خطاء کار ہے۔''

باہمی معاملات کے لیے ایک یہ بھی حکم ہے کہ سود سے بچا جائے اور اگر کسی کے ذمہ سود ہو تو اسے چھوڑ دیا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور چھوڑ دو جو بچ جائے سود میں سے اگر تم مومن ہو۔''

باہمی معاملات کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ تعلیم بھی دی کہ ناپ تول پورا رکھنا چاہیے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے'' خرابی ہے گھٹا کر دینے والوں کے لیے وہ لوگ جب دوسرے سے مال لیں تو پورا لیں اور جب دوسروں کو ناپ یا تول کر دیں تو کم دیں۔''

اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیانتداری سے ایک قدم آگے بڑھ کر احسان کی تعلیم دی۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے '' زن وارجح ''تول اور جھکتا ہوا تول۔

باہمی معاملات کا ایک ادب یہ سکھایا: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ولاتکتموا الشھادۃ ومن یکتمھا فانہ اثم قلبہ﴾

(سورۃ البقرۃ:ؐ)

''اورتم گواہی نہ چھپاؤ اور جو گواہی چھپائے گا تو اس کا دل گنہگار ہوگا۔''

گاہک نے پوچھا یہ چیز کہاں کی بنی ہوئی ہے۔ اب ایک طرح سے یہ گواہی بن گئی چیز بکے یا نہ بکے سچی گواہی دے دے۔ یہی دیانتداری کا تقاضا ہے۔ حالات گواہ ہیں کہ جن تاجروں نے یہ طریقہ اختیار کیا لوگ محض اس لیے ان سے معاملہ کرتے ہیں کہ یہ سچا تاجر ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿یایھاالذین امنوا اذا تداینتم بدین الی اجلٍ مسمی فاکتبوہ﴾

(البقرۃ:۲۸۲)

''اے ایمان والو! جب ایک دوسرے سے ادھار لین دین کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔''

پھر اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مزید تفصیلی احکامات دیئے کہ لکھنے والا انصاف سے لکھے اور اگر لکھنے کو کہا جائے تو لکھنے والا انکار نہ کرے اور لکھتے وقت کمی بیشی نہ کرے۔ اب جدید تجارتی امور کاتب کی بجائے کمپیوٹر پر آ گئے اور اطلاع کے لیے فیکس اور اس سے بھی جدید مشینیں آ رہی ہیں۔ لیکن احکامات خداوندی کی اہمیت ابھی بھی واضح ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے اگر جس شخص پر حق ہے وہ نادان یا ضعیف ہے اور وہ نہیں لکھوا سکتا تو اس کا کارکن ٹھیک طریقے سے لکھ دے۔

باہمی معاملات میں یہ بھی ضروری ہے کہ ہر چھوٹے بڑے معاملہ کو یکساں اہمیت دی جائے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ولا تسئموا ان تكتبوه صغيرًا او كبيرًا الى اجله ذالكم اقسط عند الله﴾ (البقرہ:۲۸۲)

دیانتداری کے تقاضوں کو نبھانے کے لیے کسی معاملہ کے چھوٹے یا بڑے ہونے کو نہ دیکھنا چاہیے۔ اللہ نے یہ ہدایات دیں کہ تم قرض کے معاملہ کو لکھنے سے نہ اکتایا کرو خواہ وہ معاملہ بڑا ہو یا چھوٹا یہ لکھنا انصاف کو زیادہ قائم رکھنے والا ہے اور اس سے کم از کم یہ تو ہو گا کہ تم شبہ میں نہ پڑو گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر یہ معاملہ قرض یا ادھا کا نہ ہو بلکہ تجارةً حاضرةً یعنی نقد کا معاملہ ہو، ہاتھوں ہاتھ لینا یا دینا ہو۔

تو پھر فرمایا:

﴿فليس عليكم جناح الا تكتبوها﴾ (البقرۃ:۲۸۲)

''تو پھر تم پر کوئی حرج نہیں اگر اسے نہ لکھو۔''

معاملات میں گواہ بھی بنانا چاہیے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿واشهدوا اذا تبایعتم﴾ (البقرہ:)
”جب تم خرید وفروخت کروتو گواہ بنالیا کرو۔“
ارشاد باری تعالیٰ ہے:
﴿وان کنتم علی سفرٍ ولم تجدوا کاتبا فرھن مقبوضۃ﴾
”اگر تم سفر پر ہواور تمہیں لکھنے والا نہ ملے تو ایسی حالت میں یہ قبضہ رہن رکھ لیا کرو“ (البقرہ)
پھر فرمایا:
﴿فان امن بعضکم بعضا فلیؤد الذین اؤتمن امانته ولیتق الله ربه﴾
یعنی”تجارتی امور میں ایک دوسرے پر اعتماد ہو اس لیے کہ رہن کی ضرورت نہ سمجھے تو جس شخص کا اعتبار کر لیا گیا ہے اسے چاہیے کہ وہ دوسرے کا پورا حق ادا کر دے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرے۔“
باہمی معاملات کا ایک ادب یہ بھی ہے کہ معاملات میں کسی قسم کا ابہام نہ ہو۔ مدت اور میعاد معلوم ہو، مہینہ اور تاریخ کا تعین واضح ہو۔ دیانتداری کے اس تقاضے کی اللہ تعالیٰ نے الی اجلٍ مسمی سے تعلیم دی ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ باہمی معاملات اور تجارت یاد الٰہی ،عبادت اور زکوٰۃ کی ادائیگی سے غافل نہ کرے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:
﴿رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر الله واقام الصلوٰۃ وایتآءِ الزکوٰۃ﴾ (النور:)
”ایسے لوگ جنہیں تجارت اور خرید وفروخت اللہ کے ذکر سے اور نماز پڑھنے سے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کرتی۔“
ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ نمازیں پابندی سے پڑھیں اور زکوٰۃ بھی ادا کریں تو پھر تجارتی امور کے انجام دینے میں رکاوٹ آتی ہے اور مالی نقصان بھی بظاہر نظر آتا ہے، لیکن

ہمارے خالق و مالک کو ہماری نفسیات کا بخوبی علم ہے۔اس آیت کے بعد خود فرمایا:

﴿واللہ یرزق من یشاءُ بغیر حساب﴾

''اور اللہ جسے چاہے بے حساب رزق دیتا ہے۔''

معلوم ہوا کہ باہمی معاملات میں اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے، نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے سے رزق میں کمی نہیں بلکہ کثرت و برکت آتی ہے۔

اللہ تعالیٰ باہمی معاملات میں ہم سب کو قرآن حکیم میں بتائے گئے آداب اپنانے کی توفیق عطاء فرمائے۔(آمین یارب العلمین)



ہمارے معاشرہ کے اکثر فسادات کی وجہ غصہ،

(اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس کا علاج)

﴿عن ابی هريرة رضی اللّٰه تعالٰی عنه قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم لیس الشدید بالصرعة انّما الشدید الذی یملك نفسه عِندُالغضب﴾. (رواه البخاری ومسلم)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پہلوان اور طاقت ور وہ شخص نہیں جو دوسرے کو پچھاڑ دے بلکہ طاقت ور وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ پر قابو پا لے۔''

انسان جب اپنے مزاج ،خیالات ،اصولوں اور خواہشات کے خلاف کوئی بات ہوتی دیکھتا ہے تو اس کی طبیعت میں شدت پیدا ہوتی ہے اسے غصہ کہتے ہیں۔ انسان کے اندر غصہ ہونا ایک خوبی ہے اور غصہ نہ ہونا ایک عیب ہے اس لیے کہ اگر انسان اصولوں اور مزاج کے خلاف بات دیکھنے کے باوجود طبیعت میں شدت محسوس نہ کرے تو یہ بزدلی ہے جسے عربی میں جبن کہتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے یہ دعا مانگی اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْجُبْنِ. (اے اللہ میں بزدلی سے تیری پناہ مانگتا ہوں)۔

لیکن اب یہ طے کر لینا چاہئے کہ کونسا غصہ اچھا ہے اور کونسا برا ہے۔ اس کے لیے بہت آسان سی پہچان ہے کہ اگر احکام شرعیہ یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کی خلاف ورزی پر غصہ آئے تو بہت اچھا ہے لیکن اس غصہ پر عمل اور غصہ کا اظہار بھی احکام شرعیہ کے مطابق ہونا ضروری ہے ورنہ یہ غصہ بھی وبال بن سکتا ہے جیسے اولاد کے نماز نہ پڑھنے پر غصہ آنا، ان کی نافرمانی پر غصہ آنا، دوسرے لوگوں کو اسلامی احکامات کے خلاف عمل کرتے دیکھ کر غصہ آنا، یہ غصہ کمال ایمان کی علامت ہے اس بارے میں آپ صلی

اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایات دیں کہ اگر تم میں سے کوئی برائی ہوتے دیکھے تو اپنے ہاتھ سے روکے، اگر اس کی طاقت نہ ہوتو زبان سے روکے اگر یہ بھی نہ کرسکتا ہوتو کم ازکم اس برائی کو دل سے برا سمجھے۔"

اگر غصہ اپنے مفاد، اپنے خیالات ، ذاتی اصولوں اور ذاتی خواہشات کے خلاف ہوتا دیکھ کر آئے تو اس غصہ کو دبانا اور بجھانا ضروری ہے یہی غصہ برا ہے۔قرآن حکیم میں متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ایک صفت یہ بھی بیان فرمائی "وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ" (وہ لوگ جو غصہ کو بجھانے والے ہوتے ہیں) معلوم ہوا کہ انسان کے اندر غصہ ہونا چاہئے لیکن متقی کی خوبی یہ ہے کہ وہ اس پر قابو رکھتا ہے۔شریعت میں جس غصہ کی ممانعت اور اس کی برائی بیان کی گئی ہے اس سے مراد وہی غصہ ہے جو نفسانیت کی وجہ سے ہو، اور اس غصہ میں مبتلا ہوکر انسان اللہ تعالیٰ کی حدود سے تجاوز کرجائے اور احکام شریعت کا پابند نہ رہے لیکن جو غصہ اللہ کی خاطر ہو، حدود الٰہیہ سے تجاوز نہ کرے تو یہ کمال ایمان کی نشانی اور جلال خداوندی کا عکس ہے۔

اب ہم اگر اپنی زندگی کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ہمیں شاید پانچ چھ فیصد ہی جائز غصہ آتا ہو ورنہ معاشرہ میں عموماً ذاتی مفاد، ذاتی خواہشات، ذاتی اصولوں کے خلاف ہوتا دیکھ کر ہی غصہ آتا ہے اور اسی قسم کے غصہ نے گھروں ،محلوں ، علاقوں اور خاندانوں میں فسادات کی آگ بھڑکا رکھی ہے ادب عربی کا ایک بڑا قیمتی جملہ ہے اَوَّلُ الْغَضَبِ جُنُوْنٌ وآخِرُهٗ نَدَمٌ. (غصہ کی ابتداء پاگل پن ہے اور اس کا انجام شرمندگی ہے) انسان غصہ میں مبتلا ہوکر......بلڈ پریشر ہائی (دوران خون تیز) ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو طاقتور اور بہادر سمجھتا ہے اور برا بھلا کہتا ہے' مارتا پیٹتا ہے' توڑ پھوڑ کرتا ہے' بسا اوقات قتل تک نوبت پہنچ جاتی ہے لیکن یہ بات بھی قطعی ہے کہ چاہے کتنے ہی مضبوط اعصاب کا مالک ہو کتنا ہی شقی القلب کیوں نہ ہو آخرکار اپنے کیے پر شرمندہ ضرور ہوتا ہے۔

اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہادر وہ نہیں جو دوسرے کو پچھاڑ دے،

بلکہ بہادر وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ پر قابو پالے۔‘‘ غصہ کے وقت اپنے آپ پر قابو پانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا۔ ’’جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے اور وہ کھڑا ہو تو اسے چاہیے کہ بیٹھ جائے اگر غصہ ختم ہو جائے تو ٹھیک ورنہ وہ لیٹ جائے۔‘‘ (رواہ الترمذی عن ابی ذرؓ) دراصل جب انسان غصہ میں ہوتا ہے تو اس کے اعصاب میں تناؤ آجاتا ہے جب وہ اپنی جسمانی کیفیت کو بدلے گا تو اعصابی تناؤ میں کمی واقع ہو گی اور اس طرح غصہ کم ہو جائے گا۔ غصہ میں اپنے آپ پر قابو پانے کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ہدایت دی کہ ’’جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو اسے چاہیے کہ اس وقت خاموشی اختیار کرے۔‘‘ (رواہ احمد عن ابن عباسؓ) بارہا تجربہ میں یہ بات آئی ہے کہ انسان غصہ کے وقت جو منہ میں آئے کہہ دے تو اس سے حالات اور زیادہ بگڑ جاتے ہیں لیکن غصہ کے وقت خاموش ہو جائے تو ذہن ٹھنڈا ہونے کے بعد اس بات کا اتنا عمدہ علاج اور حل ذہن میں آتا ہے کہ وہ مسئلہ بخوبی حل ہو جاتا ہے۔ ابوداؤد میں عطیہ بن عروہؓ کی روایت میں غصہ کا ایک عمدہ علاج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ’’غصہ شیطان کے اثر سے آتا ہے اور شیطان کی پیدائش آگ سے ہوئی اور آگ کو پانی سے بجھایا جاتا ہے لہٰذا جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو اسے چاہیے کہ وضو کرلے‘‘ اور طبی نقطہ نظر سے بھی یہی ہدایت کی جاتی ہے کہ جب بلڈ پریشر ہائی (دوران خون تیز) ہو جائے چہرہ تپنے لگے تو ٹھنڈے پانی کے چھینٹے منہ پر مارے جائیں۔ اب ارشاد نبوی پر عمل کرتے ہوئی آدمی غصہ کو بجھائے تو ثواب بھی ملا اور علاج بھی ہوا۔ غصہ پر قابو پانے کی فضیلت حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت سے بہت اچھی طرح معلوم ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ’’کسی بندے نے کسی چیز کا کوئی گھونٹ ایسا نہیں پیا جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک غصہ کے اس گھونٹ سے افضل ہو جسے کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر پی جائے۔‘‘ (رواہ الترمذی وابوداؤد) بیہقی میں حضرت انسؓ سے ارشاد نبوی منقول ہے’’ جو کوئی اپنے غصہ کو روکے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس سے اپنے عذاب کو روکے گا۔ جامع ترمذی اور سنن ابوداؤد میں سہل بن معاذ اپنے والد حضرت معاذ بن

جبلؓ سے ارشاد نبوی نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص غصہ کو اس حال میں پی جائے کہ اس میں اتنی طاقت اور قوت تھی کہ اپنے غصہ کے تقاضے کو پورا کرسکتا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ساری مخلوق کے سامنے اسے بلائیں گے اور اسے اختیار دیں گے کہ جنت کی حوروں میں سے جس حور کو چاہے اپنے لیے منتخب کرے۔''

اللہ رب العزت ہمیں جائز غصہ میں بھی شرعی حدود سے تجاوز کرنے سے محفوظ فرمائے، اور ناجائز غصہ میں اپنے آپ پر قابو پانے کی توفیق عطا فرمائے تا کہ ہمارے گھر، محلے، خاندان اور پورا معاشرہ امن سکون کا گہوارہ بن جائے اور آخرت میں ان تمام انعامات واعزازت سے فیض یاب ہوں۔



شکر کے انسانی زندگی پر اثرات

﴿عن ابی سعید الخدری رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من لم یشکر الناس لم یشکر الله﴾ (رواہ الترمذی)

''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کرتا۔''

اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں کی قدر دانی سے انسان کا دل ممنونیت کے جذبات سے لبریز ہو جاتا ہے۔ پھر یہ احسان مندی اور قدر شناسی کے جذبات انسان کے دل میں ایمان کے چراغ کو روشن کر دیتے ہیں۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ شکر سے بڑھ کر کوئی اور چیز انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور شان ربوبیت کو راسخ اور پختہ کرنے والی نہیں ہے۔

ارشاد خداوندی ہے:

﴿مایفعل الله بعذابکم ان شکرتم وامنتم وکان الله شاکرًا علیمًا﴾

''اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ' اللہ تعالیٰ قدر دان اور جاننے والا ہے۔''

اس آیت کریمہ میں شکر مقدم اور ایمان موخر ہے، جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ شکر سے ایمان پیدا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا بار بار تقاضا اس لیے کیا ہے کہ کہیں ہم یہ نہ سمجھنے لگیں کہ خدا کے فضل و کرم کے سوا ہم خود بھی ان نعمتوں کے مستحق ہیں' ان کے لیے نہ کوئی ہمارا خاندانی استحقاق تھا نہ علمی اور عملی استحقاق، جو کچھ ملا اس کے فضل و کرم سے ملا اور جو کچھ ملے گا وہ اسی کی عطا اور بخشش ہو گی انسان ان گنت احساناتِ خداوندی

کو دیکھ کر یہ سمجھنے لگتا ہے کہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کا احسان نہیں بلکہ فطرت کی عام بخشش ہے جس کے شکر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ وہ بیج ہے جس سے کفر والحاد کی شاخیں پھوٹتی ہیں جیسے فرعون، قارون، نمرود وغیرہ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنا ایک احسان تو گنوایا ہے اور اس پر شکر ادا کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ ان کو گنوانے کا مقصود یہی ہے کہ انسان اپنے محسن کی قدر کو پہچانے' اس کے مرتبے کو جانے اور اس کے مرتبے کو مانے اور اس کی نعمت و بخشش کو قدر دانی اور احسان مندی کی نگاہ سے دیکھے۔ یہی وہ جذبہ ہے جس کی بناء پر بندے کے دل میں اللہ تعالیٰ کی قدر و عظمت کا داعیہ ابھرتا ہے، پھر اس کی بدولت انسان احکام خداوندی کی پیروی کرتا ہے۔ اس ساری گفتگو سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ شکر اطاعت الٰہی کی بنیاد ہے۔

شکر گزاری سے انسان میں اطاعت اور فرمانبرداری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس صورت میں اسے نہ ڈرانے کی ضرورت ہے نہ دھمکانے کی بلکہ محض احسان مندی کے جذبہ کے تحت وہ اپنے محسن کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔

سورۂ ابراہیم کی آیت ۷ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "**لئن شکرتم لا زیدنکم**" اگر تم میرا شکر کرو گے تو میں تمہیں زیادہ دوں گا۔ اللہ تعالیٰ کی عطاء کردہ نعمتوں کا صحیح استعمال شکر ہے، جس پر اللہ تعالیٰ نعمتوں میں اضافہ فرماتا ہے، دنیا میں مشاہدہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے مربی اور محسن کے احسانات کو قدردانی کی نگاہ سے دیکھے تو محسن پہلے سے زیادہ احسان کرنے پر آمادہ نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو تمام انسانوں سے زیادہ اپنے بندوں کے اعمال کی قدر دانی کرنے والا ہے۔ اس کے شکر پر اس کی نعمتوں میں اضافے کا بھلا کیا ٹھکانا۔ متکبر آدمی دوسرے کا احسان ماننے میں کسرِ شان سمجھتا ہے۔ شکر میں یہ بات ضروری ہے کہ آدمی اپنے محسن کی فضلیت کو تسلیم کرے۔ اسی طریقہ سے اس کا تکبر ٹوٹتا ہے اور اس کی طبیعت میں تواضع اور انکساری پیدا ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے سے اللہ تعالیٰ کی رضاء اور خوشنودی حاصل ہوتی

ہے جو ایک مومن کی معراج ہے۔ سورۂ زمر کی آیت ۷ میں ارشاد ہے، ''اگر تم شکر کرو تو اللہ تم سے راضی ہو جائے۔'' جو لوگ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہوتے ہیں وہ دنیا میں عذاب خداوندی سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیتے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام اور ان کے ماننے والوں کا عذاب الٰہی سے محفوظ رہنے کا سبب قرآن پاک نے ان کی شگر گزاری کو بتایا ہے۔

شکر گزاروں کو اللہ تعالیٰ آخرت کی نعمتوں سے بھی خوب نوازے گا۔ ارشاد ہے ''شکر کرنے والوں کو ہم عنقریب بدلہ دیں گے۔''

شکر گزاری کی وجہ سے جب اہل ثروت اپنے غریب اور محتاج بھائیوں کی مالی و جسمانی خدمت کریں گے تو ان کے درمیان محبت و خلوص کے جذبات پیدا ہوں گے، جو حسن معاشرت کی بنیاد ہیں، اسی طرح معاشرے میں محبت کی فضاء پیدا ہو جاتی ہے۔ شکر گناہوں کا کفارہ بنتا ہے۔ ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ''جو شخص کھانا کھائے اور کہے کہ شکر اُس اللہ کا جس نے ہر تدبیر اور طاقت کے بغیر مجھے کھانا دیا تو اس کے پہلے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قوتوں اور صلاحیتوں کو ٹھیک اسی کی مرضی کے مطابق استعمال کرنا بھی شکر ہے۔ جب کوئی فرد یا قوم اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو ٹھیک استعمال کرتی ہے وہی دنیا میں عزت پاتی ہے۔



غصہ میں نفس پر قابو رکھنے والا حقیقی پہلوان ہے

﴿عن ابی هريرة رضى الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ليس الشديد بالصرعة انما الشديد الذى يملك نفسه عند الغضب﴾

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پہلوان اور طاقتور وہ نہیں جو مدمقابل کو پچھاڑ دے بلکہ پہلوان اور شہ زور درحقیقت وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔''

انسانی فطرت کا تقاضہ ہے کہ جب کوئی بات خلاف طبع پیش آئے یا ناگوار صورت حال کا سامنا کرنا پڑے تو انسانی طبیعت غصہ سے بھر جاتی ہے لیکن اس موقع پر بھی اسلام نے مسلمان کے لیے قدم بقدم رہنمائی کی ہے کیونکہ آدمی کا سب سے بڑا اور بہت ہی مشکل سے زیر ہونے والا دشمن اس کا نفس ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے کہ:

﴿اعدى عدوك نفسك الذى بين جنبيك﴾

''تیرا سخت ترین دشمن خود تیرا نفس ہے۔''

اس لیے مسلمان کو چاہیے کہ وہ خاص کر غصہ کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھے اور نفسانیت اس سے کوئی بھی حرکت اور کوئی غلط کام نہ کرا سکے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ بندہ کے دل میں وہ کیفیت بھی پیدا نہ ہو کہ جس کو غیظ وغضب اور غصہ کے لفظوں سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ کسی سخت ناگوار بات پر دل میں اس کیفیت کا پیدا ہو جانا ایک فطری بات ہے جس سے انبیاء علیہ السلام بھی مستثنیٰ نہیں ہیں لیکن مطالبہ یہ ہے کہ اس کیفیت کے وقت بھی نفس پر قابو رہے ایسا نہ ہو کہ اس سے مغلوب ہو کر آدمی

گھٹیا حرکتوں پر اتر آئے اور وہ کرنے لگے جو شان بندگی کے خلاف ہو۔

غصہ دور کرنے کی تدبیریں:

جب متعدد مواقع پر غصہ کا آ جانا انسانی فطرت میں داخل ہے تو صاحب شریعت نے اس کے برے اثرات سے بچنے کے لیے کچھ علاج بھی تجویز فرمائے ہیں جیسا کہ ایک حدیث میں حضرت ابوذرؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے اور وہ کھڑا ہو تو چاہیے کہ بیٹھ جائے پس اگر بیٹھنے سے غصہ دور ہو جائے تو فبہا اور اگر پھر بھی غصہ باقی رہے تو چاہیے کہ لیٹ جائے۔ (مسند احمد، جامع ترمذی)

اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ کو ختم کرنے کی ایک نفسیاتی تدبیر تجویز کی ہے جو بلاشبہ نہایت ہی کارگر ہے علاوہ ازیں اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ غصہ میں آدمی سے جو بیجا حرکتیں اور لغویات سرزد ہوتی ہیں کسی جگہ جم کر بیٹھ جانے سے ان کا امکان کم ہو جاتا ہے اور لیٹ جانے سے ان کا امکان مزید کم سے کم تر ہوتا چلا جاتا ہے اس طرح عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں کو دین سکھاؤ، دین کی تعلیم دو اور تعلیم میں آسانی پیدا کرو، دشواری پیدا نہ کرو اور جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو چاہیے کہ وہ اس وقت خاموشی اختیار کر لے یہ آخری بات آپ نے تین مرتبہ ارشاد فرمائی۔ (مسند احمد)

غصہ کے برے نتیجوں سے اپنی حفاظت کرنے کے لیے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی دوسری تدبیر ہے کہ جب غصہ آئے تو آدمی خاموش رہنے کا فیصلہ کر لے ظاہر ہے کہ پھر غصہ دل میں ہی گھٹ کر رہ جائے گا اور آدمی غصہ کے برے اثرات سے محفوظ رہے گا چونکہ غصہ شیطانی اثرات سے ہے یعنی غصہ میں حدود سے تجاوز شیطان کے اثر سے ہوتا ہے اور شیطان کی آفرینش آگ سے ہوئی ہے اس لیے ایک حدیث میں اس کا یہ علاج تجویز کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو وضوء کرے جس سے غصہ کی حدت میں فوری سکون پیدا ہو جائے گا اور بالکل ایسا محسوس ہوگا کہ وضوء کا پانی براہ راست غصہ کی بھڑکتی ہوئی آگ پر پڑ رہا ہے۔

اور پھر غصہ کے دبانے پر، پی جانے پر اور اس طرح دیگر شریعت کے بتائے ہوئے طور طریقوں پر عمل کرنے میں بھی بڑا اجر ہے جیسا کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کسی بندہ نے کسی چیز کا کوئی گھونٹ ایسا نہیں پیا جو اللہ کے نزدیک غصہ کے اس گھونٹ سے افضل ہو جسے کوئی بندہ اللہ کی رضاء کی خاطر پی جائے۔ (مسند احمد)

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ پینے کی بہت سے چیزیں ایسی ہیں کہ جن کا پینا اللہ کی رضا و خوشنودی کا سبب بن سکتا ہے لیکن ان میں سب سے افضل ترین اللہ کی رضاء جوئی کی خاطر غصہ کو پی جانا ہے جن پاکیزہ صفات بندوں کے لیے جنت آراستہ کی گئی ہے انہی کی ایک یہ صفت بھی بیان کی گئی ہے

﴿والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس﴾

''غصہ کو پی جانے والے اور دوسرے کی زیادتی یا دوسرے کے قصور کو معاف کردینے والے۔''

اسی طرح ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ جو شخص محض اللہ کے لیے اپنے غصہ کو پی جاتا ہے اور جس پر اس کو غصہ آتا ہے اس کو سزا نہیں دیتا تو اللہ قیامت کے دن ساری مخلوق کے سامنے اس کو بلائیں گے اور اس کو اختیار دیں گے کہ حوران جنت میں سے جس حور کو چاہے اپنے لیے منتخب کرلے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم سب کو غصہ کے شر سے محفوظ فرمائے اور قرآن وسنت کی صحیح تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

سوچ سمجھ کر کام انجام دینا اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے

﴿عن ابن عباس ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال لاشج عبدالقیس ان فیك لخصلتین یحبھما اللّٰہ الحلم والاناۃ﴾ (رواہ مسلم)

''حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ عبدالقیس کے سردار سے فرمایا تم میں دو باتیں ایسی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے۔ ایک بردباری اور دوسرے غور وفکر کے بعد کام کرنا۔''

خدائے برتر نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا اور پوری کائنات کو محض اسی کے لیے پیدا فرمایا اسی انسان کے اندر ظلمت ونور، خیر وشر، نیکی اور بدی جیسی ایک دوسرے کے مخالف صفات بھی پیدا فرما دیں اب اگر انسان چاہے تو ان متضاد صفات کے ذریعہ تمام مخلوق سے افضل اور برتر ہوسکتا ہے اور اگر وہ چاہے تو تمام تر پستیوں سے بھی گزر جائے اگر خدا کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلتا ہے تو خدا فرماتا ہے:

﴿ولقد کرمنابنی آدم وحملنا ھم فی البر والبحر﴾

''تحقیق ہم نے بنی آدم کو عزت دی اور انہیں خشکی وسمندر پر چلنے کی اور سفر کی طاقت دی۔''

اسی طرح اگر یہی انسان اپنے اندر قرآن حکیم کی ہدایات اور اس کے احکام پر عمل کرنے کا نمونہ پیش کرتا ہے تو پھر قرآن میں خدا نے وعدہ فرمایا:

﴿وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین﴾

''اور تم ہی بلند ہو اگر تم مومن ہو جاؤ۔''

لیکن اگر انسان اپنے آپ کو قرآنی چشمہ ہدایت سے محروم رکھے تو پھر قرآن میں باری تعالیٰ

نے واضح طور پر فرمایا:

﴿اولئك كالانعام بل هم اضل﴾

''کہ ایسے لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔''

خداوندکریم کی وہ امانت جس کے اٹھانے سے تمام کائنات عاجز رہی اللہ جل جلالہ نے اس امانت کو انسان کے سپرد فرمایا' اس امانت کے کچھ تقاضے ہیں اور قرآن کریم انسان سے ان تقاضوں کی تکمیل اور اس کی پیدائش سے لے کر موت تک اس امانت کے بار کو سنبھالنے کا مطالبہ کرتا ہے۔

اس تمام تر ذمہ داری کو اداء کرنے کے لیے انسان تین قوتوں سے کام لیتا ہے اور انہی تین قوتوں کو علماء اخلاق اور حکمائے اسلام نے تمام اچھے اور برے اخلاق و اعمال کا سرچشمہ قرار دیا ہے ان میں پہلی قوت فکر ہے جسے سوچ اور علم کی طاقت کہہ سکتے ہیں' دوسری غصہ کی طاقت اور تیسری خواہشات کی طاقت۔ اب اگر ان تینوں قوتوں کو اعتدال میں رکھا جائے تو انسان کامیاب ہو جاتا ہے ورنہ دنیا و آخرت دونوں میں ناکام رہتا ہے۔

سوچنے کی قوت کو استعمال کرنے اور اسے اعتدال میں رکھنے کے لیے قرآن حکیم کی تعلیمات میں تدبر کا حکم ملتا ہے۔

تدبر کا لفظی معنی غور وفکر کرنا، دور اندیشی اور سوچ سمجھ کر کوئی کام کرنا۔ انسان تدبر سے کام لینے کی اہمیت سے بخوبی واقف ہوتا ہے لیکن دو چیزیں تدبر اختیار کرنے سے روکتی ہیں۔ ایک غصہ دوسرے جلد بازی۔ جس طرح اسلام نے باقی تمام قوتوں کے لیے اعتدال کا حکم دیا ہے اسی طرح غصہ کے بارے میں بھی اعتدال اختیار کرنے کا حکم فرمایا۔ یعنی نہ اس کا استعمال بے جا کیا جائے اور نہ ہی بالکل کمی کر دی جائے۔ اگر غصہ کی کیفیت اور اس کی قوت کو بالکل استعمال نہ کیا جائے تو یہ کیفیت بزدلی کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے۔ اور اس کیفیت سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پناہ مانگتے ہوئے دعا فرمائی:

﴿اللھم انی اعوذبك من الجبن﴾

''اے اللہ مجھے بزدلی سے بچا۔''

لیکن اگر غصہ کا استعمال ہر جگہ کیا جائے تو پھر ایک انسان اچھے بھلے معاشرہ میں بے چینی پیدا کر دیتا ہے اور اہل معاشرہ کی زندگیوں سے سکون رخصت ہو جاتا ہے۔ لہٰذا انسان کو یہ کام کرنے سے پہلے خصوصاً غصہ کے وقت میں تدبر یعنی غور وفکر اور سوچ سمجھ سے کام لینا چاہیے دوسری چیز جو انسان کو تدبر اختیار کرنے نہیں دیتی وہ جلد بازی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿الاناۃ من اللّٰہ والعجلۃ من الشیطان﴾

یعنی ''کاموں کی متانت، اطمینان اور سوچ سمجھ کر انجام دینا اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور جلد بازی کرنا شیطان کے اثر سے ہوتا ہے۔''

معلوم ہوا کہ ہر ذمہ داری کو اطمینان سے انجام دینے کی عادت اچھی ہے اس کے برعکس جلد بازی ایک بری عادت ہے اس میں شیطان کا دخل ہوتا ہے۔ محاورۃً بھی کہا جاتا ہے۔ **العجلۃ الندامۃ** یعنی جلد بازی سے شرمندگی ہی حاصل ہوتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق بردباری اور غور وفکر کے بعد کام کرنا اللہ کو بہت پسند ہے۔ چنانچہ جب قبیلہ عبدالقیس کا وفد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضری کے لیے مدینہ منورہ پہنچا چونکہ یہ لوگ کافی دور سے آئے تھے اس لیے گرد وغبار میں اٹے پڑے تھے جب یہ لوگ سواریوں سے اترے' بغیر نہائے دھوئے، نہ اپنا سامان قرینے سے رکھا نہ سواریوں کو اچھی طرح باندھا فوراً جلدی سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے لیکن اس وفد کے سربراہ اشج جن کا نام منذر بن عائذ تھا انہوں نے کسی قسم کی جلد بازی نہ کی بلکہ اطمینان سے اترے سامان کو قرینے سے رکھا سواریوں کو دانہ پانی دیا۔ پھر نہا دھو کر صاف ستھرے ہو کر وقار کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد کے سربراہ منذر بن عائذ کو مخاطب کرتے ہوئے اس

کی تعریف کی اور فرمایا:

﴿ان فيك لخصلتين يحبهما الله الحلم و الاناة﴾

"بے شک تمہارے اندر دو خوبیاں پائی جاتی ہیں جو اللہ کو بہت پسند ہیں۔ ان میں سے ایک صفت بردباری اور دوسری صفت ٹھہر ٹھہر کر غور وفکر کر کے کام کرنے کی ہے۔"

اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جب انسان ہر کام سوچ و بچار کے بعد تحمل سے کرتا ہے تو وہ شخص اکثر مکمل کام کرتا ہے اور بہت کم نقصان اٹھاتا ہے۔ جبکہ بغیر سوچے سمجھے جلد بازی سے کام کرنے والے ایک عجیب قسم کے ذہنی خلجان کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ اور اکثر نامکمل اور ناقص کام کرتے ہیں۔

لہٰذا اسلامی احکام کے مطابق مسلمانوں کو تدبر یعنی غور وفکر سے کام لینا چاہیے اور مومن کی شان بھی یہی ہے چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

﴿لايلدغ المؤمن من جحر واحد مرتين﴾

یعنی "مومن کو ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جا سکتا (کیونکہ مومن ہر کام غور وفکر اور تدبر سے کرتا ہے)۔"

یہ ارشاد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمایا جب کفار کا ایک شاعر ابو عزہ مسلمانوں کی بہت زیادہ ہجو کیا کرتا تھا۔ کفار اور مشرکین کو مسلمانوں کے خلاف اکساتا اور بھڑکاتا رہتا۔ جنگ بدر میں جب یہ شاعر گرفتار ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی تنگدستی اور اپنے بچوں کا رونا روتا رہا آپ نے ترس کھا کر فدیہ لیے بغیر اسے رہا فرما دیا اس نے وعدہ کیا کہ اگر اسے چھوڑ دیا جائے تو آئندہ مسلمانوں کے خلاف ایسی حرکات نہیں کرے گا لیکن یہ کم ظرف شخص رہائی پانے کے بعد اپنے قبیلہ میں جا کر دوبارہ مشرکین کو مسلمانوں کے خلاف ابھارنے لگا۔ غزوہ احد میں دوبارہ گرفتار ہو گیا' اب پھر وہی مگر مچھ کے آنسو بہانے شروع کر دیئے رحم کی اپیلیں کرنے لگا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل کا حکم صادر

فرمایا اور ساتھ ہی آپ نے یہ بھی فرمایا کہ مومن ایک سوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جا سکتا۔ اس سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آ گئی کہ ایک عمل کرنے سے اگر کوئی نقصان ہو تو دوسری دفعہ وہ عمل نہیں کرنا چاہیے۔

ایک مرتبہ ایک شخص جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کی کہ مجھے نصیحت فرمایئے آپ نے فرمایا "اپنے کام کو تدبر اور تدبیر سے کیا کرو اگر کام کا انجام اچھا نظر آئے تو اسے کرو اور اگر انجام میں خرابی اور گمراہی نظر آئے تو اسے چھوڑ دو۔"

قرآن حکیم میں اللہ رب العزت نے جابجا تدبر کی ترغیب دی اور قرآن میں غور وفکر کرنے کی ہدایت فرمائی۔ سورۂ نساء میں ارشاد فرمایا:

﴿افلا یتدبرون القرآن ولو کان من عند غیر اللّٰہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا﴾

"یعنی یہ لوگ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے۔ اگر یہ خدا کے علاوہ کسی اور کا کلام ہوتا تو اس میں بہت سا اختلاف ہوتا۔"

پھر اللہ تعالیٰ سورۂ محمد میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا﴾

"یہ لوگ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے یا ان کے دلوں میں قفل لگے ہوئے ہیں۔"

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس میں چند چیزیں قابل توجہ ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے افلا یتدبرون فرمایا یعنی وہ غور کیوں نہیں کرتے۔ افلا یقرؤن نہیں فرمایا کہ وہ کیوں نہیں پڑھتے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ قرآن کے تمام مضامین میں بالکل اختلاف نہیں بشرطیکہ گہری نظر سے غور وفکر کے ساتھ قرآن پڑھا جائے۔ اور قرآن کا اچھی طرح سمجھنا تدبر ہی سے ہو سکتا ہے بغیر سوچے سمجھے پڑھنے سے یہ چیز حاصل نہ ہو گی۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ قرآن کا مطالبہ ہے کہ ہر انسان اس کے مطالب اور مفہوم میں غور کرے۔ تمام علوم کی

مہارت رکھنے والے علماء جب قرآن میں تدبر کریں گے تو ایک ایک آیت سے سینکڑوں مسائل کا حل تلاش کر کے امت مسلمہ کے سامنے پیش فرمائیں گے۔ اور عام آدمی اگر قرآن حکیم کا ترجمہ اور تفسیر اپنی زبان میں پڑھ کر غور وفکر اور تدبر کرے گا تو اسے اللہ تعالیٰ کی عظمت ومحبت اور آخرت کی فکر پیدا ہوگی۔ البتہ عام آدمی کو غلط فہمی اور مغالطے سے بچنے کے لیے بہتر یہ ہے کہ کسی عالم سے قرآن کو سبقا سبقا تفسیر کے ساتھ پڑھ لیں۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو کوئی مستند اور معتبر تفسیر کا مطالعہ کر لیں اور جہاں کوئی بات سمجھ میں نہ آئے یا شبہ پیدا ہو وہاں اپنی رائے سے فیصلہ نہ کریں بلکہ ماہر علماء سے رجوع کیا جائے۔ اس لیے کہ مومنین کی شان قرآن حکیم میں یہ بیان ہوئی:

﴿والذین اذا ذکروا بایات ربھم لم یخروا علیھا صما وعمیانا﴾

''اور جب ان کو ان کے پروردگار کی باتیں سمجھائی جاتی ہیں تو ان پر اندھے اور بہرے ہو کر نہیں گزر جاتے۔''

یعنی مومن کی شان یہ ہے کہ وہ تدبر اور غور وفکر سے کام لے کر احکام اسلامی کو ادا کرے۔

اللہ رب العزت ہمیں قرآن حکیم کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطاء فرمائے اور اپنی زندگی کے ہر مرحلہ میں سوچ و بچار غور وفکر اور تدبر سے کام لینے کی توفیق عطا فرمائے۔

☆☆☆

دسترخوانِ نبوی ﷺ پر ایک نظر

﴿عن ابی هریرة رضی اللّٰه تعالیٰ عنه قال اتی النبی صلی اللّٰه علیه وسلم بلحمٍ فرفع الیهِ الذراعُ وکانت تعجبه فنهس منها﴾

(رواه الترمذی)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کہیں سے گوشت آیا، اس میں سے دست (بونگ) آپ کی خدمت میں پیش ہوئی اور بونگ کا گوشت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند بھی تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دانتوں سے کاٹ کر تناول فرمایا۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں فقرو فاقہ کے دور بھی نظر آتے ہیں اور سیر ہو کر کھانے کا تذکرہ بھی احادیث میں موجود ہے۔ روایات میں یہ بھی موجود ہے کہ بسا اوقات کئی ماہ تک چولہا نہیں جلتا تھا اور دوسری طرف بھنا ہوا گوشت تناول فرمانے کی روایات بھی ملتی ہیں۔

دسترخوان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر نظر ڈالیں تو سادگی اور کفایت شعاری سے بھرپور نظر آتا ہے اور تکلفات سے بہت دور۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''سرکہ بھی کیسا اچھا سالن ہے'' ایک روایت میں فرمایا کہ سرکہ پہلے انبیاء کا بھی سالن رہا ہے، جس گھر میں سرکہ ہو وہ محتاج نہیں (یعنی سالن کی ضرورت نہیں رہتی) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مرغی کا گوشت تناول فرماتے دیکھا ہے۔ سفینہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حباری کا گوشت کھایا۔''

(حباری ایک پرندہ ہے جسے فارسی میں ہوبرہ اور شوات کہتے ہیں۔ ترکی میں

تو غدری، ہندی میں چرز، یونانی میں غلوفس کہتے ہیں۔اس کا رنگ خاکی' گردن بڑی اور پاؤں لمبے، چونچ بھی تھوڑی سی لمبی،جسم میں کونج اور مرغابی کے درمیان ہوتا ہے)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک درزی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی' میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جو کی روٹی اور کدو گوشت کا شوربا پیش کیا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ پیالہ میں ہر طرف سے کدو کے ٹکڑے تلاش فرما کر تناول فرما رہے ہیں اس وقت سے کدو مجھے بھی مرغوب ہو گیا'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میٹھا اور شہد پسند تھا۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ انہوں نے پہلو کا بھنا ہوا گوشت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا آپ نے تناول فرمایا۔

مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مہمان ہوا کھانے میں بھنا ہوا پہلو لایا گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم چھری لے کر اس میں سے کاٹ کاٹ کر مجھے مرحمت فرما رہے تھے۔ اسی دوران حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے نماز کی تیاری کی اطلاع دی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا ہوا اس کو کہ ایسے موقع پر خبر دی اور پھر چھری رکھ کر نماز کے لیے تشریف لے گئے۔''

اس روایت میں چھری سے گوشت کاٹ کر کھلانے کا تذکرہ ہے جبکہ ابوداؤد اور بیہقی کی روایات میں چاقو، چھری سے، پکا ہوا گوشت کاٹنے کی ممانعت بھی آئی ہے۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ ''خصائل نبوی شرح شمائل ترمذی'' میں لکھتے ہیں کہ ان دونوں حدیثوں کے درمیان مطابقت اس طرح ہے کہ ممانعت چاقو یا چھری سے کھانے کی ہے اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں چاقو سے کاٹ کر دوسرے کو پیش کرنے کا ذکر ہے۔ لہٰذا اگر گوشت ذرا سخت ہو تو چاقو سے کاٹ کر ہاتھ سے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ جبکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ بونگ کا گوشت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دانتوں سے کاٹ کر تناول فرمایا۔

حضرت سلمیٰ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کھانا پسند تھا اور آپ رغبت سے کھاتے تھے وہ پکا کر کھلائیں۔ حضرت سلمیٰ رضی اللہ عنہا نے کہا پیارے بچو اب وہ تمہیں کھانا پسند نہیں آئے گا۔ (کیونکہ وہ تنگی میں پسند ہوتا ہے) لیکن انہوں نے کہا کہ نہیں، پسند آئے گا تو حضرت سلمیٰ رضی اللہ عنہا اٹھیں اور تھوڑے سے جو لے کر ہانڈی میں ڈالے اس پر ذرا سا زیتون کا تیل ڈالا اور کچھ مرچیں اور زیرہ وغیرہ مسالہ پیس کر ڈالا اور پکا کر سامنے رکھ دیا اور کہا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دسترخوان پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوا کہ آپ صرف زندہ رہنے کے لیے کھاتے تھے۔ جبکہ عام انسان اس طرح کھاتا ہے گویا کھانے ہی کے لیے زندہ ہے۔



یوم عاشورہ کی فضیلت

﴿عن ابی قتادۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم صیام یوم عاشوراء احتسب علی اللّٰہ ان یکفر السنۃ التی قبلہ.﴾

''حضرت ابوقتادہؓ سے (ایک طویل روایت میں) ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اللہ تعالیٰ سے امید رکھتا ہوں کہ عاشوراء کے دن کا روزہ گذشتہ ایک سال کے گناہوں کا کفارہ ہوجائے۔'' (رواہ مسلم)

محرم کی دسویں تاریخ کا نام ''یوم عاشوراء'' اسلام سے پہلے ہی چلا آ رہا ہے۔لغت کی کتابوں میں یہ نام چار انداز سے ملتا ہے۔عشوریٰ، عاشور، عاشوراء، عاشوریٰ، لیکن اردو میں لکھی گئی کتب میں اکثر جگہ ''عاشورہ'' لکھا گیا ہے۔اس دن کا نام ''یوم عاشوراء'' اس لئے رکھا گیا کہ اس تاریخ کو بہت سے اہم واقعات پیش آئے تو گئی دسویں تاریخیں جمع ہونے کی بناء پر اس کا نام ''یوم عاشورہ'' ہوگیا۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ ''خصائل نبوی شرح شمائل ترمذی'' ص۱۸۰ میں لکھتے ہیں کہ ''عاشوراء کو آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی تھی' نوحؑ کی کشتی جودی پہاڑ کے کنارے پر ٹھہری تھی' موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے نجات ملی تھی' اور فرعون غرق ہوا تھا' عیسیٰؑ کی ولادت ہوئی' اور اسی دن آسمان پر اٹھائے گئے ،اسی دن یونسؑ کو مچھلی کے پیٹ سے نجات ملی اور اسی دن ان کی امت کا قصور معاف ہوا' یوسف علیہ السلام کنعان کے کنویں سے نکالے گئے' اور حضرت یعقوبؑ کو مشہور مرض سے صحت ہوئی' ادریسؑ آسمان پر اٹھائے گئے' ابراہیمؑ کی ولادت ہوئی' سلیمانؑ کو ملک عطاء ہوا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے' تو یہودیوں کو عاشوراء کے دن روزہ رکھتے دیکھا،آپؐ نے ان سے پوچھا تم

اس دن کیسا روزہ رکھتے ہو۔ یہودیوں نے کہا یہ بڑی عظمت والا دن ہے' اس روز خدا نے موسیٰ اور ان کی قوم کو نجات دی' فرعون اور اس کی قوم کو غرق کیا' موسیٰ ؑ نے شکر کے طور پر اس دن روزہ رکھا اس لیے ہم بھی رکھتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم تم سے زیادہ موسیٰؑ کے حقدار ہیں پس آپ ؐ نے خود بھی روزہ رکھا اور دوسرے لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم فرمایا۔(رواہ البخاری و مسلم،مشکوٰۃ صفحہ ۱۸۰)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم عاشورا کا روزہ رکھا اور دوسروں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم فرمایا تو عرض کیا گیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دن تو یہود ونصاریٰ تعظیم کرتے ہیں۔تو آپ ؐ نے فرمایا'' اگر میں آئندہ سال زندہ رہا تو نویں تاریخ کا بھی روزہ رکھوں گا۔''

(رواہ مسلم مشکوٰۃ صفحہ ۱۷۹)

لیکن اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم اگلا محرم آنے سے سے پہلے وصال فرما گئے۔'' جمع الفوائد'' میں ارشاد نبوی منقول ہے تم عاشورا کا روزہ رکھو اور اس بارے میں یہود کی مخالفت اس طرح کرو کہ ایک دن پہلے یا ایک دن بعد کا روزہ بھی رکھ لو'' جمع الفوائد'' ہی میں ایک روایت منقول ہے کہ رمضان کے روزوں کی فرضیت سے پہلے عاشورہ کا روزہ فرض تھا لیکن جب رمضان کے روزے فرض ہو گئے تو پھر جس کا جی چاہتا عاشوراء کا روزہ رکھتا اور جس کا جی چاہتا نہ رکھتا۔'' (یعنی مستحب ہو گیا)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا **من وسع علی عیاله فی النفقة یوم عاشوراء وسع الله علیه سائر سنته.** یعنی جس شخص نے عاشوراء کے دن اپنے اہل وعیال پر خرچ میں فراخی کی تو اللہ تعالیٰ تمام سال اس کے رزق میں فراخی فرما دے گا۔''

ان تمام ارشادات نبویہ سے معلوم ہوا کہ دسویں محرم کا تعلق اسلامی تعلیمات سے بہت گہرا ہے اور یہ دن ہر مسلمان کے لیے ارشادات نبویہ کے مطابق قابل احترام ہے، لیکن

اس دن کو صرف حضرت حسینؓ کی شہادت کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہوئے صرف ایک مخصوص فرقے کے لیے یوم عاشورا کو خاص سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے جبکہ حضرت حسینؓ کی شہادت کا واقعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے تقریباً پچاس سال بعد پیش آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے قبل ہی دین اسلام مکمل ہو چکا تھا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اپنی کتاب ''**زوال السنة عن اعمال السنة**''صفحہ ۵ میں تحریر فرماتے ہیں کہ'' محرم کے اعمال میں صرف دو امر وارد ہیں ایک عاشورہ کا روزہ اور دوسرے یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اس روز اپنے گھر والوں پر کھانے پینے کی فراخی رکھے سال بھر تک اس کی روزی میں برکت رہتی ہے اور جب اس کھانے میں فراخی ہوگی تو اگر اس میں کچھ محتاجوں ،غریبوں کو بھی دیدیا جائے تو کچھ حرج نہیں۔ لیکن اب جو لوگوں نے رسوم اپنی طرف سے گھڑ لی ہیں وہ سب فضول واہیات اور گناہ کی باتیں ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اس دن مسلمانوں کے لیے دو کام مستحب ہیں(۱) عاشوراء کے دن کا روزہ رکھنا اور اس کے ساتھ ایک روزہ نو یا گیارہ محرم کا شامل کر لینا۔(۲) گھر میں ہر روز کے مقابلہ میں کھانے کے اندر اپنی حیثیت کے مطابق کشادگی اور فراخی کرنا۔ اور اس سلسلہ میں مذکورہ حدیث ضرور پیش نظر رہے۔

اللہ رب العزت ہم سب کو یوم عاشوراء کی برکتیں عطا فرمائے۔



شب معراج میں ہمارے لیے سامان عبرت

عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صَلّٰی لنا یوماً الصّلٰوۃ ثم رقی المنبر فاشاربیدہ قِبَلَ قِبْلَۃَ المسجد فقال قد اریت الاٰن مذصلَّیت لکم الصّلٰوۃ الجنۃ والنّار ممثّلین فی قبل ھذا الجدار فلم ارکالیوم فی الخیروالشر. (رواہ البخاری)

''حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھائی پھر منبر پر چڑھ کر مسجد کے قبلہ کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا میں نے ابھی تمہیں نماز پڑھاتے ہوئے اس دیوار کے آگے جنت اور دوزخ کو ایک خاص شکل وصورت میں دیکھا اور میں نے جنت سے زیادہ اچھی اور جہنم سے زیادہ بری چیز آج تک نہیں دیکھی۔''

اس روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت اور جہنم کو مثالی شکل میں دیکھا لیکن بہت سی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کے موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے بہت سے عجائبات دکھلائے ان باتوں کو عموماً واقعات کے انداز میں پیش کیا جاتا ہے لیکن واقعہ معراج کا ایک اہم پہلو ایسا بھی ہے جو یقیناً سامان عبرت ہے۔ جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سزاؤں کے مثالی واقعات دیکھے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی سیرت کی معتبر ترین کتاب ''نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب'' میں بارھویں فصل ''تنویر السراج فی لیلۃ المعراج'' میں واقعہ ششم کے عنوان کے تحت اس واقعہ برزخ کا ذکر فرمایا یہ روایات جمع الفوائد، بیہقی، طبرانی، ابوداؤد، بزار، ترمذی سے ماخوذ ہیں۔

نماز میں سستی کرنے والے:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ایسی قوم پر ہوا جن کے سر پتھروں سے کچلے جارہے تھے، پتھر سر پر پڑتے ہی قیمہ قیمہ ہوجاتا پھر صحیح وسالم ہوجاتا، پھر پتھروں سے کچلا جاتا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل سے دریافت کیا یہ کون لوگ ہیں جبرئیل نے بتایا یہ وہ لوگ ہیں جو فرض نمازوں میں سستی کرتے تھے اذان کی آواز سن کر اپنے سر تکیہ پر رکھے ہوئے آرام کی نیند سوتے رہتے تھے حق تعالیٰ ان کے سروں کو فرشتوں کے ذریعہ عذاب دلا رہے ہیں۔

زکوٰۃ ادا نہ کرنے والے:

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ایسے لوگوں کے قریب سے ہوا جو اپنے سر پر چیتھڑے لپیٹے ہوئے جانوروں کی طرح چر رہے ہیں اور زقوم اور جہنم کے پتھر کھا رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل سے پوچھا یہ کون لوگ ہیں انہوں نے بتایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے تھے۔

پاکیزہ زندگی سے روگردانی کرنے والے:

پھر آپ کا گذر ایسے لوگوں پر ہوا جن کے سامنے ایک ہانڈی میں پکا ہوا پاکیزہ، اور دوسری میں کچا اور سڑا ہو گوشت رکھا ہوا ہے اور وہ اسی کچے اور سڑے ہوئے گوشت کو رغبت سے کھا رہے ہیں آپ نے دریافت فرمایا یہ کون لوگ ہیں جبرئیل نے جواب دیا یا نبی اللہ، یہ آپ کی امت کے ان لوگوں کی مثالی شکل ہے جو اپنی حلال وطیب بیوی کو چھوڑ کر غیر منکوحہ عورت سے اپنی خواہش پوری کرتے ہیں۔

امانت میں خیانت کرنے والا:

پھر آپ کا گزر ایسے شخص کے قریب سے ہوا جس نے لکڑیوں کا ایک بڑا گٹھا باندھا ہوا ہے اور اسے اٹھا کر سر پر رکھنا چاہتا ہے لیکن وہ اس سے نہیں اٹھتا، لیکن پھر بھی وہ اور لکڑیاں لاکر اس گٹھے میں رکھتا جاتا ہے (وزن کم کرنے کے بجائے اور بڑھاتا جارہا ہے) آپ نے دریافت فرمایا یہ بوجھ اٹھانے والا کون ہے جبرئیل نے جواب دیا یہ ایسا شخص ہے جو لوگوں کو امانتیں اپنے پاس رکھ کر ان میں خیانت کرتا ہے اور پہلے لوگوں کی امانتیں ادا کرنے کے بجائے

اور دوسرے لوگوں کی امانتیں رکھتا جاتا ہے۔

حلال چھوڑ کر حرام کھانے والے:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا ایک گروہ کے سامنے دسترخوان پر حلال اور پاکیزہ گوشت رکھا ہوا ہے اور دوسرے دسترخوان پر سڑا ہوا گوشت رکھا ہے وہ لوگ حلال گوشت چھوڑ کر حرام اور سڑا ہوا گوشت کھا رہے ہیں۔ پوچھنے پر بتایا گیا کہ یہ ان لوگوں کی مثالی حالت ہے جو حلال روزی کو چھوڑ کر حرام روزی اختیار کرتے ہیں۔

سود خور:

پھر ایسے لوگوں کے پاس سے گزرے کہ ان کے پیٹ کوٹھڑیوں کی طرح بڑے بڑے اور شیشہ کی طرح صاف وشفاف ہیں کہ ان کے اندر سانپ، بچھو صاف نظر آتے ہیں جب ان میں سے کوئی اٹھنا چاہتا ہے تو بھاری ہونے کی وجہ سے گر پڑتا ہے بتایا گیا کہ یہ سود کھانے والوں کی مثال ہے۔

بے سوچے سمجھے باتیں کرنے والے:

ایک جگہ سے گزر ہوا وہاں ایک چھوٹے سے پتھر سے ایک بڑا بیل پیدا ہوتا ہے۔ پھر بیل واپس پتھر کے اندر جانا چاہتا ہے لیکن کوشش کے باوجود اندر نہیں جا سکتا بتایا گیا یہ ان لوگوں کی مثالی کیفیت ہے جو بغیر سوچے سمجھے غیر ذمہ دارانہ بات منہ سے نکال دیتے ہیں اور جب خراب نتیجہ دیکھتے ہیں تو اپنی بات اور الفاظ واپس لینا چاہتے ہیں۔

غیبت کرنے والے:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اس سفر میں ایسے لوگوں کے پاس سے گزرا جن کے ناخن تانبے کے تھے وہ ان سے اپنا منہ نوچتے تھے بتایا کہ یہ غیبت کرنے والے ہیں جو لوگوں کی آبرو سے کھیلتے تھے۔

گمراہی میں ڈالنے والے واعظ:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایسی قوم پر ہوا جن کے ہونٹ اور زبانیں آگ کی قینچی سے کاٹی جارہی تھیں کٹنے کے بعد پھر پہلی حالت پر واپس آجاتیں اور یہ سلسلہ چلتا رہا' بتایا گیا کہ یہ لوگوں کو گمراہی میں ڈالنے والے واعظ ہیں۔

جھوٹی گواہی دینے والے:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کو دیکھا جن کے چہرے خنزیر جیسے تھے اور ان کی زبانیں پشت پر کھنچی ہوئی تھیں اور بڑے عذاب میں مبتلا تھے جبرئیل نے بتایا کہ یہ جھوٹی گواہی دینے والے ہیں۔

نافرمان اولاد:

ایک جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک گروہ آگ میں جل رہا ہے ادھر جل کر راکھ ہوئے اور ادھر پھر پہلے کی طرح ہوگئے پھر جلنے لگے، جبرئیل نے بتایا کہ یہ وہ بدقسمت لوگ ہیں جو دنیا میں اپنے والدین کی نافرمانی کرتے اور ستاتے تھے جس کی وجہ سے وہ غصہ میں جلا کرتے تھے اب یہ لوگ اس سزا میں خود جل رہے ہیں۔

اللہ رب العزت ہمیں ان تمام گناہوں سے محفوظ فرمائے اور اگر ایسے گناہ سرزد ہوگئے ہوں تو ان سے توبہ کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین



شب براءۃ میں حضور ﷺ کے معمولات

﴿عَنْ عَـائِشَةَ رضی اللّٰہ عنہا قَالَتْ فَقَدتُّ رَسُوْلَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لَيْـلَةً فَاِذَا هُوَ بِالْبَقِيْعِ فَقَالَ اَكُنْتِ تَخَافِيْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْكِ وَرَسُوْلُهٗ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اِنَّكَ اَتَيْتَ بَعْضَ نِسَائِكَ فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَنْزِلُ لَيْلَةَ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ اِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا فَيَغْفِرُ لِاَكْثَرَ مِنْ عَدَدِ شَعْرِ غَنَمِ كَلْبٍ﴾. (رواہ الترمذی وابن ماجہ)

”حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ پایا (پس میں آپ کو تلاش کرتے ہوئے نکلی) تو آپ کو بقیع (مدینہ کے قبرستان) میں پایا آپ نے فرمایا اے عائشہؓ ! کیا تجھے اس بات کا ڈر تھا کہ اللہ اور اس کا رسولؐ تجھ پر زیادتی کرے گا؟ عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے خیال کیا شاید آپ ازواج مطہرات میں سے کسی کے ہاں تشریف لے گئے ہوں تو آپ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ شعبان کی پندرہویں شب میں آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے پس قبیلہ کلب کی بکریوں کے بالوں (کی تعداد) سے زیادہ (دوزخی لوگوں کی) مغفرت فرماتا ہے۔“

شب برات کی مزید حقیقت اس روایت سے بھی معلوم ہوتی ہے جو بیہقی میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے کہ شعبان کی اس پندرہویں شب میں کیا ہوتا ہے؟ عرض کیا فرمائیے کیا ہوتا ہے، آپ نے فرمایا اس رات میں یہ ہوتا ہے کہ اس سال جتنے پیدا ہونے والے ہیں وہ سب لکھ دیئے جاتے ہیں اور جتنے مرنے والے ہیں وہ بھی سب لکھ دیئے جاتے ہیں اور اس رات میں سب بندوں

کے اعمال اٹھائے جاتے ہیں اوراسی رات میں لوگوں کی مقررہ روزی اتر تی ہے۔‘‘

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ اس حدیث کے شروع میں فرماتے ہیں کہ اعمال اٹھائے جانے کا یہ مطلب ہے کہ اعمال دربار خداوندی میں پیش کیے جاتے ہیں اور روزی اترنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک سال میں جتنی روزی انسان کوملنی ہے وہ سب لکھ دی جاتی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ نے ارشادفرمایا۔

’’جب شعبان کی پندرہویں شب آئے۔ تو رات کو قیام کرو(یعنی نمازیں پڑھو) اوردن (پندرہویں تاریخ) کوروزہ رکھو۔‘‘

اس حدیث سے شعبان کی پندرہویں تاریخ کو روزہ رکھنے کا حکم معلوم ہوا یہ روزہ رکھنا مستحب ہے اگرکوئی رکھے تو ثواب ہے نہ رکھے تو گناہ نہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے اس رات کان لگا کرغور سے سنا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمارہے تھے۔

اَعُوْذُ بِعَفُوِكَ مِنْ عِقَابِكَ اَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْكَ جَلَّ وَجْهُكَ اَللّٰهُمَّ لَااُحْصِيْ ثَنَاءً عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ.

(رواہ البیہقی)

’’اے اللہ میں تیرے عفو کی پناہ چاہتا ہوں تیری سزا سے اور تیری رضا کی پناہ چاہتا ہوں تیرے غصہ سے اور پناہ چاہتا ہوں تیری سختیوں سے اے اللہ میں آپ کی تعریف کا شمارنہیں کرسکتا۔ آپ کی ذات ایسی ہی بلندوبالا ہے جیسے آپ نے خودفرمایا۔‘‘

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے دریافت کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ رات کو یہ دعا پڑھ رہے تھے تو آپ نے فرمایا۔ ہاں تم بھی یہ کلمات یادکرلواور دوسروں کوبھی بتادو۔ یہ کلمات جبرئیل علیہ السلام نے

مجھے بتائے ہیں ۔بیہقی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سجدہ میں یہ دعا مانگنا بھی ثابت ہے۔

سَجَدَلَكَ خِيَالِيْ وَسَوَادِيْ وَآمَنَ بِكَ فُؤَادِيْ فَهٰذِهٖ يَدِيْ وَمَا جَنَيْتُ بِهَا عَلٰى نَفْسِيْ يَا عَظِيْمُ يُرجیٰ لِكُلِّ عَظِيْمٍ اِغْفِرِ الذَّنْبَ الْعَظِيْمَ سَجَدَ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ خَلَقَهٗ وَصَوَّرَهٗ وَشَقَّ سَمْعَهٗ وَبَصَرَهٗ."

''سجدہ کیا تجھے میرے ظاہر وباطن نے اور میں سچے دل سے تجھ پر ایمان لایا پس میرا یہ ہاتھ اور جو کچھ میں نے اس سے اپنی جان پر گناہ کیے ہیں اے عظمت وبزرگی والے ان بے شمار گناہوں کو معاف فرمادے۔سجدہ کیا میں نے اس ذات اقدس کو جس نے پیدا فرمایا اور اس کی صورت بنائی کان اور آنکھیں دیں۔''

اس کے علاوہ یہ دعا بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس رات میں مانگنا ثابت ہے۔

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِيْ قَلْباً تَقِيًّا مِّنَ الشِّرْكِ نَقِيًّا لَا فَاجِرًا وَّلَا شَقِيًّا.

''اے اللہ مجھے ایسا پاکیزہ دل عطا فرما جس میں شرک کا شائبہ بھی نہ ہو اور نہ بدکار ہو اور نہ بدبخت ہو۔''

اے رب العزت ہمیں اس رات کی برکتوں سے مستفیض فرما اور ہمارا نام بھی ان لوگوں میں شامل فرمادے جن کی مغفرت کا فیصلہ اس رات میں ہوتا ہے۔اور آنے والے سال میں جو زندگی دے وہ خیر وبرکت اور نیکی کے ساتھ ہو اور موت لکھی جا چکی ہے تو اے رب ذوالجلال ایمان پر خاتمہ نصیب فرما۔

ماہِ شعبان استقبال رمضان

﴿عن انسؓ...... اَللّٰھُمَّ بارِكْ لَنَافِیْ رَجَبَ وَشَعْبَانَ وَبَلِّغْنَا رَمَضَان۔﴾

(ابن عساکر)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جب رجب کا مہینہ شروع ہوتا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرماتے، اے اللہ رجب اور شعبان کے مہینہ میں ہمارے لیے برکت فرما اور ہمیں رمضان تک پہنچادے۔''

شعبان المعظم ہجری سال کا آٹھواں مہینہ ہے اس مہینہ کی وجہ تسمیہ (نام رکھنے کی وجہ) شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اپنی مشہور تصنیف ''ماثبت بالسنۃ'' میں حضرت انسؓ کے حوالہ سے یہ بیان فرمائی کہ اس مہینہ کا نام شعبان اس لیے رکھا گیا کہ روزہ دار کی نیکیوں (کے ثواب) میں درخت کی شاخوں کی طرح اضافہ ہوتا ہے۔ (شعبان کا لفظی مطلب ہے شاخ درشاخ ہونا)

نسائی کی روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ! میں آپ کو شعبان میں زیادہ روزے رکھتے ہوئے دیکھتا ہوں آپ نے جواب میں فرمایا یہ مہینہ ایسا ہے جو رجب اور رمضان کے درمیان ہے لوگ اس کی فضیلت سے غافل ہیں اس مہینہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے بندوں کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں میری خواہش ہے کہ جب میرے اعمال پیش ہوں تو میرا شمار روزہ داروں میں ہو۔

اس مہینہ کی پندرہویں شب کی خصوصی طور پر فضیلت بیان فرمائی گئی اس رات کو شب برات کہا جاتا ہے یعنی ''نجات کی رات'' ترمذی اور ابن ماجہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' اللہ تعالیٰ شعبان کی پندرہوں شب کو آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے اور قبیلہ قلب کی بکریوں کے بالوں کی تعداد سے زیادہ گناہگاروں کی بخشش فرماتا ہے۔'' مؤرخین لکھتے ہیں کہ قبیلہ کلب کے پاس تقریباً بیس ہزار بکریاں تھیں اب یہ انسان کے ذہن سے بالاتر

ہے کہ ان بکریوں کے بالوں کی تعداد متعین کر سکے۔

بیہقی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے کہ شعبان کی اس (پندرہویں) شب میں کیا ہوتا ہے عرض کیا فرمائیے کیا ہوتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس رات میں یہ ہوتا ہے کہ جتنے پیدا ہونے والے ہیں وہ سب لکھ دیئے جاتے ہیں اور جتنے مرنے والے ہیں وہ سب اس رات میں لکھ دیئے جاتے ہیں اور اس رات میں سب بندوں کے اعمال اٹھائے جاتے ہیں اور اسی رات میں لوگوں کی مقررہ روزی اترتی ہے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اس حدیث کی شرح میں یہ فرماتے ہیں کہ اعمال اٹھائے جانے کا یہ مطلب ہے کہ اعمال دربار خداوندی میں پیش ہوتے ہیں اور روزی اترنے کا یہ مطلب ہے کہ ایک سال میں جتنی روزی انسان کو ملنے والی ہے وہ سب لکھ دی جاتی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب شعبان کی پندرہویں شب آئے تو رات کو قیام کرو اور اگلے دن کا روزہ رکھو۔ یہ روزہ مستحب ہے اگر رکھ لیا جائے تو ثواب ہے نہ رکھے تو گناہ نہیں۔

شب براءت کے بارے میں تمام روایات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شب برات میں تین باتیں مسنون ہیں۔ (۱) پندرہویں شب میں قبرستان میں جا کر مردوں کے لیے دعائے مغفرت کرنا۔ (۲) نفل نماز اور اس میں طویل سجدے کرنا (یعنی کافی دیر تک سجدہ میں رہنا) اور دعا مانگنا (۳) پندرہویں تاریخ کا روزہ رکھنا۔

اللہ رب العزت ہمیں شعبان المعظم کی برکات نصیب فرمائے اور صحت دعافیت کے ساتھ رمضان المبارک کے روزے رکھنے اور دیگر عبادات کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین۔



رحمت ومغفرت ونجات کا مہینہ

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ رَمَضَانُ فُتِحَتْ اَبْوَابُ السَّمَاءِ وَفِی رِوَایَۃٍ فُتِحَتْ اَبْوَابُ الْجَنَّۃِ وَغُلِّقَتْ اَبْوَابُ جَھَنَّمَ وَسُلْسِلَتِ الشَّیَاطِیْنُ وَفِی رِوَایَۃٍ فُتِحَتْ اَبْوَابُ الرَّحْمَۃِ (متفق علیہ)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب رمضان شروع ہوتا ہے تو آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور شیاطین کو قید کر دیا جاتا ہے ایک روایت میں یہ فرمایا کہ رحمت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔

اس حدیث میں آسمان' جنت اور رحمت کے دروازوں کے کھلنے اور جہنم کے دروازوں کے بند ہونے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس مبارک مہینہ میں بندہ کی دُعائیں قبول ہوتی ہیں' انسان نیک اعمال کرتا ہے' گناہوں کا ارتکاب کم ہو جاتا ہے' چنانچہ رحمت خداوندی انسان کی طرف متوجہ رہتی ہے نتیجتاً انسان کے لیے جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ مزید یہ کہ اس مبارک مہینہ میں انسان نے گناہوں کے ارتکاب میں کمی کر دی اور سابقہ گناہوں کی مغفرت طلب کی اس کے علاوہ گناہ صغیرہ یعنی چھوٹے موٹے گناہوں کو خدائے عزوجل نے رمضان المبارک کی عظمت کی بنا پر معاف فرما دیا تو اب ایسے مسلمان کے لیے اس بابرکت مہینہ میں جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔

اس حدیث میں رمضان المبارک کی ایک خصوصیت یہ بیان فرمائی کہ اس ماہ میں

شیاطین کو قید کر دیا جاتا ہے۔ ذات باری تعالیٰ کس قدر رحم و کرم فرما رہی ہے کہ ایک طرف تو یہ فرمایا کہ روزہ کی جزا میں خود عطا کروں گا اور دوسری طرف ان اسباب کا خاتمہ فرما دیا جو گناہ کے ارتکاب کا سبب بنتے ہیں۔ اس وجہ سے رمضان المبارک میں گناہوں کا زور عام دنوں کی نسبت کم ہو جاتا ہے۔

ماہِ رمضان میں رحمت کی کثرت اور عبادت وفضیلت کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس مہینہ میں شیاطین انسان کو بہکانے کی بھرپور کوشش کرتے اور انسان کو نافرمانی اور گناہوں کے کاموں میں ملوث کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے لیکن ہر مسلمان کا واضح مشاہدہ ہے کہ ان میں گناہوں کے ارتکاب میں بہت حد تک کمی آ جاتی ہے اور خدا خوفی دلوں میں پیدا ہو جاتی ہے لیکن پھر ایک خیال ذہن میں آتا ہے کہ انسان اکثر شیاطین کے بہکانے کی وجہ سے گناہ کرتا ہے لیکن جب اس ماہ میں شیاطین کو قید کر دیا جاتا ہے تو پھر گناہ کیوں سرزد ہوتے ہیں۔ اس وہم کو دور کرنے کے لیے ایک بات ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ یہ بات درست ہے کہ انسان اکثر شیاطین کے بہکانے کی وجہ سے گناہ کرتا ہے لیکن انسان شیطان کے سامنے مجبور نہیں بلکہ خدائے برتر نے انسان کو اس بات کا اختیار اور طاقت دی ہے کہ وہ شیطان کے بہکانے میں آ جائے تو یہ انسان کی اپنی کمزوری ہوگی۔ چنانچہ احادیث میں بکثرت یہ بات موجود ہے کہ جب وساوس شیطانیہ ذہن میں آئیں تو استغفار کیا کریں لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ پڑھا کریں اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو شیطان کے جال سے نکلنے کی قدرت عطا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے جال سے نکلنے کے طریقے بھی سکھائے گئے ہیں۔

باقی رہا یہ کہ جب شیاطین کو قید کر دیا جاتا ہے تو پھر انسان گناہ کیوں کرتا ہے تو اس بات کا علامہ ابن حجر عسقلانیؒ بہت خوب جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شیاطین کے علاوہ خود انسان کا نفس اور اس کی بری عادات بھی گناہ کا سبب ہوسکتی ہیں۔ اور یہ کام شیطان رمضان سے پہلے انجام دے چکا ہوتا ہے چنانچہ جب ایک شخص کو گناہ کی عادت پڑ جائے تو پھر اس گناہ کے ارتکاب کے لیے شیطان کو برائی کا راستہ دکھانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ جیسا کہ ایک تاجر جس کو ذخیرہ اندوزی کی قبیح عادت پڑ جائے تو وہ رمضان میں بھی ذخیرہ اندوزی سے باز

نہیں آتا۔اس سے معلوم ہوا کہ شیاطین کے علاوہ گناہ کے کچھ اور اسباب بھی ہیں جس کی وجہ سے رمضان المبارک کے اندر شیاطین کو قید کر دیئے جانے کے باوجود گناہ سرزد ہو جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو گناہ سے بچنے کی توفیق دینے کے ساتھ سابقہ گناہوں کی مغفرت فرما دے اور رمضان المبارک اس طرح گذرے کہ ہم گناہوں کے بوجھ سے بری ہو جائیں۔ (آمین)



فضائل رمضان

﴿عن سلمان الفارسی قال خطبنا رسول اللہ ﷺ فی آخر یوم من شعبان فقال یایھاالناس قد اظلکم شھر عظیم شھر مبارک شھرفیہ لیلۃ خیر من الف شھر جعل اللہ صیامہ فریضۃ وقیام لیلۃ تطوعا من تقرب فیہ بخصلۃ من الخیر کان کمن اری فریضۃ فیما سواہ ومن اری فریضۃ فیہ کان کمن اری سبعین فریضۃ فیما سواہ وھو شھر الصبر والصبر ثوابہ الجنۃ و شھر المواساۃ وشھر یزاد فیہ رزق المؤمن من فطر فیہ صائما کان لہ مغفرۃ لذنوبہ وعتق رقبۃ من النار وکان لہ مثل اجرہ من غیران ینتقص من اجرہ شیأ قلنا یا رسول اللہ لیس کلنا نجد مانفطر بہ الصائم فقال رسول اللہ ﷺ یعطی اللہ ھذا الثواب من فطر صائما علی مذقۃ لبن اوتمرۃ اوشربۃ من ماء ومن اشبع صائما سقاہ اللہ من حوضی شربۃ لا یظمأ حتی یدخل الجنۃ الخ﴾

(رواہ البیھقی، کذافی المکشوٰۃ ص۱۷۳)

ترجمہ:- حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان کی آخری تاریخ میں لوگوں کو وعظ فرمایا کہ تمہارے اوپر ایک مہینہ آ رہا ہے جو بہت بڑا مہینہ ہے بہت مبارک مہینہ ہے اس میں ایک رات ہے (شب قدر) جو ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے روزہ کو فرض فرمایا اوراس کے رات کے قیام (یعنی تراویح) کوثواب کی چیز بنایا ہے۔ جو شخص اس

مہینہ میں کسی نیکی کے ساتھ اللہ کا قرب حاصل کرے تو یہ ایسا ہے جیسا کہ غیر رمضان میں کسی فرض کو ادا کیا اور جو شخص اس مہینہ میں کسی فرض کو ادا کرے وہ ایسا ہے جیسا کہ غیر رمضان میں ستر فرض ادا کرے یہ مہینہ صبر کا ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے اور یہ مہینہ لوگوں کے ساتھ غمخواری کرنے کا ہے اس مہینہ میں مومن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے۔ جو شخص روزہ دار کا روزہ افطار کرائے اس کے لیے گناہوں کے معاف ہونے اور آگ سے خلاصی کا سبب ہو گا۔ اور روزہ دار کے ثواب کی مانند اس کو ثواب ہو گا مگر اس روزہ دار کے ثواب سے کچھ کم نہیں کیا جائے گا۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم میں سے ہر شخص تو اتنی وسعت نہیں رکھتا کہ روزہ دار کو افطار کرائے تو آپ نے فرمایا کہ (پیٹ بھر کھلانے پر موقوف نہیں) یہ ثواب تو اللہ جل شانہٗ ایک کھجور سے کوئی افطار کرا دے یا ایک گھونٹ پانی پلا دے یا ایک گھونٹ لسی پلا دے اس پر بھی مرحمت فرما دیتے ہیں۔ یہ ایسا مہینہ ہے کہ اس کا اول حصہ اللہ کی رحمت ہے اور درمیانی حصہ مغفرت ہے اور آخری حصہ آگ سے آزادی ہے جو شخص اس مہینہ میں ہلکا کر دے اپنے غلام (وخادم) کے بوجھ کو حق تعالیٰ شانہٗ اس کی مغفرت فرماتے ہیں اور آگ سے آزادی فرماتے ہیں۔ اور چار چیزوں کی اس میں کثرت رکھا کرو جن میں سے دو چیزیں اللہ تعالیٰ کی رضا کے واسطے اور دو چیزیں ایسی ہیں کہ جن سے تمہیں چارہ نہیں۔ پہلی دو چیزیں جن سے تم اپنے رب کو راضی کرو وہ کلمہ طیبہ اور استغفار کی کثرت ہے۔ اور دوسری دو چیزیں یہ ہیں کہ جنت کی طلب کرو اور آگ سے پناہ مانگو جو شخص کسی روزہ دار کو پانی پلائے حق تعالیٰ (قیامت کے دن) میری حوض سے اس کو ایسا پانی پلائیں گے جس کے بعد جنت میں داخل ہونے تک پیاس نہیں لگے گی۔

اس حدیث سے چند امور معلوم ہوتے ہیں۔ اول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اہتمام کہ شعبان کی اخیر تاریخ میں خاص طور سے اس کا وعظ فرمایا اور لوگوں کو تنبیہ فرمائی تا کہ رمضان

المبارک کا ایک سیکنڈ بھی غفلت سے نہ گزر جائے۔ پھر اس وعظ میں تمام مہینہ کی فضیلت فرمانے کے بعد چند اہم امور کی طرف خاص طور سے متوجہ فرمایا۔ سب سے اول شب قدر کہ وہ حقیقت میں بہت ہی اہم رات ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہے کہ اللہ نے اس کے روزہ کو فرض کیا، اور اس کے قیام یعنی تراویح کو سنت کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تراویح کا ارشاد بھی خود حق سبحانہ وتقدس کی طرف سے ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ اور تراویح کا ذکر فرمانے کے بعد عام فرض اور نفل عبادات کے اہتمام کی طرف متوجہ فرمایا، کہ اس میں ایک نفل کا ثواب دوسرے مہینوں کے فرائض کے برابر ہے اور اس کے ایک فرض کا ثواب دوسرے مہینوں کے ستر فرائض کے برابر ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حدیث کے آخر میں چار چیزوں کی طرف خاص طور سے متوجہ فرمایا اور اس مہینہ میں ان کی کثرت کا حکم فرمایا۔ کلمہ طیبہ اور استغفار اور جنت کے حصول اور دوزخ سے بچنے کی دعا۔ اس لیے جتنا وقت بھی مل سکے ان چیزوں میں صرف کرنا سعادت سمجھے اور یہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک کی قدر ہے۔ کیا دقت ہے کہ اپنے دنیوی کاروبار میں مشغول رہتے ہوئے زبان سے درود شریف یا کلمہ طیبہ کا بھی ورد رہے۔

اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مہینہ کی کچھ خصوصیتیں اور آداب ارشاد فرمائے اولاً یہ کہ یہ صبر کا مہینہ ہے۔ یعنی اگر روزہ وغیرہ میں کچھ تکلیف ہو تو اسے ذوق و شوق سے برداشت کرنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ مار دھاڑ............ جیسا کہ اکثر لوگوں کی گرمی کے رمضان میں عادت ہوتی ہے اسی طرح اگر اتفاق سے سحر نہ کھائی گئی تو صبح سے ہی روزہ کا سوگ شروع ہو گیا۔ اسی طرح رات کی تراویح میں اگر دقت ہو تو اس کو بشاشت سے برداشت کرنا چاہیے۔ اس کو مصیبت اور آفت نہ سمجھیں کہ یہ بڑی سخت محرومی کی بات ہے۔ ہم لوگ دنیوی معمولی اغراض کی بدولت کھانا پینا راحت آرام چھوڑ دیتے ہیں تو کیا رضائے الٰہی کے

مقابلہ میں ان چیزوں کی کوئی وقعت ہوسکتی ہے۔

پھر ارشاد ہے کہ یہ غمخواری کا مہینہ ہے یعنی غربا مساکین کے ساتھ مدارات کا برتاؤ کرنا اگر دس چیزیں اپنی افطاری کے لیے تیار کی ہیں تو دو چار غربا کے لیے بھی کم ازکم ہونی چاہئیں۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ افطار کرانے کی فضیلت ارشاد فرمائی۔ ایک اور روایت میں آیا ہے کہ جو شخص حلال کمائی سے رمضان میں روزہ افطار کرائے اس پر رمضان کی راتوں میں فرشتے رحمت بھیجتے ہیں اور شب قدر میں جبرئیل مصافحہ کرتے ہیں (اس کی علامت یہ ہے کہ) اس کے دل میں رقت پیدا ہوتی ہے اور آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں۔ حماد بن سلمہ رحمہ اللہ علیہ ایک مشہور محدث ہیں۔ روزانہ پچاس آدمیوں کے روزہ افطار کرانے کا اہتمام کرتے تھے۔ (روح البیان)

افطار کی فضیلت ارشاد فرمانے کے بعد فرمایا ہے کہ اس مہینہ کا اول حصہ رحمت ہے۔ یعنی حق تعالیٰ شانہٗ کا انعام متوجہ ہوتا ہے اور یہ رحمت عامہ مسلمانوں کے لیے ہوتی ہے۔ اس کے بعد جو لوگ اس کا شکر ادا کرتے ہیں ان کے لیے اس رحمت میں اضافہ ہوتا ہے۔

اور اس کے درمیانی حصہ سے مغفرت شروع ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ روزوں کا کچھ حصہ گذر چکا ہے اس کا معاوضہ اور اکرام مغفرت کے ساتھ شروع ہو جاتا ہے۔ اور آخری حصہ تو بالکل آگ سے خلاصی ہے ہی۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور چیز کی طرف رغبت دلائی ہے کہ آقا لوگ اپنے ملازموں پر اس مہینہ میں تخفیف رکھیں اس لیے کہ آخر وہ بھی روزہ دار ہیں۔ کام کی زیادتی سے ان کو روزہ میں دقت ہوگی البتہ اگر کام زیادہ ہو تو اس میں مضائقہ نہیں کہ رمضان کے لیے ہنگامی ملازم ایک آدھ بڑھا لے مگر جب ہی کہ ملازم روزہ دار بھی ہو ورنہ اس کے لیے رمضان بے رمضان برابر۔ اور اس ظلم و بے غیرتی کا تو ذکر ہی کیا کہ جو روزہ خور ہو کر بیجیا منہ سے روزہ دار ملازموں سے کام لے اور نماز روزہ کی وجہ سے اگر تعمیل میں کچھ تساہل ہو تو

برسنے لگے۔

ترجمہ:۔’’ اور عنقریب ظالم لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیسی (مصیبت) کی جگہ لوٹ کر جائیں گے (مراد جہنم ہے)۔‘‘

اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک میں چار چیزوں کی کثرت کا حکم فرمایا اول کلمہ شہادت‘ احادیث میں اس کو افضل الذکر ارشاد فرمایا ہے۔ مشکوٰۃ میں بروایت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک مرتبہ اللہ جل جلالہ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ یا اللہ تو مجھے کوئی ایسی دعا بتلا دے کہ اس کے ساتھ میں تجھے یاد کیا کروں۔ وہاں سے **لا الٰہ الا اللّٰہ** ارشاد ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ یہ کلمہ تو تیرے سارے ہی بندے کہتے ہیں، میں تو کوئی دعا یا ذکر مخصوص چاہتا ہوں۔ وہاں سے ارشاد ہوا کہ موسیٰ اگر ساتوں آسمان اور ان کے آباد کرنے والے میرے سوا یعنی ملائکہ اور ساتوں زمین ایک پلڑے میں رکھ دیئے جاویں اور دوسرے میں کلمہ طیبہ رکھ دیا جاوے تو وہی جھک جائے گا۔

دوسری چیز جس کی کثرت کرنے کو حدیث بالا میں ارشاد فرمایا گیا وہ استغفار ہے۔ احادیث میں استغفار کی بھی بہت ہی فضیلت وارد ہوئی ہے، ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ جو شخص استغفار کی کثرت رکھتا ہے حق تعالیٰ شانہ‘ ہر تنگی میں اس کے لیے راستہ نکال دیتے ہیں اور ہر غم سے خلاصی نصیب فرماتے ہیں اور ایسی طرح روزی پہنچاتے ہیں کہ اس کو گمان بھی نہیں ہوتا۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ آدمی گنہگار تو ہوتا ہی ہے، بہترین گنہگار وہ ہے جو توبہ کرتا رہے۔ ایک حدیث قریب آنے والی ہے کہ جب آدمی گناہ کرتا ہے تو ایک کالا نقطہ اس کے دل پر لگ جاتا ہے۔ اگر توبہ کرتا ہے تو وہ دھل جاتا ہے ورنہ باقی رہتا ہے اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو چیزوں کے مانگنے کا امر فرمایا ہے جن کے بغیر چارہ ہی نہیں۔ جنت کا حصول اور دوزخ سے امن۔ اللہ اپنے فضل سے مجھے بھی مرحمت فرمائے ....اور تمام مسلمانوں کو بھی۔

نیز ایک حدیث میں ہے جس کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ میری اُمت کو رمضان شریف کے بارے میں پانچ چیزیں خصوصی طور پر دی گئی ہیں جو پہلی اُمتوں کو نہیں ملی ہیں:

(۱) یہ کہ ان کے منہ کی بدبو اللہ کے نزدیک مشک سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

(۲) یہ کہ ان کے لیے دریا کی مچھلیاں تک دعا کرتی ہیں اور افطار کے وقت تک کرتی رہتی ہیں۔

(۳) جنت ہر روز ان کے لیے آراستہ کی جاتی ہے۔ پھر حق تعالیٰ شانہٗ فرماتے ہیں کہ قریب ہے کہ میرے نیک بندے (دنیا کی) مشقتیں اپنے اوپر سے پھینک کر تیری طرف آویں۔

(۴) اس میں سرکش شیاطین قید کر دیئے جاتے ہیں کہ وہ رمضان میں ان برائیوں کی طرف نہیں پہنچ سکتے جن کی طرف غیر رمضان میں پہنچ سکتے ہیں۔

(۵) رمضان کی آخری رات میں روزہ داروں کے لیے مغفرت کی جاتی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یہ شب مغفرت شبِ قدر ہے؟ فرمایا نہیں بلکہ دستور یہ ہے کہ مزدور کو کام ختم ہونے کے وقت مزدوری دے دی جاتی ہے۔“

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث پاک میں پانچ خصوصیتیں ارشاد فرمائی ہیں جو اس اُمت کے لیے حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے مخصوص انعام ہوئی اور پہلی اُمت کے روزہ داروں کو مرحمت نہیں ہوئی۔ کاش ہمیں اس نعمت کی قدر ہوتی اور ان خصوصی عطایا کے حصول کی کوشش کرتے۔ (بحوالہ فضائل رمضان)



رمضان اور عید کے مسنون اعمال

﴿روی عن ابی هریرة رضی اللّٰه عنه قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: زَيِّنُوا اَعْيَادَكُمْ بِالتَّكْبِيْرِ﴾

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنی عیدوں کو تکبیر سے بارونق بناؤ۔''

التماس:

عنوان بالا کے تحت احادیث مبارکہ سے شب قدر، صدقہ فطر، نماز عید کی ترکیب وغیرہ کے مسنون اعمال پیش خدمت ہیں، قارئین کرام سے درخواست ہے کہ توجہ سے پڑھیں اور اس پر عمل کرنے کی کوشش فرمائیں۔

رمضان کی آخری رات:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رمضان کی آخری رات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لیے مغفرت وبخشش کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا۔ وہ شب قدر ہوتی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شب قدر تو نہیں ہوتی لیکن بات یہ ہے کہ عمل کرنے والا جب اپنا عمل پورا کردے تو اس کو پوری اجرت مل جاتی ہے۔

(مسند احمد۔ معارف الحدیث)

صدقہ فطر:

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے ایک شخص کو بھیجا کہ مکہ مکرمہ کے گلی کوچوں میں منادی کر دیں کہ صدقہ فطر ہر مسلمان پر واجب ہے خواہ مرد ہو یا عورت، آزاد ہو یا غلام، چھوٹا ہو یا بڑا، دو مد (تقریباً دو سیر) گیہوں یا اس کے سوا ایک صاع (ساڑھے تین سیر سے کچھ زیادہ) غلہ کا۔

(ترمذی)

نماز عید کی ترکیب:

نماز اس طرح شروع کرے کہ قبلے کی طرف منہ کر کے امام کی اقتداء میں اللہ اکبر کہتے ہوئے رفع یدین کرے اور ہاتھ باندھ لے۔ پہلی رکعت میں سبحانک اللھم پڑھنے کے بعد قرأت سے پہلے ہاتھ کانوں تک اٹھا کر اللہ اکبر کہے اور ہاتھ چھوڑ دے۔ دوسری بار پھر ہاتھ کانوں تک اٹھا کر تکبیر کہے اور ہاتھ چھوڑ دے، تیسری بار بھی اسی طرح ہاتھ اٹھا کر تکبیر کہے اور پھر ہاتھ باندھ لے اور قرأت شروع کرے۔ باقی پوری رکعت تمام نمازوں کی طرح ادا کرے۔ دوسرے رکعت میں سورہ فاتحہ اور قرأت کے بعد امام کی اقتداء میں تین تکبیروں کے ساتھ رفع یدین کرے اور ہاتھ چھوڑ دے۔ چوتھی بار جب امام اللہ اکبر کہے تو تکبیر کے ساتھ رکوع میں چلا جائے۔ اس کے بعد باقی نماز عام نمازوں کی طرح پوری کرے۔

(بہشتی گوہر)

صدقہ فطر کا وجوب:

ہر مسلمان عاقل آزاد (ہر مرد و عورت) پر واجب ہے جبکہ وہ مالک نصاب ہو یا مساوی مالک نصاب ہو خواہ نقدی کی شکل میں یا ضرورت سے زیادہ سامان کی شکل میں ہو یا مال تجارت ہو، رہائش کے مکان سے زائد مکان ہو۔ اپنی طرف سے اور اپنے ان نابالغ بچوں کی طرف سے جو اس کی زیر کفالت ہوں نصف صاع (یعنی پونے دو سیر گیہوں) یا اس کی قیمت ادا کریں۔ صدقۂ فطر نماز عید الفطر سے پہلے ادا کرنا سنت ہے۔

(بہشتی گوہر)

عیدین کے اعمال مسنونہ:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دونوں عیدوں میں غسل کرنا ثابت ہے۔حضرت خالد بن سعد سے مروی ہے کہ آپ کی عادت کریمہ تھی کہ عیدالفطر، یوم النحر ، یوم عرفہ میں غسل فرمایا کرتے تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عید کے دن خوبصورت اورعمدہ لباس زیب تن فرماتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی سبز و سرخ دھاری دار چادر شریف اوڑھتے تھے۔ یہ چادر یمن کی ہوتی تھی جسے بردیمانی کہا جاتا ہے وہ یہی چادر ہے۔عید کے لیے زیب و زینت کرنا مستحب ہے مگر لباس مشروع ہو۔ (مدارج النبوۃ)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کریمہ یہ تھی کہ روز عید الفطر عید گاہ جانے سے پہلے چند کھجوریں تناول فرماتے تھے۔ان کی تعداد طاق ہوتی یعنی پانچ سات وغیرہ۔

(بخاری۔طبرانی)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جس راہ سے عیدگاہ تشریف لے جاتے' اس راہ سے واپس تشریف نہ لاتے بلکہ دوسرے راستے سے تشریف لاتے۔ (بخاری' ترمذی' مدارج النبوۃ)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اتباع سنت کی شدت کے باعث طلوع شمس سے قبل گھر سے نہ نکلتے اور گھر سے نکلتے ہی عیدگاہ تک تکبیر کہتے رہتے۔

﴿اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر لا الہ الّا اللّٰہ واللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر وللّٰہ الحمد﴾ (ابو داؤد. زاد المعاد)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ جب عیدگاہ میں پہنچتے تو نماز عید سے قبل کوئی (نفل وغیرہ) نہ پڑھتے اور نہ بعد میں پڑھتے اور خطبے سے پہلے نماز شروع کرتے۔ اس طرح آپ عیدین میں دو رکعتیں ادا کرتے۔ (زاد المعاد)

رمضان المبارک میں ذخیرہ اندوزی کی لعنت

عَنْ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم قَالَ اَلْجَالِبُ مَرْزُوْقٌ وَالْمُحْتَكِرُ مَلْعُوْنٌ۔ (رواہ ابن ماجہ والدرامی)

''حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نفع کمانے والے کو رزق دیا جاتا ہے اور ذخیرہ اندوزی کرنے والے پر لعنت ہوتی ہے۔''

ہمارے معاشرہ میں ہر سطح پر یہ عجیب وغریب وبا پھیل چکی ہے کہ جہاں رمضان المبارک قریب آیا وہاں عام ضرورت کی اشیاء کی قلت پیدا کردی جاتی ہے اور پھر منہ مانگے دام وصول کیے جاتے ہیں۔ اس میں بنیادی طریقہ ذخیرہ اندوزی ہے۔ ہر وقت اور ہر قسم کی ذخیرہ اندوزی اسلام میں ممنوع نہیں بلکہ اس کے لیے خاص لفظ ''احتکار'' کا استعمال کیا گیا ہے یعنی ''اشیاء ضرورت کا اس لیے ذخیرہ کرلینا تاکہ مصنوعی قلت پیدا کرکے منہ مانگے دام وصول کئے جائیں جسے عرف عام میں مہنگائی کہتے ہیں'' بالفاظ دیگر مہنگائی کے خیال سے ذخیرہ اندوزی احتکار ہے۔

صاحب ہدایہ کتاب البیوع میں لکھتے ہیں ''احتکار (ذخیرہ اندوزی) سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص غلہ یا کوئی اور جنس بڑی مقدار میں اس لیے اکٹھی کرلے یا دوسرے سے خرید کر اس لیے جمع کرلے کہ بازار میں اس کی کمی واقع ہو اور مہنگائی ہوجائے اور تمام خریدار، ضرورت منداسی کی طرف رجوع کریں اور خریدار مجبور ہوکر ذخیرہ اندوزی کرنے والے کو اس کی مقرر کردہ قیمت ادا کرے۔ ہاں البتہ اگر اس چیز کی بازار میں کمی نہیں اور نہ اس کے جمع کرنے کی وجہ سے مصنوعی قلت پیدا ہو، اور اس کے جمع کرنے کی وجہ سے قیمتوں میں اضافہ نہ

ہوتا ہوتو یہ ذخیرہ اندوزی نہیں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر فرمایا کہ''ذخیر اندوزی کرنیوالا ملعون ہے۔'' لعنت، رحمت کی ضد ہے جب معاشرہ پر اللہ کی رحمت کے بجائے لعنت نازل ہونے لگے تو پھر رحمت کے آثار غائب ہونے لگتے ہیں اور لعنت کے آثار نظر آتے ہیں۔رحمت کے آثار یہ ہیں کہ اس رزق میں برکت ہو'ایسے رزق کمانے والے کو حقیقی سکون نصیب ہو اور پھر اس حلال روزی کمانے والے کے دل میں نیک کاموں کا، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا شوق پیدا ہو لیکن جب معاشرہ پر لعنت پڑنے لگے تو اس کے اثرات اس انداز میں نظر آتے ہیں کہ ہزاروں روپے کمائے جارہے ہیں لیکن زبان پر یہ الفاظ سننے میں آتے ہیں''اتنا کماتے ہیں پتہ نہیں کہاں جاتا ہے۔'' اس کی وجہ برکت کا ہاتھ اٹھ جانا ہے' پھر حرام مال کمانے کے بعد سکون ختم ہوا' عبادات کا شوق ہی نہ رہا' نیک کاموں کی طرف دل مائل ہی نہیں ہوتا یہ تمام لعنت کے آثار ہیں۔حضرت معمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

﴿مَنِ احْتَكَرَ فَهُوَ خَاطِئٌ﴾

جو ذخیرہ اندوزی کرتا ہے وہ گنہگار ہے۔''(رواہ مسلم)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''جو شخص کھانے پینے کی چیزیں ذخیرہ اندوزی کرکے مسلمانوں پر مہنگائی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے کوڑھ کے مرض اور محتاجی میں مبتلا کردیتا ہے۔''

(رواہ ابن ماجہ)

ابن قدامہ المغنی کے باب الاحتکار میں روایت کرتے ہیں کہ

''حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک دوکاندار کو ذخیرہ اندوزی سے منع فرمایا اور ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کام سے روکنا بھی واضح کیا لیکن وہ باز نہ آیا اور کوڑھی بن گیا۔''

علامہ شوکانی نیل الاوطار جلد دوم ص ۱۸۱ میں لکھتے ہیں کہ

''حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک ذخیرہ کرنے والے کا غلہ جلادیا۔''

صاحب ہدایہ کتاب الکراھیہ میں لکھتے ہیں کہ

''جب ذخیرہ اندوز کا مقدمہ قاضی کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ ذخیرہ اندوز کو حکم دے کہ وہ اپنے اور اپنے گھر والوں کے کھانے پینے کا خرچہ علیحدہ کرکے جو کچھ بچے اسے بیچ دے اور قاضی اسے ذخیرہ اندوزی سے روک دے، اگر وہ تاجر دوبارہ اسی جرم میں ملوث ہوکر عدالت میں آئے تو قاضی اسے قید کردے تاکہ عام لوگوں کو نقصان پہنچنے کا ذریعہ ختم ہوجائے۔''

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ''جو شخص چالیس دن ذخیرہ اندوزی کرے اور ذخیرہ اندوزی کا مقصد مہنگائی ہو تو وہ اللہ تعالیٰ سے بری ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے بری ہے۔ (رواہ رزین)

حضرت ابواُمامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''جو شخص چالیس دن تک غلہ مہنگائی کے خیال سے ذخیرہ کرے پھر (غلطی کا احساس ہونے پر) وہ تمام غلہ صدقہ کردے پھر بھی اس کی غلطی کا کفارہ ادا نہیں ہوتا۔'' (رواہ رزین)

حضرت معاذؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''وہ ذخیرہ اندوز بندہ برا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ بھاؤ سستا کردے تو غمگین ہوجاتا ہے اور جب مہنگا کردے تو خوش ہوجاتا ہے۔''

(رواہ البیہقی)

ان تمام ارشادات نبویہ اور تعلیمات اسلامی کے پیش نظر یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ ذخیرہ اندوزی کتنا گھناؤنا فعل ہے۔ اور پھر اتنا گھٹیا اور برا کام اور وہ بھی رمضان المبارک کے بابرکت دنوں میں، ان مبارک لمحوں کا تقاضا تو یہ ہے کہ انسان اس کے اندر ثواب

کمائے روزہ داروں کے روزے کھلوائے، غریبوں کی مدد کرے، روزہ داروں کے لیے سہولت پیدا کرے اور اپنے گناہوں کو دھلوائے، اپنی مغفرت کا سامان کرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل کی اس بدعا پر آمین بھی فرمائی کہ

"برباد ہو وہ شخص جس نے رمضان کا مہینہ پایا اور پھر بھی اس کی مغفرت نہ ہوئی۔"

ذخیرہ اندوزی کرنے والے ایسے ملعون تاجر ہیں جو صرف اپنے مسلمان بھائیوں ہی کا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے مقرب روزہ داروں کا خون چوستے ہیں اور ایسے تاجروں کو ارشادات نبویہ یاد رہنے چاہئیں۔ ان کے مالوں میں برکت نہ رہے گی، اللہ تعالیٰ انہیں محتاجی اور کوڑھ میں مبتلا کر دیں گے، یہ حرام مال کھائیں گے تو ارشاد نبوی کے مطابق ان کی دعائیں بھی قبول نہ ہونگی۔



مہنگائی سے خوش ہونے والے تاجر کا انجام

﴿عن معاذ رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ قال سَمِعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول بئس العبد المحتکر ان ارخص اللّٰہ الاسعار حزن وان اغلاھا فرحَ﴾ (رواہ البیہقی)

''حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مہنگائی کے خیال سے غلہ روکنے والا بندہ برا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نرخ سستے کردے تو یہ غمگین ہوجاتا ہے اور اگر مہنگائی کردے تو خوش ہوجاتا ہے۔''

آج کل ''مہنگائی'' کی وبا پھیل چکی ہے ہر چیز کے نرخ بڑھانے کی فکر کی جارہی ہے یہ صرف آج کے ترقی پذیر دور کے ساتھ خاص نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی مہنگائی ہوئی چنانچہ ترمذی میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نرخ بڑھ گئے تو ہم نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نرخ مقرر کردیجیے! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ ہی نرخ مقرر کرنے والا ہے وہی تنگی اور کشادگی کرنے والا ہے اور میری آرزو ہے کہ میں اپنے رب سے اس حال میں ملاقات کروں کہ تم میں سے کوئی مجھ سے خون یا مال کا مطالبہ نہ کررہا ہو۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نرخ بڑھنا' چیزوں کا مہنگا ہونا ایک فطری عمل ہے۔ کبھی چیزیں سستی ہوجاتی ہیں کبھی مہنگی ہوجاتی ہیں نرخ کا تعلق موسم کے اتار چڑھاؤ اور طلب اور رسد کی کمی اور زیادتی پر منحصر ہوتا ہے البتہ غیر فطری طریقوں سے نرخ بڑھانے کے راستوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی سے بند فرمایا۔ حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص مسلمانوں پر احتکار (غلہ روک کر گراں قیمت پر فروخت کرنا) کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس

شخص کو جذام اور افلاس میں مبتلا کردے گا، اور عبداللہ بن عمرؓ سے ارشاد نبوی منقول ہے فرمایا جس شخص نے مہنگائی کے خیال سے چالیس روز تک غلہ روکے رکھا تو وہ اللہ تعالیٰ سے بری ہوا اور اللہ تعالیٰ اسے بری ہوا۔ اور حضرت ابو حامہؓ سے ارشاد نبوی منقول ہے کہ جس شخص نے چالیس روز تک مہنگائی کے خیال سے غلہ روکے رکھا پھر اگر وہ سارا مال صدقہ بھی کردے تو پھر بھی اس کا کفارہ ادا نہ ہوگا۔ ابن قدامہؒ نے ''المغنی'' میں واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک دوکاندار کو ذخیرہ اندوزی سے منع فرمایا اور ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی سنا دیا جس میں اس کے بارے میں منع فرمایا گیا ہے لیکن وہ دکاندار باز نہ آیا اور کوڑھی بن گیا۔ امام غزالیؒ تجارت اور کسب حلال کے بارے میں لکھتے ہیں کہ **ان اللّٰہ یَاْمُرُ بِالعدل والاحسان**، اللہ تعالیٰ، عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے فرماتے ہیں کہ جس نے صرف عدل کیا اس نے دین کا سرمایہ محفوظ رکھا لیکن فائدہ احسان میں ہے اور احسان وہ بھلائی ہے جس سے معاملہ کرنے والے کو ایسا فائدہ پہنچے جو فائدہ پہنچانا آپ پر واجب نہیں تھا۔ اور تجارت میں احسان کا درجہ چھ طریقوں سے حاصل ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ اگر خریدار اپنی ضرورت کی وجہ سے زیادہ نفع دینے پر راضی ہو تب بھی اس سے زیادہ نفع نہ لے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ بہت مال دار تھے لوگوں نے مالداری کا سبب پوچھا تو فرمایا میں نے تھوڑے فائدہ کو کبھی رد نہیں کیا۔ دوسرے یہ کہ ضرورت مندوں کا مال مہنگا خرید لے تاکہ وہ خوش ہوں (ہمارے معاشرے میں آج کل دستکاری کے ہنر مند، اس زمرے میں آتے ہیں) تیسرے قیمت لینے میں تین طرح کا احسان ہوتا ہے اول قیمت کچھ کم کردی جائے' دوم کٹے پھٹے روپے لینے سے' سوم قیمت کی ادائیگی میں مہلت دینے سے' چوتھے یہ کہ ادھار اور قرض لینے والے کو چاہیے کہ وعدہ سے پہلے ادا کردے' پانچویں یہ کہ جس سے معاملہ کرے اگر وہ کرکے پشیمان ہو تو اس سے معاملہ فسخ کرلے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو بیع کو (کسی کی خیر خواہی کے لیے) فسخ کرے اور یہ سمجھ لے کہ میں نے بیع کی ہی نہ تھی تو اللہ تعالیٰ بھی اس کے گناہوں کو ایسا سمجھ لیتا ہے گویا اس نے وہ گناہ کیے ہی نہ تھے' چھٹے یہ کہ یہ عمل کرے اگرچہ تھوڑی مقدار ہی میں ہو کہ محتاجوں کو اس ارادے سے ادھار بیچے کہ جب تک ان کو قیمت ادا کرنے کی قدرت نہ ہوگی ان سے

قیمت نہیں مانگوں گا اور اگر وہ اسی حالت میں مرگیا تو اسے بخش دوں گا۔

یہ ایسے سنہری اصول ہیں کہ اگر آج بھی ان پرعمل کیا جائے تو جس طبقے پر مہنگائی کا سب سے زیادہ بوجھ پڑا ہے اُن کی تکلیفوں کو کم کیا جا سکے گا۔

☆☆☆

شب قدر کے فضائل واعمال

﴿عَنْ مَّالِكٍ اَنَّـهٗ، سَمِعَ مَنْ يَّثِقُ بِهٖ مِنْ اَهْلِ الْعِلْمِ يَقُوْلُ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُرِيَ اَعْمَارَ النَّاسِ قَبْلَهٗ، اَوْ مَاشَآءَ اللّٰهُ مِنْ ذٰلِكَ فَكَاَنَّـهٗ، تَقَاصَرَ اَعْمَارَ اُمَّتِهٖ عَنْ اَنْ لَّا يَبْلُغُوْا مِنَ الْعَمَلِ مِثْلَ الَّذِىْ بَلَغَ غَيْرُهُمْ فِىْ طُوْلِ الْعُمْرِ فَاَعْطَاهُ لَيْلَةَ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ﴾

(موطا امام مالك)

’’امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے ایک معتبر اور نیک عالم سے یہ بات سنی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اگلے لوگوں کی عمریں بتلائی گئیں جتنا اللہ کو منظور تھا تو آپ نے اپنی امت کے لوگوں کی عمروں کو کم سمجھا اور یہ خیال کیا کہ میری امت کے لوگ (اتنی سی عمر میں) ان کے برابر عمل نہ کرسکیں گے تو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شب قدر عطا فرمائی جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔‘‘

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن بنی اسرائیل کے ایک شخص کا ذکر فرمایا کہ وہ ایک ہزار مہینے تک اللہ کے راستہ میں جہاد کرتا رہا صحابہ کرامؓ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا (ہماری عمریں تو اس کے مقابلہ میں نہ ہونے کے برابر ہیں) اس پر اللہ تعالیٰ نے شب قدر عطا فرمائی جو ایک ہزار مہینوں سے افضل اور مرتبہ میں بڑھی ہوئی ہے (ہزار مہینوں کے تراسی سال ۴ ماہ ہوتے ہیں)۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے سامنے حضرت ایوب، حضرت زکریا، حضرت حزقیل اور حضرت یوشع علیہم السلام، ان چار حضرات کا ذکر فرمایا کہ یہ حضرات اسی اسی سال اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہے۔ اور پلک جھپکنے کے برابر بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کی اس پر صحابہ کرام کو تعجب اور رشک ہوا، اللہ تعالیٰ نے رحم

فرمایا اور شب قدر کا عظیم الشان تحفہ عطا فرمایا اس کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور سورۂ قدر سنائی جس کا ترجمہ یہ ہے:

> ’’بے شک ہم نے قرآن مجید کو شب قدر میں نازل کیا ہے اور آپ کو کچھ معلوم ہے کہ شب قدر کیسی بڑی چیز ہے؟ شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس رات میں فرشتے اور روح القدس (یعنی جبرئیل علیہ السلام) اپنے پروردگار کے حکم سے ہر امر خیر کو لے کر (زمین کی طرف) اترتے ہیں، (وہ رات سراپا) سلام ہے وہ رات (انہی برکتوں کے ساتھ) طلوعِ فجر تک رہتی ہے۔‘‘

(بیان القرآن)

گویا اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح فرما دی کہ ہمارے نزدیک عمر کی کمی زیادتی کوئی معنیٰ نہیں رکھتی میں اپنی قدرت سے ایک ہی رات کے دامن کو اتنا وسیع کر سکتا ہوں کہ اس کے مقابلہ میں ہزار مہینے بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

حق تعالیٰ نے امت محمدیہ پر کتنا بڑا انعام فرمایا یہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا صدقہ ہے۔

اس سورہ کا نام سورۂ قدر ہے اس میں شب قدر کی چار خصوصیتیں ذکر کی گئی ہیں۔ (۱) نزول قرآن ہوا (۲) ملائکہ کا نزول ہوتا ہے (۳) ہزار مہینوں سے زیادہ فضیلت ہے (۴) صبح صادق تک خیر و برکت امن وسلامتی کی بارش ہوتی رہتی ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شب قدر میں جبرئیل علیہ السلام ملائکہ کی ایک جماعت کے ساتھ اترتے ہیں (یعنی زمین پر) اور ہر اس شخص کے لیے جو (اس رات میں) کھڑے یا بیٹھے اللہ کا ذکر کر رہا ہو اور عبادت میں مشغول ہو دعائے رحمت کرتے ہیں۔

اور تفسیر خازن میں یہ بھی ہے کہ ایسے آدمی کے لیے جو اس رات میں مصروفِ

عبادت ہوسلامتی کی دعا کرتے ہیں۔مختصر یہ کہ شب قدر کی بڑی فضیلت ہے اسی وجہ سے اس کوتلاش کرنے کے لیے آنحضرت ﷺ نے پہلے دس دنوں کا اعتکاف فرمایا پھر درمیان کے دس دنوں کا اعتکاف فرمایا پھرآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتکاف کی جگہ میں سے اپنا سر باہر نکال کر فرمایا میں نے پہلے دہائے میں اعتکاف کیا، پھر دوسرے دہائے میں اعتکاف کیا اس کے بعد مجھے شب قدر عطا کی گئی اور بتلایا گیا کہ وہ (شب قدر) آخری دہائے میں ہے۔

ایک حدیث میں ہے:

”جس شخص نے شب قدر میں قیام کیا ایمان اور طلب ثواب کے لیۓ
بخش دیئے جاتے ہیں اس کے گذشتہ گناہ“

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شب قدر کو رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔

یعنی ۲۱،۲۳، ۲۵، ۲۷، ۲۹ ان پانچ راتوں میں تلاش کرو۔ یہ روایت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہ کو شب قدر رمضان کی آخری سات راتوں میں دکھائی گئی اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے خواب آخری سات راتوں پر متفق ہو گئے پس جو شخص شب قدر کو تلاش کرنا چاہے وہ آخری سات راتوں میں تلاش کرے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اگر مجھ کو شب قدر کا پتہ چل جائے تو میں اس میں کیا پڑھوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفُوَ فَاعْفُ عَنِّیْ﴾ (ترمذی)

”یا اللہ تو معاف کرنے والا ہے، معافی چاہنے والے کو پسند کرتا ہے،
مجھے بھی معاف فرما دے۔“

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں تھے تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر کان لگایا تو آپ یہ دعا پڑھ رہے تھے۔

﴿اَعُوْذُ بِعَفْوِكَ مِنْ عِقَابِكَ وَاَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ، وَاَعُوْذُبِكَ مِنْكَ جَلَّ وَجْهُكَ اَللّٰهُمَّ لَآ اُحْصِيْ ثَنَآءً عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ﴾ (بیہقی)

''یا اللہ میں تیرے عفو کی پناہ چاہتا ہوں تیری سزا سے' اور تیری رضا کی پناہ چاہتا ہوں تیرے غصہ سے، اور پناہ چاہتا ہوں تیری سختیوں سے یا اللہ میں آپ کی تعریف کا شمار نہیں کر سکتا، آپ کی ذات ایسی بلند و بالا ہے جیسے آپ نے بیان کی۔''

صبح کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کلمات کی تصدیق چاہی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم خود بھی یاد کر لو اور دوسروں کو بھی یاد کرا دو یہ کلمے مجھے حضرت جبرئیل علیہ السلام نے سکھائے ہیں اور فرمایا ہے کہ میں سجدے میں انہیں بار بار پڑھا کروں۔



شب قدر کی برکات

﴿عن عائشه قالت قُلت یا رسول اللّٰہ ارأیت ان علمت أیّ لیلة القدر مَااقول فیها قال قولی. اللّٰهم انك عفوٌّ تحبّ العفو فاعف عَنّی﴾ (ابن ماجه)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے شب قدر معلوم ہو جائے تو میں اس میں کیا پڑھوں؟ آپ نے فرمایا یہ کہا کرو۔''اے اللہ تو معاف کرنے والا ہے معافی چاہنے والے کو پسند کرتا ہے مجھے بھی معاف فرما دے۔''

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن بنی اسرائیل کے ایک شخص کا ذکر فرمایا کہ وہ ایک ہزار ماہ تک اللہ کے راستے میں جہاد کرتا رہا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہماری عمریں تو اس کے مقابلے میں بہت کم ہیں اس پر اللہ تعالیٰ نے شب قدر عطا فرمائی جو ایک ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ مفسرین نے سورۃ القدر کے نازل ہونے کے موقع کی تفصیل بتاتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے سامنے حضرت ایوب، حضرت زکریا، حضرت یوشع اور حضرت حزقیل علیہم السلام، ان چار حضرات کا ذکر فرماتے ہوئے بتایا کہ یہ لوگ اسی اسی سال اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہے اور ایک لمحہ بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں نہیں گزارا' اس پر صحابہ کو رشک آیا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے شب قدر کا عظیم موقعہ عطا فرمایا اور اس کے بارے میں ایک پوری سورت نازل فرمائی، جس کا نام بھی سورۃ القدر ہے اور یہ سورت قرآن حکیم کے آخری پارے میں موجود ہے۔

اس سورت میں اللہ رب العزت نے شب قدر کی چار برکتیں ذکر فرمائی ہیں۔ اس رات کی پہلی برکت تو یہ ہے کہ اِنَّـا اَنۡـزَلۡـنٰـهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ یعنی بیشک ہم نے قرآن مجید کو

شب قدر میں نازل کیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ شب قدر میں قرآن مجید لوح محفوظ سے آسمانِ دنیا پر اترا اور پھر موقع بہ موقع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا رہا۔

دوسری برکت شب قدر کی یہ بیان فرمائی لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ خَیۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شھر یعنی شب قدر ہزار مہینوں سے بھی زیادہ بہتر ہے ہزار مہینوں کو اگر سالوں میں تبدیل کیا جائے تو یہ تراسی سال چار ماہ بنتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ نہیں فرمایا کہ یہ رات ہزار مہینوں کے برابر ہے بلکہ فرمایا۔

خَیۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَھۡر ہزار مہینوں سے بھی زیادہ بہتر ہے اب وہ کتنی زیادہ بہتر ہے یہ اللہ تعالیٰ ہی کو علم ہے مفسرین نے یہاں ایک اور بات کی طرف بھی توجہ دلائی جس سے اس رات کی برکتوں کی وسعت کا علم ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ لغت عرب میں گنتی کے لیے الف سے زیادہ آگے کوئی لغت نہیں ہے۔ جیسے آج کل گنتی میں ملین اور بلین آخری عدد سمجھے جاتے ہیں اسی طرح عربی میں آخری لفظ شمار کرنے کے لیے الف ہے لہٰذا خَیۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شھۡر کا مطلب یہ ہوا کہ انسانوں کے نزدیک گنتی کا جو آخری عدد ہے شب قدر کی برکتیں اس سے بھی زیادہ ہیں۔ غور فرمایئے امت محمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اللہ جل جلالہٗ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اتنا بابرکت موقعہ عطا فرمایا۔

تیسری برکت شب قدر کی یہ بیان فرمائی تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوۡحُ فِیۡھَا بِاِذۡنِ رَبِّھِمۡ مِّنۡ کُلِّ اَمۡرٍ سَلٰمٌ کہ فرشتے اور روح القدس یعنی جبرئیل علیہ السلام اپنے پروردگار کے حکم سے ہر امر خیر کو لے کر زمین پر اترتے ہیں اور یہ رات سراپا سلامتی ہے۔

شب قدر کی فضیلت و برکت کا چوتھا پہلو یہ ارشاد فرمایا ھِیَ حَتّٰی مَطۡلَعِ الۡفَجۡر یعنی وہ شب فجر کے طلوع تک رہتی ہے، معلوم ہوا کہ شب قدر کی تمام فضیلت و برکات ساری رات رہتی ہیں رات کا کوئی خاص وقت مقرر نہیں کیا گیا۔ لہٰذا ساری رات عبادت میں گزارنی چاہیے اور اگر ساری رات عبادت کی ہمت نہ ہو رہی ہو اور یہ سوچ کر رات کے آخری حصہ

میں عبادت کرنی چاہیے سو گئے اور پھر ساری رات بغیر عبادت کے گزر گئی تو بہت بڑی خیر سے محرومی ہوگی اس لیے اگر ساری رات عبادت نہ ہو سکے تو رات کے ابتدائی حصہ کی برکات سمیٹنے کا موقعہ ہاتھ سے نہ جانا چاہیے پس جس قدر وقت ملے بندہ شب قدر میں عبادت کو غنیمت جانے۔ ان ہی عظمتوں کی بنا پر اس رات کا نام شب قدر رکھا گیا کہ یہ رات واقعی بڑی قدر و منزلت اور عظمت والی ہے۔

لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شب قدر کے لیے کسی ایک خاص تاریخ کی رات متعین نہیں فرمائی البتہ یہ خوب وضاحت فرمائی کہ شب قدر رمضان المبارک کے آخری عشرے یعنی آخری دس دنوں کی طاق راتوں میں ہوتی ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم منقول ہے فرمایا کہ شب قدر کو رمضان المبارک کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرو یعنی ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷، ۲۹ ویں شب گویا کہ ان پانچ راتوں ہی میں سے کسی ایک میں شب قدر ہوتی ہے۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ شب قدر نبی کے زمانے میں ہوتی ہے یا بعد میں بھی ہوتی ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شب قدر قیامت تک آتی رہے گی۔ بعض صحابہ کرام نے خصوصاً حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ۲۷ شب کا قول اختیار کیا ہے۔

بسا اوقات یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ چاند مختلف ممالک میں مختلف ایام میں نظر آتا ہے تو پھر شب قدر کیسے متعین ہوگی اور پھر یہ بھی خیال آتا ہے کہ ہمارے ہاں جس وقت رات ہوتی ہے بعض ممالک میں اس وقت دن ہوتا ہے پھر شب قدر کے لمحات کو کیسے مخصوص کیا جا سکتا ہے تو اس کے بارے میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ جس طرح عیدالفطر کے دن کی بھی برکتیں ہیں۔ اب یہ عید کا دن مختلف ممالک میں مختلف ہوتا ہے ہم جب یہاں عیدالفطر کے دن کی برکات سمیٹ رہے ہوتے ہیں بہت سے ممالک میں رات ہوتی ہے لیکن جب ان ممالک میں عید کا دن ہوگا وہاں بھی اللہ رب العزت عید کی برکات عطا فرماتے ہیں

بالکل اسی طرح شب قدر کی برکات بھی اللہ رب العزت ہر مسلمان کو جہاں بھی وہ ہو ضرور عطا فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل و کرم کے وسیع ہونے کے پیش نظر دل میں وسوسے نہیں آنے چاہئیں انسان کی سوچ بہت محدود ہے اللہ کی رحمت لامحدود ہے اب یہ بات کہ اس رات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے یہی سوال ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا اگر مجھے شب قدر کا پتہ چل جائے تو میں اس میں کیا پڑھوں آپ نے ارشاد فرمایا یہ پڑھا کر۔

﴿اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تحبُّ الْعَفُوَ فَاعْفُ عَنِّیْ﴾

''یعنی اے اللہ! بے شک آپ معاف کرنے والے ہیں معاف کرنے کو پسند کرتے ہیں پس مجھے معاف فرما دیجیے۔''

یہ ایک مختصر اور بڑی اہم دعا ہے اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دعا کی تعلیم دی ہے اس لیے اس رات کے لیے یہ مسنون دعا ہے۔ اس کے علاوہ شب قدر میں مختلف انداز میں عبادت کی جاسکتی ہے کیونکہ ایک ہی طرح کی عبادت جاری رکھی جائے تو پھر تجربہ یہ ہے کہ بشری تقاضوں کی وجہ سے نیند آنے لگتی ہے یا اکتاہٹ ہونے لگتی ہے اس لیے کچھ دیر نوافل پڑھ لیے جائیں کچھ وقت قرآن حکیم کی تلاوت کر لی جائے اور کچھ لمحے درود شریف، مناجات اور تسبیحات وغیرہ پڑھ لی جائیں اور پھر خوب دعائیں کی جائیں اپنے گناہوں کی معافی مانگی جائے اپنے لیے عزیز و اقارب کے لیے اور اپنے ملک کے لیے اور پوری امت مسلمہ کے لیے دعائیں کیجیے اور پوری کوشش ہو کہ شب قدر کے قیمتی لمحات سے کوئی محروم نہ رہے اس لیے کہ ابن ماجہ میں حضرت انس سے ارشاد نبوی منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رمضان المبارک کا مہینہ تمہارے پاس آیا ہے اس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے جو اس سے محروم رہا وہ ساری خیر سے محروم رہا اور محروم کے سوا کوئی اس کی خیر سے محروم نہیں ہوتا۔ اللہ رب العزت ہم سب کو شب قدر کی برکتیں نصیب فرمائے اور ہماری دعاؤں کو قبول فرمائے خصوصاً یہ دعا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھائی۔

﴿اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تحبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ﴾

''یعنی اے اللہ بے شک آپ معاف کرنے والے ہیں معاف کرنے کو پسند کرتے ہیں پس مجھے معاف فرما دیجیے۔''(آمین)

☆☆☆

رمضان المبارک

کے انوار و انعامات کیسے حاصل کیے جائیں؟

''حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے خطاب فرمایا (اس میں یہ بھی فرمایا کہ رمضان المبارک) ایسا مہینہ ہے کہ اس کا پہلا حصہ رحمت ہے، درمیانہ حصہ مغفرت اور آخری حصہ جہنم سے آزادی کا ہے۔''

اللہ رب العزت کا بڑا فضل و کرم ہے کہ اس نے ہمیں یہ بابرکت لمحات عطاء فرمائے لیکن مادیت کے اس دور میں ہماری عبادات بھی رسمی ہو کر رہ گئی ہیں ان عبادات کی اہمیت اور حقیقت ذہن میں جس طرح ہونی چاہیے تھی اس طرح نہیں رہی۔

اللہ تعالیٰ نے اس ماہ میں ایسی عبادت عطا فرمائی جس کا اجر اللہ تعالیٰ خود عطا فرمائیں گے۔ پھر ماحول بھی ایسا عطا فرما دیا کہ شیاطین کو پابند زنجیر کر دیا۔ رمضان کے تینوں عشروں کو بالترتیب رحمت، مغفرت اور جہنم سے آزادی کا زمانہ قرار دیا۔ اب ہمیں اس مبارک مہینہ میں کس طرح رہنا چاہیے تاکہ رمضان المبارک کے انوار و انعامات حاصل کرنے کی سعادت نصیب ہو جائے۔ اسی سلسلہ میں ایک مرتبہ احقر کے شیخ حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمہ اللہ علیہ (خلیفہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ علیہ) نے جمعہ کے دن ۲۲ شعبان ۱۳۹۳ھ کو ایک مجلس میں اپنے مخصوص انداز میں ارشادات سے نوازا، (احقر اس مجلس کے ارشادات تحریر کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے)۔ فرمایا کہ:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ میرا مہینہ ہے اور اس مہینہ میں طاعات و عبادات کا صلہ میں دوں گا'' خدا معلوم ان کی مشیت میں کیا کیا صلہ ہے جو وہ اپنے بندوں کو عطا فرمائیں گے۔ دیکھئے اس طرح یہ کتنا مہتم بالشان مہینہ ہے اور جب کوئی محترم و مکرم مہمان آتا ہے تو ہم

لوگ بہت کچھ تیاریاں کرتے ہیں اس لیے رمضان المبارک کے لیے ہم کو خوب تیاری پہلے سے کرنی چاہیے۔

تہیہ کر لیجیے کہ اب پاکیزہ ومحتاط زندگی گزاریں گے۔ آنکھوں کا غلط انداز نہ ہونے پائے، سماعت میں فضول باتیں نہ آنے پائیں۔ بیکار باتوں میں مشغول نہ ہوں' اخبار بینی سے زیادہ شغف نہ ہونے پائے' اس کے علاوہ غیر ضروری تعلقات بھی کم کر دیئے جائیں' ایسی تقریبات میں بھی شریک نہ ہوں جہاں شریعت کے خلاف کام ہوں تو انشاء اللہ پاک وصاف رہیں گے۔ اور یاد رکھو کہ ناپاکیوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے صحیح تعلق پیدا نہیں ہوسکتا یہ بھی اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اپنے گنہگار غفلت زدہ بندوں کو پہلے ہی سے خبردار کر دیا کہ جیسے ہی رمضان کا مبارک مہینہ شروع ہو تو اپنے عمر بھر کے تمام چھوٹے بڑے گناہ معاف کراؤ تا کہ تمہارا اپنے مربی حقیقی سے صحیح وقوی تعلق پیدا ہو جائے اور اگر تم نے ہماری مغفرت واسعہ و رحمت کاملہ کی قدر نہ کی تو؟ پھر تمہاری تباہی و بربادی میں کوئی کسر باقی نہ رہے گی۔

اب اس اعلان رحمت پر کون ایسا بدنصیب بندہ ہے جو اس کے بعد محروم رہنا چاہے گا اس لیے ہم سب لوگ یقیناً بڑے خوش نصیب ہیں کہ رمضان المبارک کا مہینہ اپنی زندگی میں پا رہے ہیں۔ اب تمام جذبات عبدیت کے ساتھ اور قوی ندامت کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں حاضر ہوں اور اس ماہ مبارک کے تمام برکات وانوار وتجلیات الٰہیہ سے مالا مال ہوں۔

لہٰذا اپنے تمام گناہ عمر بھر کے جتنے یاد اور تصور میں آ سکیں چاہے وہ دل کا گناہ ہو' آنکھ کا، زبان کا یا کان کا سب کو ندامت قلب کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں پیش کر دیں اور یہ کہیں اب وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ ایسا نہیں کریں گے۔

یا اللہ ہم کو معاف فرما دیجیے ہر وہ بات جو قابل مواخذہ ہو معاف فرما دیجیے۔ دنیا میں، برزخ میں، حشر میں، پل صراط پر، جہاں جہاں بھی مواخذہ ہوسکتا ہے معاف فرما دیجیے اور یا اللہ اب آپ جتنی زندگی بھی آئندہ عطا فرمائیں وہ حیات طیبہ ہو اعمال صالحہ کے ساتھ ہو۔

انشاء اللہ حسب وعدہ الٰہی ہماری یہ دعا ضرور قبول ہو گی۔ مایوس و ناامید نہ ہونا چاہیے جب ان کا وعدہ ہے تو سب انشاء اللہ معاف ہو جائے گا۔

البتہ چند گناہ ایسے ہیں جن کی معافی قابل توجہ ہے۔ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے کینہ نہ ہو۔ کینہ رکھنے والا شخص شب قدر کی تجلیات، مغفرت اور قبولیت دعاء سے محروم رہے گا۔ معاشرتی تعلقات میں اپنے اہل وعیال، عزیز واقارب دوست واحباب سب پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ دیکھئے کہ ان میں سے کسی کے دل میں کسی قسم کا کھوٹ، کینہ اور غصہ تو نہیں ہے۔ اگر آپ اس معاملہ میں حق بجانب اور دوسرا باطل پر ہے تو اگر آپ اللہ سے مغفرت چاہتے ہیں تو اسے معاف کر دیں۔ اگر آپ کی زیادتی ہو تو اس سے جا کر معافی مانگ لیں اس میں شرم کی بات نہیں۔ اگر بالمشافہ ہمت نہ پڑے تو ایک تحریر لکھ کر اس کے پاس بھیج دیں کہ یہ رمضان کا مہینہ ہے اس میں دلوں کو صاف رکھنا چاہیے ہم آپ کو معاف کرتے ہیں آپ بھی ہمیں معاف کر دیجیے۔

اس کے بعد ان کے بارے میں برا نہ چاہیں۔ نہ دل میں انتقام لینے کا خیال رکھیں پھر اپنی بیوی بچوں پر بھی نظر ڈال لیں کہ ان میں سے آپ سے کوئی ناراض تو نہیں یعنی ان کے ساتھ کوئی بے جا تشدد یا زیادتی تو نہیں کی۔ ایسا ہے تو ان سے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں بلکہ خوش اسلوبی سے ایسا برتاؤ کریں جس سے وہ خوش ہو جائیں اس طرح بھائی، بہن، عزیز واقارب، غرض کسی سے کسی قسم کی بھی رنجش ہو تو ان کو معاف کر دیں اس لیے کہ آپ بھی تو آخر اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے ہیں۔

اسی طرح فضول باتوں سے پرہیز کیجئے، لغو باتیں کرنے سے عبادت کا نور جاتا رہتا ہے، کلام پاک پڑھیے، سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پڑھئے۔ رمضان المبارک کی دو عبادتیں سب سے بڑی ہیں۔ ایک تو کثرت سے نمازیں پڑھنا جس میں تراویح کی نماز بھی شامل ہے اس کے علاوہ تہجد، اشراق، چاشت اور اوابین کا خاص اہتمام ہونا چاہیے۔ دوسری عبادت تلاوت کلام پاک ہے۔

اگر آپ کسی دفتر میں کام کرتے ہیں تو تہیہ کرلیں کہ آپ کے ہاتھ سے، زبان سے قلم سے خدا کی مخلوق کو کوئی پریشانی نہ ہو، کسی کو دھوکہ نہ دیں' کسی ناجائز غرض سے اس کا کام نہ روکیں' کوئی بات خلاف شریعت نہ ہو' اگر آپ تاجر ہیں تو صداقت وامانت سے کام کریں۔

اکثر دیندار عورتیں اس بات کی شکایت کرتی ہیں کہ ان کو روزہ افطار کرنے سے قبل عصر اور مغرب کے درمیان تسبیحات پڑھنے یا دعائیں کرنے کا موقع نہیں ملتا کیونکہ یہ وقت ان کا باورچی خانہ میں صرف ہو جاتا ہے۔ کھانا تیار کرنے میں مشغول رہتی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ وقت بھی عبادت ہی میں گزرتا ہے روزہ داروں کے افطار اور کھانے کا انتظام کرتی ہیں جس میں ثواب ہی ثواب ہے۔

رمضان کی راتیں عبادت میں گزارنے سے دن میں بھی سچائی اور دیانت سے کام کرنے کی عادت ہو جاتی ہے اس مبارک ماہ میں لیلۃ القدر ہے قرآن مجید میں ہے کہ یہ رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ہم پر یہ عظیم انعام ہے۔ شب قدر کے بارے میں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس کا وقت غروب آفتاب سے طلوع فجر تک رہتا ہے اس لیے اس کا اہتمام ضروری رکھنا چاہیے۔ جس قدر ممکن ہو نوافل، تسبیحات اور دعاؤں میں کچھ اضافہ ہی کر دینا چاہیے۔ ساری رات جاگنے کی ہمت نہ ہو تو جس قدر تحمل ہو بہت ہے۔ جی بھر کے استغفار کر لیا تو اب بھی استغفار کرتے رہیے زیادہ ماضی کے پیچھے نہ پڑیئے اب مستقبل کو سوچیے، مستقبل ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طاعات اور عبادات میں زیادہ سے زیادہ وقت گزاریئے۔

رمضان کے متبرک مہینہ میں یہ دعائیں مانگئے:

یا اللہ اپنے اس متبرک ماہ میں جتنے وعدے فرمائے ہیں اور آپ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنی بشارتیں دی ہیں یا اللہ ہم ان سب کے محتاج ہیں آپ یہ سب عطا فرما دیجئے۔ یا اللہ ہم لوگ جو توبہ واستغفار کریں وہ سب قبول کر لیجیے زیادہ سے زیادہ اعمال صالحہ کی توفیق دیجئے۔

یا اللہ سب مسلمانوں پر رحم فرمایئے۔ یا اللہ خصوصاً پاکستان میں زندقہ اور الحاد کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو دور فرما دیجیے۔آئندہ نسلیں نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ جائیں۔ یا اللہ ان کی حفاظت فرمایئے ان کے دلوں میں دین کی عظمت اور آخرت کا خوف پیدا کیجیے یا اللہ ان میں انسانیت اور شرافت کے احساسات و جذبات پیدا فرما دیجیے۔

یا اللہ ہر طرح کی برائیوں سے تباہ کاریوں سے بچا لیجیے۔

یا اللہ امن و امان کی صورت پیدا فرما دیجیے بیرونی سازشوں، دشمنوں کی نقصان رسانی سے ہماری مملکت اسلامیہ کو بچا لیجیے۔ یا اللہ ہمارے دین کی حفاظت فرمایئے۔ ہمارے ظاہر و باطن کو پاک کر دیجیے۔ یا اللہ جو دشواریاں، بیماریاں، پریشانیاں، آنے والے خدشات و آفات ہیں ان سب سے ہمیں محفوظ فرما دیجیے۔ ہماری تمام حاجات پوری فرما دیجیے۔ ہمیں اسلام پر قائم رکھئے اور ہمارا خاتمہ ایمان پر فرما دیجیے۔ آمین۔



روزہ کا فدیہ

﴿عن نافع عن ابن عمر عن النبی صلی الله علیه وسلم قال من مات وعلیه صیام شهر رمضان فلیطعم عنه مکان کل یوم مسکین.﴾ (رواہ الترمذی)

وقال الصحیح انه موقوف علی ابن عمر.

''حضرت نافع رضی اللہ عنہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی مر جائے اور اس کے ذمہ ماہ رمضان کے روزے ہوں تو ہر روزہ کے بدلہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا چاہیے۔'' امام ترمذی نے اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ صحیح یہ ہے کہ یہ روایت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے۔'' (مشکوۃ باب القضاء فصل ثانی)

اس حدیث میں روزہ کے فدیہ کا تذکرہ ہے اسی طرح سورہ بقرہ میں بھی فدیہ کا تذکرہ موجود ہے۔ وعلی الذین یطیقونه فدیة طعام مسکین۔ (البقرہ آیت ۱۸۴)

مفسرین نے اس آیت کی مختلف تفسیریں کی ہیں راجح تفسیر حضرت مولانا مفتی شفیع صاحبؒ نے ارشاد فرمائی ہے کہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جو لوگ مریض یا مسافر کی طرح روزہ رکھنے سے مجبور نہیں بلکہ روزہ کی طاقت تو رکھتے ہیں مگر کسی وجہ سے دل نہیں چاہتا تو ان کے لیے بھی یہ گنجائش ہے کہ وہ روزہ کے بجائے روزہ کا فدیہ بطور صدقہ ادا کر دیں اس کے ساتھ اتنا فرما دیا: وان تصوموا خیر لکم (یعنی تمہارے لیے بہتر ہے کہ روزہ رکھو) یہ حکم شروع اسلام میں تھا۔ جب لوگوں کو روزہ کا خوگر (عادی) کرنا مقصود تھا اس کے بعد جو آیت آنے والی ہے من شهد منکم الشهر فلیصمه اس سے یہ حکم عام لوگوں کے حق میں منسوخ کر دیا گیا۔ صرف ایسے لوگوں کے حق میں اب بھی باجماع امت باقی رہ گیا ہے جو بہت بوڑھے ہوں (جصاص) یا ایسے بیمار ہوں کہ اب صحت کی امید ہی نہیں رہی، جمہور صحابہ و

تابعین کا یہی قول ہے۔

(معارف القرآن جلد اول ص ۴۴۵)

صحیح بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی، طبرانی وغیرہ تمام ائمہ حدیث نے حضرت سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت: **وعلی الذین یطیقونہ** نازل ہوئی تو ہمیں اختیار دے دیا گیا تھا کہ جس کا جی چاہے روزہ رکھے، جس کا جی چاہے ہر روزہ کا فدیہ دے دے پھر جب دوسری آیت **فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ**" نازل ہوئی تو یہ اختیار ختم ہو کر طاقت والوں پر صرف روزہ ہی رکھنا لازم ہو گیا۔

مسند احمد میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ نماز کے معاملات میں بھی ابتدائے اسلام میں تین تبدیلیاں آئی تھیں اور روزہ کے معاملہ میں بھی تین تبدیلیاں ہوئیں۔ پہلی یہ کہ ابتداء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مہینہ میں تین روزے اور ایک روزہ یوم عاشوراء (دس محرم) کا رکھتے تھے۔ پھر رمضان کے روزے فرض ہو گئے دوسری تبدیلی یہ کہ پہلے یہ حکم عام تھا کہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ روزہ رکھے یا فدیہ دے اور روزہ رکھنا افضل اور بہتر ہے پھر اللہ تعالیٰ نے **من شھد منکم الشھر** والی آیت نازل فرما دی اس آیت نے تندرست قوی کے لیے یہ اختیار ختم کر کے صرف روزہ رکھنا لازم کر دیا، صرف بوڑھے افراد کے لیے حکم باقی رہا۔ تیسری تبدیلی یہ ہوئی کہ شروع میں افطار کے بعد کھانے پینے اور ازدواجی تعلق کی اجازت اس وقت تک تھی جب تک آدمی سوئے نہیں، جب سو گیا تو دوسرا روزہ شروع ہو گیا کھانا پینا وغیرہ ممنوع ہو گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آیت **احل لکم لیلۃ الصیام الرفث** نازل فرما کر یہ آسانی فرما دی کہ اگلے دن صبح صادق تک کھانا پینا سب جائز ہیں۔

احادیث کی روشنی میں روزہ کے فدیہ کے بارے میں یہ بات واضح ہوئی کہ جس پر روزہ فرض نہیں جیسے نابالغ، غیر مسلم، مجنون وغیرہ تو ان کی طرف سے روزہ کا فدیہ بھی نہیں، لیکن جو مسلمان، بالغ، عاقل ہو اس پر روزہ فرض ہو گا اور اگر وہ بڑھاپے یا شدید بیماری کی وجہ

سے روزہ نہیں رکھ سکتا اور نہ یہ توقع ہے کہ آئندہ رکھ سکے گا تو اس کے لیے فدیہ ادا کر دینا جائز ہے۔بعض لوگ دوسروں کو روزہ رکھوا دیتے ہیں اس کے بارے میں ارشادنبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص دوسرے سے اپنے لیے روزہ نہیں رکھوا سکتا۔

(بحوالہ مشکوٰۃ باب القضاء)

اسی طرح میت کے قضاء روزوں کے بارے میں فقہاء نے ''حیلہ اسقاط'' کا تذکرہ کیا ہے لیکن لوگوں نے اس کا بھی انتہائی غلط استعمال شروع کر دیا ہے چنانچہ ایک مرتبہ میرے والد محترم حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب نور اللہ مرقدہ کے پاس ایک استفتاء اسی کے بارے میں آیا تو حضرت والد صاحب نے یہ استفتاء فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے حوالہ فرما دیا کہ آپ جواب لکھیں حضرت مفتی شفیع صاحبؒ نے اس کے جواب میں ایک رسالہ لکھ دیا۔'' حکم الاقساط فی حیلہ الاسقاط (یعنی حیلہ اسقاط کی شرعی حیثیت'') اس استفتاء کے جواب پر حضرت والد صاحب نے دستخط بھی فرمائے۔اب یہ رسالہ حضرت مفتی شفیع صاحبؒ کے مجموعہ رسائل جواہر الفقہ جلد اول صفحہ نمبر ۳۷۸ میں موجود ہے (آپ کے مطالعہ کے لیے ''الحسن'' کے اس شمارے میں یہ مضمون بھی موجود ہے)

قرآن وسنت سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کا فدیہ ایک مسکین کو دو وقت کھانا کھلانا ہے۔گویا ایک روزہ کا فدیہ صدقہ فطر کے برابر ہے تقریباً پونے دو کلو گندم یا اس کی قیمت۔اس طرح ایک رمضان کے تیس روزوں کا فدیہ ساڑھے باون کلو گندم ہوا۔اس کی قیمت عام بازار سے معلوم کر کے رقم بھی ادا کی جاسکتی ہے۔

اسی طرح میت کی ہر نماز کا فدیہ بھی صدقہ فطر کے برابر ہے۔وتر سمیت دن رات کی چھ نمازیں ہیں۔(پانچ فرض ایک واجب) لہٰذا ایک دن کی نمازوں کا فدیہ ساڑھے دس کلو گندم ہوا۔ایک مہینہ کی نمازوں کا فدیہ ۳۱۵ کلو اور ایک سال کی نمازوں کا فدیہ تین ہزار سات سو اسی (۳۷۸۰) کلو ہوا۔

مکمل سارا فدیہ یکمشت بھی ادا کیا جا سکتا ہے اور تھوڑا تھوڑا کر کے ادا کرنا بھی جائز

ہے۔فدیہ کی رقم کسی دینی مدرسہ میں جمع کرائی جاسکتی ہے۔

شامی نے بحوالہ بحراز قنیہ نقل کیا ہے کہ ایک روزہ کے فدیہ کو دوافراد میں تقسیم کرنا یا چند روزوں کے فدیہ کو ایک ہی شخص کو ایک ہی تاریخ میں دینا درست نہیں۔حضرت تھانویؒ نے بیان القرآن میں اسی کو نقل کیا ہے لیکن حضرت تھانویؒ نے امداد الفتاوی میں فتویٰ اس پر نقل کیا ہے کہ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں۔شامی نے بھی فتویٰ اسی پر نقل کیا ہے البتہ امداد الفتاوی میں ہے کہ احتیاط اسی میں ہے کہ کئی روزوں کا فدی ایک تاریخ میں ایک ہی شخص کو نہ دے لیکن دینے میں گنجائش بھی ہے (یہ فتویٰ مورخہ ۱۲۵۳ھ امداد الفتاوی جلد دوم صفحہ ۱۲۴ میں منقول ہے)

اگر کسی کو فدیہ ادا کرنے کی بھی وسعت نہ ہو تو صرف اور صرف استغفار کر لے اور دل میں نیت رکھے کہ جب ہو سکے گا ادا کروں گا۔

☆☆☆

رمضان المبارک مواخات کا مہینہ

﴿عن سلمان الفارسی رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من فطر صائما علی مذقة لبن اوتمرة اوشربة من ماء و من اشبع صائما سقاه الله من حوضی شربة لا یظماء حتی یدخل الجنة﴾ (رواہ البیہقی)

''ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو بھی روزہ کا ثواب عطا فرماتا ہے جو دودھ کے ایک گھونٹ یا ایک کھجور یا پانی کے ایک گھونٹ سے کسی روزہ دار کو افطار کرائے اور جو شخص روزہ دار کو پیٹ بھر کر کھانا کھلائے تو اللہ تعالیٰ اس کو میرے حوض سے ایسا سیراب کرے گا کہ پھر اسے کبھی پیاس نہ لگے گی یہاں تک کہ وہ جنت میں داخل ہوگا۔''

مواخاۃ کا لفظ اخوت سے بنا ہے اور لفظ اخوت، اخ سے بنایا گیا ہے اخ کا معنی ہے بھائی اور اخوت کا معنی بھائی بھائی ہونا اور بھائی چارہ پھر جب آپس میں بھائی چارہ کی فضا قائم ہو جائے تو اسے مواخاۃ کہتے ہیں یعنی آپس میں اس طرح ہو جانا جس طرح ایک بھائی دوسرے بھائی کے لیے ہوتا ہے۔ عام طور پر بھائی چارے کا رشتہ خاندانی تعلقات کی بنا پر ہوتا ہے لیکن اخوت اسلامی کا رشتہ بہت زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے کوئی مسلمان چاہے دنیا کے کسی کنارے میں رہتا ہو، کسی بھی رنگ یا نسل سے تعلق رکھتا ہو وہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہر اس مسلمان کا بھائی ہوتا ہے جو دنیا کے کسی خطہ میں بھی ہو، اللہ رب العزت نے اخوت کو ایک نعمت قرار دیتے ہوئے سورۂ آل عمران میں فرمایا:

''تم اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے پھر اس نے تمہارے دلوں کو الفت اور محبت سے جوڑ دیا اور پھر تم اس نعمت کی وجہ سے بھائی بھائی ہو گئے مواخاۃ یعنی آپس میں بھائی چارے کا اعلیٰ ترین معیار اس وقت نظر آتا ہے جب ہجرت مدینہ

کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار میں سے ایک دوسرے کو بھائی بھائی بنایا پھر ہر انصاری نے اپنے مہاجر بھائی کو اپنے مال میں شریک کیا، اپنے گھر کا ایک فرد بنا لیا اور پھر ان بھائیوں کے لیے ہر مرحلہ پر ایثار سے کام لیا۔

شریعت اسلامی نے مسلمانوں کے لیے ہر زمانہ اور ہر دور میں آپس میں اخوت کے رشتہ کو قائم کرنے کی ہدایات دیں۔ لیکن رمضان المبارک کے مقدس مہینہ میں اخوت اور بھائی چارے کی فضا کو خصوصی طور پر قائم کرنے کی ہدایات دیں۔

یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب شعبان کی آخری تاریخ کو رمضان المبارک کے فضائل کے بارے میں تقریر فرمائی تو آپ نے یہ جملہ بھی ارشاد فرمایا:

﴿وهو شهر الصبر والصبر ثوابه الجنة وشهر المواساة﴾

"فرمایا کہ یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے اور یہ باہمی رواداری اور غم خواری کا مہینہ ہے۔"

جب ان ارشادات کا مطالعہ کیا جائے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک کے مقدس ماہ کے بارے میں فرمائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اس ماہ میں اخوت کی خصوصی تربیت دی۔ اخوت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ مسلمان اپنے بھائی کے لیے وہی پسند کرے جو اپنے لیے کرتا ہے جس کے نتیجہ میں ایک مسلمان دوسرے سے ہمدردی کا رویہ اختیار کرتا ہے اور اسے تکلیف یا دکھ دینے سے پرہیز کرتا ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿اذا كان يوم صوم احدكم فلا يرفث ولا يصخب فان سابه احد او قاتله فليقل انى امرأ صائم﴾

"یعنی جس دن کسی کا روزہ ہو تو وہ نہ بری باتیں کرے نہ بے جا چلائے اور اگر کوئی اسے برا بھلا کہے یا اس سے لڑنے لگے تو اس سے کہہ دے کہ میں روزہ دار ہوں۔"

آپس میں بھائی چارے کی تربیت میں یہ بھی شامل ہے کہ کینہ، بغض، حسد اور اس جیسے برے جذبات آپس میں ختم ہو جائیں اور آپس میں ہمدردی اور شفقت پیدا ہو، اس بات کی تربیت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿من فطر فیه صائما کان له مغفرة لذنوبه و عتق رقبته من النار و کان له مثل اجره من غیر ان ینقص من اجره شیئا﴾

''کہ جو شخص اس ماہ میں کسی روزہ دار کا روزہ افطار کرائے تو وہ اس کے لیے گناہوں کے معاف ہونے اور نجات کا ذریعہ ہوگا اور جس کا روزہ کھلوایا جائے اس کے اجر و ثواب میں کمی کئے بغیر روزہ کھلوانے والے کو بھی اتنا ہی اجر و ثواب ملے گا۔''

یہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سننے کے بعد صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں سے ہر شخص تو اتنی وسعت نہیں رکھتا کہ روزہ دار کو افطار کرائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر کوئی شخص روزہ دار کا روزہ صرف ایک کھجور، دودھ یا پانی کے ایک گھونٹ سے بھی کھلوا دے تب بھی اللہ تعالیٰ اسے اتنا ہی ثواب عطا فرمائے گا۔

اخوت اسلامی کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کی مشکلات میں کام آئے اور دنیاوی پریشانیوں اور دکھوں کو دور کرنے کی کوشش کرے خصوصاً رمضان المبارک کے مقدس مہینہ میں پوری کوشش رہے کہ کسی مسلمان کو اس سے تکلیف نہ پہنچے۔ روزہ ایثار اور قربانی کا سبق دیتا ہے اسے اپنے معاشرہ میں ہر فرد کے ساتھ استعمال کرنے کی کوشش کرے اگر تاجر ہے تو ملاوٹ اور ذخیرہ اندوزی کرنے یا ماپ تول کی کمی کر کے مسلمان بھائیوں کی مشکلات میں اضافہ کا سبب نہ بنے۔ چنانچہ ایسی تمام باتوں سے پرہیز کی تعلیم دی گئی کہ جن سے اخوت کے رشتہ میں کمی آنے کا خطرہ ہو۔

رمضان المبارک کے صرف اس ایک ماہ میں جب اہل معاشرہ آپس میں بھائی چارے اور مواخات کی فضا بنا لیں تو اس کے اثرات پورے سال بلکہ پوری زندگی میں اس

طرح نظر آئیں گے کہ ہر مسلمان دوسرے کے لیے وہی پسند کرے گا جو اپنے لیے کرتا ہے، ہر مسلمان دوسرے کی عزت و آبرو کی حفاظت کرے گا، اپنی زبان اور عمل سے دوسروں کو تکلیف پہنچانے سے گریز کرے گا۔ اس لیے کہ جب معاشرہ میں اخوت قائم ہو جاتی ہے تو پھر اس معاشرے میں ایثار و قربانی، شفقت و محبت، ہمدردی اور غمخواری کے جذبات ہر شخص کو نظر آتے ہیں اللہ رب العزت ہمیں اس بابرکت مہینہ میں روزہ کے تمام آداب و احکام پر عمل کرتے ہوئے آپس میں بھائی چارے اور مواخاۃ کی وہ دولت عطاء فرمائے جس کے ثمرات سے دنیا کی زندگی بھی کامیاب ہو جائے اور آخرت میں بھی کامیابی نصیب ہو۔



رمضان المبارک دعاؤں کی قبولیت کا مہینہ ہے

﴿عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلی الله عليه وسلم اذا كان اول ليلة من شهر رمضان صفدت الشياطين و مردة الجن و غلقت ابواب النار فلم يفتح منها بابا وفتحت ابواب الجنة فلم يغلق منها باب وينادی مناد يا باغی الخير اقبل وياباغی الشرا قصر ولله عتقاء من النار وذالك كل ليلة﴾ (رواه الترمذی وابن ماجة واحمد)

''حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب رمضان کی پہلی رات آتی ہے تو شیطان اور سرکش جن قید کر دیئے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں پھر ان میں سے کوئی دروازہ نہیں کھولا جاتا اور جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں پھر ان کو بند نہیں کیا جاتا اور ایک اعلان کرنے والا اللہ کی طرف سے اعلان کرتا ہے کہ اے نیکی کے طالب! نیکی طرف آگے بڑھ اور اے بدکاری کا ارادہ کرنے والے !بدی چھوڑ دے۔ اور اللہ تعالیٰ اس مہینہ میں بہت سے لوگوں کو جہنم کی آگ سے آزاد کرتا ہے۔ اور یہ رمضان کی ہر رات کو ہوتا ہے۔''

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿واذا سالك عبادی عنی فانی قريب اجيب دعوة الداع اذا دعان فليستجيبوالی وليؤمنوابی لعلهم يرشدون﴾

''اور جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق پوچھیں تو آپ فرما دیجیے کہ میں قریب ہی ہوں۔ دعا مانگنے والوں کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے دعا مانگیں۔ پس انہیں میرا حکم ماننا چاہیے اور مجھ پر ایمان لانا چاہیے تاکہ وہ نیک راہ پر آجائیں۔''

یہ سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۸۶ ہے۔ اس سے پہلے تین آیتوں میں روزے اور رمضان کے احکام اور فضائل کا ذکر تھا اس کے بعد اس آیت میں فرمایا کہ میں اپنے بندوں سے قریب ہی ہوں جب بھی وہ دعائیں مانگتے ہیں میں قبول کرتا ہوں۔

روزوں اور رمضان المبارک کے ذکر کے ساتھ دعا مانگنے کا تذکرہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ رمضان کا مہینہ دعاؤں کی قبولیت کا مہینہ ہے۔

دعا عربی زبان کا لفظ ہے اس کا معنی ہے پکارنا، بلانا، عموماً یہ لفظ کسی ضرورت یا مدد کے لیے پکارنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو دعا مانگنے کا حکم دیا اور دعا کو بھی ایک عبادت اور بندگی کا ذریعہ قرار دیا ہے جو کہ اس امت کا خاص اعزاز ہے ورنہ حضرت کعب احبار کی روایت کے مطابق پہلے زمانہ میں یہ خصوصیت انبیاء کی تھی۔ انبیاء لوگوں کے لیے دعا کرتے، اللہ تعالیٰ قبول فرماتا اور امت محمدیہ کی خصوصیت کہ یہ حکم پوری امت کے لیے عام قرار دیا اور فرمایا:

﴿وقال ربکم ادعونی استجب لکم﴾

”اور تمہارے رب نے کہا کہ تم مجھ سے دعا مانگو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔“

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم منقول ہے ”ان الدعاء سلاح المؤمن“ یعنی دعاء مومن کا ہتھیار ہے۔ ظاہر ہے کہ ہتھیار صحیح کام تب ہی دکھاتا ہے جب ہتھیار بھی تیز ہو اور چلانے والا بھی طاقتور ہو۔

اب دعا کیسے طاقتور بنے اس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آداب سکھلائے۔ دعاؤں کے الفاظ سکھلائے جو مسنون دعائیں کہلاتی ہیں اور وہ اوقات بتائے جن میں دعائیں زیادہ قبول ہوتی ہیں ان میں ایک موقعہ رمضان المبارک کا مہینہ ہے ہماری دعائیں کیسے طاقتور بنیں اس کے لیے بنیادی اصول اللہ تعالیٰ نے سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۵۵ میں فرمایا ”ادعوا ربکم تضرعا و خفیۃ“ یعنی تم اپنے رب سے دعا کیا کرو عاجزی

کے ساتھ اور پوشیدہ طریقے سے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ دعا کرنے والا خشوع وخضوع یعنی عاجزی اور اللہ کے دھیان کے ساتھ دعا مانگے اور دوسرا ادب یہ معلوم ہوا کہ آہستہ آواز سے دعا مانگے اگر عام مقتدی دعاؤں سے ناواقف ہوں تو پھر امام کے لیے اونچی آواز سے دعا مانگنے میں کوئی حرج نہیں۔

دعاء کی قبولیت کو مزید موثر بنانے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ دعائیں مانگی جائیں جو قرآن مجید میں مختلف انبیاء کے حوالے سے مذکور ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی وہ دعائیں قبول فرمائی ہیں۔ یا احادیث میں جو دعائیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھائی ہیں وہ مانگی جائیں۔

لیکن قرآن وحدیث کے عربی جملے جن میں دعائیں ہیں اگر ان کا ترجمہ اور مطلب معلوم ہو تو پھر وہی دعائیں مانگنا افضل اور بہتر ہے لیکن عام حالات میں اگر ان دعاؤں کا مطلب معلوم نہ ہو تو پھر مانگنے والے کو تو معلوم نہیں کہ ان دعائیہ جملوں سے ہم اللہ سے کیا مانگ رہے ہیں۔ لہٰذا ان دعاؤں کے پڑھنے کا ثواب تو ضرور ملے گا لیکن اسے دعا مانگنا نہیں کہیں گے بلکہ دعا پڑھنا کہیں گے اس لیے دعا مانگتے وقت پہلے مسنون دعائیں بھی پڑھ لی جائیں پھر جو دعاؤں کا مفہوم نہ جانتا ہو وہ اپنی زبان میں بھی دعائیں مانگ سکتا ہے۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ رمضان المبارک دعاؤں کی قبولیت کا مہینہ ہے تو دل میں ایک خیال آجاتا ہے جس کی وجہ سے انسان دعا مانگنے سے رک جاتا ہے اور وہ یہ خیال آتا ہے کہ ہم نے بہت سی دعائیں مانگی ہیں ہماری دعا قبول ہی نہیں ہوتی لہٰذا پھر وہ انسان دعا مانگنے کی طرف متوجہ نہیں رہتا۔

اس بارے میں ایک بات تو یہ قابل ذکر ہے کہ ارشادات نبویہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حرام مال کھانے اور حرام لباس استعمال کرنے اور حرام کمائی کرنے والے کی دعاء قبول نہیں ہوتی لیکن اس کے علاوہ ہر شخص کی دعا قبول ہوتی ہے وہ بات پھر ذہن میں رہتی ہے کہ ہم نے بہت کچھ مانگا ہمیں تو نہیں ملا اس کا جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا۔ جس کا

خلاصہ یہ ہے کہ مومن کی دعاء ضرور قبول ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ زیادہ جانتا ہے کہ اس بندہ کے لیے کیا چیز بہتر ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿عسی ان تکرھوا شیئا وھو خیرلکم و عسی ان تحبوا شیئا وھو شرلکم واللہ یعلم وانتم لا تعلمون﴾

''کہ بسا اوقات تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہوتی ہے۔اور بسا اوقات تم کسی چیز کو پسند کرتے ہو اور وہ تمہارے لیے بری ہوتی ہے۔''

اس لیے انسان کا کام ہے اللہ سے دعائیں کرتے رہنا، مانگتے رہنا، یا تو اللہ تعالیٰ بندہ کو وہی چیز دیتا ہے یا اس کا نعم البدل عطاء فرما دیتا ہے یا دنیا میں اس دعا کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ اس کی دعاؤں کی بدولت اس کے گناہ معاف فرما دیتا ہے اور جب گناہ ختم ہو جائیں تو پھر ان دعاؤں کو اس بندہ کی نیکیاں شمار کرلیا جاتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن بندہ نیکیوں کے ایک ڈھیر کو دیکھ کر کہے گا یہ نیکیاں تو میری نہیں ہیں۔اسے بتایا جائے گا کہ یہ تمہاری وہ دعائیں ہیں جو دنیا میں قبول نہیں ہوئی تھیں ان کے بدلہ میں نیکیاں ملی ہیں اس وقت بندہ کہے گا کہ کاش دنیا میں میری کوئی دعا قبول نہ ہوتی سب کا بدلہ یہاں آخرت میں ملتا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاؤں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ بہت سے لوگ جلد بازی کی وجہ سے اپنی دعائیں ضائع کر دیتے ہیں۔صحابہ کرامؓ نے عرض کیا جلد بازی سے کیا مراد ہے؟ فرمایا دعا مانگنے کے بعد یہ کہنا کہ میری دعا قبول نہیں ہوتی، دعا کو ضائع کرنا ہے۔

لہٰذا رمضان کے اس بابرکت مہینہ میں خوب دعائیں مانگی جائیں اور اس یقین کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہی ہماری دعائیں قبول کرنے والا ہے، دعا میں اپنے لیے، اپنے والدین کے لیے اور دوسرے مسلمان بھائیوں کے لیے دعا کرنا۔ پوری انسانیت کی ہدایت کے لیے دعا مانگنا، پختہ عزم سے دعا مانگنا، بار بار دعا کرنا، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿شهرا وله رحمة واوسطه مغفرة وآخره عتق من النار﴾

''یعنی رمضان کا یہ مہینہ ایسا ہے کہ اس کا پہلا عشرہ رحمت کا ہے اور درمیانہ عشرہ بخشش کا ہے اور آخری حصہ جہنم کی آگ سے آزادی کا ہے۔''

اس لیے دعا کرتے ہوئے رمضان المبارک میں خصوصاً اپنے گناہوں کی معافی مانگنی چاہیے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب رمضان کا مہینہ آتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ بدل جاتا' نماز میں اضافہ ہو جاتا اور دعا میں بڑی عاجزی فرماتے۔

حضرت عبادۃ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک کے قریب ارشاد فرمایا۔ رمضان کا مہینہ آ گیا ہے جو بڑی برکتوں والا ہے اللہ تعالیٰ اس مہینہ میں بندوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں' اپنی خاص رحمت نازل فرماتے ہیں' خطاؤں کو معاف فرما دیتے ہیں' دعا کو قبول فرماتے ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سحری کے وقت یہ پڑھتے رہا کرو یـــا واسع المغفرة یعنی اے وسیع بخشش والے، اس کے پڑھنے والے کے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ روزے میں دن بھر خوب دعائیں مانگی جائیں پھر جب افطار کا وقت آ جائے تو یہ بھی بڑی قبولیت کا وقت ہوتا ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿للصائم عند فطره دعوة مستجابة﴾

''یعنی روزہ افطار کرنے کے وقت روزہ دار کی دعا قبول ہوتی ہے۔''

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم افطار کے وقت یہ دعا بھی مانگتے:

﴿یاواسع الفضل اغفرلی﴾

☆☆☆

اعتکاف کے ذریعہ فیوض و برکات

﴿عن ابن عباس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال فی المعتکف وھو یعتکف الذنوب ویجری لہ من الحسنات کعامل الحسنات کلھا﴾(رواہ ابن ماجہ)

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتکاف کرنے والے کے حق میں یہ فرمایا کہ وہ گناہوں سے بچا رہتا ہے اور نیکیاں اس کے لیے جاری کی جاتی ہیں ایسی نیکیاں جیسی کہ عام طور پر نیکیاں کرنے والے ہر قسم کی نیکیاں کرتے ہیں۔''

اعتکاف کا لفظی مطلب ہے روکنا اور منع کرنا۔ چونکہ انسان اعتکاف میں اپنے آپ کو چند مخصوص باتوں سے روکتا ہے اس لیے اسے اعتکاف کہتے ہیں۔

اعتکاف رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں ہوتا ہے۔ یعنی بیسویں روزے کی شام کو غروب آفتاب سے شروع ہوتا ہے اور عید کا چاند نظر آنے پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ اعتکاف سنت مؤکدہ علی الکفایہ ہے یعنی کسی بستی اور محلّہ میں سے ایک آدمی بھی اعتکاف کر لے تو سب کے ذمہ سے اتر گیا اور اگر بستی یا محلّہ میں سے کسی نے بھی اعتکاف نہ کیا تو وہاں کے تمام مسلمان گنہگار رہوں گے۔

مرد کے اعتکاف کا طریقہ یہ ہے کہ بیسویں روزے کی شام کو مغرب سے پہلے مسجد میں داخل ہو اور پھر عید کا چاند نظر آنے پر مسجد سے باہر نکلے۔ اس دوران کھانا، پینا، سونا جاگنا، پڑھنا لکھنا سب کچھ مسجد کے اندر رہ کر کرے گا۔ البتہ ضروری حاجت کے لیے مسجد سے باہر نکل سکتا ہے۔ اگر بغیر عذر کے ایک لمحہ کے لیے بھی باہر نکلا تو اعتکاف ٹوٹ جائے گا۔ عورت کے اعتکاف کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے گھر کے کسی کمرہ میں یا کسی کمرہ کے ایک مخصوص کونے میں ٹھہر جائے وہیں کھائے پیئے۔ وہیں سوئے۔ صرف ضروری حاجت کے لیے اپنی جگہ سے

باہر جاسکتی ہے۔

یہاں یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ بعض لوگوں میں یہ بات مشہور ہے کہ اعتکاف کی حالت میں بالکل خاموش رہنا چاہیئے' یہ غلط ہے بلکہ اعتکاف کی حالت میں بالکل خاموش ہو جانا اور خاموشی کو عبادت سمجھنا مکروہ ہے لیکن فضول باتیں کرنا بھی مکروہ ہے۔بس دین کی باتیں کرے اچھی اور پاکیزہ گفتگو کی مکمل اجازت ہے۔

اب یہ بات بھی سامنے رکھنی چاہیے کہ اعتکاف کی حالت میں کیا کرنا چاہیے تو اس میں عام حضرات کے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ جو بھی نیک کام ہو وہ کریں' مثلاً نوافل پڑھیں' قرآن حکیم کی تلاوت کریں' درود شریف کثرت سے پڑھیں۔اور اچھی کتابوں کا مطالعہ کریں۔ اور جو حضرات تعلیم یافتہ ہیں ان کے لیے مناسب یہ ہے کہ وہ روزانہ کم ازکم ایک پارہ تلاوت کریں۔اور پھر اس کے بعد اسی پارے کی تفسیر اور ترجمہ کا مطالعہ کریں۔اس طرح صرف تیس دن میں پورے قرآن حکیم کے اجمالی مطالعہ کی سعادت حاصل ہو جائے گی۔

جب ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اعتکاف کے بڑے فضائل معلوم ہوتے ہیں جس سے ذہن میں اعتکاف کی اہمیت پیدا ہوتی ہے۔

چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے یہاں تک کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے وفات دی آپ کی وفات کے بعد ازواج مطہرات امہات المؤمنین اعتکاف فرماتی رہیں۔

ایک اور موقع پر ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہوا فرمایا جو شخص ایک دن بھی اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے اعتکاف کرتا ہے۔تو اللہ اس شخص کے اور دوزخ کے درمیان تین ایسی خندقوں کے برابر دیوار قائم فرما دیتے ہیں جن خندقوں کا فاصلہ زمین و آسمان کے فاصلہ سے بھی زیادہ ہے۔بیہقی کی ایک روایت میں بڑی اہم حدیث آتی ہے فرمایا رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم نے جو شخص رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کرے تو اسے دو حج اور دو عمروں کے برابر ثواب ملے گا۔

جیسا کہ ابھی معلوم ہوا کہ اعتکاف کی حالت میں انسان مسجد سے باہر نہیں نکل سکتا سوائے حاجت ضروریہ کے لہٰذا بہت سے ایسے کام ہیں جنہیں انسان مسجد سے باہر کرتا ہے تو اسے ثواب ملتا ہے لیکن اعتکاف کی حالت میں وہ کام نہیں کرسکتا مثلاً نہ کسی کی عیادت کے لیے جا سکتا ہے، نہ کسی جنازے کے ساتھ جا سکتا ہے نہ کسی کی خیر خواہی وغیرہ کے لیے جا سکتا ہے۔تو اس کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿المعتكف هو يعتكف الذنوب ويجرى له من الحسنات كلها﴾

فرمایا ''اعتکاف کرنے والا گناہوں سے تو محفوظ رہتا ہی ہے اور اس کے لیے نیکیاں اتنی ہی لکھی جاتی ہیں جتنی کرنے والے کے لیے۔''

اللہ رب العزت ہمیں رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں اعتکاف کر کے نیکیاں سمیٹنے اور گناہ مٹانے کی توفیق نصیب فرمائے۔



نماز، روزہ، زکوٰۃ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ مفلس اور کنگال ہونے سے بچیئے

﴿عن ابی هريرة رضی الله عنه ان رسول الله صلی الله عليه وسلم قال اتدرون ماالمفلس قالو االمفلس فينا من لادرهم له ولا متاع. فقال ان المفلس من امتی من يأتی يوم القيامة بصلوة وصيام وزكوٰة ويأتی وقد شتم هذا وقذف هذا واكل مال هذا وسفك دم هذا وضرب هذا فيعطی هذا من حسناته وهذا من حسناته فان فنيت حسناته قبل ان يقضٰی ماعليه اخذ من خطاياهم فطرحت عليه ثم طرح فی النار﴾ (رواه مسلم)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا ہم میں مفلس وہ شخص سمجھا جاتا ہے جس کے پاس نہ تو درہم ہو اور نہ سامان۔ آپ نے فرمایا میری امت میں سے قیامت کے دن مفلس وہ شخص ہوگا جو دنیا سے نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ لے کر آئے گا اور ساتھ ہی کسی کو گالی دینے، کسی پر تہمت لگانے، کسی کا مال کھانے اور کسی کو مارنے کا گناہ بھی لائے گا۔ پھر ہر ایک مظلوم کو اس کی نیکیوں میں سے دیا جائے گا اور جب اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی اور لوگوں کے حقوق پھر بھی باقی رہ جائیں گے تو ان حقداروں کے گناہ اس پر ڈال دیئے جائیں گے پھر اس کو جہنم کی آگ میں ڈال دیا جائے گا۔''

اس لیے ہم سب کو صرف نماز، روزہ اور دیگر عبادات ادا کر کے محتاط رہنا ہوگا کہ حقوق العباد کی ادائیگی کرتے رہیں اور کسی پر کسی بھی انداز کا ظلم نہ کریں اگرچہ اس بات کی

گنجائش موجود ہے کہ اگر کوئی ظلم کرے تو اس کے بقدر بدلہ لے لیا جائے۔جیسا کہ سورۂ شوریٰ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ولمن انتصر بعد ظلمه فاولئك ماعليهم من سبيل، انما السبيل على الذين يظلمون الناس ويبغون فى الارض بغير الحق اولئك لهم عذاب اليم﴾

”جو لوگ اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد برابر کا بدلہ لیں تو ایسے لوگوں پر کوئی الزام نہیں الزام صرف ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ناحق دنیا میں سرکشی کرتے ہیں ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔“

سورۂ شوریٰ میں اللہ تعالیٰ نے ایک کامل انسان کی صفات بیان کرتے ہوئے ظلم سے بچنے کو بھی ایک خوبی قرار دیا۔ کیونکہ ظلم، انسانی شخصیت کو تعمیر کے بجائے تخریب کی طرف لے جاتا ہے۔

ظلم، عدل کی ضد ہے، عدل کا معنی ہے کسی چیز کو اس کے اپنے مقام پر رکھنا، چنانچہ ظلم کا معنی ہوا ”وضع الشی فی غیر محله“ یعنی چیز کو اپنی جگہ نہ رکھنا جب عدل کا تعلق زندگی کے ہر شعبہ سے ہے تو پھر ظلم سے بچنے کا تعلق بھی زندگی کے ہر ہر مرحلہ سے ہے چنانچہ معاشرتی زندگی میں ظلم کا نہ ہونا اس کے کامیاب ہونے کی دلیل ہے اور اگر یہ ظلم معاشرتی زندگی میں آ جائے تو پھر انسانی زندگی واقعی جہنم بن جاتی ہے۔گھریلو زندگی بھی ظلم سے بچنے کی محتاج ہے۔قرآن حکیم میں ایک سے زائد بیویاں رکھنے کی اجازت دی گئی ہے لیکن پھر فوراً یہ الفاظ فرمائے گئے ”فان خفتم الا تعدلوا فواحدة“ یعنی اگر تمہیں خوف ہو کہ تم انصاف نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی کافی ہے یہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد کے درمیان بھی ایک جیسا سلوک رکھنے کی تاکید فرمائی، تاکہ فطری محبت کی زیادتی اور کمی کی وجہ سے اولاد سے ایسا تعلق رہے کہ ظلم کی حدود تک بات نہ پہنچ جائے۔ ماں باپ سر سے اٹھ جائیں تو یہ اولاد یتیم

کہلاتی ہے قرآن حکیم نے پھر تاکید کی "**ولا تاکلوا اموال الیتمی ظلما**" "یعنی یتیموں کے مالوں کو ظلماً نہ کھاؤ۔" اس مرحلہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے ظلم سے بچنے کی تاکید فرمائی۔ انسان اپنی ضروریات کو حاصل کرنے کے لیے بازار کا رخ کرتا ہے وہاں بھی اللہ تعالیٰ کا حکم موجود "**اوفوا الکیل والمیزان بالقسط**" یعنی "ناپ تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرو۔" اب کم ناپنے والا، کم تولنے والا خریدار پر ظلم کرنے والا شمار ہوگا۔ اگر سودا ادھار لیا یا قرض لیا پھر حکم الٰہی موجود ہے "ادھار اور قرض کے معاملات کو انصاف سے لکھ لیا کرو" پھر فرمایا "**ذالکم اقسط عنداللہ**" "یہ اللہ کے نزدیک انصاف ہے۔"

اگر کوئی بطور ظلم حق ادا نہ کرے یا ظلم کر کے حق چھین لے تو پھر عدالتیں موجود ہیں جہاں انصاف کے تقاضے پورے کر کے حق، حقدار کو مل جاتا ہے، لیکن وہاں بھی ہر مرحلے میں ظلم سے بچنے کی تاکید فرمائی حتیٰ کہ دستاویزات لکھنے میں بھی ظلم کا دخل نہ ہو فرمایا "**ولیکتب بینکم کاتب بالعدل**" "یعنی دستاویز لکھنے والا بھی انصاف کے ساتھ لکھے" پھر جب گواہی کا موقع آیا تو فرمایا "**واذا قلتم فاعدلوا ولو کان ذا قربی**" "اور جب تم کہو تو انصاف کی بات کرو اگر چہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔" جب فیصلہ کا وقت آیا تو پھر ہدایات دیں تاکہ یہ انسان ظلم سے بچا رہے فرمایا "**واذاحکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل**" "جب تم لوگوں میں فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔"

گویا کہ زندگی کے ہر مرحلے میں اللہ رب العزت نے ظلم سے بچنے کا حکم فرمایا اگر زندگی کے ہر شعبہ میں انسان محتاط نہ ہو تو پھر آخرت کے اعتبار سے بھی اس کی شخصیت مسخ ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے کہ مفلس کون ہوتا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ وہ شخص جس کے پاس درہم نہ ہو اور سامان نہ ہو۔ آپ نے فرمایا نہیں! میری امت میں مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نماز، روزہ اور زکوٰۃ جیسے اعمال لے کر آئے گا لیکن اس حال میں کہ کسی کو برا بھلا کہا ہوگا، کسی پر تہمت لگائی ہوگی، کسی کا مال کھایا ہوگا کسی کا خون بہایا ہوگا یا کسی کو مارا پیٹا ہوگا۔ اب اس کی یہ نیکیاں اُن مظلوم لوگوں میں تقسیم کر دی جائیں گی جب یہ شخص مفلس اور کنگال رہ جائے گا تو پھر ان حق دار

لوگوں کے گناہ اس پر ڈال دیئے جائیں گے اور پھر اس کو جہنم میں دھکیل دیا جائے گا۔

معاشرہ میں اپنے ماحول پر نظر ڈالنے سے اس بات کی بخوبی تصدیق ہو جاتی ہے کہ کسی بھی انداز میں ظلم کرنے والے افراد معاشرہ میں اپنی شخصیت کو تعمیری انداز میں پیش نہیں کر سکتے۔

بسا اوقات معاشرہ کے افراد سے یہ بات بھی سننے کو ملتی ہے کہ جناب جو ہمارے ساتھ اچھا سلوک کرے گا ہم بھی اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے ورنہ ہم بھی ایسا نہ کریں گے یہ انسانی شخصیت کے لیے بالکل منفی پہلو ہے اور بہت ہی چھوٹا سا ذہن رکھنے کی علامت ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿لاتکونوا امعة﴾

''تم لوگ امعہ نہ بن جاؤ۔''

عربی زبان میں امعہ ایسے شخص کو کہتے ہیں جو یہ کہے کہ اگر لوگ ہمارے ساتھ بھلائی کریں گے تو ہم بھی بھلائی کریں گے اور اگر ظلم کریں گے تو ہم بھی ظلم کریں گے ایسے انداز میں سوچنے والے وہ افراد ہوتے ہیں جن کی اپنی کوئی شخصیت نہیں ہوتی صرف دوسروں کے اعمال پر اپنا ردعمل پیش کر سکتے ہیں۔

تعمیر شخصیت کا صرف یہ تقاضا نہیں کہ ظلم سے بچا جائے بلکہ اپنے کسی بھی عمل سے ظلم سے وابستگی ثابت نہ ہونے دی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر یہ ہدایت دی فرمایا۔

﴿من مشیٰ مع ظالم لیقویه وهو یعلم انه ظالم فقد خرج من الاسلام﴾

''یعنی جو شخص ظالم کے ساتھ یہ سوچ کر چلے کہ اسے تقویت حاصل ہو تو وہ شخص اسلامی تعلیمات کی حدود سے نکل جاتا ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا:

﴿انصر اخاك ظالماً او مظلوماً﴾

''یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو۔''

صحابہ نے عرض کیا مظلوم کی مدد تو سمجھ میں آتی ہے ظالم کی مدد کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے فرمایا ظالم کو ظلم سے روک دو یہی اس کی مدد ہے۔

اسلام نے اپنی تعلیمات کے ذریعہ انسانی شخصیت کی تعمیر کے لیے مکمل ہدایات دیں ان میں بنیادی چیز عدل وانصاف کو اپنانا اور ظلم سے بچنا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کائنات کا سارا حسن اللہ تعالیٰ نے بڑا متوازن رکھا لیکن انسان کے ذریعہ جہاں ظلم کا سایہ بھی پڑا وہاں کائنات کی خوبصورتی بگڑ گئی۔ چاہے وہ گھریلو زندگی ہو، کاروبار ہو، دفتر ہو یا دوکان ہو، پھر خود انسان کی شخصیت اتنی بگڑ جاتی ہے کہ نہ دوسرے اس سے محبت کرتے ہیں نہ اعتماد، نہ ملاقات کے قابل سمجھتے ہیں نہ دوستی کے۔ یہ انسان دنیا میں پھر تنہا رہ جاتا ہے اللہ رب العزت ہمیں زندگی کے ہر مرحلہ میں ظلم سے بچنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین۔



صدقہ فطر کی حقیقت، اہمیت اور مسائل

فطر کے معنی روزہ افطار کرنے یا روزہ نہ رکھنے کے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رمضان شریف کے روزے ختم ہونے کی خوشی میں شکریہ کے طور پر یہ صدقہ مقرر فرمایا ہے اسی کو صدقہ فطر کہتے ہیں۔ رمضان کے روزے ختم ہونے کی خوشی میں جو عید منائی جاتی ہے اس کو اسی لیے عید الفطر کہا جاتا ہے۔

صدقہ فطر ہر مسلمان صاحب نصاب پر واجب ہے، جو نصاب زکوٰۃ کا ہے وہی اس کا بھی ہے، فرق دونوں میں یہ ہے کہ زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے تو چاندی یا سونا یا مال تجارت ہونا اور اس پر ایک سال گذرنا شرط ہے، اور صدقہ فطر واجب ہونے کے لیے ان باتوں کی ضرورت نہیں، بلکہ اس کے واجب ہونے کے لیے اتنا کافی ہے کہ ضروری سامان کے علاوہ کسی کے پاس اتنا مال واسباب ہو جس پر زکوٰۃ واجب ہوگی ہے، تو اس پر صدقہ فطر واجب ہے، اس پر سال گزرنا شرط نہیں ہے۔

مثلاً کسی کے پاس استعمالی کپڑوں سے زیادہ کپڑے رکھے ہوئے ہیں، یا کسی کا کوئی ذاتی مکان خالی پڑا ہے، یا اسی قسم کا کوئی اور سامان اور اسباب ہے جو اس کی حاجت اور ضرورت سے زائد ہے اور ان چیزوں کی قیمت نصاب کے برابر یا زیادہ ہے تو ایسے شخص پر صدقہ فطر واجب ہے۔

حدیث میں صدقہ فطر کی بہت تاکید آئی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو مقرر کر کے مکہ معظّمہ کے گلی کوچوں میں یہ اعلان کرایا کہ صدقہ فطر ہر مسلمان پر واجب ہے، مرد ہو یا عورت، چھوٹا ہو یا بڑا، آزاد ہو کہ غلام۔ (ابوداؤد)

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: جس شخص نے عید کی نماز سے پہلے صدقہ فطر ادا کر دیا تو یہ زکوٰۃ مقبولہ ہے، اور جس شخص نے عید کی نماز کے بعد ادا کیا تو وہ

صدقوں میں ایک صدقہ ہے۔'' (دار قطنی ، بیہقی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ماہ رمضان کا روزہ آسمان اور زمین کے درمیان معلق رہتا ہے، اور بغیر صدقہ فطر کے اوپر نہیں اٹھایا جاتا۔ (انوار الصوم)

صدقہ فطر غرباء کے کھانے کی غرض سے مقرر کیا گیا ہے، اور اس لیے (بھی) مقرر کیا گیا ہے کہ روزوں میں جو کوتاہی ہوگئی ہو وہ دور ہوجائے، روزوں میں کبھی لغو اور بیہودہ بات ہوجاتی ہے وہ صدقہ فطر سے معاف ہوجائے۔ (ابوداؤد)

عبداللہ بن ثعلبہؓ یا ثعلبہ بن عبداللہ بن صغیرؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ایک صاع گیہوں ہر شخص کے ذمہ ہے، بچہ ہو یا بڑا آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت، غنی ہو یا فقیر۔

غنی کو تو اللہ تعالیٰ (صدقہ فطر کی وجہ سے) پاک کردیتے ہیں (اس کی جان اور مال دونوں کو) اور فقیر کو اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ واپس کردیتے ہیں، جو اس نے (صدقہ میں) دیا ہے۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ)

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صدقہ فطر فقیروں پر بھی ہے، اسی وجہ سے بعض علماء کے نزدیک فقراء اور مساکین پر بھی صدقہ فطر ادا کرنا واجب ہے، اور دلیل ان کی یہ ہے کہ صدقہ فطر کے واجب ہونے کی علت اور مصلحت یہ ہے کہ اس سے روزہ داران بیہودہ اور لغو باتوں سے پاک ہوجاتا ہے جو روزہ میں اس سے سرزد ہوجاتی ہیں، کیونکہ روزہ میں ایک نہ ایک بات روزے کے آداب کے خلاف ہو ہی جاتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صدقہ فطر جب فقیر پر بھی واجب ہوگیا تو پھر کس کو دیا جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر کی علت اور مصلحت بتا کر اس کی اہمیت لوگوں کے ذہن میں بٹھائی ہے، تاکہ لوگ اس کے ادا کرنے میں غفلت اور سستی نہ کریں۔

اب رہا یہ سوال کہ جب خود فقراء پر صدقہ فطر ادا کرنا واجب ہوا تو کس کو دیا جائے، تو اس کی صورت یہ ہے کہ مالدار لوگ غرباء کو دیں، اور غرباء اپنے سے زیادہ غریب اور محتاج کو

دیں۔

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ فقراء کے ذمہ صدقہ فطر واجب نہیں، اگر ان پر بھی ضروری قرار دیا جائے تو پھر مستحق کون رہے گا، ویسے فقراء بھی ادا کردیں تو ثواب ان کو بھی ملے گا۔(درمختار)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰىۙ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى﴾

''یعنی جس نے پاکی حاصل کی اور خدا کا نام لیا پھر نماز پڑھی وہ کامیاب ہوگیا۔''

کی تفسیر پوچھی گئی تو آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ یہ آیت صدقہ فطر کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ بعض سلف کہتے ہیں''تَزَكّٰى'' زکوٰۃ سے ہے مراد یہاں صدقۃ الفطر ہے، اور ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ سے تکبیرات عید مراد ہیں اور فَصَلّٰى میں نماز عید کا ذکر ہے۔یعنی عید کے روز کا پروگرام یوں ہے، صدقۃ الفطر، پھر تکبیریں، پھر نماز۔(فوائد عثمانیؒ)

حاصل یہ ہوا کہ تَزَكّٰى سے مراد صدقہ فطر ادا کرنا ہے، کیونکہ اس سے تزکیہ اور صفائی حاصل ہوتی ہے، اور اللہ کا نام لینے سے مراد تکبیر تحریمہ اور تکبیرات زائدہ ہیں جو عید کی نماز میں کہی جاتی ہیں، اور نماز سے عید کی نماز مراد ہے۔

صدقہ فطر کی مقدار: عموماً صدقہ فطر کی مقدار مختلف لکھی جاتی ہے، مگر صحیح بات یہ ہے کہ پونے دو کلو گیہوں یا اس کی قیمت ادا کرنے سے صدقہ فطر ادا ہو جائے گا۔

(فتاویٰ دارالعلوم ج٦)

عموماً لوگ پوچھتے ہیں کہ فلاں اخبار میں صدقہ فطر کی مقدار یہ بیان کی گئی ہے اور فلاں اخبار میں اس سے زیادہ یا کم بتائی گئی ہے، تو اس کے بارے میں پریشان ہونے کی کوئی

بات نہیں۔بس آپ پونے دوکلوگندم کی قیمت کسی دوکان سے خود معلوم کرلیں،اوراسی پر اعتماد کر کے صدقہ فطر ادا کریں۔

اگرکوئی شخص اس سے زائد دے تو اس زائد کا ثواب علیحدہ ملے گا،اوراس اختلاف سے بچنے کی بہتر صورت یہ ہے کہ متعین مقدار سے زیادہ دیدے،تاکہ شک اورتردد کی بات ہی نہ رہے کیونکہ چند پیسوں کا فرق پڑتا ہے۔

صدقہ فطر کے مسائل:

مسئلہ: کسی شخص کے پاس ضروری اسباب (یعنی اپنی حاجت) سے زیادہ مال واسباب ہے اور وہ قرضدار بھی ہے تو یہ اندازہ کرکے دیکھا جائے کہ قرضہ ادا کرنے کے بعد کتنا مال بچتا ہے، اگر اتنی قیمت کا مال بچ جائے جتنے پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، تو اس پر صدقہ فطر واجب ہے، اور اتنی مقدار سے کم ہوتو واجب نہیں۔

(درمختار،ج۱)

مسئلہ: اگرکوئی شخص عید کے دن صبح صادق سے پہلے مرگیا تو اس پر صدقہ فطر واجب نہیں ، اس کے چھوڑے ہوئے مال میں سے نہ دیا جائے۔ (عالمگیری)

مسئلہ: مستحب اور زیادہ ثواب کی بات یہ ہے کہ عید کی نماز پڑھنے جانے سے پہلے صدقہ فطر ادا کردیا جائے۔ (عالمگیری)

مسئلہ: اگر صدقہ فطر کوئی شخص رمضان میں دیدے تو دوبارہ دینے کی ضرورت نہیں۔

(درمختار،ج۲)

مسئلہ: اگرکوئی شخص عید کے دن صدقہ فطر نہ دے سکا تو بعد میں دیدے۔ (ہدایہ ج۱)

مسئلہ: کسی نے اگر کسی وجہ سے رمضان کے روزے نہیں رکھے تو اس پر بھی صدقہ فطر واجب ہے، روزہ رکھنے والے اور نہ رکھنے والے میں کوئی فرق نہیں۔(عالمگیری،ج۱)

مسئلہ: ایک آدمی کا صدقہ فطر ایک محتاج کو یا تھوڑا تھوڑا کئی کو دے سکتا ہے۔

(درمختار،ج۲)

مسئلہ: کئی آدمی مل کر ایک محتاج کو بھی صدقہ فطر دے سکتے ہیں، لیکن وہ صدقہ فطر اتنا زیادہ نہ ہو کہ مقدار زکوٰۃ کو پہنچ جائے۔(درمختار، ج۲)

مسئلہ: صدقہ فطر میں اگر غلہ یا کپڑے کی بجائے قیمت دیدے تو زیادہ اچھا ہے۔ (عالمگیری، ج۱)

مسئلہ: جن لوگوں کو زکوٰۃ دینی جائز ہے وہی لوگ صدقہ فطر کے بھی مستحق ہیں۔(درمختار، ج۲)

مسئلہ: مرد پر صدقہ فطر اپنی اور اپنی چھوٹی اولاد کی طرف سے بھی واجب ہے' ایسے ہی جو بچہ عید کے دن صبح صادق سے پہلے پیدا ہو، اس کا بھی صدقہ فطر دیا جائے۔(درمختار)

صدقہ فطر کن لوگوں کو دینا جائز ہے:

مسئلہ: جن لوگوں کو زکوٰۃ دینی جائز ہے ان کو صدقہ فطر دینا بھی جائز ہے، مثلاً بھائی، بہن، بھتیجی، بھانجی، چچا، پھوپھی، خالہ، ماموں، سوتیلا باپ، سوتیلی ماں، دادا، ساس، سسر، سالہ، سالی وغیرہ، ان سب کو زکوٰۃ اور صدقہ فطر دینا جائز ہے۔(شامی) نیز صدقہ فطر بطور عیدی بھی دیا جاسکتا ہے۔

کن لوگوں کو صدقہ فطر دینا جائز نہیں:

ماں، باپ، دادا، دادی، نانا، نانی، پردادا، پردادی، بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی، نواسا، نواسی، خاوند، بیوی وغیرہ ان سب کو زکوٰۃ وصدقہ فطر دینا ناجائز ہے۔

☆☆☆

سنت نبوی ﷺ کے مطابق عید الفطر کس طرح منائی جائے؟

﴿عن انس رضی اللّٰہ عنہ قال قدم النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم المدینۃ ولھم یومان یلعبون فیھما فقال ماھذان الیومان، قالوا کنا نلعب فیھما فی الجاھلیۃ فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قد ابدلکم اللّٰہ بھما خیراً منھما یوم الاضحی ویوم الفطر﴾(رواہ ابوداؤد)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو اس زمانہ میں اہل مدینہ نے دو دن مقرر کر رکھے تھے جن میں وہ خوشیاں مناتے اور کھیل تماشے کرتے تھے آپ نے لوگوں سے پوچھا، یہ دو دن کیسے ہیں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا ان ایام میں ہم لوگ عہد جاہلیت کے اندر خوشیاں مناتے اور کھیلتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے تمہارے ان دنوں کو دو بہترین دنوں میں تبدیل فرما دیا ہے یعنی عیدالاضحیٰ اور عید الفطر۔''

پہلے انبیاء کی امتیں بھی کسی نہ کسی شکل میں عید منایا کرتی تھیں، آدم علیہ السلام کی امت اس دن عید مناتی تھی جس دن حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی' حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امت اس دن عید مناتی تھی جس دن حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمرود کی آگ سے نجات ملی' حضرت یونس علیہ السلام کی قوم اس دن عید مناتی تھی جس دن حضرت یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ سے نجات پائی' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم اس روز عید مناتی تھی جس دن آسمان سے ''مائدہ'' نازل ہوا تھا' اہل عرب سال میں مختلف تہوار مناتے تھے جن میں شراب نوشی، جواء، شعروشاعری' رقص وسرور کی محفلیں سجائی جاتی تھیں۔

یہ اسلام کا فیضان ہے کہ اس نے مسلمانوں کے خوشیاں منانے کو ایک پاکیزہ سانچے میں ڈھال دیا۔

عیدالفطر کا دن ہر مسلمان کے لیے خوشی اور مسرت کا دن ہوتا ہے لیکن بازار کی چہل پہل، گہما گہمی، بچوں کا کھیل کود، کھانے پینے کی محفلوں عید کا سارا دن وی سی آر اور ٹی وی دیکھ کر اونچی آواز میں گانے سن کر اور دیگر غیر شرعی تفریحات میں مشغول ہو کر عید کی حقیقی خوشی ہرگز حاصل نہیں کی جاسکتی۔

اللہ تعالیٰ نے عید کی حقیقی خوشی عطا فرمانے سے پہلے رمضان کے روزے فرض کیے ایک ماہ تک دن بھر کھانے پینے سے روکا نفس کی مخصوص خواہشات پورا کرنے سے منع کر دیا اور مقصد یہ بتایا **لعلکم تتقون** (تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ) جب اللہ تعالیٰ کے حکم کو اس کے حقوق و آداب کے ساتھ پورا کر دیا تو روزہ دار کے دل میں نورِ تقویٰ پیدا ہو گیا اسی عظیم نعمت کا شکر ادا کرنے کے لیے مسلمان عظیم اجتماع کے ساتھ دو رکعت نماز عید پڑھ کر شکر خداوندی ادا کرتا ہے غرباء کو صدقہ فطر ادا کر کے اپنے روزہ کی کوتاہیوں کو مٹانے کے ساتھ ساتھ ان محتاج افراد کو بھی عید کی خوشیوں میں شریک کرتا ہے۔

اس حقیقی خوشی کا لطف وہی خوش نصیب روزہ دار جانتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے رمضان کے مکمل روزے رکھنے کی توفیق عطا فرمائی۔ اس عید کا نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''عیدالفطر'' رکھا یعنی روزہ کھولنے کی عید اب جس شخص نے روزہ رکھا ہی نہیں اسے روزہ کھولنے کی خوشی کیا ہو گی اور دوسرے طرف اگر روزہ رکھنے والوں نے عید کو اپنے نفس کی ناجائز خواہشات کو پورا کر کے منایا تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ رمضان المبارک کے روزے رکھ کر نفس کی تربیت میں کمی رہ گئی یا عید کی خوشی منانے والے کا دل اس نورِ تقویٰ سے بالکل خالی ہے اور وہ شخص عید کی خوشیاں محض رسمی طور پر منانے میں مشغول ہے۔

لہٰذا جب ہمیں اسلام نے عیدالفطر کی خوشیاں عطا فرمائیں تو ان خوشیوں کو اسی طرح منانا چاہیے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشی کے یہ لمحات گزارے۔ احادیث کی روشنی

میں عید الفطر کے ان اعمال کو ترتیب وار ذکر کیا جاتا ہے تاکہ ہر مسلمان ان کو سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سمجھ کر ادا کرے، اس لیے کہ ان میں سے اکثر کام عام مسلمان کرتا ہے لیکن ذہن میں قطعاً یہ نہیں ہوتا کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔

(۱) عید کے دن صبح جلدی بیدار ہونا۔

(۲) مسواک کرنا۔

(۳) غسل کرنا۔ حضرت خالد بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ عیدالفطر، یوم النحر اور یوم عرفہ کو غسل فرمایا کرتے تھے۔

(۴) عمدہ کپڑے پہننا جو پاس موجود ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید کے دن خوبصورت اور عمدہ لباس زیب تن فرماتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی سبز و سرخ دھاری دار چادر اوڑھتے یہ چادر یمن کی ہوتی جسے بُرد یمانی کہا جاتا ہے۔

(مدارج النبوۃ)

(۵) عید کے دن زیب و زینت اور شریعت کے موافق آرائش کرنا مستحب ہے۔

(مدارج النبوۃ)

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ فرماتے ہیں ''لوگ کپڑوں کا بہت اہتمام کرتے ہیں حتی کہ بعض قرض لے کر نئے کپڑے بنواتے ہیں، بعض مستعار (ادھار مانگ کر) پہنتے ہیں۔ اس کی بھی کوئی اصل نہیں ہے بلکہ سنت یہ ہے کہ ہر شخص کے پاس موجود کپڑے ان میں سے جو اچھے ہیں وہ پہنے۔

(زوال السنۃ عن اعمال السنۃ: ص۳۲)

(۶) خوشبو لگانا۔ (بحوالہ مذکورہ بالا)

(۷) عید گاہ جانے سے پہلے کوئی میٹھی چیز کھانا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کریمہ تھی کہ عیدالفطر کے دن عید گاہ جانے سے پہلے چند کھجوریں تناول فرماتے تھے ان کی تعداد طاق ہوتی تھی یعنی تین، پانچ، سات۔ (صحیح بخاری) لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم

عیدالاضحیٰ کے دن نماز سے واپس آنے سے پہلے کچھ نہ کھاتے، عید کی نماز پڑھ کر قربانی کر لیتے پھر قربانی کے گوشت میں سے کچھ تناول فرماتے۔ (بحوالہ جامع ترمذی، ابن ماجہ، مدارج النبوۃ)

حضرت تھانویؒ کہتے ہیں کہ بعض لوگ سویاں پکانا ضروری خیال کرتے ہیں یہ بھی غلط ہے بلکہ جو چاہے پکائے اور چاہے نہ پکائے شرع میں اس (سویاں پکانے کی) تخصیص کی کوئی اصل نہیں ہے۔ (بحوالہ زوال السنۃ عن اعمال السنۃ: ص ۳۲)

(۸) عیدگاہ جانے سے قبل صدقہ فطر دے دینا۔ صدقہ فطر ہر مسلمان عاقل، مرد و عورت پر واجب ہے جب کہ وہ زکوٰۃ کے نصاب کا مالک ہو چاہے اس مال پر سال نہ گزرا ہو۔ اپنی طرف سے اپنے نابالغ بچوں کی طرف جو زیر کفالت ہوں نصف صاع (یعنی پونے دو کلو) گندم یا اس کی قیمت ادا کرنا۔ (بہشتی گوہر)

(۹) عیدگاہ جلدی جانا۔ (بحوالہ زوال السنۃ عن اعمال السنۃ)

(۱۰) عیدگاہ میں نماز عید ادا کرنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ نماز عید گاہ (میدان) میں ادا فرماتے تھے۔ (صحیح مسلم و صحیح بخاری)

حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز عید کے لیے میدان میں نکلنا مسجد میں نماز ادا کرنے سے افضل ہے اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باوجود اس فضل و شرف کے جو آپ کی مسجد شریف کو حاصل ہے نماز کے لیے عیدگاہ (میدان) میں باہر تشریف لے جاتے تھے لیکن اگر کوئی عذر لاحق ہو تو جائز ہے۔

(اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم: ص ۴۰۶)

جیسا کہ ایک مرتبہ عید کے روز بارش ہو رہی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کی نماز مسجد میں پڑھائی۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ)

(۱۱) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جس راستہ سے عیدگاہ تشریف لے جاتے اس سے واپس

تشریف نہ لاتے بلکہ دوسرے راستہ سے تشریف لاتے۔(بخاری، ترمذی)

(۱۲) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عیدگاہ تک پیدل تشریف لے جاتے۔(سنن ابن ماجہ ترمذی) اس پر عمل کرنا سنت ہے بعض علماء نے مستحب کہا ہے۔

(اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ص ۴۰۷)

(۱۳) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز عید الفطر میں تاخیر فرماتے اور نماز عید الاضحیٰ کو جلد ادا فرماتے۔ (مشکوٰۃ باب صلوٰۃ)

(۱۴) عید الفطر میں راستہ میں چلتے وقت آہستہ تکبیر کہنا مسنون ہے۔(عید الاضحیٰ میں بآواز بلند کہنا چاہیے) (بہشتی گوہر) تکبیر کے کلمات یہ ہیں: **اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر لا الہ الا اللّٰہ و اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر و اللّٰہ الحمد.**

حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں "یہ بات عام ہے کہ نماز عید کے بعد آپس میں مصافحہ اور معانقہ کرتے ہیں اور اس کو ضروری خیال کرتے ہیں یہ بالکل بدعت ہے ہاں جو لوگ باہر سے آتے ہیں اگر ان سے بوجہ ملاقات اور دنوں کی طرح اس روز بھی معانقہ یا مصافحہ کیا جائے کوئی حرج نہیں ہے۔ عید کے روز ایک دوسرے کو کلمات تہنیت (مبارک باد کے کلمات) دینا یا اس کے ہم مضمون لفظ سے جیسا کہ عید مبارک کہنا وغیرہ جائز اور فی الجملہ مستحب ہے بشرطیکہ بطور رسم کی پابندی کے ساتھ نہ ہو۔

(زوال السنۃ عن اعمال السنۃ: ص ۳۴)

اللہ رب العزت ہم سب کو عید الفطر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق گزارنے کی توفیق نصیب فرمائے۔(آمین)



قربانی کی کھال کے شرعی احکام

﴿عَنْ عَلی رضی اللّٰہ عنہ قال امرنی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اَنْ اَقُوْمَ عَلیٰ بُدْنِہٖ وَاَنْ اَتَصَدَّقَ بَلحمِھَا وَجُلُوْدِھَا وَاَجِلّتِھَا وَاَنْ لَّا اُعْطِیَ الّجَزَّارَ مِنْھَا قَالَ نَحْنُ نُعْطِیْہِ مِنْ عِنْدِنا﴾ (متفق علیہ)

''حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ آپ کے قربانی والے اونٹوں کی خبر گیری کروں اور ان کے گوشت کو خیرات کر دوں اور ان کی کھالیں اور جھولیں بھی صدقہ کر دوں اور قصاب کی مزدوری اس میں سے نہ دوں آپ نے فرمایا کہ مزدوری ہم اپنے پاس سے دیں گے۔''

قربانی کی کھال فروخت نہ کی جائے تو شریعت نے قربانی کرنے والے کو اس میں کئی طرح کا اختیار دیا ہے لیکن فروخت کرنے سے اکثر صورتوں میں قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہو جاتا ہے بعض صورتوں میں واجب نہیں ہوتا ان سب مسائل کی ضروری تفصیل مولانا محمد رفیع عثمانی مدظلہ نے اپنے ایک رسالہ میں بیان فرمائی ہے وہی تفصیل درج کی جاتی ہے۔

کھال کے احکام:

(۱) قربانی کی کھال اپنے اہل وعیال کے استعمال میں لانا جائز ہے مثلاً جائے نماز' کتابوں کی جلد' مشکیزہ' ڈول' دستر خوان جراب' جوتہ وغیرہ کوئی بھی چیز بنا کر استعمال کی جا سکتی ہے، بلا کراہت جائز ہے۔ (ہدایہ ودرمختار)

لیکن ان چیزوں کو کرایہ پر دینا جائز نہیں، اگر دے دیں تو جو کرایہ ملے، اس کا صدقہ کرنا واجب ہے۔ (شامی وعالمگیری)

(۲) یہ بھی جائز ہے کہ کھال یا اس سے بنائی ہوئی چیز کسی کو ہبہ میں (بلا معاوضہ) دے دی جائے، جس کو دی جائے خواہ وہ سید اور مالدار ہو، یا اپنے ماں باپ اور اہل وعیال ہوں، اجنبی ہو یا رشتہ دار، کافر ہو یا مسلمان، بلا معاوضہ ہر ایک کو دینا چاہیے۔

(ہدایہ، عالمگیری، امداد الفتاویٰ)

(۳) فقراء مساکین کو خیرات میں بھی دی جا سکتی ہے مگر یہ مستحب ہے، واجب نہیں۔

(بحر، عالمگیری)

(۴) قربانی کی کھال، گوشت، چربی، اُون، آنتیں وغیرہ یعنی قربانی کے جانور کا کوئی جز کسی خدمت کے معاوضہ میں دینا جائز نہیں، اگر دے دیا تو اس کی قیمت کا صدقہ واجب ہے۔ (ہدایہ، عالمگیری و امداد الفتاویٰ)

(۵) قربانی کے جانور کی جھول، رسی اور ہار جو گلے میں پڑا ہو، وہ بھی کسی کی خدمت کے معاوضے میں دینا جائز نہیں، ان چیزوں کو خیرات کر دینا مستحب ہے۔

(شامی، عالمگیری)

قربانی کی کوئی چیز قصائی وغیرہ کو بھی اس کی مزدوری میں دینا جائز نہیں، اس کی مزدوری الگ دینی چاہیے۔ (ہدایہ، درمختار)

امام و مؤذن کو بھی حق الخدمت کے طور پر دینا جائز نہیں، حق الخدمت اور معاوضے کے بغیر ہر ایک کو دے سکتے ہیں ان کو بھی دے سکتے ہیں۔

کھال کی قیمت کے احکام:

(٦) قربانی کی کھال یا اس سے بنائی گئی چیز کو فروخت کرنے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر وہ روپے کے بدلے فروخت کی تو اس رقم کا صدقہ کرنا واجب ہے، اسی طرح اگر ایسی کسی اور چیز کے بدلے میں فروخت کی جو باقی رہتے ہوئے استعمال میں نہیں آتی، یعنی اسے خرچ کیے بغیر اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا مثلاً کھانے پینے کی چیزیں اور تیل، پٹرول، رنگ و روغن وغیرہ، تو ان اشیاء کا بھی صدقہ واجب ہے یہ فقراء و مساکین کا حق ہے، کسی اور مصرف میں لانا جائز نہیں۔

(ہدایہ، بدائع، امداد الفتاویٰ)

ان اشیاء کے بدلے قربانی کی کھال اس نیت سے فروخت کرنا کہ اپنے خرچ میں لے

آ ئیں گے، مکروہ بھی ہے۔صدقہ کرنے کی نیت سے فروخت کرنے میں مضائقہ نہیں لیکن کسی بھی نیت سے فروخت کی ہو بیع نافذ ہو جائے گی، اوران اشیاء کا صدقہ بہر حال واجب ہو گا۔

(بحرُ درمختار، عالمگیری)

اور اگر قربانی کی کھال، یا اس سے بنائی چیز کسی ایسی چیز کے بدلے میں فروخت کی جو باقی رہتے ہوئے استعمال میں آتی ہے، یعنی اسے خرچ کیے بغیر اس سے فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے، مثلاً کپڑے، برتن، میز، کرسی، کتاب، قلم وغیرہ، تو ان اشیاء کا صدقہ واجب نہیں بلکہ ان کا وہی حکم ہے جو پیچھے کھال کا بیان ہوا، کہ خود اپنے کام میں لانا، دوسرے کو ہبہ میں (بلا معاوضہ) دے دینا اور خیرات کرنا سب جائز ہے۔

(ہدایہ، بدائع، درمختار، امداد الفتاویٰ)

مصرف:

(۷) اوپر اور آگے جن جن مسائل میں صدقہ کا واجب ہونا بیان کیا گیا ہے وہ صدقہ صرف انہی فقراُ و مساکین کو دیا جا سکتا ہے، جنہیں زکوٰۃ دینا درست ہے، جن لوگوں کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں، انہیں یہ صدقہ بھی نہیں دیا جا سکتا۔ تفصیل آگے مسائل میں آ رہی ہے۔(امداد الفتاویٰ ص۵۲۶، ۵۶۶: ج ۳)

(۸) جس کی ملکیت میں اتنا مال ہو کہ اس سے زکوٰۃ یا قربانی واجب ہو جاتی ہے، وہ شرعاً مالدار ہے، اسے یہ صدقہ دینا جائز نہیں اور جس کے پاس اس سے کم مال ہو وہ شرعاً غریب اور مستحق زکوٰۃ ہے، اسے یہ صدقہ بھی دیا جا سکتا ہے۔

(درمختار ص۹۹: ج ۲ و بحر ص۲۶۳: ج ۲)

نابالغ بچوں کا باپ اگر مالدار ہو تو ان کو بھی نہیں دے سکتے، لیکن اگر اولاد بالغ ہو اور مالدار نہ ہو تو ان کو دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح مالدار کی بیوی اگر مالدار نہ ہو تو اُسے بھی ہدیہ دے سکتے ہیں۔

اگر نابالغ بچوں کی ماں تو مالدار ہے، باپ مالدار نہیں، تو ان بچوں کو بھی دیا جا سکتا ہے۔

(۹) سید اور بنو ہاشم کو (یعنی جو لوگ حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ، حضرت جعفرؓ، حضرت عقیلؓ، یا حضرت حارثؓ بن عبدالمطلب کی اولاد میں ہوں) ان کو یہ صدقہ دینا جائز نہیں۔

(شامی، ہدایہ، بحر، امداد الفتاویٰ)

(۱۰) اپنے ماں باپ، دادا دادی، نانا نانی، پردادا وغیرہ کو کہ جن کی اولاد میں یہ خود ہے یہ صدقہ دینا درست نہیں۔ (ہدایہ ج۱)

اسی طرح اولاد، پوتے، پوتی، نواسے نواسی وغیرہ جو اس کی اولاد میں داخل ہیں ان کو دینے سے بھی یہ صدقہ ادا نہ ہوگا۔ شوہر اور بیوی بھی ایک دوسرے کو نہیں دے سکتے' باقی سب رشتہ داروں کو دینا جائز ہے بشرطیکہ وہ مستحق زکوٰۃ ہوں، بلکہ ان کو دے۔

(درمختار)

(۱۱) فتویٰ اس پر ہے کہ یہ صدقہ کافر کو نہ دیا جائے۔

(شامی ص۹۲ ج ۲، درمختار ص ۱۰۸ ج ۲ و امداد المفتین ص ۴۶۴)

(۱۲) کسی کی مزدوری یا حق الخدمت کے طور پر یہ صدقہ بھی نہیں دیا جا سکتا۔

(۱۳) زکوٰۃ اور دوسرے صدقات واجبہ کی طرح اس صدقہ کی ادائیگی کے لیے بھی یہ شرط ہے کہ یہ کسی فقیر مسکین کو مالکانہ طور پر دے دیا جائے جس میں اس کو ہر طرح کا اختیار ہو، اس کے مالکانہ قبضے کے بغیر یہ صدقہ بھی ادا نہ ہوگا۔

(درمختار ص ۱۸۷ ج ۴ و امداد الفتاویٰ)

چنانچہ اسے مسجد، مدرسہ، شفاخانہ، کنویں، پل یا کسی اور رفاہی ادارے کی تعمیر میں خرچ کرنا جائز نہیں، اسی طرح کسی لاوارث کے کفن دفن یا میت کی طرف سے قرض ادا کرنے میں بھی اسے خرچ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہاں کسی فقیر کو مالک بنانا، اور اس کے قبضے میں دینا نہیں پایا گیا۔ (کنز، بحر، ہدایہ)

کسی ایسے مدرسے یا انجمن وغیرہ میں دینا بھی کہ جہاں وہ غریبوں کو مالکانہ طور پر نہ دیا جاتا ہو، بلکہ ملازمین کی تنخواہوں، یا تعمیر اور فرنیچر وغیرہ انتظامی مصارف میں خرچ کر دیا جاتا ہو، جائز نہیں، البتہ اگر کسی ادارے میں غریب طلبہ یا دوسرے مسکینوں کو کھانا وغیرہ مفت دیا جاتا ہو، تو

وہاں یہ صدقہ دینا جائز ہے۔لیکن یہ اس وقت ادا ہوگا جب وہ رقم بعینہ، یا اس سے خریدی ہوئی اشیاء مثلاً کھانا، کتابیں، کپڑے، دواوغیرہ ان غریبوں کو مالکانہ طور پر مفت دے دی جائیں۔

(امدادالفتاویٰ)

حیلۂ تملیک:

البتہ اگر کھال کسی غریب یا مالدار کو، یا کھال کی رقم کسی غریب کو مالکانہ طور پر قبضہ میں دے دی اور صراحت کر دی کہ تم اس کے پوری طرح مالک ہو،ہمیں اس میں کوئی اختیار نہیں، پھر وہ اپنی خوشی سے اس کی رقم مسجد، مدرسہ یا کسی بھی رفاہی ادارے کی تعمیر یا اس کے ملازمین کی تنخواہوں وغیرہ میں اپنی طرف سے لگا دے تو یہ جائز ہے۔''حیلۂ تملیک'' کے نام سے جو کھیل عام طور سے کھیلا جاتا ہے اس سے زکوٰۃ کی طرح یہ صدقہ بھی ادا نہیں ہوتا، کیونکہ عموماً جس کو یہ دیا جاتا ہے وہ یقین رکھتا ہے کہ مجھے اس مال کا کوئی اختیار نہیں، اگر اپنے پاس رکھ لوں گا تو لوگ ملامت کریں گے، اس خوف اور شرم سے بے چارہ یہ رقم چندہ میں دے دیتا ہے یہ محض زبانی جمع خرچ ہے اس طرح نہ وہ مالک ہوتا ہے، نہ دینے والے کا صدقہ ادا ہوتا ہے۔اس حیلے سے یہ رقم مسجد یا مدرسہ وغیرہ کی تعمیر و انتظامی ضروریات میں خرچ کرنا جائز نہیں۔(امدادالفتاویٰ ص۵۲۴، ج ۳)

متفرق مسائل:

(۱۴) بعض لوگ جانور کی کھال اس طرح اتارتے ہیں کہ اس میں چھری لگ کر سوراخ ہو جاتے ہیں، یا کھال پر گوشت لگا رہ جاتا ہے، جس سے کھال کو نقصان پہنچتا ہے، بعض لوگ کھال اتارنے کے بعد اس کی حفاظت نہیں کرتے، سڑ کر بے کار یا بہت کم قیمت کی رہ جاتی ہے۔ یہ سب امور اسراف اور ''تبذیر'' (فضول خرچی) میں داخل ہیں، جس کی ممانعت قرآن کریم میں آئی ہے اس لیے کھال احتیاط سے اتار کر ضائع ہونے سے بچانا شرعاً ضروری ہے۔

(۱۵) جس نے قربانی کی کھال خریدی، وہ اس کا مالک ہوگیا، اس میں ہر قسم کا تصرف کر سکتا

ہے، خواہ اپنے پاس رکھے یا فروخت کر کے قیمت اپنے خرچ میں لائے۔

(امداد الفتاویٰ)

(۱۶) قربانی کی گائے میں لوگ شریک ہوں، وہ کھال میں بھی اپنے اپنے حصے کے برابر شریک ہوں گے، کسی ایک شریک کو یہ کھال باقی شرکاء کی اجازت کے بغیر اپنے پاس رکھ لینا، یا کسی کو دے دینا جائز نہیں۔

(۱۷) اگر ایک شریک باقی شرکاء سے ان کے حصے جو کھال میں ہیں، خرید لے تو اب پوری کھال اپنے استعمال میں لانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ پھر اگر یہ شخص اس کھال کو روپے، یا کھانے پینے کی اشیاء کے بدلے فروخت کرے گا، تو قیمت کا ساتواں حصہ جو اس کا اپنا تھا اس کا تو صدقہ واجب ہوگا، اور باقی چھ حصے جو شرکا سے خریدے تھے، ان کی قیمت کا صدقہ اس پر واجب نہیں، اسے اپنے خرچ میں لا سکتا ہے۔ (امداد الفتاویٰ ص ۵۷۵ ج ۳)

(۱۸) مذکورہ بالا سب مسائل میں جو احکام کھال کے ہیں، وہی جانور ذبح کرنے کے بعد اس کی اُون اور بالوں کے ہیں، اور اگر اُون اور بال فروخت کر دیئے تو جو تفصیل کھال کی قیمت کے متعلق بیان کی گئی، وہی ان کی قیمت میں بھی ہوگی۔

مگر یاد رہے کہ قربانی کا جانور ذبح کرنے سے پہلے اس کی اُون یا بال کاٹنا جائز نہیں اگر کاٹ لیے تو ان کا یا ان کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہے، اسے استعمال میں لانا جائز نہیں۔

☆☆☆

آیئے عیدالاضحیٰ سنت نبوی ﷺ کے مطابق گزاریں

﴿عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امرت بیوم الاضحیٰ عیدا جعلہ اللہ لھذہ الامۃ﴾

(رواہ ابو داؤد والنسائی)

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے یوم الاضحیٰ (قربانی کے دن) کو عید کا حکم دیا گیا جسے اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے عید بنایا ہے۔''

چنانچہ ہر مسلمان کی بھرپور کوشش ہونی چاہیے کہ عیدالاضحیٰ کو سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق گزارے تاکہ اس عید کے لمحات اجروثواب کا ذریعہ بن جائیں۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب ذوالحجہ کا پہلا عشرہ آئے تو تم میں سے جو لوگ قربانی کا ارادہ کریں وہ نہ تو اپنے بال منڈائیں اور نہ ترشوائیں اور نہ ناخن کاٹیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ جو شخص ذوالحجہ کا چاند دیکھے اور قربانی کا ارادہ کرے اسے چاہیے کہ (جب تک قربانی نہ کرلے) نہ بال منڈائے نہ ترشوائے اور ناخن کٹوائے۔ (رواہ مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی دن جس میں اللہ کی عبادت کی جائے ذوالحجہ کے عشرہ سے بہتر نہیں ہے ان دونوں میں ایک دن کے روزہ کا ثواب سال بھر کے روزوں کے ثواب کے برابر ہے۔ (رواہ الترمذی وقال اسنادہ ضعیف)

یوم عرفہ یعنی نویں تاریخ کی فجر کی نماز سے تیرھویں تاریخ کی عصر تک ہر فرض نماز کے بعد بآواز بلند ایک مرتبہ یہ تکبیر پڑھنا واجب ہے اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ

اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد فتویٰ اس پر ہے کہ باجماعت نماز پڑھنے والے اور اکیلے نماز پڑھنے والے دونوں کے لیے تکبیر پڑھنا واجب ہے صاحبینؒ کے نزدیک مرد وعورت دونوں پر واجب ہے۔ البتہ عورت بلند آواز سے تکبیر نہ کہے آہستہ کہے۔ (شامی)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

اس تکبیر کا متوسط (درمیانی) بلند آواز سے کہنا ضروری ہے بہت سے لوگ اس میں غفلت کرتے ہیں پڑھتے ہی نہیں یا آہستہ پڑھ لیتے ہیں اس کی اصلاح ضروری ہے۔ (احکام عیدالاضحیٰ وقربانی ص۳۲)

عیدالاضحیٰ کے دن یہ چیزیں مسنون ہیں:

صبح جلدی اٹھنا، غسل کرنا، مسواک کرنا، عمدہ سے عمدہ کپڑے پہننا جو پاس موجود ہوں، خوشبو لگانا، شرع کے موافق آرائش کرنا، عیدگاہ میں جلدی جانا، عیدگاہ میں نماز عید کے لیے جانے سے پہلے کوئی چیز نہ کھانا بلکہ نماز کے بعد قربانی کے گوشت میں سے کھانا۔

(بعض لوگ اس عمل کو روزہ کہتے ہیں۔ ایسا نہیں کہنا چاہیے اس لیے کہ عید کے ایام میں روزہ رکھنا منع ہے۔ اور یہ عمل شہر کے لیے ہے دیہات میں جہاں عید کی نماز نہیں ہوتی وہاں دسویں تاریخ کو صبح صادق کے بعد قربانی جائز ہے لہٰذا وہاں قربانی کا گوشت قربانی کے فوراً بعد کھایا جاسکتا ہے)

عیدگاہ میں نماز پڑھنے کے لیے پیدل جانا، جس راستہ سے جائیں اس کے سوا دوسرے راستے سے واپس آنا، راستہ میں بلند آواز سے **اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد** پڑھتے جانا۔ (جب کہ عیدالفطر میں آہستہ آواز سے مسنون ہے)

عیدالاضحیٰ کی نماز پڑھنا مسنون ہے۔ (بحر، جلد۲ ص۱۶۰) (مدارج النبوۃ)

حضرت خالد بن سعدؓ سے مروی ہے کہ آپ کی عادت کریمہ تھی کہ عیدالفطر یوم النحر اور یوم عرفہ میں غسل فرماتے تھے۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عید کے دن خوبصورت اور عمدہ لباس زیب تن فرماتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی سبز و سرخ دھاری دار چادر اوڑھتے تھے یہ چادر یمن کی ہوتی تھی جسے بردیمانی کہا جاتا ہے۔ عید کے لیے زیب و زینت کرنا مستحب ہے لیکن لباس مشروع ہو۔

(مدارج النبوۃ)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کریمہ تھی کہ نماز عید عیدگاہ (میدان) میں ادا فرماتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز خطبہ سے پہلے پڑھتے اور جب نماز سے فارغ ہوتے تو کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرماتے۔

عیدین کے خطبہ میں پہلے تکبیر سے ابتدا کرے۔ اول خطبہ میں نو مرتبہ اللہ اکبر کہے اور دوسرے خطبہ میں سات مرتبہ۔ (شرح التنویر جلد ۱ ص ۱۱۶) (بحر، جلد ۲ ص ۱۶۲)



شوال کے چھ روزوں کی فضیلت

عن ابی ایوب رضی اللّٰہ عنہٗ اَنَّ رَسُوْلَ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قَالَ مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ثُمَّ اَتْبَعَهٗ سِتاً مِنْ شَوَّالٍ کَانَ کَصِیَامِ الدَّھْرِ (رواہ مسلم)

''حضرت ابوایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، جو شخص رمضان کے روزے رکھنے کے بعد چھ روزے شوال میں رکھے تو گویا اس نے ہمیشہ روزے رکھے۔

رمضان المبارک کے روزوں کے مکمل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک دن خوشی کا عطا فرمایا اور اسے عیدالفطر کا نام دیا پھر اسی شوال کے مہینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مطابق چھ روزے مزید رکھنے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔ ان چھ روزوں کا شمار نفلی روزوں میں ہوتا ہے اور یہ سنت غیر مؤکدہ ہیں یعنی اگر یہ روزہ رکھ لیں تو بہت بڑا ثواب ملے گا اور اگر نہ رکھیں تو کوئی گناہ نہیں ہے۔

چونکہ یہ چھ روزے عید کے بعد ہوتے ہیں اس لیے عام طور پر اس کو ''شش عید کے روزے'' کہا جاتا ہے لیکن یہ کوئی شرعی نام نہیں ہے۔

اسی طرح لوگوں میں یہ بات بھی مشہور ہے کہ ان روزوں کا ثواب اسی وقت ہوگا جبکہ عیدالفطر کے اگلے روز ایک روزہ رکھ لیا جائے' باقی پانچ جس طرح جی چاہے رکھ لے یہ بات بالکل غلط ہے بلکہ شوال کے مہینے میں جب بھی چاہے یہ چھ روزے رکھ سکتا ہے' چاہے اکٹھے چھ روزے رکھ لئے جائیں یا الگ الگ' سنت ادا ہوجائے گی البتہ یہ ہے کہ پورے مہینہ میں کوئی سے دنوں میں چھ روزے ایک ساتھ لگاتار رکھ لئے جائیں کیونکہ طبرانی کی ایک روایت سے یہی معلوم ہوتا ہے اور فتاویٰ عالمگیری صفحہ ۲۱۳۰ میں ہے کہ '' عید کے بعد ہر ہفتہ میں دو روزے رکھ لے'' اس طرح تین ہفتوں میں چھ روزے پورے ہوجائیں گے۔ البتہ تجربہ کی بات یہ ہے کہ عید کے ایک دن بعد ہی اگر ایک ساتھ چھ روزے رکھ لیے جائیں تو قدرے آسانی رہتی ہے کیونکہ

رمضان کے روزوں کی عادت ہوچکی ہوتی ہے اس لئے سحری وافطار کا انتظام وغیرہ زیادہ محسوس نہیں ہوتا۔

اگران روزوں کے ثواب کی طرف توجہ ہوتو ان روزوں کے لیے مزید شوق پیدا ہوتا ہے طبرانی میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ''جس نے رمضان کے روزے رکھے اور پھر اس کے بعد شوال میں چھ روزے رکھے تو وہ اپنے گناہوں سے ایسا پاک ہوتا ہے جیسا کہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے بعد پاک تھا۔''

نسائی کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک نیکی کو دس نیکیوں کے برابر کیا پس ایک مہینہ (رمضان) دس مہینوں کے برابر ہوگیا اور عید کے بعد چھ روزوں سے سال پورا ہوگیا۔ اس روایت کی تشریح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

﴿مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾ (پ۸،ع۷)

یعنی ''جو شخص ایک نیکی کرے گا اُسے دس گنا ثواب ملے گا۔''

چنانچہ رمضان المبارک کے تیس روزوں کا ثواب تین سو روزوں کے برابر ہوگا۔ اور اگر شوال کے روزے بھی رکھ لے جائیں تو ان کا ثواب ساٹھ روزوں کے برابر ہوا اس طرح ان روزوں کا ثواب سال بھر کے روزوں کے برابر ہوگیا گویا کہ اس نے پورے سال کے روزے رکھے اللہ رب العزت ہمیں یہ روزے رکھنے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ یہ عظیم ثواب پاسکیں۔ (آمین)



حج بیت اللہ کی تاثیر

﴿عن ابی هریرةؓ قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ یَرْ فُثْ وَلَمْ یَفْسُق رَجَعَ کَیَوْمٍ وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ﴾ (متفق علیہ)

''حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے حج کرے اور اس میں بری باتیں اور برے کام نہ کرے تو وہ حج کر کے اسی طرح لوٹتا ہے گویا کہ آج اس کی ماں نے اسے جنا۔''

حج کی حقیقت ہی یہی ہے کہ خدا کی رحمتوں اور برکتوں کے نازل ہونے کی جگہ میں حاضری دینا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح اللہ کی دعوت پر لبیک کہنا اور اس عظیم الشان قربانی کی روح کو زندہ کرنا، ابراہیمؑ واسماعیلؑ جیسی برگزیدہ بندوں کی پیروی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے تسلیم ورضا، فرمانبرداری اور اطاعت کے ساتھ اپنی گردن جھکا دینا۔ اور اس بندگی کے طریقے کو اسی طرح بجالانا جس طرح وہ ہزاروں برس پہلے بجالائے اور خدائی نوازشوں اور بخششوں سے مالا مال ہوئے یہی ملت ابراہیمی اور یہی حقیقی اسلام ہے یہی روح اور یہی باطنی احساس ہے جس کو حاجی حضرات ان برگزیدہ بندوں کے مقدس اعمال کو اپنے جسم پر سجا کر ظاہر کرتے ہیں۔ اسی ابتدائی دور کی طرح بغیر سلے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں، اپنے بدن اور سر کے بال نہ منڈواتے ہیں نہ کٹواتے ہیں، نہ خوشبو لگاتے ہیں نہ رنگین کپڑے پہنتے ہیں' نہ سر ڈھانپتے ہیں جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ میں حاضر ہو کر پکارا۔

﴿لبیك اللهم لبیك ، لبیك لاشریك لك لبیك ان الحمد والنعمة لك والملك لا شریك لك.﴾

''میں حاضر ہوں، اے اللہ میں حاضر ہوں میں حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔ سب خوبیاں اور سب نعمتیں تیری ہی ہیں اور سلطنت تیری ہے تیرا کوئی شریک نہیں۔''

آج ان تمام حاجیوں کے زبانوں پر وہی تین چار ہزار سال پہلے کے کلمات جاری ہوجاتے ہیں۔ یہ توحید کی صدا ان تمام مقامات اور بلند گھاٹیوں میں بلند کرتے ہیں جہاں ان دونوں نیک بندوں کے نقش قدم زمین پر پڑے۔ پھر اسماعیل علیہ السلام کی والدہ محترمہ ہاجرہ نے پانی کی تلاش میں صفاو مروہ کے درمیان چکر لگائے آج حاجی وہاں سعی کرتے ہیں چلتے ہیں مخصوص جگہ میں دوڑتے ہیں، دعا کرتے ہیں گناہوں کی بخشش چاہتے ہیں۔ عرفات کے بڑے میدان میں جمع ہوکر اپنی گذشتہ عمر کے گناہوں اور کوتاہیوں کی معافی چاہتے ہیں' خدا کے حضور گڑ گڑاتے روتے ہیں، اپنے قصور معاف کرواتے ہیں، اور وہاں وعدہ کرتے ہیں آئندہ زندگی میں اللہ کی اطاعت وفرمانبرداری کا عہد کرتے ہیں اسی وقوف عرفات کو حج کا بنیادی رکن کہتے ہیں یہ تاریخی میدان دعا کے مقامات، لاکھوں بندگان خدا کا ایک وحدت کے رنگ میں ایک لباس، ایک ہی جذبہ میں سرشار، ایک بے آب و گیاہ، خشک میدان، پہاڑوں کے درمیان دعا ومغفرت کی پکار گذشتہ عمر کی کوتاہیوں اور بربادیوں پر آہ وزاری، اپنی بدکاریوں کا اقرار، بڑے بڑے شقی القلب لوگوں کے دل موم کی طرح پگھلنے لگتے ہیں۔ پھر اس پاکیزگی کے بعد یہ احساس کہ یہی وہ مقام ہے جہاں ابراہیم علیہ السلام سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک بہت سے انبیاء اسی حالت اور اسی صورت میں اسی جگہ کھڑے ہوئے تھے۔ ایسا روحانی منظر، ایسا کیف، ایسا اثر، ایسا گداز، ایسی تاثیر پیدا کرتا ہے جس کی مٹھاس روح اور جسم کی تار تار اور نس نس میں رچ بس جاتی ہے۔ پھر حاجی قربانی کرتے ہیں۔ ارشاد نبوی کے مطابق اپنے باپ ابراہیم کی سنت پر عمل کرتے ہیں۔

اور پھر یہ کہتے ہیں "میں نے موحد بن کر ہر طرف سے منہ موڑ کر اس کی طرف منہ کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں" (الانعام آیت ۷۹)

پھر حاجی یہ اقرار کرتا ہے۔

"میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا میرا مرنا سب اللہ کے لیے ہے جو تمام دنیا کا پروردگار ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور یہی حکم مجھے ہوا ہے،

اور میں سب سے پہلے فرمانبرداری کا اقرار کرتا ہوں۔''

(الانعام آیت۱۶۲۔۱۶۳)

حج بیت اللہ کی ان تمام کیفیات کو سمیٹ کرلانے والا یقیناً ارشادِ نبوی کے مطابق ایسا ہوتا ہے گویا ابھی جنم لیا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں حج بیت اللہ کرنے کی سعادت اور پھراس کی برکات سے مستفیض فرمائے۔



عیدالاضحیٰ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے قربانی کیسے کی؟

﴿عن زید بن ارقم قال قال اصحاب رسول اللّٰہ صلی علیه وسلم یا رسول اللّٰہِ ماھٰذہٖ الاضاحی قال سنة ابیکم ابراھیم علیه السلام قالوا فما لنا فیھا یارسول الله قال لکل شعرة حسنة قالوا فالصوف یارسول اللّٰہ قال لکل شعرة من الصوف حسنة﴾ (رواہ احمد وابن ماجہ)

حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ! یہ قربانیاں کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان قربانیوں کے بدلے میں ہمیں کیا ملے گا؟ فرمایا ہر بال کے بدلہ ایک نیکی۔ عرض کیا اوراون (جن جانوروں میں بال کے بجائے اون ہوتی ہے۔ ان سے ثواب کس طرح ہوگا) آپ نے فرمایا! اون کے بھی ہر بال کے بدلہ ایک نیکی۔‘‘

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسا دنبہ لانے کا حکم فرمایا جس کے سر پر سینگ ہوں، وہ سیاہی میں چلتا ہو(یعنی اس کے پاؤں سیاہ ہوں) اور سیاہی میں بیٹھتا ہو۔(یعنی پیٹ اور منہ کالا ہو) اور سیاہی میں دیکھتا ہو۔(یعنی آنکھوں کا حلقہ سیاہ ہو) پس ایسا ہی دنبہ آپ کی قربانی کے لیے لایا گیا۔ آپ نے فرمایا اے عائشہ چھری لاؤ پھر آپ نے فرمایا پتھر پر چھری تیز کرلو اس کے بعد آپ نے چھری کو ہاتھ میں لیا دنبہ کو لٹایا اور پھر بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰھُمَّ تَقَبَّلْ مِنْ مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ وَمِنْ اُمَّةِ مُحَمَّد کہہ کراسے ذبح کردیا۔

حضرت ابویعلی شداد بن اوسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا’’جب تم ذبح کروتو اچھے طریقہ سے ذبح کرو اور تم میں سے کوئی اپنی چھری بھی تیز کرلے تاکہ ذبیحہ کو ذبح کے وقت آرام پہنچے۔(رواہ مسلم)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو ابلق سینگوں والے دنبوں کی قربانی کی اپنے ہاتھ سے ذبح فرمایا بسم کہی اور تکبیر پڑھی اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنبوں کے پہلو پر پاؤں رکھے دیکھا۔(متفق علیہ)

حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب عیدالاضحیٰ کا پہلا عشرہ آئے تو تم میں سے جو لوگ قربانی کا ارادہ کریں وہ نہ تو اپنے بال منڈوائیں اور نہ ترشوائیں اور نہ ناخن کٹوائیں۔ایک روایت میں ہے کہ جو شخص ذی الحجہ کا چاند دیکھے اور قربانی کا ارادہ کرے اسے چاہیے کہ نہ بال منڈوائے نہ ترشوائے نہ ناخن کاٹے۔(رواہ مسلم)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دنبوں کو ذبح کیا جو سینگدار ابلق اور خصی تھے۔(رواہ ابوداؤد)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اولادِ آدم نے قربانی کے دن کوئی ایسا عمل نہیں کیا جو خدا کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہو خون بہانے (قربانی) سے اور قیامت کے دن وہ ذبح کیا ہوا جانور آئے گا اپنے سینگوں ، بالوں اور کھروں کے ساتھ، اور فرمایا کہ قربانی کا خون زمین پر گرنے سے پہلے خدا کے ہاں قبول ہو جاتا ہے پس تم خوش دلی سے قربانی کیا کرو۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں دس سال تک رہے اور ہر سال قربانی کرتے تھے۔



فرض ہونے کے باوجود
حج نہ کرنے والے کے لیے لمحۂ فکریہ

﴿عن علی رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من ملك زادا وراحلة تبلغه الی بیت الله ولم یحج فلا علیه ان یموت یهودیا اونصرانیاو ذالك ان الله تبارك وتعالیٰ یقول ولله علی الناس حج البیت من استطاع الیه سبیلا﴾ (رواه الترمذی)

''حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کے پاس سفرِ حج کا ضروری سامان ہو اور اس کو سواری میسر ہو جو بیت اللہ تک اس کو پہنچا سکے اور پھر وہ حج نہ کرے تو کوئی فرق نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر، اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''اللہ کے لیے بیت اللہ کا حج فرض ہے ان لوگوں پر جو اس تک جانے کی استطاعت رکھتے ہوں۔''

حج کی فرضیت کا حکم راجح قول کے مطابق ۹ھ میں آیا اور اگلے سال ۱۰ھ میں اپنی وفات سے صرف تین ماہ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کی بہت بڑی جماعت کے ساتھ حج فرمایا جو ''حجۃ الوداع'' کے نام سے مشہور ہے اور اس حجۃ الوداع میں خاص عرفات کے میدان میں آپ پر یہ آیت نازل ہوئی **الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی الایه**۔(المائدہ)

اس آیت میں تکمیل دین کے ساتھ ساتھ ایک لطیف اشارہ ہے کہ حج اسلام کا تکمیلی رکن ہے۔ اگر بندہ کو مخلصانہ حج نصیب ہو جائے جس کو دین وشریعت کی زبان میں ''حج مبرور'' کہتے ہیں تو گویا اس شخص کو سعادت کا اعلیٰ مقام حاصل ہو گیا۔

لیکن جو شخص حج کرنے کی استطاعت رکھنے کے باوجود حج نہ کرے اس کے لیے آغاز میں مذکور ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بڑی سخت وعید آئی ہے۔ مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ

معارف الحدیث میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

حج فرض ہونے کے باوجود حج نہ کرنے والوں کو مشرکین کے بجائے یہود و نصاریٰ سے تشبیہ دینے کا راز یہ ہے کہ حج نہ کرنا یہود و نصاریٰ کی خصوصیت تھی البتہ مشرکین عرب حج کیا کرتے تھے لیکن وہ نماز نہیں پڑھتے تھے اس لیے ترک نماز کو مشرکین کا عمل بتایا گیا۔

﴿اقیموا الصلوٰۃ ولا تکونوا من المشرکین﴾ (سورۂ روم)

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں استطاعت کے باوجود حج نہ کرنے والوں کے لیے یہ فرمایا گیا یہودی و نصرانی ہو کر مرنا گویا برابر ہے (معاذ اللہ) اس کے بعد حدیث میں سورہ آل عمران کی اس آیت کا حوالہ دیا گیا جس میں حج کی فرضیت کا بیان ہے "**للہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا**" لیکن معلوم ہوتا ہے کہ راوی نے صرف حوالہ کے طور پر آیت کا ابتدائی حصہ پڑھنے پر اکتفاء کیا، حدیث میں مذکور وعید آیت کے جس حصہ سے نکلتی ہے وہ اس کے آگے والا حصہ ہے یعنی **ومن کفر فان اللہ غنی عن العالمین** (جس کا مطلب یہ ہے کہ اس حکم کے بعد جو کوئی کافرانہ رویہ اختیار کرے یعنی باوجود استطاعت کے حج نہ کرے تو اللہ کو کوئی پرواہ نہیں وہ ساری دنیا اور ساری کائنات سے بے نیاز ہے)۔

اس میں استطاعت کے باوجود حج نہ کرنے والوں کے رویہ کو "من کفر" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور "**ان اللہ غنی عن العالمین**" کی وعید سنائی گئی ہے اس کا مطلب یہی ہوا کہ ایسے ناشکرے اور نافرمان جو کچھ بھی کریں اور جس حال میں مریں اللہ کو ان کی کوئی پرواہ نہیں۔ (معارف الحدیث جلد چہارم صفحہ ۱۹۳)

باقی رہا یہ کہ حج کس پر فرض ہوتا ہے تو اس بارے میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت کافی راہنمائی کر رہی ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے سوال کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مایوجب الحج (کیا چیز حج کو واجب کر دیتی ہے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا الزاد و الراحلہ (سامان سفر اور سواری)۔ (جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

قرآن مجید میں فرضیت حج کی شرط کے طور پر "**من استطاع الیہ سبیلا**" فرمایا گیا

ہے یعنی حج ان لوگوں پر فرض ہے جو سفر کر کے مکہ معظّمہ تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں اس آیت میں جو اجمال ہے غالبًا سوال کرنے والے صحابی نے اس کی وضاحت چاہی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت فرمائی کہ:

ایک تو سواری کا انتظام جس پر مکہ معظّمہ تک سفر کیا جا سکے اور اس کے علاوہ کھانے پینے جیسی ضروریات کے لیے اتنا سرمایہ ہو جو اس زمانہ سفر کے گزارنے کے لیے کافی ہو۔

فقہائے کرام نے ان اخراجات میں ان لوگوں کے اخراجات کو بھی شامل کیا ہے جن کی کفالت حج پر جانے والے کے ذمہ ہو (اس سلسلہ میں مزید تفصیلات کے لیے کتاب معلم الحجاج کا مطالعہ فرمالیجیے)

جب کوئی شخص حج کر لے تو اس کے لیے بڑی بشارتیں ہیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے حج کیا اس میں نہ تو کسی شہوانی اور فحش بات کا ارتکاب کیا اور نہ اللہ کی کوئی نافرمانی کی تو وہ گناہوں سے ایسا پاک وصاف ہو کر واپس ہوگا جیسا اس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اسے جنا تھا۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

جو شخص اخلاص کے ساتھ حج یا عمرہ کرتا ہے وہ گویا کہ اللہ تعالیٰ کے دریائے رحمت میں غوطہ لگاتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ گناہوں کے گندے اثرات سے پاک صاف ہو جاتا ہے اور اس کے علاوہ دنیا میں بھی اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فضل ہوتا ہے کہ فقر ومحتاجی اور پریشان حالی سے اس کو نجات مل جاتی ہے، خوشحالی اور اطمینان قلب کی دولت نصیب ہو جاتی ہے، اور ''حج مبرور'' کے صلہ میں جنت کا عطا ہونا اللہ تعالیٰ کا قطعی فیصلہ ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک عمرہ سے دوسرے عمرہ تک کفارہ ہو جاتا ہے ان کے درمیان گناہوں کا ''**والحج المبرور ليس له جزاء الا الجنة**'' اور حج مبرور (نیکی سمجھتے ہوئے اخلاص کے ساتھ حج کرنے) کا بدلہ تو بس جنت ہی ہے۔'' (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پے در پے حج اور عمرہ کیا کرو کیونکہ حج اور عمرہ دونوں فقر ومحتاجی اور گناہوں کو اس طرح

دور کر دیتے ہیں جس طرح لوہار اور سنار کی بھٹی لوہے اور سونے اور چاندی کا میل کچیل دور کر دیتی ہے اور حج مبرور کا صلہ تو بس جنت ہی ہے۔

(جامع ترمذی، سنن نسائی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''حج اور عمرہ کرنے والے اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں۔ اگر وہ اللہ سے دعا کریں تو وہ ان کی دعا قبول فرمائے اور اگر وہ اس سے مغفرت مانگیں تو وہ ان کی مغفرت فرمائے۔''

(سنن ابن ماجہ)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کسی حج کرنے والے سے تمہاری ملاقات ہو تو اس کے اپنے گھر میں پہنچنے سے پہلے اس کو سلام کرو اور مصافحہ کرو اور اس سے مغفرت کی دعا کے لیے کہو کیونکہ وہ اس حال میں ہے کہ اس کے گناہوں کی مغفرت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ (مسند احمد)

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اخلاص کے ساتھ بار بار حج اور عمرہ کی سعادت فرمائے اور حج مبرور نصیب فرمائے۔ آمین۔

نماز میں خشوع وخضوع کی

حقیقت ،اہمیت ،حیثیت

﴿عن عبادة بن الصامت قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم خمس صلوات افترضهن اللّٰه تعالٰی من احسن وضوء هن وصلّاهن لِوقتهنّ واتمّ رکوعهن وخشوعهن کان لَهٗ علی اللّٰه عهد ان یغفرله ومن لّم یفعل فلیس لَه عَلَی اللّٰه عهدٌ اِنْ شاءَ غفرلهٗ وانْ شاء عذّبَه﴾

(رواہ ابوداؤد، مشکوٰۃ۔ کتاب الصلوٰۃ۔ فصل ثانی۔ حدیث اوّل)

''حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، پانچ نمازیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے فرض کیا ہے، پس جس شخص نے ان نمازوں کے لیے اچھی طرح وضو کیا' ان کے وقت پر ان کو پڑھا اور رکوع کو خوبی کے ساتھ ادا کیا اور خشوع سے نماز ادا کی، اس کے لیے خدا کا وعدہ ہے کہ اسے بخش دے گا اور جو ایسا نہ کرے اس کے لیے خدا کا کوئی وعدہ نہیں، چاہے اسے بخشے اور چاہے عذاب دے۔''

خشوع کی حقیقت:

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ بوادرالنوادر ص ۸۰۸ میں فرماتے ہیں ''خشوع لغت میں مطلقاً سکون کو کہتے ہیں'' قرآن وسنت میں جہاں خشوع کی ترغیب دی گئی ہے اس سے مراد قلبی سکون وانکساری ہے جو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے سامنے اپنی حقارت کے علم سے پیدا ہوتی ہے، اس کے نتیجہ میں اطاعت وعبادت آسان ہوجاتی ہے۔ کبھی خشوع کے آثار بدن پر بھی ظاہر ہونے لگتے ہیں کہ وہ باادب متواضع نظر آتا ہے۔ اگر دل میں خوف خدا اور تواضع نہ ہوتو وہ ظاہر میں چاہے کتنا ہی با ادب اور متواضع نظر آئے لیکن وہ خشوع کا حامل نہیں ہوتا۔ خشوع کے

اثرات کو جان بوجھ کر ظاہر کرنا بھی پسندیدہ نہیں، حضرت عمرؓ نے ایک نوجوان کو دیکھا کر سر جھکائے بیٹھا ہے، فرمایا، سر اٹھا، خشوع دل میں ہوتا ہے۔حضرت ابراہیم نخعیؒ کا ارشاد ہے"موٹا پہننے،موٹا کھانے اور سر جھکانے کا نام خشوع نہیں' خشوع تو یہ ہے کہ تم پر جو کام فرض کیا گیا ہے اُسے ادا کرنے میں اللہ کے لیے قلب کو فارغ کرلو۔"

حضرت حسنؒ کا ارشاد ہے کہ "حضرت عمرؓ جب بات کرتے تو سنا کر کرتے (اونچی آواز سے) جب چلتے تو تیز چلتے اور جب مارتے تو زور سے مارتے تھے حالانکہ وہ بلاشبہ خشوع رکھنے والے تھے" قرطبی میں لکھا ہے کہ اپنے ارادہ اور اختیار سے خاشعین کی صورت بنانا شیطان اور نفس کا دھوکہ ہے اور مذموم ہے ہاں اگر بے اختیار یہ کیفیت ظاہر ہوجائے تو معذور ہے۔"

خشوع اور خضوع میں فرق:

خشوع کے ساتھ ایک دوسرا لفظ"خضوع" بھی استعمال ہوتا ہے' قرآن کریم میں بھی بار بار آیا ہے ان دونوں کا معنی ملتا جلتا ہے لیکن خشوع کا لفظ اصل کے اعتبار سے آواز اور نگاہ کی پستی کے لیے بولا جاتا ہے جب کہ وہ مصنوعی نہ ہو بلکہ قلبی خوف اور تواضع کا نتیجہ ہو قرآن حکیم میں ارشاد باری ہے:

﴿خَشَعَتِ الْاَصواتُ﴾
"آوازیں پست ہوگئیں"

اور خضوع کا لفظ بدن کی تواضع اور انکساری کے لیے استعمال ہوتا ہے قرآن حکیم میں ہے۔

﴿فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِيْنَ﴾
"پس ان کی گردنیں اس کے سامنے جھک گئیں۔"

نماز میں خشوع وخضوع کی فقہی حیثیت:

نماز میں خشوع کی تاکید قرآن وسنت میں بار بار آئی ہے ارشاد باری ہے وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ "اور نماز قائم کر مجھے یاد کرنے کے لیے" ظاہر ہے کہ "غفلت" یاد کرنے کی

ضد ہے۔ جونماز میں اللہ تعالیٰ سے غافل ہے وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کا فریضہ انجام نہیں دے رہا۔ ایک اور آیت میں ارشاد فرمایا ''وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِينَ ''اور تو غافلوں میں سے نہ ہو۔ ارشاد نبوی ہے: '' جس کی نماز اسے بے حیائی اور برائیوں سے نہ روک سکے وہ اللہ سے دور ہی ہوتا جاتا ہے۔''

احیاء العلوم میں امام غزالی ؒ نے مذکورہ آیات، روایات اور دوسرے دلائل پیش کرنے کے بعد فرمایا کہ ان کا تقاضا یہ ہے کہ خشوع نماز کے لیے شرط ہوتا اور نماز کی صحت اس پر موقوف ہوتی، پھر فرمایا کہ سفیان ثوریؒ، حسن بصریؒ اور معاذ بن جبلؓ کا مذہب یہی تھا کہ خشوع کے بغیر نماز ادا نہیں ہوتی۔

لیکن ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء نے خشوع کو شرطِ صلوٰۃ قرار نہیں دیا بلکہ اسے نماز کی روح قرار دینے کے باوجود صرف اتنا شرط ٹھہرایا کہ تکبیر تحریمہ کے وقت قلب کو حاضر کر کے اللہ کے لیے نماز کی نیت کرے، باقی نماز میں اگر خشوع حاصل نہ ہو تو اگرچہ اتنی نماز کا ثواب اسے نہیں ملے گا جتنے حصہ میں خشوع نہیں رہا لیکن فقہ کی رو سے وہ تارک صلوٰۃ (نماز چھوڑنے والا) نہیں کہلائے گا اور نہ اس پر تعزیر وغیرہ کے وہ احکام مرتب ہوں گے جو تارکِ صلوٰۃ پر ہوتے ہیں۔

امام غزالی ؒ نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ فقہاء باطنی احوال اور قلبی کیفیات پر حکم نہیں لگاتے بلکہ وہ صرف ظاہری اعضاء کے اعمال پر ظاہری احکام بیان کرتے ہیں۔ یہ بات کہ فلاں عمل کا ثواب آخرت میں ملے گا یا نہیں یہ فقہ کی حدود سے خارج ہے، چونکہ باطنی کیفیات پر حکم لگانا ان کی بحث سے خارج ہے اور خشوع ایک باطنی کیفیت ہے اس لیے انہوں نے خشوع کو پوری نماز میں شرط قرار نہیں دیا بلکہ خشوع کے ادنیٰ مرتبہ کو شرط کہا ہے اور وہ یہ کہ کم از کم تکبیر تحریمہ کے وقت محض اللہ کی عبادت و تعظیم کی نیت کرے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ معارف القرآن (جلد اول ص ۲۲۲) میں فرماتے ہیں کہ

> ''خشوع کو پوری نماز میں شرط قرار نہ دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن حکیم کی دوسری آیات میں تشریع احکام کا یہ واضح اصول بتایا گیا ہے کہ

انسانوں پر کوئی ایسی چیز فرض نہیں کی جاتی جو ان کی طاقت وامکان سے باہر ہو اور پوری نماز میں خشوع برقرار رکھنے سے (ماسوائے چند خاص افراد کے) اکثر لوگ عاجز ہوتے ہیں۔ اس لیے تکلیف **مَالایُطَاق** سے بچنے کے لیے پوری نماز کی بجائے صرف ابتداء صلوٰۃ میں خشوع کو شرط قرار دیا گیا۔"

خشوع کے بغیر نماز کو بے قاعدہ نہیں سمجھنا چاہئے:

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ خشوع کی اس غیر معمولی اہمیت کے باوجود ہمیں اللہ تعالیٰ سے یہی امید ہے کہ غفلت کے ساتھ نماز پڑھنے والا بھی بالکل نماز چھوڑنے والے کے درجہ میں نہیں ہوگا، کیونکہ اس نے بہر حال ادائے فرض کا اقدام تو کیا ہے اور تھوڑی سی دیر کے لیے قلب کو اللہ تعالیٰ کے لیے فارغ بھی کیا ایسی نماز کا کم از کم یہ فائدہ تو ضرور ہے کہ اس کا نام نافرمانوں اور بے نمازوں سے نکل گیا۔"

خشوع کیسے حاصل کیا جائے:

حضرت تھانویؒ تصوف وسلوک صفحہ۲۳ میں فرماتے ہیں اگر صفت خشوع موجود نہیں تو خود اس کے حاصل کرنے کے چار اسباب ہیں۔ ایک سبب تو یہ ہے کہ اس کے آثار کا اختیار کرنا ضروری ہے اور اس کے ظاہر آثار یہ ہیں کہ جب چلے گردن جھکا کر چلے بات چیت اور معاملات میں سختی نہ کرے، غصہ اور غضب میں آپے سے باہر نہ ہو، بدلہ لینے کی فکر میں نہ رہے، اپنی رفتار میں میانہ روی پیدا ہو، اور آواز پست ہو، دوسرا سبب یہ ہے کہ اہل خشوع کی صحبت اختیار کی جائے۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں بٹھایا جائے اس خوف کو پیدا کرنے کے لیے یہ تدبیر کی جائے کہ کوئی مناسب وقت تجویز کر کے اس میں تنہا بیٹھ کر نافرمانی کی حالت اور پھر خداوند کریم کی نعمتیں سوچے کہ نافرمانی کی وجہ سے یہ موقوف نہ ہو جائیں اور عذاب آخرت، قیامت کی ہولناک باتوں اور دوزخ وغیرہ کے حالات کو سوچا جائے تو انشاء اللہ بہت فائدہ ہوگا

اور پھر خوف سے خشوع پیدا ہوگا۔ چوتھا سبب خشوع کے پیدا ہونے کا یہ ہے (اور کتابوں وغیرہ کی تعلیم سے بھی فراغت کے بعد ضروری ہے) اگر ظاہری علم حاصل کرنے میں دس سال ختم کئے ہیں تو باطن کی درستگی میں فی سال ایک مہینہ ہی خرچ کردیجئے یعنی دس مہینے ہی کسی کامل بزرگ کی صحبت میں خرچ کیجئے اور اس کے ارشاد کے مطابق عمل کیجئے خداوند کریم کی عادت ہے کہ اس کی برکت سے خشوع کی دولت عطا فرماتے ہیں'' پھر حضرت تھانویؒ نے ''الصبر والصلوٰۃ صفحہ ۳۸'' میں فرمایا کہ یہ تصور رکھیں کہ میں خداوند کریم کے سامنے ہوں اور خداوند کریم سن اور دیکھ رہے ہیں اس طریقے سے خشوع جلد حاصل ہوجائے گا۔



مسواک

حقیقت، حیثیت، فضیلت، افادیت، کیفیت

﴿عن عائشة رضی الله عنها قالت قال رسول الله صلی الله علیه وسلم السواك مطهرة للفم مرضاة الرب﴾

(رواه الشافعی واحمد والدارمی والنسائی)

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مسواک منہ کی پاکی کا سبب ہے، پروردگار کی خوشنودی کا باعث ہے۔''

لفظ ''سواک'' (سین کی زیر کے ساتھ) عربی زبان میں مایدلك به الانسان (وہ لکڑی جس سے دانتوں کو رگڑا جائے) کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ ساک یسوک سوکا سے ماخوذ ہے یعنی مسواک سے رگڑنا۔ عربی زبان میں لفظ ''سواک'' معنی مصدری (مسواک کرنا) اور آلہ (مسواک) دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ البتہ اردو زبان میں مصدری معنی ادا کرنے کے لیے ''مسواک کرنا'' کہتے ہیں اور دانت رگڑنے کے آلہ کے لیے لفظ ''مسواک'' استعمال کرتے ہیں جو کہ عربی گرائمر کے اعتبار سے اسم آلہ کا صیغہ ہے۔ لفظ سواک سے جب آلہ (مسواک) مراد ہوگا اس وقت اس کی جمع سوک آئے گی جیسے کتاب کی جمع کتب۔ عربی لغات میں اس لفظ کی تفصیل میں لکھتے ہیں کہ لفظ سواک ماخوذ ہے تساوکت الابل سے۔ جبکہ اونٹ ضعف کی وجہ سے بہت آہستہ اور نرم چال سے چل رہے ہوں۔ لہٰذا اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہوا کہ مسواک نرمی سے کرنا چاہیے۔

فقہی اصطلاح میں سواک کہتے ہیں لکڑی وغیرہ استعمال کرنا تاکہ دانتوں کی گندگی اور پیلا پن دور ہو جائے۔ افضل یہ ہے کہ مسواک کسی کڑوے درخت کی ہو۔ افضل مسواک اراک

یعنی پیلو کی ہے۔ اس کے بعد زیتون کی مسواک ہے۔ یہ دستیاب نہ ہوں تو کسی بھی درخت کی شاخ یا جڑ بطور مسواک استعمال کی جا سکتی ہے۔

ائمہ اربعہ اس بات پر متفق ہیں کہ مسواک کرنا سنت ہے۔ لیکن اس بارے میں اختلاف ہے کہ مسواک کرنا وضوء کی سنت ہے یا نماز کے لیے سنت ہے۔ شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک سنن وضوء اور سنن صلوٰۃ دونوں میں سے ہے۔ بعض حضرات جب حج اور عمرہ کے لیے جاتے ہیں تو وہاں اہل عرب کو دیکھتے ہیں کہ وہ نماز میں شامل ہونے سے پہلے بلکہ کبھی کبھی صف میں کھڑے کھڑے مسواک کرتے ہیں تو وہ حیرت سے بعد میں سوال کرتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ شافعی اور حنبلی حضرات کے نزدیک مسواک کرنا مستقل طور پر نماز کی بھی سنت ہے۔ البتہ احناف کے نزدیک مشہور قول کے مطابق صرف وضوء کی سنتوں میں سے ہے۔ نماز کی سنتوں میں سے نہیں ہے۔ لیکن ایک قول ہمارے ہاں بھی موجود ہے جیسا کہ شیخ ابن الہمام نے لکھا ہے کہ مسواک کرنا پانچ اوقات میں مستحب ہے:

(۱) عنداصفرار الاسنان (جب دانت پیلے ہو جائیں)

(۲) عند تغیر الرائحہ (جب منہ میں بو پیدا ہو جائے)

(۳) عند القیام من النوم (نیند سے بیدار ہوتے وقت)

(۴) عند القیام الی الصلوٰۃ (نماز کے لیے کھڑے ہوتے وقت)

(۵) عند الوضوء (وضو کے وقت)

لہٰذا اس قول کی بنا پر احناف کے نزدیک مسواک کرنا وضوء کے وقت سنت موکدہ ہے اور نماز کے وقت سنت غیر موکدہ، مستحب ہے۔ اور مالکیہ کے نزدیک بھی مسواک کرنا وضوء کی سنت ہے۔ لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر وضوء اور نماز کے درمیان کافی زیادہ وقت کا فاصلہ ہو تو پھر نماز کے وقت بھی مسواک کرنا سنت ہے۔ اور اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ روایات میں مختلف الفاظ آ رہے ہیں لہٰذا احناف علماء نے یہی لکھا ہے کہ اگر نماز سے تھوڑی دیر پہلے وضوء کیا ہو تو پھر وضوء میں مسواک کرنا کافی ہے اور اگر وضو کیے ہوئے کافی دیر ہو چکی ہے تو پھر نماز کے وقت

صرف مسواک کر لی جائے تو بہتر ہے تاکہ تمام احادیث پر عمل ہو جائے۔

اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسواک کی بہت فضیلت ارشاد فرمائی ہے۔نسائی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم مروی ہے کہ مسواک سے منہ کی پاکیزگی اور صفائی حاصل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔اور مسند احمد کی روایت میں ہے "**صلوٰة بسواك افضل من سبعين صلوٰة بغير سواك**"یعنی وہ ایک نماز جو مسواک کر کے پڑھی جائے ان ستر نمازوں سے بہتر ہے جو بغیر مسواک پڑھی جائیں۔"

علامہ ابن القیم اس قدر بڑی فضیلت کی حکمت تحریر فرماتے ہیں کہ مسواک کر کے نماز پڑھنا اہتمام پر دلالت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو بندہ سے عبادات میں اہتمام ہی مطلوب ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسواک کو فطری عبادات میں شمار فرمایا ہے۔

مسواک کے خواص کے سلسلہ میں ملا علی قاری نے بعض علماء سے مسواک کے ستر فوائد نقل کیے ہیں۔ایک جگہ لکھتے ہیں:"**ادناھا تذکر الشهادتين عند الموت**" یعنی مسواک کا ادنیٰ فائدہ یہ ہے کہ موت کے وقت کلمہ شہادت یاد آ جاتا ہے۔علامہ شامی نے بھی یہی بات لکھی ہے لیکن انہوں نے ادناھا کے بجائے "اعلاھا" لکھا ہے یعنی یہ سب سے بڑا فائدہ ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم منقول ہے کہ "اگر میں مسلمانوں کے حق میں مشقت محسوس نہ کرتا اور مجھے مشقت کا ڈر نہ ہوتا تو میں ان کے لیے ہر نماز کے وقت مسواک کو ضروری قرار دیتا۔" ابوسلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے زید بن خالد الجھنیؓ کو دیکھا کہ جس وقت وہ مسجد میں نماز کے انتظار میں بیٹھے تھے تو مسواک ان کے کان کے پیچھے اس طرح لگی رہتی جس طرح لکھنے والے کے کان کے پیچھے قلم رکھا رہتا ہے (جیسا کہ ہمارے معاشرہ میں مستری، بڑھئی وغیرہ کان کے پیچھے پینسل لگائے رکھتے ہیں) چنانچہ زید بن خالد جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو کان کے پیچھے سے مسواک نکال کر مسواک کرتے۔اس روایت سے صحابہ کرام کے ہاں مسواک کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

مسواک کی کیفیت اور مسائل کے بارے میں مستقل کتابیں بھی لکھی گئی ہیں جن میں

شیخ احمد الزاہد کی ''تحفۃ السلاک فی فضائل السواک'' کی تصنیف قابل ذکر ہے اور متفرق طور پر مسواک کی کیفیت مسائل کا ذکر تفصیلاً کتب فقہ میں موجود ہے۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ مسواک سیدھی ہو، گرہ دار نہ ہو۔ کم ازکم چار انگل لمبی ہو اور زیادہ سے زیادہ ایک بالشت لمبی ہو مگر باریک ہو۔ پہلے ایک مرتبہ کلی کرلیں۔ پھر مسواک کو دھو کر دائیں ہاتھ میں اس طرح پکڑیں کہ درمیانی تین انگلیاں مسواک کے اوپر، چھنگلیا (سب سے چھوٹی انگلی) نیچے اور انگوٹھا مسواک کے نیچے اور منہ کے سامنے آ جائے۔ مسواک دانتوں کی چوڑائی میں (دائیں بائیں) کریں۔ لمبائی میں نہ کریں۔ (جدید میڈیکل سائنس میں دانتوں کے معالج بھی مریضوں کو تلقین کرتے ہیں کہ برش یا مسواک دانتوں پر اس طرح رگڑیں کہ مسوڑھے زخمی نہ ہوں) پہلے دائیں طرف پھر سامنے کے دانتوں میں پھر بائیں طرف اسی طرح اندر کی طرف۔ تین دفعہ مسواک کرنا اور ہر دفعہ مسواک کو دھو لینا مسنون ہے۔ اگر وقت کم ہو تو ایک دفعہ بھی کر سکتے ہیں۔ علامہ طحطاوی حاشیہ علی مراقی الفلاح ص ۳۸ میں لکھتے ہیں کہ لیٹ کر مسواک کرنا یا مٹھی سے پکڑ کر مسواک نہیں کرنی چاہیے درمختار وغیرہ میں لکھا ہے کہ مسواک چوسنا، فراغت کے بعد دھو کر نہ رکھنا، مسواک کو کھڑا کر کے نہ رکھنا، الٹی کر کے رکھنا، اور کسی دوسرے کی مسواک کرنا منع ہے۔

یہاں جب یہ کہا جائے کہ دوسرے کی مسواک کرنا منع ہے تو یہاں بلا اجازت دوسرے کی مسواک کرنا مراد ہے۔ اگر دوسرا اجازت دے تو پھر جائز ہے جیسا کہ ابوداؤد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسواک فرما رہے تھے اور آپ کے پاس دو شخص حاضر تھے تو آپ نے ان کو اپنی مسواک کرنے کے لیے دی تھی۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسواک زبان پر بھی کرنی چاہیے جس سے زبان بھی صاف ہو جائے گی۔ جیسا کہ حضرت حذیفہؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو بیدار ہوتے تو مسواک کے ذریعہ اپنے منہ کو صاف کرتے تھے۔

جدید دور میں برش، منجن، پیسٹ کے بارے میں سوال ابھرتا ہے کہ کیا یہ مسواک کا بدل ہوسکتا ہے۔ تو اس کا واضح جواب یہ ہے کہ مسواک کا فائدہ یعنی دانتوں کی صفائی تو یقیناً برش سے حاصل ہوسکتی ہے لیکن سنت اسی وقت اداء ہوگی جب مسواک لکڑی کی ہو اور اسی کیفیت میں

ہو جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔

اس لیے برش، سنت مسواک کے قائم مقام نہیں ہوسکتا۔ اس جواب کو تنگ نظری یا دقیا نوسیت پر محمول نہ کیا جائے اس لیے کہ نشتر میڈیکل کالج ملتان کے پروفیسر آف میڈیسن ڈاکٹر نور احمد نور اپنے تحقیقی مقالہ ''دین فطرت'' میں لکھتے ہیں کہ ''یورپ میں اب اس بات پر ریسرچ ہو رہی ہے کہ دانتوں کی صفائی اور صحت کے لیے بہترین مسواک کون سی ہے کیونکہ وہاں کے ماہرین کا اس بات پر اتفاق ہو چکا ہے کہ مسواک کا ریشہ اب تک دریافت ہونے والے ریشوں میں سے دانتوں کے لیے بہترین اور موزوں ترین ہے۔''

صاحب مراقی الفلاح نے ص ۳۸ میں حضرت علیؓ، عباسؓ، حضرت عطاءؒ سے مسواک کے بہت سے فضائل تحریر فرمائے ہیں۔ جن میں سے چند ایک یہ ہیں' اللہ تعالیٰ کی رضا مندی حاصل ہوتی ہے' نماز کے ثواب میں اضافہ ہوتا ہے، رزق میں کشادگی، منہ کی صفائی، مسوڑھوں کی مضبوطی، سردرد میں کمی، بلغم کا علاج، دانتوں کی مضبوطی، چمک اور سفیدی میں اضافہ، بینائی میں اضافہ، معدہ کی درستگی، بدن کی طاقت، فصاحت میں اضافہ، یادداشت اور حافظہ میں اضافہ، ہضم طعام میں معاون اور اب جدید سائنس میں بھی دانتوں کی صفائی کو بہت سی بیماریوں سے بچاؤ کا طریقہ قرار دیا گیا ہے۔

لیکن ایک مسلمان تو صرف اسی لیے مسواک کرے گا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ پھر اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ اس کو دنیا و آخرت کے فیوض و برکات بھی ضرور نصیب فرمائے گا۔



نماز باجماعت میں صف کے فضائل، احکام اور اہمیت

﴿عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنه قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم سو واصفوفکم فان تسویة الصف من تمام الصلوة﴾

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صفوں کو برابر رکھا کرو۔ پس بے شک صف کی برابری و درستی نماز ہی کی تکمیل کا حصہ ہے''(رواہ البخاری ومسلم)

باجماعت نماز ادا کرتے ہوئے صفوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصی ہدایات ارشاد فرمائی ہیں۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بے شک اللہ رحمتیں بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے دعائیں کرتے ہیں پہلی صف کے لیے یا یہ فرمایا کہ پہلی صفوں کے لیے۔''(رواہ احمد باسناد جید۔مجمع الزوائد ج۲ص۹۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کچھ لوگ مسلسل (کافی عرصہ تک) صف اول سے پیچھے ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کو جہنم کا مستحق کر کے پیچھے ہی کر دیتا ہے۔(رواہ ابوداؤد) محدثین نے اس کا مطلب یہ لکھا ہے کہ ان کی بدعملی اور کوتاہی کا یہ اثر ہوتا ہے کہ یہ لوگ جہنم کے مستحق ٹھہرا دیئے جاتے ہیں۔ (الترغیب والترہیب جلد دوم ص۴۲)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوں کو سیدھا رکھنے کی بہت تاکید فرمائی۔ حضرت

براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صف کے کنارے تک تشریف لاتے اور لوگوں کے سینوں اور کندھوں کو برابر کیا کرتے تھے اور فرماتے تھے تم مختلف (یعنی آگے پیچھے) نہ رہو کہیں (اس کے نتیجہ میں) تمہارے دلوں میں آپس کے اندر اختلاف نہ پیدا ہو جائے۔ (رواہ ابن خزیمہ فی صحیحہ)

جہاں ہر نیک عمل کا اثر ہوتا ہے وہاں ہر بدعمل پر اللہ کی طرف سے اس کی سزا ملتی ہے اور پھر اس بدعملی کے اثرات اس دنیا میں بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ صفوں کی بے ترتیبی کا اثر انسانی دلوں پر پڑتا ہے ان میں بھی اختلاف اور انتشار کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو نماز میں اپنے کندھے نرم رکھے۔''

(رواہ ابوداؤد رواہ والبزار باسناد حسن)

محدثین نے اس کا مطلب یہ لکھا ہے کہ صفیں درست کرنے کے لیے اگر اس کے کندھے پکڑ کر درست کرنے کی ضرورت پیش آئے تو وہ نماز میں اکڑ کر نہ کھڑا ہو اگر امام یا کوئی دوسرا شخص اسے کندھوں سے پکڑ کر درست کرے تو اسے اپنی توہین نہیں سمجھنا چاہیے۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری صفوں کو اس قدر سیدھا کیا کرتے تھے گویا کہ آپ ان کے ذریعہ تیروں کو سیدھا کریں گے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اندازہ کر لیا کہ ہم نے اس بات کو خوب سمجھ لیا ہے۔ اس کے بعد ایک روز آپ نماز پڑھانے کے لیے تشریف لائے، نماز کے لیے کھڑے ہوئے یہاں تک کہ قریب تھا کہ آپ تکبیر کہتے (اللہ اکبر کہہ کر نماز شروع کر دیتے) اتنے میں ایک شخص کا سینہ صف سے کچھ باہر نکلا ہوا نظر آیا آپ نے فرمایا: اللہ کے بندو! اپنی صفوں کو سیدھا رکھا کرو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے چہروں کو ایک دوسرے کے مخالف کر دے گا۔ (رواہ مالک، ومسلم وابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوں کے درمیان خالی جگہ چھوڑنے کی بھی ممانعت

فرمائی ہے۔حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنی صفوں میں (نماز میں شریک افراد کو) ایک دوسرے سے خوب اچھی طرح ملا لیا کرو اور صفوں کے قریب قریب رکھا کرو اور گردنیں برابر رکھا کرو۔ اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں شیطان کو اچھی طرح دیکھتا ہوں کہ وہ صف کی خالی جگہوں میں بکری کے بچوں کی طرح گھس جاتا ہے۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی، وابن خزیمہ)

صفیں درست کرنے کے لیے کندھے، گردنیں اور ایڑیاں دیکھنی چاہئیں۔ عام طور پر لوگ پاؤں کی انگلیاں دیکھ کر صفیں سیدھی کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس سے صف سیدھی نہیں ہوتی۔

اس طرح یہ بات بھی انتہائی اہم ہے کہ جب تک اگلی صف میں جگہ باقی ہو پچھلی صف شروع نہیں کرنی چاہیے اور شروع کی جا چکی ہو تو بعد میں آنے والے کو پچھلی صف کی بجائے اگلی صف میں کھڑا ہونا چاہیے جہاں جگہ ابھی باقی ہے۔

حدیث میں صف توڑنے کی جو ممانعت آئی ہے اس کا مطلب محدثین نے یہ بیان فرمایا ہے کہ صف میں سے بلا عذر نکل کر چلا جائے یا صف کے درمیان ایسی جگہ پر کوئی سامان رکھ دے کہ صف پوری نہ ہو سکے یا خالی جگہ دیکھنے کے باوجود اسے پر نہ کرے یہ سب باتیں صف توڑنے میں شامل ہیں۔ (مرقاۃ شرح مشکوۃ جلد۲ ص۸۳)

صف کے دائیں اور بائیں حصے کی فضیلت بھی ارشادات نبویہ میں تفصیل سے موجود ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صفوں کے داہنے حصوں پر اللہ تعالیٰ رحمت نازل فرماتا ہے اور فرشتے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجہ)

جس طرح پہلی صف اور باقی صفوں کے درمیان ثواب کے مختلف درجات ارشادات نبویہ میں آ رہے ہیں اسی طرح ایک صف کے مختلف حصوں کے درجات میں فرق ہے۔

اول درجہ امام کے بالکل پیچھے کھڑا ہونے کا ہے دوسرا درجہ صف کے داہنے حصے کا

ہے۔ تیسرا درجہ صف کے بائیں حصہ کا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک ضعیف روایت میں ہے کہ ایک صحابی رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجیے جو مجھے جنت میں پہنچا دے آپ نے فرمایا اذان کہا کرو، انہوں نے کہا یہ تو مجھ سے نہیں ہوسکتا فرمایا امام بن جاؤ عرض کیا یہ بھی میرے بس سے باہر ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بس تم امام کے پیچھے اس کے بالمقابل کھڑے ہوا کرو۔

(رواہ البخاری فی تاریخہ والطبرانی فی الاوسط۔ وقال الہیثمی فیہ محمد بن اسمعیل الضبی وھو منکر الحدیث۔ الترغیب باب ماجاء فی فضل الاذان جلد اص ۱۸۱ احیاء علوم الدین بتخریج العراقی جلد اص ۱۵۶ مجمع الزوائد جلد اص ۳۲۷)

یہ روایت اگرچہ ضعیف ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ صف اول میں امام کے پیچھے وہ شخص جگہ پا سکتا ہے جو سب سے پہلے مسجد میں پہنچ جائے۔

بعض لوگ اپنی جگہ روکنے کے لیے کپڑا وغیرہ ڈال کر رکھ دیتے ہیں اس کے بارے میں تحقیق یہ ہے کہ جو شخص مسجد میں پہلے آجائے وہ خالی جگہ کا مستحق ہے پس اگر کوئی پہلے آکر جگہ روک لے اور پھر وضو وغیرہ میں مشغول ہو جائے تو اس کا جگہ روکنا صحیح ہے۔ لیکن اگر جگہ روک کر گھر چلا جائے یا بازار میں پھرتا رہے تو اس کا جگہ روکنا جائز نہیں۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل جلد دوم ص ۲۱۸)

دوسرا درجہ صف کے داہنے حصے کا ہے اس لیے صف میں شریک ہوتے وقت دیکھنا چاہیے اگر صف کا دایاں حصہ بائیں حصہ کے مقابلہ میں کم ہے یا برابر ہے تو دہنی طرف کھڑا ہونا چاہیے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لوگوں نے عرض کیا کہ مسجد کا بایاں حصہ (لوگوں کے کھڑے نہ ہونے کی وجہ سے) بے کار ہو کر رہ گیا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مسجد کا بایاں حصہ آباد کرے گا اسے دوگنا اجر ملے گا۔

(رواہ ابن ماجہ وابن خزیمۃ مجمع الزوائد جلد ۱ ص ۹۲ سنن ابن ماجہ باب فضل میمنۃ الصّف ص ۷۵)

صف اول کا ثواب حاصل کرنے کے لیے اور تھوڑی سی خالی جگہ کو پر کرنے کے خیال سے بعض لوگ پہلی صف میں گھسنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن تنگ ہونے کی وجہ سے بسااوقات خود آنے والے شخص کو بھی پریشانی ہوتی ہے، یا پھر کندھے پھلانگ کر دوسروں کو تکلیف میں مبتلا کر کے پھر آگے آتے ہیں ان باتوں سے پرہیز کرنا ضروری ہے ورنہ ایذاء مسلم کا گناہ ذمہ میں آ جائے گا۔

حصرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے صف اول اس خیال سے چھوڑ دی کہ کسی کو تکلیف پہنچے گی تو اللہ تعالیٰ اس کا اجر بڑھا کر صف اول کے برابر کر دے گا۔

(رواہ الطبرانی فی الاوسط وفیہ نوح بن ابی مریم وھوضعیف)

اس لیے جو لوگ موجود ہوں انہیں چاہیے کہ صفوں کے درمیان جگہ چھوڑ کر نہ بیٹھیں تو لوگ بھی گردنیں پھلانگ کر نہیں آئیں گے اور اگر اگلی صفوں میں آ کر ثواب حاصل کرنے کا شوق ہو تو یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ آرام سے بغیر کسی کو تکلیف دیئے کھڑے ہونے کے قابل جگہ ہے یا نہیں، جب اگلی صف کے شوق کے باوجود یہ جذبہ بھی ہو کہ کسی کو تکلیف نہ پہنچے تو اللہ تعالیٰ اس جذبہ کی قدر کرتے ہوئے پچھلی صف میں بھی اگلی صف کا ثواب عطا فرما دے گا۔



صلوٰۃ الحاجۃ کا مسنون طریقہ، فضیلت، احکام

﴿وعن عبدالله بن ابی اوفی رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من کانت له حاجة الی الله اوالی احد من بنی أدم فلیتوضا فلیحسن الوضوء ثم لیصل رکعتین ثم لیثن علی الله تعالیٰ ولیصل علی النبی صلی الله علیه وسلم ثم لیقل لا اله الا الله الحلیم الکریم سبحان الله رب العرش العظیم والحمد لله رب العلمین اسئلك موجبات رحمتك وعزائم مغفرتك والغنیمة من کل بروالسلامة من کل اثم لا تدع لی ذنبا الا غفرته ولا هما الا فرجته ولا حاجة هی لك رضا الا قضیتها یا ارحم الراحمین.﴾ (رواه الترمذی وابن ماجه وقال الترمذی هذا حدیث غریب. ترمذی باب ماجاء فی صلوٰة الحاجة جلد اول ص [illegible]، [illegible]، مشکوٰة باب التطوع، فصل ثانی ص [illegible])

”حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی خدا سے حاجت رکھتا ہو یا کسی آدمی سے حاجت ہو (یعنی اسے کوئی دینی یا دنیوی حاجت پیش آئے) تو اسے چاہیے کہ وضو کرے اور خوب اچھی طرح وضو کرے پھر دو رکعت نماز پڑھے پھر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھے اور اس کے بعد یہ دعا پڑھے لا اله الا الله الحلیم الکریم سے یا ارحم الراحمین تک (یہ دعا شروع میں مذکور حدیث میں موجود ہے) جس کا ترجمہ یہ ہے:“

”اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ بڑے حلم والا بڑے کرم والا ہے۔

پاک اور مقدس ہے وہ اللہ جو عرشِ عظیم کا بھی پروردگار اور خالق ہے تمام تعریفیں اسی اللہ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ اے اللہ میں تجھ سے ان تمام اعمال واخلاق اور ان تمام چیزوں کا سوال کرتا ہوں جو تیری رحمت کا مستحق بنا دیتی ہیں اور جو تیری مغفرت کا پختہ اور مضبوط ذریعہ ہیں اور تجھ سے سوال کرتا ہوں ہر نیکی میں سے بھر پور حصہ لینے (کی توفیق) کا اور ہر گناہ سے سلامتی اور حفاظت کا (اے اللہ) میرے تمام گناہ بخش دے اور میرے تمام غموں اور پریشانیوں کو دور فرما دے اور میری کوئی حاجت ایسی نہ چھوڑ جو تیری رضا کا سبب بنے مگر یہ کہ تو اسے پورا فرما دے اے سب مہربانوں میں سے بڑے مہربان۔"

یہی دعا ترمذی، ابن ماجہ اور حاکم میں موجود ہے، اس روایت کی سند میں کلام ہے۔

امام ترمذی نے فرمایا **وفی اسناده مقال قائد بن عبدالرحمن یضعف فی الحدیث وقائد ھو ابو الورقاء.** "(ترمذی جلد اول ص ۱۰۹)

لیکن حاکم نے مستدرک جلد اول صفحہ ۳۲۰ میں فرمایا:

﴿"**وھو مستقیم الحدیث" وقال الذھبی فی تلخیص المستدرك بل متروك. وقال المنذری متروك روی عنه الثقات و قال ابن عدی مع ضعفه یکتب حدیثه وقال السیوطی فی اللالی قال ابو الورقاء قائد مستقیم الحدیث.**"﴾

مشہور دعاؤں کی کتاب "حصن حصین" صفحہ ۲۰۵ میں امام محمد بن محمد الجزری الشافعی ؒ نے "صلوٰۃ الحاجۃ" کی یہی دعا لکھی ہے لیکن اس میں "عزائم مغفرتک" کے بعد والعصمۃ من کل ذنب کا جملہ بھی موجود ہے۔

صلوٰۃ الحاجۃ کا ایک اور طریقہ بھی بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے جیسا کہ حاکم کی

روایت میں ہے کہ:

''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (صلوٰۃ الحاجتہ کا طریقہ سکھاتے ہوئے) فرمایا کہ رات کو یا دن کو کسی وقت بارہ رکعت نماز پڑھو اور ہر دو رکعتوں کے درمیان التحیات پڑھو۔ پھر جب اس نماز کی آخری رکعت میں تشہد پڑھ لو تو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرو اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھو پھر سجدہ کی حالت میں سات مرتبہ سورہ فاتحہ اور سات مرتبہ آیۃ الکرسی پڑھو اور دس مرتبہ یہ دعا پڑھو۔

﴿لا الـه الا الله وحده لا شريك له له الملك وله الحمد وهو علی كل شئ قدير﴾

''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اسی کی حقیقی بادشاہی ہے تمام تعریفیں اس کے لیے ہیں اور وہ ہر چیز پر قدرت والا ہے۔''

اس کے بعد ایک مرتبہ یہ دعا پڑھو:

﴿اللهم انی اسئلك بمعا قد العز من عرشك ومنتهی الرحمة من كتابك واسمك الاعظم وجدك الاعلی وكلماتك التامة﴾

''اے اللہ میں تجھ سے تیرے عرش عظیم کے غلبہ و اقتدار کی بنیادوں اور مرکزوں کے واسطے سے اور تیری کتاب کی رحمت کی آخری حدوں کے وسیلے سے اور تیرے اسم اعظم اور تیرے مرتبہ عالی اور تیرے مکمل کلمات کے وسیلے سے تجھ سے سوال کرتا ہوں۔''

اس کے بعد اپنی ضرورت اور حاجت مانگیں اور اس کے بعد سجدے سے سر اٹھائیں اور دائیں بائیں سلام پھیر دیں۔ (اس کے بعد روایت میں یہ الفاظ ہیں)

ولا تعلموها السفهاء فانهم يدعون بها فيستجابون۔ (یعنی یہ طریقہ ناسمجھ

لوگوں کو نہ سکھاؤ ورنہ وہ (بے سوچ سمجھے) دعائیں کر لیں گے اور وہ قبول ہو جائیں گی)۔(رواہ الحاکم والدیلمی ورواہ ابونعیم فی الحلیۃ من قول وہب بن الورد بسند قواہ الزبیدی فی شرح الاحیاء انتخاب الترغیب والترہیب اردو جلد دوم ص ۱۱۵،۱۱۶)

امام ابوعبداللہ حاکم یہ روایت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ احمد بن حرب نے کہا ہے کہ میں نے اس کا تجربہ کیا اور صحیح پایا۔ ابراہیم بن الدبیلی کہتے ہیں کہ میں نے بھی اس کا تجربہ کیا اور درست پایا۔ حاکم کہتے ہیں کہ مجھ سے ابوزکریا نے بیان کیا کہ میں نے اسے آزمایا اور صحیح پایا۔ اور خود حاکم فرماتے ہیں کہ میں نے بھی اس کا تجربہ کیا تو حق پایا۔

بہرحال اس حدیث کی سند کمزور ہے اور محدثین کے معیار انتخاب سے کم ہے لیکن حافظ زکی الدین المنذری اور حافظ ابن حجر عسقلانی جیسے بلند پایہ ناقدین نے اس روایت کو یہ کہہ کر قبول کرلیا ہے کہ **والا عتماد فی مثل ھذا علی التجربۃ لا علی الاسناد**۔ یعنی اس طرح کی روایات پر سند کی وجہ سے نہیں بلکہ تجربہ کی بنیاد پر اعتماد کرلیا جاتا ہے۔

صلوٰۃ الحاجتہ کے اس طریقہ میں ایک اور بات بھی ہے جس میں بحث کی جاتی ہے کہ اس طریقہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ سجدہ میں جا کر سورہ فاتحہ اور آیۃ الکرسی پڑھیں جبکہ صحیح مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اور صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ **الا انی نھیت ان اقرا القران راکعا او ساجدا**۔(مشکوٰۃ باب الرکوع صفحہ نمبر ۸۲) اس روایت سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ میں قرآن کریم کی تلاوت کرنے سے منع فرمایا۔

چنانچہ امام ترمذی نے فرمایا:

﴿**وھو قول اھل العلم من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ومن بعدھم کرھوا القراۃ فی الرکوع والسجود.**﴾

(ترمذی جلد اول صفحہ)

مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ لکھتے ہیں کہ "اگر رکوع یا سجدہ میں بھول کر قرأت کر لے تو

اس میں دوقول ہیں ایک یہ کہ سجدہ سہو لازم آئے گا دوم یہ کہ سجدہ سہو لازم نہیں آئے گا۔صاحب بحر نے پہلے قول کو ظاہر کہا ہے یعنی اس صورت میں سجدہ سہو لازم آئے گا۔

(آپ کے مسائل اور ان کا حل جلد دوم ص ۲۱۲)

بعض محدثین نے رکوع اور سجدہ میں قرآن حکیم پڑھنے کی ممانعت کو کراہت تنزیہی پر محمول کیا ہے جیسا کہ مشکوٰۃ کے بعض محشین نے لکھا ہے اور بعض علماء نے نوافل کے اندر حالت سجدہ میں دعاؤں کی صورت میں قرأت کی گنجائش بیان کی ہے۔ جیسا کہ مولانا محمد عبداللہ طارق دہلوی نے انتخاب الترغیب والترہیب جلد دوم صفحہ ۱۱۶ میں صلوٰۃ الحاجتہ کے زیر بحث طریقہ پر حاشیہ میں لکھا ہے کہ ''مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ سجدہ میں خوب دل لگا کر دعا کرنی چاہیے۔'' نیل الاوطار جلد ۲ ص ۹۸۔ سورہ فاتحہ اور آیت الکرسی قرآن ہونے کے ساتھ دعا بھی ہے۔اس لیے ان دونوں کو سجدہ میں پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔''

خلاصہ بحث یہ کہ اکثر علماء کے نزدیک معتبر اور مشہور طریقہ صلوٰۃ الحاجتہ کا وہی ہے جو آغاز کی حدیث میں بروایت حضرت عبداللہ بن ابی اوفی ذکر کیا گیا۔ دراصل ہر طرح کی حاجتوں اور تمناؤں کے لیے نماز کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنا قرآن مجید سے ثابت ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿یا ایھاالذین امنوا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ﴾

''اے ایمان والوتم اللہ سے مدد طلب کروصبر اور نماز کے ساتھ''

(البقرہ آیت ۱۵۳)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب بھی آپ کو کوئی پریشانی لاحق ہوتی یا کوئی اہم واقعہ پیش آجاتا تو آپ نماز میں مشغول ہو جاتے۔

لہٰذا ایک مومن کا یہ طریقہ ہونا چاہیے کہ ہر کام کے لیے اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے طریقہ پر چلے اور یہ یقین رکھے کہ میری تمام تدبیروں کو کامیاب بنانے والا صرف اللہ ہے پھر اسی سے اپنی حاجات کو مانگے' غیر اللہ سے مانگ کر شرک کی حدود میں داخل

ہونے کی کوشش نہ کرے۔

جو شخص یقین اور اعتماد کے ساتھ صلوٰۃ الحاجتہ کو اپنا معمول بنا لیتا ہے وہ واضح طور پر اس کے فوائد اور برکات کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ ہم سب کی جائز حاجات کو پورا کرے۔آمین

☆☆☆

استخارہ کا مسنون طریقہ، حقیقت واحکام

﴿عن جابر بن عبدالله رضی الله عنه قال کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یعلمنا الا ستخارة فی الامورا کلها الحدیث﴾

(رواہ البخاری)

ہر سلیم الفطرت انسان کو چاہیے کہ وہ نیک کام کرے اور جو کام بھی کرے اس میں خیر ہی خیر ہو نقصان اور شر نہ ہو۔ انسان اپنے محدود علم اور ناقص تجربہ کی وجہ سے اپنے معاملات کے نفع ونقصان سے بسا اوقات ناواقف ہوتا ہے کوئی انسان کام کرنا چاہتا ہے لیکن اسے یہ خطرہ رہتا ہے کہ یہ کام میرے لیے مفید ہے یا نہیں۔ اس اندیشے اور خطرہ کی فکر نے انسان کو اس بات کی طرف مائل کیا کہ وہ اپنے ہونے والے یا کرنے والے کام کی برائی یا بھلائی معلوم کرنے کا طریقہ معلوم کرے چنانچہ مختلف ادوار میں لوگوں نے مختلف طریقے آزمائے کسی نے پرندوں کے اڑنے کی سمت سے اس کام کے خیر اور شر کو معلوم کیا۔ بعض نے ستاروں وغیرہ کا سہارا لیا۔ کسی نے مختلف کاموں کو خیر وشر کی علامت بنایا مثلاً کالی بلی گزر گئی تو یہ راستہ اب اختیار نہ کرو اس میں شر ہے۔ اہل عرب نے جوئے کے تیروں کو اپنے معاملات میں خیر وشر کے معلوم کرنے کے لیے استعمال کیا۔

الغرض انسان کے سامنے ایک ضرورت تھی، ضرورت ایجاد کی ماں ہے چنانچہ نت نئے طریقے خیر وشر معلوم کرنے کے لیے آزمائے جاتے ہیں۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں ہدایت کے ساتھ دنیا وآخرت کی مکمل راہنمائی عطا کر کے بھیجا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کاموں میں خیر معلوم کرنے کا حقیقی اور سچا طریقہ سکھایا۔

شرعی طریقے سے ہٹ کر خیر معلوم کرنے کے تمام طریقے انسانی ذہن کی پیداوار ہیں جن میں سچائی صرف ایک اٹکل اور تکہ بازی کی حد تک ہے۔

لیکن استخارہ کا مسنون طریقہ اللہ رب العزت کے پیغمبر کا سکھایا ہوا طریقہ ہے اس لیے استخارہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نہایت اہم عطیہ ہے اور مستقبل کے خطرات سے بچنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

استخارہ کی حقیقت:

''استخارہ'' باب استفعال ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے معنی میں طلب کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے چنانچہ استخارہ کا لفظی معنی ہے خیر طلب کرنا، بھلائی چاہنا اور شرعی اصطلاح میں استخارہ سے مراد یہ ہے کہ جیسا کسی بندہ کو اپنے کسی معاملہ کے مفید یا نقصان دہ ہونے میں تردد ہوتو وہ شخص اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرے کہ اے اللہ تو اس معاملہ کی بہتری اور خیر میرے دل پر واضح فرما دے شک اور تردد کو دور کر کے کسی ایک جانب کو متعین فرما دے جس میں خیر ہو۔

استخارہ کی فضیلت:

استخارہ چونکہ اللہ تعالیٰ سے خیر معلوم کرنے کا ایک طریقہ ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کو کائنات کی ہر چیز اور ہر کام کا مکمل علم ہے اس لیے جس کام کے لیے استخارہ کرلیا جائے اس میں انشاء اللہ کچھ نقصان نہیں ہوسکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

﴿**ماخاب من استخار ولاندم من استشار ولا عال من اقتصد**﴾ (رواہ الطبرانی فی الاوسط والصغیر عن انس، مجمع الزوائد جلد۸ ص ۲۸۰)

یعنی ''جو شخص استخارہ کرتا ہے وہ ناکام نہیں ہوتا اور جو مشورہ کرتا ہے اسے شرمندگی نہیں ہوتی اور جو میانہ روی اختیار کرتا ہے وہ محتاج نہیں ہوتا۔''

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ **من سعادة ابن آدم استخارته الله عزوجل** ۔یعنی آدمی کی نیک بختی میں سے یہ بات بھی ہے کہ وہ (اپنے معاملات کے بارے میں) اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرے۔

(مسند احمد جلد ۳ صفحہ ۲۸ حدیث ۱۴۴۴) بحاشیہ احمد محمد شاکر مطبوعہ دارالمعارف مصر ۱۳۷۵ھ میں یہ اضافہ بھی موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ومن شقوۃ ابن آدم ترکہ استخارۃ اللہ۔ یعنی آدمی کی بدنصیبی میں سے ہے کہ وہ استخارہ کرنا چھوڑ دے۔

معلوم ہوا کہ جو شخص کوئی اہم کام اس کے کام کے نفع ونقصان کو جانے بغیر شروع کر دے اس کے لیے کامیابی اور ناکامی دونوں کے امکانات موجود ہیں اور جو شخص پہلے استخارہ کر کے اس کام کے لیے قدم اٹھاتا ہے تو وہ بلاشبہ خوش قسمت اور سعادت مند ہے۔

استخارہ کا مسنون طریقہ:

صحیح بخاری، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں (صحابہ کرام) کو تمام معاملات کے لیے استخارہ اس طرح (اہمیت کے ساتھ) سکھاتے تھے جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں قرآن کریم کی کوئی سورت سکھاتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ جب تم میں سے کوئی شخص کسی (اہم) کام کا ارادہ کرے تو اسے چاہیے کہ وہ دو رکعت نفل پڑھے اور پھر یہ دعا کرے۔

﴿اللھم انی استخیرك بعلمك و استقدرك بقدرتك و اسئلك من فضلك العظیم فانك تقدر ولااقدر وتعلم ولا اعلم وانت علام الغیوب. اللھم ان كنت تعلم ان ھذا الامر خیر لی فی دینی و معاشی وعاقبة امری فاقدرہ ویسرہ لی ثم بارك لی فیہ وان كنت تعلم ان ھذا الامر شرلی فی دینی و معاشی و عاقبة امری فاصرفہ عنی واصرفنی عنہ واقدر لی الخیر حیث كان ثم ارضنی بہ﴾

"اے اللہ میں تیرے علم کے ذریعہ اپنے معاملہ میں خیر کی صورت معلوم کرنا چاہتا ہوں اور تیری قدرت کاملہ سے قدرت حاصل کرنا چاہتا ہوں اور تیرے عظیم فضل کی وجہ سے تجھ سے سوال کرتا ہوں اس لیے کہ تو

قدرت والا ہے اور مجھے قدرت نہیں اور تجھے علم ہے اور مجھے کچھ علم نہیں یقیناً تو ہی پوشیدہ باتوں کا جاننے والا ہے۔ اے اللہ اگر تیرے علم میں اس کام کے اندر میرے لیے خیر ہے میرے دین کے لحاظ سے میری معاش اور میری آخرت وانجام کے بارے میں تو اس کام کو میرے لیے مقدر فرما دے اور یہ کام میرے لیے آسان کر دے پھر میرے لیے اس میں برکت عطا فرما۔ اور اگر تو جانتا ہے کہ یہ کام میرے لیے دین، دنیا یا انجام کے اعتبار سے اچھا نہیں تو اس کو مجھ سے پھیر دے اور مجھے اس کی طرف سے پھیر دے اور میرے لیے خیر اور بھلائی مقدر فرما دے خواہ وہ کہیں ہو پھر اس پر مجھے راضی اور مطمئن فرما دے۔''

ایک روایت میں ''عاقبۃ امری'' کی جگہ ''عاجل امری وآجلہ'' ہے۔ لیکن حضرت تھانویؒ نے عاقبۃ امری والی روایت کو ذکر فرمایا ہے۔ (بحوالہ بہشتی زیور حصہ دوم ص ۳۳۰)

جب ہذا الامر (جہاں اوپر لکیر لگی ہے) پر پہنچے تو اس کو پڑھتے وقت اس کام کا خیال ذہن میں لے آئے جس کے بارے میں استخارہ کرنا چاہے۔ اس کے بعد پاک صاف بستر پر قبلہ کی طرف منہ کر کے باوضو سو جائے۔ (ردالمحتار جلد اص ۷۱۸)

جب سو کر اٹھیں اس وقت جو بات دل میں مضبوطی سے آئے اور جس طرف طبیعت کا رجحان زیادہ ہو وہی بہتر ہے اسی کو کرنا چاہیے۔

استخارہ کے اہم مسائل:

(۱) اگر ایک دن استخارہ کر کے کچھ معلوم نہ ہو یا کسی بات پر دل نہ جمے اور دل کا خلجان اور تردد نہ جائے تو دوسرے دن پھر ایسا ہی کریں اس طرح سات دن کریں انشاءاللہ اس کام کی اچھائی اور برائی معلوم ہو جائے گی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم کسی کام کا ارادہ کرو تو اپنے پروردگار سے سات مرتبہ استخارہ کر لو پھر دیکھو کہ کون سا کام

تمہارے دل کی طرف جاتا ہے پس بے شک اس میں خیر ہے۔

(رواہ ابن السنی فی عمل الیوم واللیلۃ صفحہ ۱۶۱۔ دائرۃ المعارف حیدر آباد ۱۳۵۸ھ)

(۲) اگر کسی وجہ سے نماز استخارہ مشکل لگے تو پھر صرف دعا سے بھی استخارہ کیا جا سکتا ہے۔ (ردالمختار جلد ۱ ص ۷۱۸) میں ہے **ولوتعذرت علیه الصلوٰۃ استخارہ بالدعاء.**

(۳) استخارہ کے بعد خواب میں کچھ دکھائی دینا ضروری نہیں کبھی خواب میں کچھ اشارہ ہو جاتا ہے لیکن اس اشارہ یا خواب کا انتظار نہیں کرنا چاہیے بلکہ دل کے میلان کو دیکھنا چاہیے۔ اسی بات کی ارشاد نبوی میں تلقین ہے۔

(کمارواہ ابن السنی انتخاب الترغیب والترہیب جلد ۲ ص ۱۲۸)

(۴) اگر استخارہ کے لیے طویل دعا یاد نہ ہو سکے یا نہ پڑھ سکے تو یہ مختصر سی دعا گیارہ مرتبہ پڑھے:

﴿اللهم خرلي واخترلي.﴾

''اے اللہ میرے لیے خیر فرما اور میرے لیے بہتر صورت اختیار فرما''

(کتاب الاذکار للنووی صفحہ ۱۲۳ مطبع حجازی قاہرہ)

(۵) صوفیائے کرام اور عاملین کے ہاں استخارہ کے بہت سے طریقے رائج ہیں جو اگرچہ قرآن وحدیث کے اشارات اور ذاتی تجربات ہی سے سمجھے گئے ہیں لیکن سب سے زیادہ اہم اور بہتر طریقہ وہی ہے جو ارشاد نبوی میں مذکور ہے (جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے) لیکن چونکہ ان طریقوں کی ممانعت پر بھی کوئی دلیل نہیں ہے اس لیے ان پر عمل کرنا جائز ہے۔ حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ لکھتے ہیں کہ صوفیائے کرام کے مجوزہ استخاروں کے ساتھ اگر یہ مسنون دعا بھی شامل کر لی جائے تو بہتر ہے۔

(معارف السنن شرح سنن ترمذی جلد ۴ صفحہ ۲۷۸۔۲۷۹ مطبوعہ کراچی ۱۳۸۸ھ)

(۶) استخارہ ان کاموں کے لیے کیا جاتا ہے جن کا خیر اور شر ہونا باعتبار نتائج کے معلوم نہ ہو لیکن جو کام شرعاً و اخلاقاً واجب اور ضروری ہیں یا وہ کام ناجائز اور حرام ہیں ان کے لیے استخارہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر حج کے لیے جانا ہو تو یہ استخارہ نہ کریں کہ میں

حج کے لیے جاؤں یا نہ جاؤں۔ ہاں البتہ اس بارے میں استخارہ ہوسکتا ہے کہ ہوائی جہاز سے سفر کروں یا بحری جہاز سے اور کس کو اپنا ہمسفر بناؤں۔

(بہشتی زیور دوسرا حصہ ص۳۴ ردالمختار جلد ا ص ۷۱۸)

(۷) استخارہ کرنے کے بعد اگر مرضی کے مطابق کامیابی نہ ہو (تو استخارہ کی برکت ضرور ہوتی ہے اس لیے) اسی کو خیر سمجھے۔(امدادالفتاوی)

(۸) اگر کوئی شخص خود استخارہ نہ کر سکے تو دوسرے سے استخارہ کروا سکتا ہے مگر بہتر یہ ہے کہ خود ہی استخارہ کرے۔

اللہ رب العزت ہمیں اپنے کاموں میں استخارہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔



حفاظت صلوٰۃ کی برکت اور حفاظت صلوٰۃ نہ کرنے کی نحوست

﴿عن عبداللہ بن عمرو بن العاص عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ ذکر الصلوٰۃ یوما فقال من حافظ علیھا کانت لہ نورا وبرھانا ونجاۃ یوم القیمۃ ومن لم یحافظ علیھا لم تکن لہ نورا ولا برھانا ولا نجاۃ فکان یوم القیمۃ مع قارون و فرعون و ھامان وابی بن خلف﴾ (رواہ الدارمی والبیھقی)

''حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز نماز کا ذکر کیا پس فرمایا جو شخص نماز کی حفاظت کرتا ہے تو یہ نماز اس کے لیے نور کا سبب ہوگی، کمال ایمان کی دلیل اور قیامت کے دن بخشش کا ذریعہ ہوگی اور جو نماز کی حفاظت نہ کرے اس کے لیے نہ نور ہوگا نہ کمال ایمان کی دلیل ہوگی' نہ بخشش کا ذریعہ ہوگا اور وہ قیامت کے دن قارون، فرعون، ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ اُٹھایا جائیگا (یعنی ان لوگوں کے ساتھ اس کا حشر ہوگا)''

چنانچہ نماز کی حفاظت اور پابندی اتنا اہم عمل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿حافظوا علی الصلوات والصلوٰۃ الوسطی وقوموا اللہ قانتین﴾

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے نمازوں کی حفاظت کا حکم فرمایا: نمازوں کی حفاظت سے مراد یہ ہے کہ ان کے آداب و احکام کو پورا کرتے ہوئے پابندی کے ساتھ نمازوں کو ادا کیا جائے۔

انسان کسی بھی کام کو مکمل حفاظت کے ساتھ اسی وقت پورا کرسکتا ہے جب کہ اس کو

وہ کام بخوبی کرنا آتا ہو اور اسے اس کام کی اہمیت معلوم ہو۔ نماز کی اہمیت قرآن و حدیث میں بہت تفصیل سے بیان کی گئی ہے اور ایک مسلمان کے لیے اس سے زیادہ کون سی بات اہم ہو گی کہ نماز پڑھنے کا حکم اس کے پروردگار نے دیا ہے بار بار اپنے پاکیزہ کلام میں ''اقیموا الصلوٰۃ'' کا حکم فرمایا۔ جب نماز کی اہمیت دل میں پختہ ہو گئی تو اب دوسرے مرحلہ میں اس بات کی ضرورت ہو گی کہ نماز کا عمل خوب اچھی طرح آتا ہو اس کے لیے ہمیں نماز سے متعلقہ کتابیں پڑھنی چاہئیں اپنے بزرگوں اور علماء سے باقاعدہ پوچھ پوچھ کر سیکھنا چاہیے اور پھر جب آپ نماز پابندی سے پڑھیں گے اور اس کے آداب کا خیال رکھتے ہوئے دن میں پانچ باران پر عمل ہو گا تو ظاہر ہے کہ نماز کی حفاظت آسان ہو جائے گی۔

عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی طالب علم کے امتحانات قریب ہیں یا کسی شخص کو کوئی مشکل پیش آ گئی تو وہ پابندی سے پانچ وقت کی نماز مسجد میں ادا کرنے لگتا ہے ایسے لوگوں سے یہ نہیں کہنا چاہیے کہ جناب ضرورت کے پیش نظر عبادت ہو رہی ہے بلکہ ایسے لوگوں سے یہ کہنا چاہیے کہ جب آپ نے پابندی سے چند روز یہ کام کیا ہے تو لازماً آپ کو اس کی عادت پڑ چکی ہو گی کہ نماز کا وقت ہوا تو فوراً تیاری کر کے مسجد کی طرف چلدیئے اب اس عادت کو پوری زندگی جاری رکھنے کی کوشش کیجیے۔

مفسرین لکھتے ہیں کہ حفاظت صلوٰۃ سے مراد یہ بھی ہے کہ نماز کو پابندی سے ادا کیا جائے کسی بھی کام کی پابندی صرف اس وقت ممکن ہے جب کہ اس کام کی عادت پڑ جائے اور ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ کسی کام کی عادت اس وقت پختہ ہوتی ہے جب کام کرنے والے کو اس کام میں لگن اور شوق ہو اور دوسری طرف اس شخص کو کسی بھی قسم کا فائدہ نظر آتا ہو۔ اس لیے ہمیں وہ بشارتیں اور انعامات ذہن میں رکھنے چاہئیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے۔

آخرت میں اللہ تعالیٰ نے جنت اور اس کی بہت سی نعمتوں کا وعدہ نماز کے لیے مقرر فرمایا اور دنیا کی زندگی میں نماز کی ادائیگی کا ثمرہ یہ بیان فرمایا کہ

﴿ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر﴾

یعنی ’’نماز برے کام اور ایسے کاموں سے روکتی ہے جو حیاء کے خلاف ہوں۔‘‘

دیکھئے انسان وقتی بیماری کے لیے وقتی دواء کھاتا ہے اور شفایاب ہو جاتا ہے لیکن اگر بیماری کے جراثیم لمبی مدت تک جسم میں موجود رہنے کا خدشہ ہو تو طویل مدت تک دواء استعمال کی جاتی ہے لیکن انسان کے اندر برے کام پر ابھارنے والا نفس تو ہر وقت موجود رہتا ہے وہ اسے برائیوں پر اکساتا رہتا ہے اور یہ برائی کے جراثیم ساری زندگی عام انسان کے اندر رہتے ہیں لہٰذا اس کا علاج یعنی نماز بھی ساری زندگی ہی جاری رہنا چاہیے۔ رہا یہ کہ نماز کا عمل ساری زندگی کس طرح پابندی سے جاری رکھا جائے تو اس کے لیے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت سامنے آتی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿من صلی اربعین یوما فی جماعۃ تدرکہ التکبیرۃ الاولی کتب لہ براءتان براءۃ من النار وبراءۃ من النفاق﴾

فرمایا ’’کہ جو شخص چالیس دن اس طرح نماز پڑھے کہ جماعت کے ساتھ پہلی تکبیر ہی میں شامل ہوتا رہے تو اس کے لیے چھٹکارے کی دو دستاویزات لکھ دی جاتی ہیں ایک جہنم کی آگ سے چھٹکارے کی دستاویز اور دوسرے نفاق سے بری ہونے کی دستاویز‘‘

اس طرح حدیث پر عمل کرتے ہوئے اتنی بشارت بھی نصیب ہو جاتی ہے اور نماز باجماعت کی عادت بھی ہو جاتی ہے۔

جب ایک دفعہ حفاظت صلوٰۃ کا عمل پختہ ہو جائے تو پھر کسی رکاوٹ کو درمیان میں نہ آنے دیجئے نہ کاروبار نہ دیگر مصروفیات اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کا خاص طور پر اہم مقام بیان فرمایا جنہیں ان کے کاروبار وغیرہ نماز سے غافل نہیں کرتے۔ فرمایا:

﴿رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ واقام الصلوٰۃ﴾

اللہ تعالیٰ ہمیں نماز کے آداب و مسائل کو ملحوظ رکھتے ہوئے پابندی سے نماز ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔



قنوتِ نازلہ

﴿عن عاصم الاحول قال سالت أنس بن مالك رضى الله عنه عن القنوت فى الصلوٰة كان قبل الركوع اوبعده قال قبله إنما قنت رسول الله صلى الله عليه وسلم بعد الركوع شهرا انه كان بعث أناسا يقال لهم القراء سبعون رجلا فأصيبوا فقنت رسول الله صلى الله عليه وسلم بعد الركوع شهرا يدعوا عليهم﴾(متفق عليه)

''عاصم احول کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے نماز میں قنوت کے بارے میں پوچھا کہ قنوت رکوع سے پہلے پڑھی جائے یا رکوع کے بعد؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رکوع سے پہلے پڑھی جائے اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع کے بعد صرف ایک مہینہ تک قنوت پڑھی تھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند افراد کو جنہیں ''قراء'' کہا جاتا تھا اران کی تعداد ستر تھی باہر بھیجا تھا ان کو شہید کر دیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قاتلوں کے خلاف بدُدعا کرنے کیلئے ایک مہینہ تک رکوع کے بعد قنوت پڑھی جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم قاتلوں کے لیے بددعاء کرتے تھے۔''

اسی روایت کی مزید وضاحت صحیحین کی ایک اور روایت سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ستر قراء صحابہ کرام کو معلم بنا کر بھیجا راستہ میں بنوسلیم کے دو قبیلوں رعل اور ذکوان نے بدعہدی کرتے ہوئے انہیں شہید کر دیا۔ اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پتہ چلا تو بہت دکھ ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہینہ تک فجر کی نماز میں قنوت نازلہ پڑھی اور ان ظالموں کے لیے بددعاء کی' یہ قنوت نازلہ کی ابتداء تھی اس سے پہلے ہم اسے نہ جانتے تھے۔

دراصل قنوت کا معنی ہے فرمانبرداری کرنا، خاموش رہنا اور نماز میں کھڑا ہونا، اور نازلہ کا معنی سخت نازل ہونے والی مصیبت چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سنت ہے کہ جب مسلمانوں کو کوئی بڑی مشکل پیش آ جائے یا حالات سنگین ہو جائیں، مسلمانوں پر کوئی بڑی آفت نازل ہو مثلاً کافروں کے پنجوں میں گرفتار ہو جائیں یا اسلامی ملک پر کافر حملہ آور ہوں تو نماز فجر کی جماعت میں دوسری رکعت کے رکوع کے بعد امام قنوت نازلہ پڑھے اور مقتدی آمین کہتے ہیں۔

فقہاء نے قنوت نازل کے احکام و مسائل درج ذیل بیان فرمائے ہیں:

(ا) قنوت نازلہ صرف فجر کی نماز میں دوسری رکعت کے بعد پڑھی جائے۔

(ب) سنتوں یا تنہا ادا کیے جانے والے فرضوں میں قنوت نازلہ نہیں پڑھی جاتی۔

(ج) قنوت نازلہ بلند آواز میں پڑھی جائے۔

(د) امام اونچی آواز سے دعا (قنوت نازلہ) پڑھے اور مقتدی دعاء کا ہر جملہ مکمل ہونے کے بعد آہستہ آہستہ آمین کہیں۔

(ھ) قنوت نازلہ پڑھتے ہوئے دعا کی طرح ہاتھ سینے کے سامنے نہ اٹھائے بلکہ ناف کے نیچے باندھے رکھے یا بغیر ہاتھ باندھے کھڑا رہے۔

(اعلاء السنن جلد ششم صفحہ ۱۱۴۔۱۲۴)

مختلف روایات میں قنوت نازلہ کے الفاظ کہیں کہیں فرق کے ساتھ آ رہے ہیں لیکن عموماً اکابر سے قنوت نازلہ میں یہ دعا منقول ہے:

﴿اللهم اهدنا فيمن هديت، (آمين) وعافنا فيمن عافيت، (آمين) وتولنا فيمن توليت، (آمين) وبارك لنا فيما أعطيت، (آمين) وقنا شرما قضيت، (آمين) فانك تقضى ولا يقضى عليك، انه لا يذل من واليت، ولا يعزّ من عاديت، تباركت ربنا وتعاليت، (آمين) نستغفرك ونتوب إليك. (آمين)

اللهم اغفر للمؤمنين والمؤمنات والمسلمين والمسلمات، (آمين) وألف بين قلوبهم، (آمين) واصلح ذات بينهم، (آمين) وانصرهم على عدوك وعدوهم (آمين) اللهم العن الكفرة الذين يكذبون رسلك، ويقاتلون اولياء ك (آمين) اللهم خالف بين كلمتهم، وزلزل اقدامهم، وأنزل بهم بأسك الذى لا يرد عن القوم المجرمين﴾

''اے اللہ! تو ہمیں ہدایت دے ان لوگوں میں جن کو تو نے ہدایت دی اور تو ہمیں عافیت والوں میں عافیت عطاء فرما اور تو ہماری کارسازی فرما ان لوگوں میں جن کی تو نے کارسازی کی اور جو کچھ تو نے ہمیں دیا اس میں برکت عطاء فرما اور جو تو نے فیصلہ کر لیا ہے اس کی برائی سے محفوظ فرما کیونکہ تو فیصلہ کر سکتا ہے، تیرے خلاف فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، بے شک وہ ذلیل نہیں ہوسکتا جس کا تو والی بن جائے اور وہ عزت نہیں پا سکتا جس کا تو دشمن ہو جائے اے ہمارے رب تو بابرکت ہے اور بلند و بالا ہے۔

اے اللہ! ہماری اور تمام مؤمن مردوں اور عورتوں کی مغفرت فرما اور مسلمان مردوں اور عورتوں کی اور ان کے دلوں میں الفت ڈال دے اور ان کے درمیان اصلاح فرما اور ان کی مدد فرما اپنے اور ان کے دشمن پر اے اللہ! لعنت کر کافروں پر جو تیرے راستے سے روکتے ہیں اور تیرے رسولوں کو جھٹلاتے ہیں اور تیرے دوستوں سے لڑائی کرتے ہیں۔

اے اللہ! ان کے درمیان اختلاف ڈال دے اور ان کے قدم ڈگمگا دے اور ان پر ایسا عذاب نازل کر جو مجرموں کی قوم سے لوٹایا نہیں جاتا۔''

آج کفار، یہود و نصاریٰ کے امت اور خصوصاً اسلامی جمہوریہ پاکستان کے خلاف

ریشہ دوانیاں اور ظالمانہ کارروائیوں کے ارادے تیار ہو رہے ہیں ائمہ کرام قنوت نازلہ کے ذریعہ امت مسلمہ کے لیے دعائیں مانگیں، اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئے گی۔ انشاء اللہ۔

نیز اہل علم حضرات اگر قنوت نازلہ کے بارے میں مزید دلائل و مسائل کا مطالعہ فرمانا چاہیں تو درج ذیل حوالہ جات کی طرف رجوع فرمالیں۔

(۱) الکوکب الدری جلد ۱ ص ۱۷۷۔

(۲) اعلاء السنن جلد ۲ ص ۷۲ تا ص ۷۸۔

(۳) سنن ابی داؤد جلد ۱ ص ۲۰۳۔

(۴) سنن دار قطنی جلد ۲ ص ۳۹۔



خطیب، واعظ اور مبلغ کا طرزِ عمل

﴿عن انس رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ھؤلآء خطباء من امتك یا مرون الناس بالبر وینسون انفسھم﴾ (شرح السنة، مشکوٰة)

”حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، میں نے معراج کی رات بہت سے لوگوں کو دیکھا اُن کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے ہیں۔ پوچھا جبرئیل، یہ کون لوگ ہیں؟ کہا، یہ لوگ آپ کی امت کے خطیب اور واعظ ہیں جو لوگوں کو نیکی کی ہدایت کرتے تھے اور اپنے آپ کو بھول جاتے تھے۔ (یعنی خود نیک کام نہیں کرتے تھے)“

اللہ رب العزت نے پوری انسانیت کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی بنا کر بھیجا اور لوگوں کی راہنمائی کے لیے دینِ حق دین اسلام عطا فرمایا۔

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ابلاغِ حق یعنی حق بات لوگوں تک پہنچانے کا فریضہ عطا فرمایا۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اعلیٰ ترین طرزِ عمل سے لوگوں تک حق بات پہنچائی۔

پہلی وحی کے نازل ہونے کے تین ماہ بعد دوسری وحی آئی تو اُس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ آپ اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ سے ڈرائیں اور بت پرستی سے منع فرمائیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خفیہ طور پر تبلیغ شروع کر دی۔ چنانچہ سب سے پہلے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل ہی تھا جو ابلاغِ حق کا مؤثر ترین ذریعہ ثابت ہوا۔ چنانچہ اب آپ وہ الفاظ ذہن میں لائیے جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے پہلی وحی کے نازل ہونے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کے لیے کہے تھے۔

''کہ آپ فکر نہ کیجیے آپ کو نقصان نہیں پہنچے گا، کیونکہ آپ رشتہ داروں سے اچھا سلوک کرتے ہیں، محتاجوں کی مدد کرتے ہیں اور مہمانوں کا اکرام کرتے ہیں اور مصیبت میں غیروں کی مدد کرتے ہیں۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمدہ طرزِ عمل اپنے گھر کے اندر بھی تھا اور گھر سے باہر عزیز واقرباء اور دوست واحباب میں بھی تھا۔ چنانچہ مردوں میں سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراز اور ہمدم حضرت ابوبکر صدیقؓ ایمان لائے اور دعوتِ حق کو قبول کیا۔ پھر بچوں میں سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دعوتِ حق پر لبیک کہا۔ مکہ معظّمہ کے معززین میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا بہت اثر ورسوخ تھا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تبلیغ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت طلحہؓ جیسے مقتدر صحابہ نے دعوتِ حق کو قبول کیا اس طرح اسلام کا حلقہ وسیع وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام مسلمانوں کی تربیت اور تبلیغ کے لیے حضرت ارقم مخزومیؓ کے گھر کو منتخب فرمایا۔

آخر تین سال بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلانیہ تبلیغ کا حکم ہوا اور قرآن مجید کا یہ حکم نازل ہوا ''**فاصدع بما تؤمر**'' یعنی آپ کو جو حکم دیا گیا ہے اسے علی الاعلان کہہ دیں۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کھلم کھلا دعوتِ اسلام شروع کر دی۔ پھر اللہ تعالیٰ کا ایک اور حکم آیا جس میں عزیز واقارب کو دعوتِ حق دینے کا حکم تھا۔

﴿وانذر عشيرتك الاقربين﴾

''یعنی آپ اپنے قریبی رشتہ داروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیے۔''

زندگی کے اس موڑ پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طرزِ عمل کو دعوت حق کی بنیاد بنایا۔ تمام اہل مکہ کو ایک قریبی پہاڑی کوہِ صفا کے دامن میں اکٹھا کیا اور ان سے اس طرح خطاب فرمایا: اگر میں تم سے کہوں کہ پہاڑ کے دوسری طرف ایک لشکر آ رہا ہے تو کیا تم یقین کر لو گے؟ سب نے بیک زبان کہا، ہاں ضرور یقین کریں گے۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم

نے دعوت حق دی اور شرک سے منع فرمایا تو یہ سن کر قریش مکہ کے سردار گھروں کو واپس چل دیئے۔لیکن پہلے انہوں نے یہ جو کہا کہ ہم آپ بات کی مان لیں گے تو یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا سابقہ زندگی کا طرزِ عمل تھا جس کی بنیاد پر قریش مکہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صادق اور امین سچا اور امانت دار ہونے کا لقب دیا تھا۔

لیکن چونکہ قریش مکہ صدیوں سے کفر و شرک میں مبتلا چلے آ رہے تھے اس لیے وہ دین حق کو قبول کرنے اور صرف ایک خدا کو ماننے سے گھبراتے رہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دعوتِ حق دیتے رہے اور پھر کفارِ مکہ نے بڑے زور وشور سے مخالفت شروع کر دی۔مسلمانوں کو طرح طرح کی تکالیف پہنچائیں۔اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل صبر واستقامت کا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بھی صبر و استقامت کی تلقین کرتے رہے اور اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی بھی قرآن مجید کی وہ آیات نازل کیں جن میں توحید پر ثابت قدم رہنے اور صبر و استقامت کی تاکید فرمائی۔ ہجرت حبشہ کا واقعہ پیش آیا۔شعب ابی طالب میں نظر بندی اور وہاں کی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔تین سال کی متواتر نظر بندی کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ تشریف لائے۔گیارہ سال کی جدوجہد کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم طائف کے لوگوں کو دعوتِ حق دینے کے لیے تشریف لے گئے وہاں کے سرداروں سے ملاقات کی۔اپنا مقصد بتایا تو یہ لوگ مکہ والوں سے بدسلوکی میں آگے بڑھ گئے مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رحمۃ اللعالمین ہونے کا طرزِ عمل پیش کیا۔ بجائے بددعا کے ان کے لیے ہدایت کی دعا کی۔اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے کیونکہ یہ نہیں جانتے کہ میں کون ہوں۔ پھر مدینہ طیبہ میں دعوت کا آغاز ہوا۔وہاں کے یہود نے اپنی آسمانی کتاب میں آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نشانیاں پڑھی ہوئی تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے طرزِ عمل کا تذکرہ بھی گذشتہ آسمانی کتابوں میں موجود تھا۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہؓ کے درمیان اٹھنا بیٹھنا اور حلم و بردباری اور دیگر اخلاق کا تذکرہ بھی گذشتہ آسمانی کتابوں میں موجود تھا۔

چنانچہ ایک مرتبہ ایک یہودی راہب نے تاجر کے روپ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم

سے کھجوروں کا سودا کیا کہ یہ رقم لے لیں اور میں فلاں تاریخ کو آ کر کھجوریں لے لوں گا پھر یہودی راہب مقرر تاریخ سے چند روز پہلے آ گیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے غیر مناسب انداز اختیار کیا۔ حضرت عمرؓ بھی وہاں موجود تھے۔ انہیں بہت غصہ آیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا ''اسے سودے کی کھجوریں دے دو۔''

وزده عشرين صاعاً مكان من ....اوراس جھگڑے کے بدلے میں بیس صاع کھجوریں اور دیدو۔ اس تاجر نے وہ کھجوریں لے کر ایک طرف رکھیں اور کہا کہ اے عمر اللہ تیرا بھلا کرے۔ میں نے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جونشانیاں اپنی آسمانی کتابوں میں پڑھی تھیں وہ سب میں نے پالی تھیں ایک نشانی رہ گئی تھی کہ آخری نبی میں حلم اور بردباری بھی اورلوگوں سے زیادہ ہوگی اور یہ خوبی بھی آج دیکھ لی۔ اوراس نے اسی وقت اسلام قبول کرلیا۔

اللہ تعالیٰ نے ابلاغ حق کے لیے مؤثر ترین طرزِعمل اپنانے کا سلیقہ قرآن مجید میں سکھایا۔ فرمایا:

﴿ادع الى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتى هى احسن﴾

''اللہ کے راستے کی طرف بڑی دانائی سمجھداری اورعمدہ نصیحت سے بلاؤ اوراچھے طریقے سے دلیل کے ساتھ بات کرو۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ دعوتِ اسلام کے لیے بہترین طرزِعمل امت کے سامنے رکھا۔ لوگوں کی طبیعت کا خیال رکھا اپنے طرزِعمل سے دین کو آسان بنا کر پیش فرمایا۔ فضائل اورخوشخبریاں دے کر دین سکھایا۔ وقت پڑنے پر اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا۔ یہی بہترین طرزعمل آج بھی وقت کی اہم ضرورت ہے۔

اللہ رب العزت ہمیں سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پرعمل پیرا ہوتے ہوئے دین اسلام کے مطابق بہترین طرزِعمل اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

☆☆☆

بنجر زمین کی آباد کاری

عن عائشةؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من عمر ارضا لیست لاحد فھواحق' قال عروةؓ قضٰی بہ عمر فی خلافتہ.

(رواہ البخاری)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص کسی ایسی زمین کو آباد کرے جس کا کوئی مالک نہ ہوتو وہ آباد کرنے والا ہی اُس زمین کا سب سے زیادہ حق دار ہے''۔

حضرت عروہؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی خلافت کے دور میں اسی کے مطابق فیصلہ فرمایا تھا۔

انسانی آبادی اور ذرائع پیداوار میں توازن، مسئلہ معاش کا اہم اصول ہے قرآن نے آسمان وزمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کی پیداوار کو انسان کی روزی ''**رزقاً للعباد**'' قرار دے کر ذرائع پیداوار میں بے انتہا فراخی اور وسعت پیدا کر دی۔ انسان میں تسخیر کائنات ''**سخر لکم مافی السموات وما فی الارض جمیعاً**'' کا جذبہ بیدار کر کے ان وسیع وعریض ذرائع کو انسانی تصرف میں لانے کی طرف توجہ دلائی۔

اللہ تعالیٰ نے زمین اور کھیتوں کو حکمت سے پیدا فرمایا ہے اور خدا چاہتا ہے کہ یہ زمین اور کھیت آباد رہیں سرسبز وشاداب رہیں اور ان سے مخلوق کو یہ معلوم ہو جائے کہ دنیا کی آباد کاری جس سے فائدہ اور آمدنی مقصود ہو۔ نفع اور آمدنی کے لیے آباد کاری کے کام میں کتنا ثواب ہے زمین کو بیکار پڑے رہنے دینے میں کتنا گناہ ہے تو آبادی کے اسباب کو کبھی برباد ہونے کے لیے نہ چھوڑیں۔

جو شخص زمین کا کوئی ٹکڑا رکھتا ہے جس سے ہزار من غلہ سالانہ حاصل ہوسکتا ہے تو اگر اس کی سستی سے بجائے ہزار من کے نو سو من غلہ اس زمین سے حاصل ہوا اور اس کی وجہ

سے سومن غلہ مخلوق کے حلق میں نہ پہنچ سکا تو قیامت کے دن اس سے باز پرس ہوگی اور اسی کے برابر اس سے واپس مانگا جائے گا۔

زمین کی آبادکاری کی ان ساری دلچسپیوں میں نسل انسانی کے سب سے بڑے خیر خواہ اور اس کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی عملی وقولی قوت پوشیدہ تھی کہ پرند و چرند کا کھایا ہوا بھی آبادکاروں کی طرف سے صدقہ اور نیکی ہے۔

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جن کی ہتھیلیوں میں کدال اور پھاوڑے کے گٹے پڑے ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گٹے پڑے ہاتھوں کو چومتے جاتے تھے اور فرما رہے تھے دونوں ہتھیلیاں خدا کی محبوب ہیں۔ اس سے زیادہ زمین اور اس کی آبادی کی اہمیت کے اعتراف و اعلان کی عملی مثال شاید انسانی تاریخ میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

ارض مباحہ یعنی وہ زمین جس کا کوئی خاص شخص مالک نہیں اس کی تین قسمیں ہیں۔

اول وہ جو آبادی کے قریب بستی والوں کی عام اور مشترک ضروریات میں کارآمد ہو جیسے بستی کے اندر گلی کوچے وغیرہ اور سڑکیں یا بستی کے باہر قبرستان، عیدگاہ وغیرہ۔

دوم وہ غیر مملوک زمین جو کسی بستی کی ضروریات میں مشغول نہیں مگر قابل زراعت و انتفاع ہو ان کو اراضی بیت المال کہا جاتا ہے۔

سوم وہ غیر آباد اور بیکار زمینیں جو نہ کسی شخص کی ملک میں داخل ہیں اور نہ کسی بستی کے متعلق ہیں اور نہ قابل زراعت و انتفاع ہیں۔ ایسی زمین کو اصطلاح شرع میں ارض موات کہا جاتا ہے۔

ایسی زمین کا شرعی حکم یہ ہے کہ جو شخص اس کو آباد کرتا ہے اور قابل انتفاع بناتا ہے وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ایسی زمین کو آباد کرنے کے لیے حکومت سے اجازت لینا شرط ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ سے ایک شخص نے ایک ایسی ہی غیر آباد زمین کی درخواست کی

جو دجلہ کے کنارے پر واقع تھی۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے عراق کے گورنر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے نام فرمان جاری فرمایا کہ بعد از تحقیق مطلوبہ زمین اس شخص کو دے دی جائے۔

حکومت کی اجازت ونگرانی کے بغیر جو بھی شخص بنجر و غیر آباد زمین کو آباد کرے اور وہ اسی کی ملکیت قرار دی جائے تو اس طرح سے نظم و ضبط برقرار نہیں رہ سکتا۔ اس لیے حکومت سے اجازت لینا ضروری اور شرط قرار دیا گیا۔



مضاربت

بیروزگاری ختم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے

﴿عن عبداللہ قال قال رسول اللہ ﷺ طَلَبُ کسب الحلال فریضة بعد الفریضة﴾ (رواہ البیہقی)

''حلال کمائی تلاش کرنا دیگر فرائض کے بعد ایک فرض ہے۔''

شریعت اسلامیہ نے حلال روزی کمانے کے جو طریقے جائز قرار دیئے ہیں ان میں سے ایک مضاربت بھی ہے۔شریعت اسلامی میں مضاربت کا مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص کا مال ہو اور دوسرا شخص محنت کرے اور منافع دونوں کے درمیان تقسیم ہو جائے لفظ مضاربت اصل میں لفظ ضرب سے بنا ہے جس کا معنی ہے سفر کرنا۔ چونکہ تجارتی معاملات میں عموماً سفر کرنا پڑتا ہے اس لیے اس کا نام مضاربت رکھ دیا گیا۔

مضاربت کا معاملہ عہد جاہلیت میں بھی جانا پہچانا تھا۔اسلام نے اسے جاری رکھا کیونکہ اس طریقہ سے معاملات کو اچھے طریقے سے طے کیا جا سکتا ہے۔اسلام ہمیشہ ہر کام میں اصلاح سے کام لیتا رہا ہے اگر کسی معاملہ میں برائی ہے تو اسلام نے اس سے منع کیا اور اگر تجارت کا کوئی طریقہ زمانہ اسلام سے پہلے جاری تھا تو اسلام نے صرف اس لیے اس معاملہ سے منع نہیں کیا کہ یہ زمانہ جاہلیت کا طریقہ تھا بلکہ اسلام نے ایسے معاملات کو اس طرح پرکھا کہ کیا لوگ اس سے برائی میں مبتلا تو نہیں ہو جائیں گے کیا اس طریقہ سے لوگوں کے درمیان معاملات کی خرابیاں تو پیدا نہیں ہوں گی۔کیا یہ طریقہ احکام اسلام کے خلاف تو نہیں اگر اس قسم کی برائیاں اس معاملہ میں موجود نہ ہوں تو اسلام نے کھلے دل سے اس کی اجازت دی۔

معاملہ مضاربت یعنی ایک کا مال دوسرے کی محنت اور منافع دونوں میں تقسیم ہو جائے اس معاملہ کا ثبوت اجماع سے ملتا ہے درحقیقت مضاربت کے جائز ہونے پر تمام

مسلمانوں کا اجماع ہے اور کسی نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی .... پہلی مثال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دو صاحبزادوں عبداللہ اور عبید اللہ کا واقعہ ہے۔ علامہ عبدالرحمٰن الجزیری نے کتاب الفقہ جلد دوم میں ایک واقعہ نقل کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عبداللہ اور ان کے بھائی عراقی فوج کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ان دنوں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بصرہ کے گورنر تھے۔ یہ دونوں بھائی ان کے پاس ٹھہرے ابوموسیٰ اشعری نے ان سے کہا میں کچھ مال امیرالمؤمنین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں تم یہ مال لے لو اور عراق سے مال تجارت خرید کر مدینہ میں جا کر فروخت کر دینا اور منافع تقسیم کر لینا۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور امیرالمؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے قبول کر لیا۔

اگر آج بھی ہمارے معاشرہ میں مضاربت عام ہو جائے تو پھر چھپا ہوا سرمایہ بھی گردش کرنے لگے گا اور بے روزگاری پر قابو پایا جا سکے گا۔ اور وہ اس طرح کہ ہم اپنے معاشرے میں بہت سے لوگ دیکھ سکتے ہیں جن کے پاس تعلیم کا زیور ہے یا تجارتی تجربہ خوب ہے لیکن سرمائے کے نہ ہونے کی وجہ سے بے روزگاری میں مبتلا ہیں اب ایسے لوگ سامنے آئیں جن کے پاس پیسہ تو ہے لیکن ان کے پاس کام کرنے کا وقت نہیں یا انہیں تجربہ نہیں۔ تو پھر ایسے لوگ اپنا پیسہ باہر نکالیں اور کام کے .... کریں اور اس طرح منافع بھی ملے گا اور دوسرے مسلمان بھائی کی بے روزگاری بھی دور ہو جائے گی۔

لیکن اس معاملۂ مضاربت کے بھی چند آداب اسلام نے مقرر کیے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ایک آدمی صرف مال دے گا اور دوسرا آدمی صرف محنت کرے گا۔ اور دونوں آپس میں منافع طے کریں کہ کل منافع کا کتنا مالکِ مال کو ملے گا اور کتنا محنت کرنے والے کو۔ اب اگر کاروبار میں نقصان ہوا تو نقصان صرف مال کے مالک کا ہوگا۔ محنت کرنے والا نقصان کا ذمہ دار نہ ہوگا۔ اس لیے مضاربت کرنے کے لیے محنت کرنے والا بااعتماد اور دیانت دار ہونا چاہیے۔ اور منافع بھی اس طرح تقسیم کیا جائے گا کہ پہلے اصل مال کو الگ کر کے باقی جو بچے گا وہ منافع ہوگا۔ منافع کی تقسیم میں شریعت نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ چاہے دونوں

شخص آدھا آدھا منافع کر لیں اور چاہے مالک مال کم منافع اپنے لیے طے کرے اور زیادہ محنت کرنے والے کے لیے یا کم طے کرے۔ یہ تو دونوں کی آپس میں رضا مندی سے پہلے ہی سے طے کرنا ہو گا۔

اب جو بات بتا رہا ہوں اسے غور سے سنئے گا۔ معاملہ مضاربت کے لیے بہت بڑی رقم یا بہت بڑے سرمایہ کی ضرورت نہیں اور نہ اس کے لیے کسی پگڑی یا بہت بڑے تجارتی ادارے کی ضرورت ہے آپ اپنی تنخواہ میں سے ہر ماہ کچھ بچا لیا کریں۔ جب ہزار دو ہزار جمع ہو جائیں تو دیکھئے آپ کے محلّہ میں کوئی غریب بیوہ عورت رہتی ہے تو اسے یہ رقم دے دیجئے اور اس سے کہیں کہ وہ ایک سلائی مشین خرید لے اور کپڑے سینا شروع کر دے اور جتنا منافع ہو اس میں سے آدھا تمہارا آدھا میرا یا زیادہ منافع بیوہ کو دینا طے کر لیں اور کم اپنے لیے اسی طرح آپ نے کچھ رقم بچت کر کے جمع کر لی آپ اپنے احباب میں اپنے محلّہ میں نگاہ ڈالیں اگر کوئی بے روزگار ہے یا عیالدار ہے گھریلو حالت بیچارے کی بہت گئی گزری ہے آپ اپنی رقم اسے دے دیں اور اسے کہیں کہ چھوٹی سی دکان ڈال لے اور جو منافع ہو گا۔ وہ آپس میں طے کر لیں آپ کی اصل رقم بھی محفوظ رہے گی اور منافع بھی ملتا رہے گا لیکن اب یہ کام آپ کا ہے کہ آپ کسی بااعتماد شخص کو تلاش کریں اور خوب چھان بین کر کے اسے رقم دیں۔ اور باقاعدہ قانونی طور پر رسید لیں کیونکہ ان تمام احتیاطی تدابیر کے اختیار کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کے انتالیسویں رکوع میں دیا اور فرمایا کہ ایسے معاملات کو باقاعدہ لکھ لینا چاہیے اور دو گواہ بھی اس معاملہ پر لینے چاہئیں۔ اگر واقعی ہم اپنے معاملات کو اتنے عمدہ طریقوں سے انجام دیں خصوصاً اپنے معاشرے میں مضاربت کو رائج کریں تو ایک طرف سرمایہ بے کار پڑا نہیں رہے گا۔ دوسری طرف ہمیں بچت کی عادت پڑے گی اور سب سے بڑا کارنامہ یہ ہو گا کہ مضاربت کے ذریعہ بے روزگاری پر قابو پایا جا سکے گا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں حلال روزی کمانے اور اس پر قناعت کی توفیق عطا فرمائے۔

ناجائز تجاوزات اور شرعی تقاضے

﴿عن سعید بن زیدٍ رضی اللّٰہ عنہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من اخذ شبراً من الارض ظلماً فانہ یطوقہ یوم القیامۃ عن سبع ارضین﴾ (متفق علیہ)

''حضرت سعید بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص ایک بالشت بھر زمین ظلم سے حاصل کرے گا اس زمین کے ساتوں طبقے قیامت کے دن اس کی گردن میں طوق کے طور پر پہنائے جائیں گے۔''

اللہ رب العزت نے انسانوں کو جہاں اور بے شمار نعمتیں عطا فرمائیں وہاں ایک نعمت زمین بھی عطا فرمائی' اس زمین کا تعلق انسان کے ساتھ مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے جب پیدائش کا مسئلہ آیا تو بتایا کہ انسان کی پیدائش زمین کی مٹی سے ہوئی' جب روزی کا مرحلہ آیا تو زمین ہی کے ذریعے روزی حاصل کرنے کا ذکر کیا' جب موت کا ذکر آیا تو بتایا کہ یہ انسان مرکر قبر میں جاکر زمین میں دفن ہوکر مٹی میں مل جائے گا اور جب خالق کائنات نے اپنے بارے میں غور وفکر کی دعوت دی تو جب بھی زمین اور اس کے فوائد اور حالات میں غوروفکر کرکے اپنی ذات پر ایمان لانے کے دلائل پیش کیے۔

آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی اگرچہ معیشت کے وسائل مختلف ہیں لیکن زراعت، تجارت صنعت وحرفت کو آج بھی بنیادی اہمیت حاصل ہے اور ان میں سب سے مقدم زراعت ہے' زمین سے روزی اور فائدہ حاصل کرنے کا حق ہر انسان کو دیا گیا ہے لیکن زمین سے فائدہ حاصل کرنے کی اسلام نے چند شرائط اور چند آداب مقرر کئے ہیں ان میں سے بنیادی شرط زمین کا مالک ہونا ہے یہ بات طے شدہ ہے کہ تمام کائنات کا خالق، مالک حقیقی صرف خدائے تعالیٰ کی ذات ہے لیکن یہاں ملکیت سے عارضی ملکیت مراد ہے کہ جس

ملکیت کے ذریعے انسان اس زمین سے فائدہ اٹھاسکے اور دوسرے کے حقوق میں دخل اندازی نہ کرسکے' اگر زمین کو ملکیت اجتماعی قرار دیا جائے تو پھر کوئی انسان بھی صحیح طریقے سے اپنے حق سے فائدہ نہ اٹھاسکے گا' پھر ایک انسان سے دوسرے انسان کی ملکیت میں جانے سے پہلے زمین کے ہمسائے سے پوچھنا بھی ضروری قرار دیا تاکہ کوئی دوسرا انسان اس ہمسائے کو تکلیف یا نقصان نہ پہنچا سکے اسی چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر انسان کو حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنی ساتھ والی زمین یا مکان کا مالک کسی ایسے شخص کو نہ بننے دے جس سے اس کو نقصان پہنچ سکتا ہو اس حق کو شرعی اصطلاح میں حق شفعہ کہتے ہیں۔

اسلام کے معاشرتی نظام میں ایک انسان کو دوسرے انسان سے اس طرح مربوط رکھا گیا ہے کہ ہر انسان دوسرے کی زندگی میں معاون ہو ایک دوسرے کا حق غصب نہ کرسکیں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" جو شخص ایک بالشت بھر زمین ظلم سے حاصل کرے گا اس زمین کے ٹکڑے کے ساتوں طبقے قیامت کے دن اس کی گردن میں طوق کے طور پر پہنائے جائیں گے۔" اب یہاں ایک بالشت بھر زمین حاصل کرنے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ایک بالشت بھر زمین کھود کر کہیں لے گیا بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ بالشت بھر زمین جس پر کسی دوسرے شخص کے لیے نفع حاصل کرنے کا حق تھا اس زمین سے دوسرا شخص ناجائز طور پر نفع حاصل کر رہا ہے یا اصل حقدار کو نفع حاصل کرنے سے روک رہا ہے تو اس کے لیے یہ سخت ترین سزاء بیان کی گئی ہے۔

آج ہمارے معاشرے میں چاہے وہ دیہات ہو یا شہر، گھر ہوں یا دکانیں ہر طرف اور ہر جگہ زمین پر ناجائز قبضہ اور اس کے نتیجہ میں ہونے والے فسادات سامنے آتے ہیں' دیہات میں جہاں جابر اور طاقتور زمیندار ہے وہاں کمزور زمیندار کی زمین پر ناجائز قبضہ کے مقدمات کی بھرمار ہے۔ شہروں میں آج کل یہ وبا بہت ہی زیادہ پھیل چکی ہے کوئی صاحب مکان تعمیر کر رہے ہیں تو بڑے مہذب طریقے سے زمین پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں ناجائز قبضہ کرنے کی انتہائی جدید ترین صورتیں بنالی گئی ہیں، مکان بنایا دوسرے کی زمین کی جانب دروازہ

کھول لیا، روشن دان رکھ لیا، کھڑکیاں اس طرف بنالیں۔اب دوسرا شخص جب مکان بنائے گا تو مجبوراً کچھ جگہ چھوڑ کر تعمیر کریگا ورنہ ہمسائے سے ساری زندگی فساد رہے گا۔ پھر ایسا بھی کیا جاتا ہے کہ مکان کی بنیادیں بالکل صحیح پیمائش کے ساتھ اپنی زمین پر اٹھالیں لیکن جب چھت ڈالنے کا موقع آیا تو ڈیڑھ فٹ کا چھجا (شیڈ) دوسرے کی زمین کی طرف بڑھا دیا، اب دوسری منزل کا کمرہ بڑا ہوگیا اور دوسرا جب مکان بنائے گا لازماً جگہ چھوڑے گا۔ ایسے ایسے عجیب وغریب طریقے ناجائز قبضہ کے بنالیے گئے ہیں یہی حال دوکانداروں کا ہے حکومت نے سڑک کے کنارے پیدل چلنے کا راستہ (فٹ پاتھ) بنایا، دوکاندار تھوڑا سا شوکیس آگے بڑھا لیتا ہے اور کچھ سامان فٹ پاتھ پر رکھ دیتا ہے اب اس زمین کے حصہ پر پیدل چلنے والوں کا حق تھا لیکن اس دوکاندار نے اس کا حق ماردیا۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ حکومت وقت شہریوں کے آرام وراحت کے لیے جو قوانین بناتی ہے اگر شریعت کے احکام کے خلاف نہ ہوں تو اسلام ان قوانین کے ماننے اوراس پر عمل کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔

یہ انسان تھوڑی سی زمین پر ناجائز قبضہ کرتے وقت قرآن کریم کے وہ کلمات ذہن میں لے آئے تو اس کی ذہنی اصلاح ہوجائے اور یہ کلمات مردہ کو دفنانے کے بعد دونوں ہاتھوں سے تین مرتبہ مٹی ڈالتے ہوئے بھی کہے جاتے ہیں۔

﴿منها خلقنكم وفيها نعيد كم ومنها نخرجكم تارةً اخرى﴾

"اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ہم نے تمہیں اسی مٹی سے پیدا کیا پھر اسی مٹی
میں ہم تمہیں لوٹائیں گے، اور پھر دوبارہ اسی مٹی سے اٹھایا جائے گا۔"

جب انسان اس ارشاد باری کو سمجھ لے تو پھر ایک انچ زمین پر ناجائز قبضہ کرنا بھی مشکل نظر آئے گا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی بخاری شریف میں ہے کہ جو شخص زمین سے ناحق کچھ لے اسے قیامت کے دن زمین کے ساتویں طبقے تک دھنسایا جائے گا اور مسند احمد کی روایت یعلی ابن مرۃ مروی سے ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔"جو شخص بالشت بھر زمین بھی ظلم کرکے لے گا اللہ تعالیٰ اسے حکم دے گا

کہ اس زمین کے ساتویں طبقے تک اسے کھودو پھر وہ زمین طوق بنا کر اسکے گلے میں ڈالی جائے گی اور وہ قیامت تک اس حال پر رہے گا یہاں تک کہ قیامت کے دن تمام لوگوں کے معاملات کا فیصلہ ہو۔'' اللہ رب العزت ہمیں زمین پر ناجائز قبضہ سے محفوظ فرمائے اور جو اس گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں اللہ انہیں ہدایت اور توبہ کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین۔



وقت کا اہم تقاضا رواداری

﴿عن عبداللّٰہ بن عمر رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم مِنَ الْکَبَائِرِ شَتْمُ الرَّجُلِ وَالِدَیْہِ قَالُوْا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ وَھَلْ یَشْتِمُ الرَّجُلُ وَالِدَیْہِ قَالَ نَعَمْ یَسُبُّ اَبَاالرَّجُلِ فَیَسُبُّ اَبَاہُ وَیَسُبُّ اُمَّہٗ فَیَسُبُّ اُمَّہٗ.﴾ (رواہ البخاری ومسلم)

''حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آدمی کا اپنے والدین کو گالی دینا گناہ کبیرہ میں سے ہے۔صحابہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ! کیا آدمی اپنے والدین کو گالی دے سکتا ہے؟ فرمایا، ہاں وہ کسی کے باپ کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کے باپ کو گالی دیتا ہے' وہ اُس کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے۔''

آج ہمارے معاشرہ میں یہی چیز ایک فتنہ اور ایک وبال کی صورت میں عام ہوچکی ہے جس کے نتیجہ میں ہر گھر، خاندان، معاشرہ،صوبوں اور علاقوں میں نفرت پھیلتی جارہی ہے' ایک دوسرے کے خلاف بیان بازی اس قدر عام ہوچکی ہے کہ حق اور باطل میں فرق کرنا مشکل ہوگیا ہے حالانکہ اللہ تعالٰی نے قرآن مجید میں سورہ انعام کی آیت نمبر۱۰۸ میں ارشاد فرمایا۔

''اورتم لوگ ان کو برا نہ کہوجن کی یہ پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا۔ پس وہ برا کہنے لگیں گے اللہ کو بے ادبی سے بغیر سمجھے۔اسی طرح ہم نے ہر طریقے والوں کے لیے ان کا عمل آراستہ کر رکھا ہے پھر ان سب کو اپنے رب کے پاس پہنچنا ہے تب وہ جتلا دے گا ان کو جو کچھ وہ کرتے ہیں۔''

اس میں اللہ تعالٰی نے ایک اہم اصول کی ہدایت فرمائی ہے اور یہ اصول اسلامی تہذیب وتمدن کا ایک بنیادی اصول ہے اوروہ یہ کہ جو کام خود کرنا جائز نہیں اس کا سبب اور

ذریعہ بننا بھی جائز نہیں، اگر ایک کام کرنا انسان برا سمجھتا ہے تو پھر اس کام کا محرک بننا بھی درست نہ ہوگا اسی سے رواداری کا اصول سمجھ آ جاتا ہے۔

یہ آیت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جن حالات میں نازل ہوئی اگر ان حالات کو پیش نظر رکھا جائے تو خوب اچھی طرح یہ بات واضح ہوجائے گی کہ انسان کو کس حد تک رواداری کا خیال رکھنا چاہیے۔

ابن جریرؒ کی تفصیلات کے مطابق جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب مرض الموت میں تھے تو قریش کے مشرک سردار جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی اور آپ کو تکلیفیں پہنچانے میں لگے ہوئے تھے ان کو یہ فکر ہوئی کہ ابو طالب کی وفات ہمارے لیے ایک مشکل مسئلہ بن جائے گی کیونکہ اگر ہم ابو طالب کے بعد ان کو قتل کریں گے تو لوگ کہیں گے کہ ابو طالب کے سامنے تو کچھ نہ کر سکے اب اکیلا پا کر قتل کردیا لہٰذا اب وقت ہے خود ہم ابوطالب سے مل کر فیصلہ کن بات کرلیں۔

چند قریشی سرداروں نے یہ مشورہ کرکے ابو طالب کے پاس جانے کے لیے ایک وفد مرتب کیا جس میں ابوسفیان، ابوجہل، عمرو بن عاص قریش کے سردار تھے، ابو طالب سے اس وفد کے لیے وقت لینے کا کام ایک شخص مطلب کے سپرد ہوا، اس نے ابو طالب سے اجازت لے کر وفد کو وہاں پہنچایا، وفد نے ابوطالب سے کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے بھتیجے نے ہمارے معبودوں کو اور ہمیں سخت تکلیف پہنچا رکھی ہے ہم چاہتے ہیں کہ آپ ان کو بلا کر سمجھا دیں کہ وہ ہمارے معبودوں کو برا نہ کہیں۔ ابو طالب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے پاس بلایا اور کہا یہ آپ کی برادری کے سردار آئے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ آپ ہمیں اور ہمارے معبودوں کو برا کہنا چھوڑ دیں تو پھر ہم بھی آپ کو اور آپ کے معبود کو برا نہ کہیں گے اس طرح مخالفت ختم ہوجائے گی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اچھا یہ بتاؤ اگر میں تمہاری یہ بات مان لوں تو کیا تم ایک ایسا کلمہ کہنے کے لیے تیار ہوجاؤ گے جس کے کہنے سے تم سارے عرب کے مالک

ہوجاؤ گے؟ ابوجہل بولا، ایسا کلمہ ایک نہیں ہم دس کہنے کو تیار ہیں۔ آپ بتائیں وہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ یہ سنتے ہی سب برہم ہوگئے۔ ابوطالب نے کہا کہ اے میرے بھتیجے اس کلمہ کے سوا کوئی اور بات کہو کیونکہ آپ کی قوم اس کلمہ سے گھبرا گئی ہے آپ نے فرمایا چچا جان میں تو اس کلمہ کے سوا کوئی دوسرا کلمہ نہیں کہہ سکتا اگرچہ وہ آسمان سے آفتاب لاکر میرے ہاتھ پر رکھ دیں، اس پر وہ لوگ ناراض ہوکر کہنے لگے کہ پھر ہم بھی آپ کے معبود کو برا کہیں گے اس پر سورۂ انعام کی یہ آیت نازل ہوئی کہ آپ ان کے بتوں کو برا نہ کہیں جن کو ان لوگوں نے خدا بنا رکھا ہے ورنہ وہ اپنی بے راہ روی اور بے سمجھی سے اللہ تعالیٰ کو برا کہیں گے۔"

رواداری کا یہ سنہری اصول ذہن میں آنے کے بعد ایک سوال اُبھرتا ہے کہ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں بتوں کا تذکرہ سخت الفاظ میں آیا ہے جیسے فرمایا:

﴿ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ﴾

"یعنی یہ بت بھی کمزور اور ان کے چاہنے والے بھی کمزور"

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا۔

﴿اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾

"یعنی تم اور جن بتوں کی تم عبادت کرتے ہو وہ سب جہنم کا ایندھن"

تو ان آیات میں بتوں کو برا کہا گیا ہے پھر رواداری کا مطلب کیا ہوا؟ اسی بات کا جواب روح المعانی میں تفصیل سے دیا گیا ہے کہ ان آیات میں کسی کو برا بھلا کہنا مقصود نہیں بلکہ غلط کام کا برا انجام بتانا مقصود ہے لہٰذا یہ رواداری کے خلاف نہیں۔

رواداری کی ایک اور مثال حدیث میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے مخاطب ہوکر فرمایا کوئی شخص اپنے ماں باپ کو برا نہ کہے، صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے عرض کیا یارسول اللہ! یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ کو برا کہے؟ آپ نے فرمایا ہاں، انسان خود تو اپنے ماں باپ کو برا نہیں کہتا لیکن جب وہ کسی

دوسرے شخص کے والدین کو برا کہے گا تو اس کے نتیجہ میں وہ دوسرا اس کے ماں باپ کو برا کہے گا اس کا سبب یہ بیٹا بنا تو یہ ایسا ہی ہے جیسے خود اس نے اپنے والدین کو برا کہا۔

جب معاشرے میں کسی بھی مرحلے میں دوسرے کو برا کہا جائے گا تو جواب میں برا ہی سننے کو ملے گا یہاں سے فساد کا دروازہ کھل جائے گا جس سے ایک گھر کے افراد میں پھوٹ پڑ جاتی ہے' باپ بیٹا ایک ساتھ کھانا چھوڑ دیتے ہیں صرف اس لیے کہ باپ نے اسے برا کہا جسے بیٹا اچھا سمجھتا تھا اور بیٹے نے اسے برا کہا جسے باپ اچھا سمجھتا تھا۔

رواداری اسلامی تہذیب وتمدن کی خصوصیات میں سے ہے اچھے شہریوں کی خوبی رواداری ہے رواداری امت مسلمہ کی امتیازی خصوصیات میں سے ہے اسلام نے جہاں یہ تعلیم دی کہ کسی کو برا نہ کہو وہاں یہ بھی تعلیم دی کہ اگر تمہیں کوئی برا کہے یا اسے برا کہا جائے جسے تم چاہتے ہو تو پھر جواب میں اللہ تعالیٰ نے دو خوبیاں پیدا کرنے کا حکم دیا' ایک صبر اور دوسری خوبی عفوودرگذر۔

بسا اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ آج کل صبر اور عفوودرگذر کا دور نہیں کوئی ایک کہے تو اسے چار سناؤ لیکن یہی وہ بنیادی خرابی ہے جس سے پیدا ہونے والی بیشمار برائیوں کو روکنا اس انسان کے بس سے باہر ہے' دو دلوں میں دوری پیدا ہوجاتی ہے' دو خاندانوں دو علاقوں میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ تعلیم دی کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور اس کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

ایک دوسرے کے جذبات کا احترام، ایک دوسرے کی عزت نفس کا خیال رکھتے ہوئے ہم اپنے خیالات بیان کریں اور دل کو وسیع کر کے کھلے ذہن سے دوسرے کی بات سنیں' اپنی بات میں وزن پیدا کرنا ہے تو دلیل سے وزن پیدا کریں دوسرے کی بات کو رد کرنا ہے تو دلیل سے رد کریں اسی سے جمہور تقاضوں کو پورا کیا جاسکے گا یہی اسلامی قدریں ہیں یہی وقت کا اہم تقاضا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں زندگی کے ہر مرحلے میں رواداری اپنانے کی توفیق نصیب فرمائیں

اور ہر قسم کے تعصب سے بالاتر ہو کر دوسروں کے جذبات اور خیالات کو ٹھیس پہنچائے بغیر اپنے جذبات اور خیالات کو بیان کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔



قرض ایک اہم معاشی مسئلہ

قرض کی حقیقت، بلاضرورت قرض کی مذمت،

قرض اُتارنے کیلئے مجرب دعائیں

﴿عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَخَذَ اَمْوَالَ النَّاسِ یُرِیْدُ اَدَاءَ هَا اَدَّی اللّٰهُ عَنْهُ وَمَنْ اَخَذَ یُرِیْدُ اِتْلَافَهَا اَتْلَفَهُ اللّٰهُ عَلَیْهِ﴾ (رواہ البخاری)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص لوگوں سے قرض لے اور اس کے ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو وہ قرض اللہ تعالیٰ اس سے ادا کرا دیتا ہے اور جو شخص اس نیت سے قرض لے کہ وہ اسے ادا نہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو ہلاک کر دیتا ہے۔''

آج معاشرہ کے بہت سے افراد کے لیے قرض ایک مشکل مسئلہ بن چکا ہے ان میں سے کچھ افراد ایسے ہیں جو واقعی مجبور ہو کر قرض لیتے ہیں ورنہ عموماً غیر اہم ضروریات کے لیے قرض لے لیا جاتا ہے اب ان میں سے کچھ افراد ایسے بھی ہیں کہ جو قرض ''پی جانے'' میں بڑی مہارت رکھتے ہیں اور بعض محض ٹال ٹال کر تنگ کر کے یا مختصر قسطوں میں ادا کرتے ہیں اور بہت کم افراد ایسے ہیں جو اقعی بامر مجبوری قرض لیتے ہیں اور پھر اس کی واپسی کی مکمل کوشش کرتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے ہر قسم کے فرد کے لیے ہدایات عطا فرمائی ہیں۔ سب سے پہلے یہ ذہن نشین کروایا کہ قرض کتنی بری چیز ہے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْكُفْرِ وَالدَّیْنِ (میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں کفر اور قرض سے) ایک صحابی نے عرض یارسول اللہ! کیا آپ قرض کو کفر کے برابر کرتے ہیں؟ فرمایا ہاں (رواہ النسائی) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا قرض زمین میں

خدا کا جھنڈا ہے' جب وہ کسی بندہ کی ذلت کا ارادہ کرتا ہے تو اس کی گردن پر قرض کا بوجھ رکھ دیتا ہے۔(رواہ الحاکم)ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کو اس طرح وصیت فرمارہے تھے کہ گناہ کم کیا کروتم پر موت آسان ہوجائے گی اور قرض کم لیا کرو آزاد ہوکر زندگی گزارو گے۔(رواہ البیہقی عن ابن عمرؓ) اگر مجبوری کی حالت میں قرض لے لیا تو پھر انسان کو اس کے ادا کرنے کی بھرپور کوشش کرنی چاہیئے اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' میری امت میں سے جو شخص قرض کے بوجھ میں لدجائے پھر اس کے ادا کرنے کی کوشش کرے لیکن ادا کرنے سے پہلے مرجائے تو میں اس کا مدد گار ہوں گا۔(رواہ احمد عن عائشہؓ) محدثین اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ پوری کوشش سے مراد یہ ہے کہ ضروری حاجات کے علاوہ زائد اخراجات اور سامان تعیش بالکل بند کردے اور ضروریات میں کفایت شعاری سے کام لے فضول خرچی نہ کرے' بہت سے لوگ ایک اور قرض میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن اسے قرض ہی نہیں سمجھتے اور وہ ہے عورت کا حق مہر۔اس کے بارے میں یہی ارشاد نبویؐ کافی ہے فرمایا'' جس نے کسی عورت سے قلیل یا کثیر مقدار کے مہر پر نکاح کیا اور اس کے دل میں عورت کا حق مہر ادا کرنے کی نیت نہیں، دھوکہ دیا، پھر بغیر ادا کئے مرگیا تو وہ قیامت کے روز زناکار بن کر خدا کے سامنے جائے گا پھر فرمایا جس شخص نے کسی سے قرض لیا اور اس کے دل میں قرض ادا کرنے کی نیت نہیں بلکہ دھوکہ کیا پھر بغیر ادا کئے مرگیا تو وہ خدا کے سامنے چور بن کر جائے گا۔(رواہ الطبرانی عن میمون عن ابیہ)

قرض ادا کرنے کی بھرپور کوشش کرنے کی تلقین کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی دعائیں بھی بتائی ہیں جن سے اللہ تعالیٰ قرض کی ادائیگی کی راہیں کھول دیتا ہے' ان میں سے ایک دعا ترمذی میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ ایک مقروض کو فرمایا'' میں تجھے چند کلمات نہ بتادوں جو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائے ہیں اگر تجھ پر کوہِ ثبیر کے برابر بھی قرض ہوگا تو حق تعالیٰ ادا کروادیں گے تو یہ کہا کر''

اَللّٰهُمَّ اكْفِنِي بِحَلَالِكَ عَنْ حَرَامِكَ وَاَغْنِنِي بِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ.

''اے اللہ تو مجھے اپنا حلال رزق دے کر حرام سے بچالے اور اپنے فضل وکرم سے مجھے اپنے ماسوا سے بے نیاز فرما۔''

طبرانی میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ سے فرمایا میں تمہیں ایسی دعا نہ بتادوں کہ اگر تمہارے اوپر پہاڑ کے برابر قرض ہو تو اسے بھی حق تعالیٰ ادا کروا دیں گے۔ یوں کہا کرو:

﴿اَللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ، رَحْمٰنَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ، تُعْطِيْهِمَا مَنْ تَشَآءُ ، وَتَمْنَعُ مِنْهُمَا مَنْ تَشَآءُ، اِرْحَمْنِيْ رَحْمَةً تُغْنِيْنِيْ بِهَا عَنْ رَحْمَةِ مَنْ سِوَاكَ.﴾

''اے اللہ، ملک کے مالک، تو ہی جسے چاہتا ہے ملک دیتا ہے، اور تو ہی جس سے چاہتا ہے ملک چھین لیتا ہے تو ہی جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے، اور تو ہی جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ اے دنیا و آخرت میں نہایت رحم کرنے والے تو جس کو چاہتا ہے دنیا اور آخرت کی نعمتیں دیدیتا ہے اور جسے چاہتا ہے اس کو دونوں سے محروم کر دیتا ہے تو مجھ پر خاص رحمت فرما کر اس کے ذریعہ اپنے علاوہ کی رحمت سے مجھے بے نیاز فرما دے۔''

علماء نے لکھا ہے کہ ان دعاؤں کے لیے کوئی وقت یا تعداد منقول نہیں البتہ ہر نماز کے بعد تین یا سات مرتبہ پڑھنا اور جب بھی ذہن پر قرض کا بوجھ محسوس ہو اس وقت پڑھنا بڑا مجرب نسخہ ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر پختہ یقین ہو۔



تجارت میں بے برکتی کا سبب ناپ تول میں کمی

﴿عن ابن عباس رضی اللّٰہ عنہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لَاَصْحَابِ الْکَیْلِ وَالْمِیْزَانِ اِنَّکُمْ قَدْ وُلِّیتُمْ اَمْرَیْنِ ھَلَکَتْ فِیھِمَا الْاُمَمُ السَّابِقَۃُ﴾(رواہ الترمذی)

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپنے اور تولنے والوں سے فرمایا۔تمہارے ہاتھ میں دو کام ایسے ہیں جن کی وجہ سے تم سے پہلی قومیں ہلاک ہوئیں (یعنی کم ناپنے اور کم تولنے کی وجہ سے، لہٰذا تم ایسا نہ کرنا)''

تجارت کے بابرکت اور باوقار پیشہ کو ناپاک اور بے وقار بنانے کی ایک مکروہ سازش اور انسانیت سوز چال ناپ تول میں کمی ہے اس مکروہ حیلہ کے ذریعے تاجر کم مال دے کر زیادہ کے دام وصول کرنا چاہتا ہے اور اپنے بھائیوں کی آنکھوں میں دھول ڈال کر ان کے خون پسینے سے کمائے ہوئے دام بٹور لیتا ہے۔

اسلام کے قانونِ تجارت نے اس قبیح حرکت کو بہت بڑا جرم بتایا ہے اور اس پر دنیا و آخرت کی خرابی اور رسوائی کی وعید سنائی ہے۔قرآن مجید نے اس حرکت پر تنبیہہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ o الَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ o وَاِذَا کَالُوْھُمْ اَوْ وَّزَنُوْھُمْ یُخْسِرُوْنَ o﴾ (المطففین ۱تا۳)

''خرابی ہے گھٹا کر دینے والوں کے لیے، وہ لوگ کہ جب دوسروں سے مال لیں تو پورا پورا لیں اور جب دوسروں کو ناپ کر یا تول کر دیں تو کم دیں۔''

علامہ طبریؒ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت نقل کی ہے وہ کہتے

ہیں ''جس وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو وہاں کے لوگ ماپنے میں بڑے خبیث تھے وہ لوگ ناپ میں پاسنگ مارتے تھے۔ یہاں اس امر کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ اہل مکہ اشیاء تول کر فروخت کرتے تھے اور اہل مدینہ منورہ ناپ کر فروخت کرتے تھے۔

زمخشری نے اس ضمن میں ایک شخص ابومہینہ کا ذکر کیا ہے جو تول ناپ میں کمی کی وجہ سے سارے مدینہ منورہ میں مشہور تھا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو ابومہینہ کے پاس دو پیمانے تھے ایک اپنے خریدنے کے لیے استعمال کرتا اور دوسرا لوگوں کو اپنی اشیاء فروخت کرنے کے لیے استعمال میں لاتا۔

ناپ تول کی کمی ایک ایسی لعنت ہے جس میں بعض سابقہ امم کے بددیانت تجار بھی مبتلا تھے اور جس قوم کے نبی علیہ السلام نے یہ ناپاک حرکت اپنی قوم میں پائی اس نے ہمیشہ اس کی مذمت کی اور اس سے باز رہنے کی تلقین فرمائی خصوصاً حضرت شعیب علیہ السلام جن کا وظیفہ ہی اللہ کریم نے یہ بتایا کہ انہیں صرف اس منحوس حرکت سے لوگوں کو باز رکھنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ ارشاد باری ہے:

﴿والیٰ مدین اخاھم شعیبا قال یا قوم اعبدوا اللّٰہ مالکم من الہ غیرہ قدجاء تکم بینة من ربکم فاوفوا الکیل والمیزان ولا تبخسوا الناس اشیاء ھم ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا﴾ (الاعراف:۹)

''اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب علیہ السلام کو بھیجا انہوں نے کہا اے قوم اللہ کریم کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے تمہارے پروردگار کی طرف سے واضح نشانی آ چکی ہے لہٰذا ناپ تول پورا پورا کیا کرو اور لوگوں کو ان کی (خرید کردہ) اشیاء کم کر کے نہ دیا کرو اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد (اپنے اس ناپاک عمل سے) فساد

بپانہ کرو۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تجار کو ناپ تول میں کمی کے عذاب اور انجام سے ڈراتے ہوئے فرمایا:

﴿قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا صحاب الکیل والمیزان انکم قد ولیتم امرین ھلکت فیھما الامم السابقة قبلکم﴾ (مشکوٰۃ باب السلم والرھن)

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپ تول والوں کو فرمایا بلاشبہ تمہیں ایسے دو کاموں کی نگرانی سونپی گئی ہے جن میں کوتاہی کی وجہ سے کئی قومیں تم سے پہلے ہلاک ہوگئیں وہ دو کام ہیں ناپ تول۔''

اسلام کا قانون تجارت ناپ تول میں عدل وقسط سے آگے بڑھ کر یہاں احسان کا درس دیتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن بازار سے گزر رہے تھے ایک شخص کو دیکھتے ہیں جو پیشہ ور تولا وا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تعلیم دیتے ہوئے فرمایا:

﴿زِنْ وَارْجح﴾ (مشکوٰۃ باب الافلاس والانظار)

''جھکتا تولو۔''

دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد وقتی تعلیم نہیں تھا بلکہ قیامت تک آنے والے تمام تجارت پیشہ افراد کے لیے ایک وصیت ہے۔ وحی کے ذریعے غیب کی باتیں بتانے والے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ آئندہ چل کر ڈنڈی مارنے والے اور ترازو کے جھکاؤ کا دھوکہ دے کر کم تول دینے والے، گاہک کی آنکھوں میں دھول ڈال کر اسے زیادہ ملنے کی خوش فہمی میں مبتلا کرنے والے ماہر تولا وے اور وزن کرنے والے بھی آئیں گے جنہیں اپنے اس مکروہ فن پر ناز بھی ہوگا ان کے لیے اس وصیت میں درس فلاح ہے کہ تولو اور جھکتا تولو۔

ناپ تول پورا پورا دینے کے خوشگوار معاشرتی نتائج برآمد ہوتے ہیں اور اس طرح

انسانی قلوب ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں کہ بسا اوقات انسان معاشرتی تعلقات کی بہتر استواری کے لیے اپنی خواہشات تک کی قربانی دینے اور مشکلات برداشت کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں اس کی طرف اشارہ قرآن مجید نے حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کے قصہ میں کیا ہے جب یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں، جو ابھی تک آپ سے ناآشنا تھے سے حضرت بنیامین علیہ السلام (جو یوسف علیہ السلام کے سگے اور دوسرے بھائیوں کے سوتیلے بھائی تھے) کو مصر لانے کو کہا اور انہیں آمادہ کرانے کو کہا تو انہیں یہی احسان جتلایا کہ دیکھو میں تمہیں پورا پورا تول دیتا ہوں اگر میرا یہ احسان سمجھتے ہو تو آئندہ اپنے بھائی بنیامین کو بھی لانا قرآن مجید کے الفاظ کا ترجمہ یوں ہے:

''(یوسف علیہ السلام نے) فرمایا میرے پاس اپنے باپ کی طرف سے بھائی کو بھی لے کر آنا تم دیکھتے نہیں میں پورا پورا پیمانہ بھر کر دیتا ہوں اور مہمان نوازی بھی اچھی طرح کرتا ہوں۔'' (یوسف:۵۹)



قرآن وسنت کی روشنی میں

کُفّار کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات

کس طرح ہونے چاہئیں؟

﴿عَنْ اَبِیْ سَعِیْد رَضِیَ اللّٰه عنه اَنَّه، سمِعَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمْ یَقُوْلُ لَا تُصَاحِبْ اِلَّا مُؤْمِناً وَلَا یَاکُلْ طَعَامَکَ اِلَّا تَقِیٌّ﴾

(رواه الترمذی و ابوداؤد والدارمی)

''حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ اپنا ساتھی اور دوست نہ بنا مگر مسلمان کو اور اپنا کھانا نہ کھلا مگر پرہیز گار کو۔''

صاحب مرقات اس روایت کی تشریح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

﴿والمراد منه النهی عن مصاحبة الکفار والمنافقین لانّ مصاجتهم مضرة فی الدین﴾

''لاتصاحب سے مراد کفار اور منافقین سے دوستی رکھنے کو منع کرنا ہے اس لیے کہ ان سے دوستی دین کے لیے نقصان دہ ہے۔''

قرآن حکیم میں بہت سی آیات میں مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ دوستی اور محبت کرنے سے شدت کے ساتھ روکا گیا ہے۔

سورۂ ممتحنہ کی پہلی آیت میں فرمایا: ''اے ایمان والو! میرے دشمن اور اپنے دشمن (یعنی کافرکو) دوست نہ بناؤ کہ تم ان کو دوستی کے پیغام بھیجو۔''

سورۂ مائدہ کی آیت ۵۱ میں فرمایا ''اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ کیونکہ وہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے دوست ہیں جو ان سے دوستی کرے گا وہ انہی میں

شمار ہوگا۔ سورۂ مجادلہ کی آخری آیت میں فرمایا ''آپ نہ پائیں گے کسی قوم کو جو یقین رکھتے ہوں اللہ پر اور آخرت کے دن پر کہ دوستی کریں ایسے لوگوں سے جو مخالف ہیں اللہ اور اس کے رسول کے خواہ وہ اپنے باپ دادا ہی ہوں یا اپنی اولاد یا اپنے بھائی یا اپنے خاندان والے۔''

ان واضح آیات قرآنیہ کو دیکھ کر حقیقت حال سے ناواقف لوگوں کو تو یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک غیر مسلموں سے کسی قسم کی رواداری اور تعلق بلکہ حسن اخلاق کی بھی کوئی گنجائش نہیں، دوسری طرف قرآن مجید کی بہت سی آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور عمل سے، خلفائے راشدین اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تعامل سے غیر مسلموں کے ساتھ احسان وسلوک، ہمدردی اور غم خواری کے احکام اور ایسے ایسے واقعات ثابت ہوتے ہیں جن کی مثالیں دنیا کی اقوام میں ملنا مشکل ہیں اب ایک سطحی نظر رکھنے والے مسلمان کو بھی اس جگہ قرآن وسنت کے احکام میں تعارض اور تصادم محسوس ہونے لگتا ہے لیکن یہ دونوں خیال قرآن حکیم کی حقیقی تعلیمات پر سطحی نظر اور ناقص تحقیق کا نتیجہ ہوتے ہیں اگر تمام مقامات سے قرآن حکیم کی آیات جو اس موضوع سے متعلق ہیں ان کو جمع کر کے غور کیا جائے تو نہ غیر مسلموں کو شکایت کا موقعہ ملے گا اور نہ مسلمانوں کے دلوں میں شکوک وشبہات جنم لیں گے۔

سورۂ آل عمران کی آیت ۲۸ میں ارشاد باری ہے ''مسلمانوں کو چاہیے کہ کفار کو دوست نہ بنائیں مسلمانوں کو چھوڑ کر، اور جو شخص ایسا کرے گا وہ اللہ کے ساتھ دوستی رکھنے میں شمار نہیں مگر ایسی صورت میں کہ تم اس سے کسی قسم کا اندیشہ رکھتے ہو۔''

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر بیان القرآن میں اس آیت کی تفسیر میں اس مسئلہ کی خوب وضاحت فرمائی اور فرمایا کہ کفار سے تین قسم کے معاملات ہیں: (۱) موالات، (۲) مدارات، (۳) مواسات اور پھر تفصیل پیش فرمائی۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے معارف القرآن جلد دوم صفحہ ۵۰ میں سورۂ آل عمران کی اس آیت کی تفسیر حضرت تھانویؒ کی تفسیر نقل کرنے کے بعد ایک چوتھا درجہ معاملات کا بھی لکھا ہے۔ ان تفصیلات کے مطالعہ کے بعد بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ کفار سے کس قسم کے

تعلقات جائز ہیں اور کون سے ناجائز اوران کی وجوہات کیا ہیں۔حضرت مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ دو شخصیتوں یا دو جماعتوں میں تعلقات کے مختلف درجات ہوتے ہیں ایک درجہ تعلق کا قلبی موالات یعنی دلی مودت اور محبت کا ہے اور یہ صرف مومنین کے ساتھ مخصوص ہے غیر مومن کے ساتھ مومن کا یہ تعلق کسی حال میں قطعاً جائز نہیں۔

دوسرا درجہ مواسات کا ہے جس کے معنی ہیں ہمدردی، خیرخواہی اور نفع رسانی، یہ سب غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے سوائے ان کفار کے جو اہل حرب ہیں اور مسلمانوں کے ساتھ برسرپیکار ہیں۔سورۂ ممتحنہ کی آٹھویں آیت میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے ''اللہ تعالیٰ تمہیں منع نہیں کرتا ان سے جولڑتے نہیں تم سے دین پر اور نکالا نہیں تم کو تمہارے گھروں سے کہ ان کے ساتھ احسان اور انصاف کا سلوک کرو۔''

تیسرا درجہ مدارات کا ہے جس کے معنی ہیں ظاہری خوش خلقی اور دوستانہ برتاؤ یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے جبکہ اس سے مقصود ان کو دینی نفع پہنچانا ہو یا وہ اپنے مہمان ہوں یا ان کے شر اور ضرر رسانی سے اپنے آپ کو بچانا مقصود ہو، جیسا کہ سورۂ آل عمران کی آیت ۲۸ میں ''اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰةً.'' (مگر تم ان سے کسی قسم کا اندیشہ رکھتے ہو) سے یہی درجۂ مدارات مراد ہے۔

چوتھا درجہ معاملات کا ہے کہ ان سے تجارت یا اجرت و ملازمت اور صنعت و حرفت کے معاملات کیے جائیں یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے سوائے ایسی حالت کے کہ ان معاملات سے عام مسلمانوں کو نقصان پہنچتا ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدینؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ کا تعامل اس پر شاہد ہے' فقہاء نے اسی بناء پر کفار اہل حرب کے ہاتھ اسلحہ فروخت کرنے کو ممنوع قرار دیا ہے باقی تجارت وغیرہ کی اجازت دی ہے اور ان کو اپنا ملازم رکھنا یا خود ان کے کارخانوں اور اداروں میں ملازم ہونا یہ سب جائز ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ دلی دوستی اور محبت تو کسی کافر کے ساتھ کسی حال میں جائز نہیں اور احسان اور ہمدردی اور نفع پہنچانا اہل حرب کے سوا سب کفار کے ساتھ جائز ہے اسی طرح ظاہری خوش خلقی اور دوستانہ برتاؤ بھی سب کے ساتھ جائز ہے جبکہ اس کا مقصد

مہمان کی خاطر داری یا غیر مسلموں کو اسلامی معلومات اور دینی فائدہ پہنچانا ہو یا اپنے آپ کو ان کے کسی ضرر سے بچانا مقصود ہو۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہو کر اس دنیا میں تشریف لائے آپ نے غیر مسلموں کے ساتھ جو احسان و ہمدردی اور خوش خلقی کے معاملات کیے اس کی نظیر دنیا میں ملنا مشکل ہے' مکہ میں قحط پڑا تو جن دشمنوں نے آپ کو اپنے وطن سے نکالا تھا ان کی خود مدد فرمائی، پھر مکہ مکرمہ کی فتح کے موقع پر سب دشمن آپ کے قابو میں آ گئے تو سب کو یہ فرما کر آزاد کر دیا کہ آج تمہیں صرف معافی نہیں دی جاتی بلکہ تمہارے پچھلے مظالم اور تکالیف پر ہم کوئی ملامت بھی نہیں کرتے، غیر مسلم جنگی قیدی ہاتھ آئے تو ان کے ساتھ وہ سلوک کیا جو اپنی اولاد کے ساتھ بھی ہر شخص نہیں کرتا' کفار نے آپ کو طرح طرح کی ایذائیں پہنچائیں لیکن کبھی آپ کا ہاتھ انتقام کے لیے نہیں اٹھا، زبان مبارک سے بددعاء بھی نہیں فرمائی۔ بنو ثقیف جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے ان کا ایک وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا گیا جو مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ عزت کا مقام تھا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے غیر مسلم محتاج آدمیوں کو مسلمانوں کی طرح بیت المال سے وظیفے دیئے۔ خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ کے معاملات اس قسم کے واقعات سے بھرے ہوئے ہیں یہ سب مواسات یا مدارات یا معاملات کی صورتیں تھیں جس موالات سے منع کیا گیا ہے وہ ہرگز نہیں تھی بخاری اور مسلم میں ارشاد نبوی ہے کہ جس شخص نے اپنی دوستی اور دشمنی کو صرف اللہ کے لیے وقف کر دیا اس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا۔ معلوم ہوا کہ ایمان کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جبکہ انسان اپنی محبت، دوستی، دشمنی اور نفرت کو اللہ تعالیٰ کے تابع کر دے۔



کیا حکومت سے از خود عہدہ طلب کرنا جائز ہے؟

﴿عن عبدالرحمن بن سمرة قال قال لی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم لا تسال الامارة فانك انّ اُعطیتها عن مسئلة وکلت الیها وان اُعطیتَها عن غیرِ مسئلَةٍ اعنت عَلیها﴾(رواہ البخاری و مسلم)

''حضرت عبدالرحمٰن بن سمرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا امارت (حکومت یا اس کے عہدے) کی خواہش نہ کر اس لیے کہ اگر تجھ کو مانگنے سے حکومت ملی تو تجھے حکومت کے حوالہ کر دیا جائے گا اور اگر بے مانگے ملے تو اللہ کی طرف سے تیری مدد کی جائے گی۔''

دورِ حاضر میں حکومت اور اس کے عہدوں کو ہر طرح کی طاقت اور طاغوتی وسائل کو استعمال کرتے ہوئے حاصل کرنے کی تگ و دو جاری ہے۔ ملک و ملت کے ہمدرد، صالح باعمل اور اہل علم حضرات کے دلوں میں گہرا دکھ بھی ہے کیونکہ ہر کام میں حلال وحرام کی فکر اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاجوئی ان کی زندگی کا مقصد ہے لیکن جب کلیدی اسامیوں، دفتری عہدوں اور انتظامی اداروں میں ایک مخصوص قماش اور کردار کے حامل افراد قرآن وسنت کے احکام کو بالائے طاق رکھ کر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے آزاد نظر آتے ہیں تو پھر یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا وہ خود آگے بڑھ کر حکومت کا کوئی عہدہ طلب کر سکتے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بہت سے صحابہ کرام کو مختلف عہدے عطا فرمائے اور کلیدی اسامیوں پر فائز فرمایا لیکن ساتھ ہی حکومت کے عہدہ کو طلب کرنے کی حوصلہ شکنی بھی فرمائی۔

صحیح مسلم میں ہے ایک مرتبہ حضرت ابو ذر ! نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کیا آپ مجھے کسی جگہ کا عامل (حاکم وغیرہ) مقرر نہیں فرمائیں گے؟ (حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے کندھے کو تھپک کر فرمایا اے ابو ذر رضی اللہ عنہ تو کمزور ہے اور یہ عہدہ امانت ہے اور یہ عہدہ قیامت کے دن ذلت اور رسوائی کا سبب ہے مگر جس شخص نے اسے حق کے ساتھ لیا اور اس عہدہ کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اس پر ہیں ان کو ادا کیا۔

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم لوگ حاکم بننے کی حرص کرو گے عنقریب قیامت کے دن یہ شرمندگی کا سبب بنے گی پس یہ (حاکم بننے کی حرص) بہترین مرضعہ (دودھ پلانے والی) ہے اور بدترین دودھ چھڑانے والی ہے'' (یعنی امارت کا آغاز نہایت خوشنما اور دل پسند ہوتا ہے لیکن انجام بُرا ہوتا ہے)۔

بخاری اور مسلم کی روایت ہے کہ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ''میں اور میرے چچا کے ۲ بیٹے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے ان میں سے ایک نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو اللہ نے والی اور حاکم بنایا ہے تو ہمیں بھی آپ بعض چیزوں پر والی مقرر فرمائیں، دوسرے نے بھی اسی قسم کی خواہش ظاہر کی آپ نے فرمایا خدا کی قسم ہم کسی ایسے شخص کو ان کاموں کا والی نہیں بناتے جو ہم سے خود والی بننا طلب کرے۔''

ان ارشادات نبویہ سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کا کوئی عہدہ بذات خود طلب نہیں کرنا چاہیے لیکن قرآن حکیم کی تلاوت کرتے ہوئے سورۂ یوسف کی آیت ۵۵ پڑھتے ہیں تو وہاں حضرت یوسف علیہ السلام نے نہ صرف یہ کہ خود عہدہ طلب کیا بلکہ اپنی تعریف اور خوبیاں بیان کر کے عہدہ طلب کیا۔ فرمایا:

﴿ اجعلنی علیٰ خزائن الارض انی حفیظٌ علیم ﴾

''مجھے ملک کے خزانوں پر مقرر کر، میں خوب جاننے والا نگہبان ہوں۔''

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ بیان القرآن میں اسی آیت کی تفسیر میں

لکھتے ہیں'' معلوم ہوا کہ جب کسی کام کی لیاقت اپنے اندر منحصر دیکھے، خود اس کی درخواست جائز ہے مگر مقصود نفع رسانی ہو نہ کہ نفس پروری۔''

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ معارف القرآن جلد پنجم صفحہ ۷۸ پر اسی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ کسی سرکاری عہدہ اور منصب کو طلب کرنا خاص صورتوں میں جائز ہے جیسے یوسف علیہ السلام نے خزائن ارض کا انتظام اور ذمہ داری طلب فرمائی۔

دراصل حضرت یوسف علیہ السلام جانتے تھے کہ بادشاہ مصر کافر ہے اس کا عملہ بھی ایسا ہی ہے اور ملک میں قحط آنے والا ہے اس وقت خودغرض لوگ اللہ کی مخلوق پر رحم نہ کریں گے اور لاکھوں انسان بھوک سے مر جائیں گے کوئی دوسرا شخص ایسا موجود نہیں تھا جو غریبوں کے حقوق میں انصاف کر سکے اس لیے خود عہدہ کی درخواست کی اگرچہ اس کے ساتھ کچھ اپنے کمالات کا اظہار بھی ضرورت کی وجہ سے کرنا پڑا تاکہ بادشاہ مطمئن ہو کر عہدہ ان کے سپرد کر دے۔

تفسیر الجامع لاحکام القرآن (جو کہ تفسیر قرطبی کے نام سے مشہور ہے) میں علامہ محمد بن احمد القرطبی لکھتے ہیں۔''اگر آج بھی کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ کوئی عہدہ حکومت کا ایسا ہے جس کے فرائض کو کوئی دوسرا آدمی صحیح طور پر انجام دینے والا موجود نہیں اور خود اس کو یہ اندازہ ہے کہ میں صحیح انجام دے سکتا ہوں تو اس کے لیے جائز ہے بلکہ واجب ہے کہ اس عہد ہ کی خود درخواست کرے مگر اپنے جاہ و مال کے لیے نہیں بلکہ خدمت خلق کے لیے جس کا تعلق قلبی نیت اور ارادہ سے ہے جو اللہ تعالیٰ پر خوب روشن ہے۔''

سورۂ یوسف کی اسی آیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ مصر کی ملازمت قبول فرمائی حالانکہ وہ کافر تھا جس سے معلوم ہوا کہ کافر یا فاسق حکمران کی حکومت کا عہدہ قبول کرنا خاص حالات میں جائز ہے۔

(تفصیل کے لیے معارف القرآن جلد ۵ صفحہ ۷۹ کا مطالعہ فرمایئے)

علامہ ابو حبان غرناطی اندلسی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر البحر المحیط میں لکھتے ہیں۔ ''جہاں یہ معلوم ہو کہ علماء اور صلحاء اگر یہ عہدہ قبول نہیں کریں گے تو لوگوں کے حقوق ضائع ہو جائیں گے انصاف نہیں ہو سکے گا وہاں ایسا عہدہ قبول کرنا جائز ہے بلکہ ثواب ہے بشرطیکہ اس عہدے میں خود اس کو خلاف شرع امور کے ارتکاب پر مجبوری پیش نہ آئے۔''

اس تمام تر تفصیل اور بحث کا حاصل حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ کے محتاط کلمات کے ساتھ پیش خدمت ہے۔ (بحوالہ معارف القرآن جلد ۵ صفحہ ۷۸)

''جب کسی خاص عہدہ کے متعلق یہ معلوم ہو کہ کوئی دوسرا آدمی اس کا اچھا انتظام نہیں کر سکے گا اور اپنے بارے میں یہ اندازہ ہو کہ عہدہ کے کام کو اچھا انجام دے سکے گا اور کسی گناہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ نہ ہو، ایسی حالت میں عہدہ کا خود طلب کر لینا بھی جائز ہے بشرطیکہ حُب جاہ و مال اس کا سبب نہ ہو بلکہ خلق اللہ کی صحیح خدمت اور انصاف کے ساتھ ان کے حقوق پہنچانا مقصود ہو جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے صرف یہی مقصد تھا اور جہاں یہ صورت نہ ہو تو (وہاں) حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت کا کوئی عہدہ خود طلب کرنے سے منع فرمایا ہے اور جس نے خود کسی عہدہ کی درخواست کی اس کو (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے) عہدہ نہیں دیا۔



منشیات ایک لعنت ہے اور اس میں ملوث ہر فرد معلون ہے

﴿عن انس رضی اللّٰہ عنہ قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فِی الْخَمْرِ عَشْرَۃً عَاصِرَھَا وَمُعْتَصِرَھَا وَشَارِبَھَا وَحَامِلَھَا وَالْمَحْمُوْلَۃَ اِلَیْہِ وَسَاقِیَھَا وَبَائِعَھَا وَمُبْتَاعَھَا وَآکِلَ ثَمَنِھَا وَالْمُشْتَرِیَ لَہٗ﴾ (رواہ الترمذی، وابن ماجہ)

”حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے بارے میں دس افراد پر لعنت فرمائی۔ (۱) نچوڑنے والا، (۲) نچڑوانے والا، بنانے والا، (۳) پینے والا، (۴) اس کو لادکر لانے والا، (۵) اور جس کے لیے لائی جائے، (۶) اور پلانے والا، (۷) اور اس کو بیچنے والا، (۸) اس کو خریدنے والا، (۹) اس کی آمدنی کھانے والا، (۱۰) اور اس شخص پر جس کے لیے خریدی گئی۔“

شراب کو نشہ آور ہونے کی وجہ سے حرام کیا گیا ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قانون ارشاد فرمایا کُلُّ مُسْکِرٍ حَرَامٌ ”ہر نشہ لانے والی چیز حرام ہے۔“ لہٰذا دور جدید کی ہر طرح کی منشیات حرام ہیں جیسے بھنگ، چرس، ہیروئن وغیرہ“

اہل عرب شراب کے عادی تھے چنانچہ شریعت اسلام نے شراب کو درجہ بدرجہ حرام کیا اس لیے کہ عمر بھر کی عادت خصوصاً نشہ کی عادت چھوڑنا انسانی طبیعت پر انتہائی مشکل اور مشقت والا کام ہے۔ عربی محاورہ ہے ”فِطَامُ الْعَادَۃِ اَشَدُّ مِنْ فِطَامِ الرضاعۃ“ یعنی کسی عادت کا چھڑانا شیر خوار بچے کو ماں کے دودھ سے چھڑوانے سے بھی زیادہ سخت ہوتا ہے۔

فرمانبردار صحابہ کرامؓ نے پہلا حکم پاتے ہی اپنے اپنے گھروں میں جو شراب رکھی تھی اسی وقت اس کو بہا دیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے مدینہ کی گلیوں میں یہ آواز لگوائی کہ شراب حرام کر دی گئی ہے تو جس کے ہاتھ میں جو برتن شراب کا تھا اس کو وہیں پھینک دیا جس کے پاس شراب کا جام بھی تھا اس کو گھر سے باہر لا کر توڑ دیا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ اس وقت ایک مجلس میں دورِ جام کے ساقی بنے ہوئے تھے ابوطلحہ، ابوعبیدہ بن الجراح، ابی بن کعب، سہیل رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے جلیل القدر صحابہ موجود تھے منادی کی آواز کان میں پڑتے ہی سب شراب گرا دی۔ جام وسبو توڑ دیئے۔ مدینہ میں اس روز شراب اسی طرح بہہ رہی تھی جیسے بارش کا پانی اور مدینہ کی گلیوں میں طویل عرصہ تک یہ حالت رہی کہ جب بارش ہوتی تو شراب کی بو اور رنگ مٹی میں نظر آتا۔

شراب کی حرمت کے حکم پر مسلمانوں کے عمل کا ایک نمونہ سامنے آ گیا جسے پیغمبرانہ تربیت کا بے مثال اثر کہنا چاہیے یہ ذہن سازی کا شاندار نتیجہ ہے ہر شخص کو معلوم ہے کہ نشہ کی عادت چھوڑنا انتہائی دشوار ہوتا ہے اور عرب میں اس قدر رواج تھا کہ چند گھنٹے بھی شراب کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے لیکن ایک اعلان کی آواز آتے ہی سب کے مزاج بدل گئے' ان کی عادتوں میں انقلاب برپا ہو گیا، چند لمحے پہلے جو چیز انتہائی مرغوب تھی اب وہی چیز انتہائی مبغوض بن گئی، فحش اور ناپاک ہو گئی۔

آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی نشہ اور منشیات کے خلاف آواز اٹھ رہی ہے بلکہ شور برپا ہے ماہرین صحت، سماجی اصلاح کرنے والے کونسلیں بنا رہے ہیں' کانفرنسوں کا انعقاد ہو رہا ہے کیونکہ انہیں یہ معلوم ہو گیا ہے کہ منشیات سے بے شمار اور انتہائی مہلک بیماریاں پیدا ہو رہی ہیں ذرائع ابلاغ اور نشر و اشاعت کے نئے نئے ذرائع جو ترقی یافتہ دور میں انقلاب کا اہم ذریعہ سمجھے جاتے ہیں یہ تمام منشیات کے خلاف بول رہے ہیں ''جہاد'' کر رہے ہیں لیکن بات بنتی نظر نہیں آتی اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ اور دور جدید کے طریقہ میں ایک بہت بڑا فرق ہے اور وہ یہ کہ شریعت اسلام نے صرف قانون کو قوم کی اصلاح کے لیے کبھی کافی نہیں سمجھا بلکہ قانون سے پہلے ان کی ذہنی تربیت کی عبادت، پرہیزگاری اور فکر آخرت کے کیمیاوی نسخوں سے ان کے مزاجوں میں ایک انقلاب پیدا کر کے ایسے افراد پیدا

کیے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر جان و مال سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائیں، ذہنوں کو ہموار کرنے کے لیے بے شک اب بھی بہت زور لگایا جا رہا ہے لیکن زور میں ہر طرح کا شور ہے مگر فکر آخرت اور احکام الٰہیہ کا احساس اُجاگر کرنے کا عزم نہیں ہے۔ وجوہات تلاش کی جائیں کہ آخر منشیات کا طوفان کیوں آیا؟ نوجوان نسل ذہنی دباؤ اور پریشانیوں کا مقابلہ نہ کرسکی تو ادھر آ گئی کیا ان کو ذہن نشین نہیں کروایا گیا کہ اسلام نے ہمیں اطمینان قلب کے لیے ذکر الٰہی سکھایا ہے۔

"الا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب" کیا ماں باپ اولاد سے غافل تو نہیں ہو گئے جس کے نتیجے میں یہ دن دیکھنے کو ملا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں باپ کو اولاد کی تربیت کا ذمہ دار قرار دیا۔ کیا لوگوں کو حرص اور لالچ کے اندھے کنوئیں میں گرنے سے بچانے کے لیے اسلام نے زریں اصول نہیں سکھائے؟

دور جدید میں احکام اسلام کی روشنی میں ذہن سازی کے ساتھ ساتھ اس دور کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے منشیات کے لیے سخت سے سخت سزائیں مقرر کی جائیں اور پھر اس میں بلا امتیاز فوری کاروائی کر کے اس لعنت سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آغاز میں شراب کا نشہ کرنے والے پایا جاتا تو اس کو لوگ ہاتھوں اور جوتوں سے مارتے اور چادروں کے کوڑے بنا کر مارتے۔ کھجور کی ٹہنیوں سے مارا جاتا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بڑھتی ہوئی بیماری کو دیکھتے ہوئے چالیس کوڑوں کی سزا مقرر کی، جب شراب پینے والوں کی تعداد بڑھی تو اسی کوڑوں کی سزا مقرر کی۔

غور فرمایئے عام لوگوں کا جوتوں سے مارنا، کھجور کی ٹہنیوں سے مارنا یہ عوام کا نفرت آمیز ردعمل تھا اور پھر خلفائے راشدین نے باقاعدہ سزا مقرر کی۔ دورِ حاضر میں منشیات کے استعمال نے قوم کی ایک بڑی تعداد کو ذہنی طور پر مفلوج کر کے رکھ دیا آج کوئی شخص اپنی اولاد کو اس جہنم میں دھنسنے سے بچانا چاہتا ہے تو اسے ابھی سے بچوں کی دینی تربیت کا خیال رکھنا چاہیے بچوں کو زیادہ وقت گھر سے باہر نہ رہنے دے، درسگاہ اور دوستوں کی سرگرمیوں پر کڑی

نظر رکھے، محض اچھا کھلانا، اچھا لینا دینا اچھی درسگاہ میں داخل کرا دینا یہی تربیت نہیں ہوتی۔ پھر معاشرہ کے ذمہ دار افراد منشیات کے عادی افراد کو علاج گاہوں تک پہنچانے کی بھرپور سعی کریں اور قانون نافذ کرنے والے ادارے منشیات کے کاروبار میں ملوث چاہے وہ کسی بھی درجہ میں ملوث ہوں کو سخت سزا دیں۔ عموماً یہ دیکھنے میں آیا کہ ماں باپ عزیز و اقارب پہلے منشیات کے عادی افراد کی حرکتوں پر پردے ڈالتے ہیں ان کی بے جا فرمائشوں کو پورا کرتے ہیں لیکن معاملہ حد سے آگے گزر جانے پر ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں لہٰذا اس معاملہ میں قطعاً کوتاہی نہ کی جائے ورنہ یہ اہل معاشرہ، والدین، عزیز و اقارب اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہ ہوں گے۔

آج کے دور میں منشیات کے عادی افراد کے لیے جدید ترین علاج گاہیں اور رفاہی ادارے کام کر رہے ہیں جہاں جدید ترین نفسیاتی طریقوں اور ادویات سے اس کا مکمل علاج کیا جاتا ہے لہٰذا جہاں کہیں ایسا مریض ملے اسے علاج تک پہنچانے کی بھرپور سعی کی جائے۔ جس طرح منشیات کو پھیلانے، اس کے استعمال کرنے اور اس کے کاروبار میں ہر شخص ارشاد نبوی کے مطابق ملعون ہے یقیناً اسی طرح منشیات کے انسداد کے لیے ہر مرحلہ میں تعاون کرنے والا شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مستحق ہو گا۔

اللہ تعالیٰ پوری دنیا کو خصوصاً پاکستان کو اس غلیظ ترین لعنت سے پاک فرما دے اور اس کے کاروبار میں ملوث ہر شخص کو ہدایت عطا فرمائے۔ (آمین)

مہنگائی کے دور میں اخراجات پر کنٹرول کس طرح کریں؟

﴿عن ابن عمر رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ قال قال رَسُوْلُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اَلْاِ قْتِصَادُ فِی النّفقۃِ نِصْفُ الْمَعِیْشَۃِ﴾ (رواہ البیہقی)

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اخراجات میں میانہ روی اختیار کرنا نصف معیشت (زندگی گزارنے کا طریقہ) ہے۔''

اچھی نیت سے، نیک مقصد کے لیے دنیا کی دولت حلال ذریعہ سے حاصل کرنے کی کوشش کرنا صرف جائز ہی نہیں بلکہ بہت بڑی نیکی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص دنیا کی دولت حلال طریقے سے حاصل کرے اور اس مقصد کے لیے حاصل کرے کہ دوسروں کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے دوسروں سے مانگنے سے بچار ہے' اپنے اہل وعیال کے لیے روزی اور آرام وآسائش کا سامان مہیا کر سکے اور اپنے ہمسایوں کے ساتھ بھی احسان اور اچھا سلوک کر سکے تو ایسا شخص قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس شان کے ساتھ حاضر ہوگا کہ اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتا ہوا اور روشن ہوگا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص دنیا کی دولت حلال طریقے ہی سے حاصل کرے لیکن اس کا مقصد یہ ہو کہ وہ بہت بڑا مالدار ہو جائے اور اس دولت مندی کی وجہ سے دوسروں کے مقابلہ میں اپنی شان اونچی کر سکے اور لوگوں کی نظروں میں بڑا بننے کے لیے دولت حاصل کرے۔ لَقِیَ اللّٰہ تعالٰی وَھُوَ عَلَیہِ غَضْبَانُ تو ایسا شخص قیامت کے روز اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر غضبناک ہوں گے۔

مال ودولت کی حرص عام انسانوں کی فطرت میں داخل ہوتی ہے' اگر دولت سے انکا

گھر تو کیا جنگل کے جنگل اور صحراء بھی بھرے ہوئے ہوں تب بھی اس انسان کا دل قناعت نہیں کرتا۔ یہ انسان اس میں اضافہ اور زیادتی چاہتا ہے زندگی کے آخری سانس تک اس کی ہوس کا یہی حال رہتا ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں۔

﴿لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِن مَالٍ لا بتَغٰى ثَالِثًا و لا يَمْلاءُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ اِلَّا التُّرَابُ﴾

"یعنی اگر آدمی کے پاس مال سے بھری ہوئی دو وادیاں ہوں تو یہ تیسری بھی چاہے گا اور آدمی کا پیٹ کوئی چیز بھی نہیں بھر سکتی مگر قبر کی مٹی۔"

دولت کی ہوس جہاں انسان کے لیے دنیا کی بربادی کا نشان ہے وہاں آخرت کی ناکامی ہے لیکن یہی دنیا اور اس کی دولت اللہ کے احکام کے مطابق استعمال کی جائے تو وہ عبادت بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو احکامات دولت کے بارے میں عطا فرمائے ہیں ان کا تعلق اعتدال اور میانہ روی سے ہے ارشاد نبوی ہے' فرمایا مَا عَالَ مَنِ اقْتَصَد. جو میانہ روی اختیار کرتا ہے وہ محتاج نہیں ہوتا۔ لیکن اگر انسان دولت کو حقوق پورا کرنے میں بھی صرف نہیں کرتا تو اس سے بخل پیدا ہوتا ہے اور ایسے شخص کو بخیل کہا جاتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لا يَجْتَمِعُ الشُّحُّ وَالْاِيْمَانُ فی قَلْبِ عَبْدٍ اَبَداً. فرمایا کہ بخل اور ایمان کسی مومن بندے کے دل میں کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔ اور اگر انسان بے جا خرچ کرنا شروع کر دے تو اسے اسراف اور فضول خرچی کہتے ہیں جس سے اللہ رب العزت نے منع فرمایا۔ کلوا و اشربوا و لا تسرفوا. کھاؤ پیو لیکن فضول خرچی نہ کرو۔

معلوم ہوا کہ اگر مناسب جگہ بھی نہ خرچ کیا جائے تو بخل ہے اور اگر بے جا خرچ کیا جائے تو فضول خرچی ہے ان دو کے درمیان انفاق فی سبیل اللہ یعنی اللہ کے راستے میں خرچ کرنا ہے اور یہی خرچ کرنے کا صحیح طریقہ ہے۔

علماء نے اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی وضاحت فرمائی ہے کہ اگر اللہ کے

بتائے ہوئے حقوق پر خرچ کیا تو یہ اللہ کے لیے خرچ کیا حتیٰ کہ اپنی جان پر اپنے گھر والوں پر اپنے بچوں پر خرچ کرنا بھی اللہ ہی کی خاطر ہوتو وہ بھی عبادت ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک دینار تم نے اللہ کے راستہ میں خرچ کیا، ایک دینار کسی غلام کو آزاد کرنے میں خرچ کیا، ایک دینار مسکینوں پر خرچ کیا اور ایک دینار گھر والوں پر خرچ کیا۔تو وہ دینار جو گھر والوں پر خرچ کیا اس کا درجہ سب سے زیادہ ہے۔

حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا۔تم اللہ کی رضا اور خوشنودی کی خاطر اگر اپنی بیوی کو ایک لقمہ بھی کھلاؤ گے اللہ اس کا بھی اجر دے گا اور وہ صدقہ ہے۔

یہ بات درست ہے کہ سادگی ایمان ہی کا حصہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ جب نصیب فرمائے اور وسعت وگنجائش ہوتو بدحال اور میلے کچیلے کپڑوں میں رہنا درست نہیں۔

ابوالاحوص تابعی اپنے والد سے روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں بہت معمولی اور گھٹیا قسم کے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔تو آپ نے مجھ سے فرمایا کیا تمہارے پاس کچھ مال ودولت ہے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں اللہ کا فضل ہے آپ نے پوچھا کس قسم کا مال ہے میں نے عرض کیا مجھے اللہ نے ہر قسم کا مال دے رکھا ہے۔ اونٹ ، گائے ، بیل ، بھیڑ بکریاں غلام باندیاں بھی ہیں۔آپ نے ارشاد فرمایا جب اللہ نے تمھیں مال ودولت سے نوازا ہے تو پھر اللہ کے انعام واحسان کا اثر تمہارے اوپر ضرور نظر آنا چاہیئے۔

اللہ تعالیٰ جب بندہ کو دے بندہ اسے جائز خرچ کرے چاہے اپنی ذات پر خرچ کرے اللہ اسے پسند فرماتا ہے۔ارشاد نبوی ہے فرمایا۔

﴿اِنَّ اللّٰہ یُحِبُّ اَن یُّریٰ اَثرُ نِعُمَتِہٖ عَلٰی عبدہ﴾

”یعنی اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ اپنے بندہ پر اپنی دی ہوئی نعمت کا اثر دیکھے۔“

معلوم ہوا کہ بخل اور کنجوسی کی وجہ سے یا صرف طبیعت کے گنوار پن کی وجہ سے صاحب استطاعت ہونے کے باوجود گھٹیا حالت میں رہنا درست نہیں۔ اللہ کی دی ہوئی نعمت اس کے بتائے ہوئے طریقوں پر خرچ کرنا یہ بھی شکر کا ایک انداز ہے۔

انسان کو کس حد تک خرچ کرنا چاہیئے وہ حدود اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرمادی ہیں۔ فرمایا۔

﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا وَالْبَسُوا وَتَصَدَّقُوا مَالَمْ يُخَالِطْ إِسْرَافٌ وَلَا مَخِيلَةٌ﴾

''یعنی کھاؤ، پیو اور خیرات کرو، اور کپڑے بنا کر پہنو بشرطیکہ اسراف اور نیت میں فخر اور تکبر نہ ہو۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود عام طور پر معمولی سوتی قسم کے کپڑے پہنتے تھے۔ بسا اوقات ان میں کئی کئی پیوند بھی ہوتے تھے لیکن جب وسعت ہوئی تو دوسرے ملکوں اور دوسرے علاقوں کے بنے ہوئے قیمتی جبے بھی پہن لیتے تھے۔ کئی کئی روز فاقہ سے بھی گزرتے تھے' دو دو ماہ تک آپ کے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی اور جب کھانے میسر ہوتے تو عمدہ کھانے بھی تناول فرمالیتے۔ خرچ کرنے کا صحیح اور اسلامی انداز واضح ہونے کے بعد آج عام معاشرہ کی طرف دیکھنا ہوگا۔ جہاں یہ انسان عام شادی بیاہ رچاتا ہے' ہزاروں روپے آتشبازی کی نذر کردیتا ہے' گھروں اور دیواروں کو روشنیوں سے جگمگانے پر سینکڑوں روپے بہادیتا ہے مہمانوں سے کئی گنا زیادہ کھانا پکاتا ہے۔ یہ تمام کام یہ انسان صرف اپنی ناک اپنی عزت کی خاطر کرتا ہے یہی وہ غلط انداز ہے جہاں ایک لڑکی کی شادی کرتا ہے اتنی ہی رقم میں عمدہ طریقے سے دس لڑکیوں کی شادی کرسکتا تھا۔ گھر میں چند بلبوں اور ٹیوب لائٹوں سے گذارا ہوسکتا ہے' یہ انسان ایک کمرے میں کئی بلب روشن کرتا ہے۔ چند کمروں میں چند افراد رہتے ہیں لیکن ہر کمرے میں ائرکنڈیشنڈ چل رہا ہے یہی پیسے کے خرچ کرنے کا غلط انداز ہے۔

اسلام نے خرچ کرنے کی جگہیں بھی بالکل واضح طور پر سامنے رکھی ہیں۔ اپنے گھر والوں پر اپنی ذات پر ہمسایوں پر رشتہ داروں پر خرچ کیجئے۔ بقدرضرورت اور بقدرحق اور زکوٰۃ وصدقات جو اللہ نے بندہ پر حکما جاری فرمائے ہیں ان کے لئے خدائے برتر نے جگہیں مقرر فرمادی ہیں، جن میں غرباء مساکین، قرض دار، مسافر وغیرہ شامل ہیں لیکن آج کے معاشرہ میں کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن حکیم نشان دہی فرماتا ہے۔ ایسے لوگوں کو پہچان کران کی مدد کرنا اعلیٰ ترین اخلاقی خوبی ہے فرمایا۔

﴿یَحۡسَبُھُمُ الۡجَاھِلُ اَغۡنِیَاءَ مِنَ التَّعففِ تعرفھُم بِسِیمٰھُم لَایَسئَلوُن النَّاسَ اِلۡحَافاً﴾

''یعنی ایسے لوگ جنہیں ناواقف، مالدار سمجھتے ہیں لیکن آپ ان کو نشانیوں سے پہچان سکتے ہیں یہ لوگوں سے لپٹ لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔''

ان لوگوں کو ہمارے معاشرہ میں سفید پوش کہا جاتا ہے جو کسی بھی حالت میں مانگنا گوارانہیں کرتے حتیٰ کہ انہیں یہ بھی اندازہ ہوجائے کہ دینے والا غریب سمجھ کر دے رہا ہے تو لینے سے انکار کردیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ہدیے اور تحفوں اور اشیاء ضرورت کو پیش کر کے ان پر خرچ کیا جاسکتا ہے۔ جب انسان کسی پر خرچ کرے تو خرچ کرنے کے ان آداب کو ضرور ملحوظ رکھے جو اللہ رب العزت نے فرمائے۔ ارشاد باری ہے۔ فرمایا۔

﴿اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَھُمۡ فِی سَبِیۡلِ اللّٰہ ثُمَّ لَا یُتبعُونَ مَا اَنۡفقوا منًّا وَّلَا اذیً لَّھُمۡ اَجۡرُھُمۡ عِنۡدَ رَبِّھِمۡ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡھِم وَلَاھُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ﴾

اس آیت میں اللہ رب العزت نے خرچ کرنے کے یہ آداب بیان فرمائے کہ جب کسی پر کچھ خرچ کریں تو احسان نہ جتلائیں اور رقم خرچ کرکے اسے دکھ نہ دیں، اور ریاکاری سے خرچ نہ کیا جائے اگر دکھاوے کے لیے خرچ کیا تو اللہ کے یہاں اس کا کوئی اجر

نہیں۔

اللہ رب العزت ہمیں رزق حلال حاصل کرنے کی توفیق نصیب فرمائے، اور ہمارے رزق میں برکت نصیب فرمائے، اور پھر اسے خرچ کرنے کا سلیقہ بھی عطاء فرمائے۔

☆☆☆

اُدھار لین دین محبت کا قاطع، نفرت کا بیج، تنازعات کی جڑ، ایک معاشی المیہ

مگر اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے سے ایسا نہیں ہوگا

﴿عَن حذیفة رضی اللّٰه تعالٰی عنه قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلّم اِنَّ رَجُلًا......قال ماا علم شیاءً غیر انّی کنت ابایع الناس فی الدُّنیا وَاحَازیھم فانظر المُوسِرَ واتجاوز عَن المعسر فادخلهٗ الجنّة﴾

(رواہ البخاری ومسلم)

''حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم سے پہلے لوگوں میں ایک شخص تھا۔ جب موت کا فرشتہ اس کے پاس اس کی روح نکالنے آیا تو اس سے پوچھا کیا تو نے کوئی نیک کام کیا ہے؟ اس نے کہا مجھے یاد نہیں آتا، فرشتہ نے کہا، سوچ، اس نے کہا اور تو کوئی بات نہیں ہاں یہ بات ہے کہ دنیا میں جب لوگوں سے خرید وفروخت کا معاملہ کرتا تھا تو ان سے اچھا سلوک کرتا تھا کہ خوشحال کو مہلت دے دیتا اور تنگ دست کو معاف کردیتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی وجہ سے اسے جنت میں داخل کردیا۔''

شدید ضرورت کے بغیر ادھار کا لین دین اچھا نہیں لیکن بسا اوقات اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ اس لیے جہاں تک ہوسکے ہر شخص قناعت اور کفایت شعاری سے زندگی گزارے اور قرض یعنی ادھار لین دین سے بچا رہے۔

لیکن آج کے دور میں تجارتی امور میں اور عام زندگی کی ضروریات میں ادھار خوب چلتا ہے لیکن ادھار لین دین کے جس مرحلہ میں بھی اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی ہوتی ہے وہاں فساد پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ اسلام نے ادھار کے معاملہ میں جو تعلیمات دی ہیں ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک طرف تو اسلام نے ادھار دینے والے (قرض خواہ) کے

لیے اصول بتائے ہیں۔ دوسری طرف ادھار لینے والے (مقروض) کو آداب سکھائے ہیں۔ ادھار دینے والے کے لیے اسلام نے یہ آداب واصول بتائے کہ وہ اپنے ضرورت مند بھائی کو جب قرض حسنہ یا سودا ادھار دے تو اگر وہ تنگ دست ہے تو اسے مہلت دے اگر وہ اتنا مفلس ہے کہ ادا نہیں کرسکتا تو اسے معاف کر کے اپنے پروردگار کے ہاں نیکیوں کا خزانہ جمع کرلے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ترجمہ: ”اگر ادھار لینے والا تنگدست ہے تو اسے فراخی تک مہلت دو اور اگر معاف ہی کردو تو تمہارے لیے بہت ہی بہتر ہے۔“ (البقرۃ آیت ۲۸۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہلت دینے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا: ”جس شخص کا کسی پر حق ہو، اور وہ اسے مہلت دے تو اس کے لیے ہر دن کے عوض صدقہ کا ثواب ہے۔“ (مسند احمد عن عمران بن حصین) ایک اور ارشاد نبوی ہے۔”جس کسی کو یہ بات اچھی لگتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن کی سختیوں سے بچالے تو اسے چاہیئے کہ تنگدست مقروض کو مہلت دے یا اسے معاف ہی کردے۔ (مسلم، مشکوۃ کتاب البیوع)

ایک حدیث میں ہے: ”جس کسی نے تنگدست کو مہلت دی یا اسے قرضہ معاف کردیا اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن اپنے سایہ میں جگہ دیں گے (مشکوۃ کتاب البیوع) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ہدایت فرمائی کہ اگر ادھار دینے والے کو معاف کرنے کی ہمت نہ ہو۔ یعنی ایسے معاشی حالات نہ ہوں کہ معاف کیا جاسکے تو پھر بھی ادھار لینے والے سے نرمی کے ساتھ تقاضہ کرے۔ مقروض کی غربت اور مجبوری کا احساس دلا کر باتیں بنا کر دل نہ دکھائے۔ صحیح بخاری میں ارشاد نبوی ہے اللہ تعالیٰ رحم کرے اس شریف انسان پر جو جب بیچے اور جب خریدے اور جب ادھار کا تقاضا کرے تو نرمی کرے اور درگذر سے کام لے۔

دوسری طرف اسلام نے ادھار لینے والے کو بھی خوب ہدایات دیں اور بتایا کہ ادھار لین دین ایک معاہدہ ہوتا ہے اور عہد کی باز پرس ہوگی اور بتایا کہ ادھار لینے والا استطاعت کے باوجود قرض ادا نہ کرے ٹال مٹول کرے اس کی اس مجرمانہ غفلت کو ظلم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشاد نبوی ہے ”مال دار کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔“ (بخاری ومسلم)

قرض خواہ ایسے مقروض کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کر کے اپنا حق وصول کر سکتا ہے

قرض ادا نہ کرنا اتنا بڑا جرم ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے شخص کی نماز جنازہ نہیں پڑھایا کرتے تھے جو قرض ادا کیے بغیر مرجاتا تھا جیسا کہ حضرت سلمہ بن اکوعؓ سے ایک شخص کے بارے میں تفصیلی واقعہ منقول ہے۔(بخاری،مشکوٰۃ باب الافلاس والانظار)

جب اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ کے بعد دنیوی رحمتوں کے دروازے اُمت پر کھول دیئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود غریب امتیوں کا قرض ادا فرما دیتے۔

بخاری شریف جلد۲ صفحہ۹۹۹ میں ہے کہ ''جب اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر فتوحات کے دروازے کھول دیئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا۔ میں مسلمانوں کو ان کی جانوں سے بھی زیادہ محبوب ہوں ان مومنین میں سے جو مرجائے اور قرضہ چھوڑ جائے تو اس کی ادائیگی میرے ذمہ ہے اور جو کوئی مال چھوڑ کر وفات پاجائے وہ مال اس کی وارثوں کو ملے گا۔''

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اگر مقروض قرضہ ادا کئے بغیر انتقال کر جائے اور کوئی ایسی جائیداد یا سامان نہ چھوڑ جائے جس سے قرض کی ادائیگی کا بندوست کیا جاسکے تو پھر اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے انتقال کرنے والے مقروض کے قرضہ کی ادائیگی کا بندوبست کرے تاکہ وہ مقروض آخرت کی باز پرس سے بھی بچ جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی ارشادات میں قرض کو ناقابل معافی جرم قرار دیا ہے حتیٰ کہ شہید سے بھی قرض کا مطالبہ ہوگا فرمایا'' شہید کے تمام گناہ معاف کردیئے جائیں گے مگر قرض معاف نہ ہوگا۔''

(رواہ مسلم)

حضرت شرید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' دینے کی قدرت رکھنے والے کی ٹال مٹول (تاخیری حربے اور بہانے پیش کرنا) اس کی بے عزتی اور اس کو سزا دینا جائز کردیتی ہے۔(رواہ ابوداؤد ونسائی) اسلام نے ادھار لینے والے کو یہاں تک تاکید کی ہے کہ وہ وقت پر ادا کرے اور اچھے طریقے سے ادا کرے جیسا کہ حضرت

جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے چالیس ہزار قرض لیے جب مال آیا تو آپ نے میرا قرض واپس کر دیا اور فرمایا'' اللہ تعالیٰ تیرے اہل اور مال میں برکت دے بے شک قرض کا بدلہ شکریہ ادا کرنا اور قرض ادا کرنا ہے۔'' (مشکوٰۃ باب الافلاس والانظار حدیث نمبر ۲۶)

قرآن حکیم کے احکامات اور ارشادات نبویہ کی روشنی میں اُدھار لین دین کے جو آداب معلوم ہوئے وہ یہ ہیں۔

(۱) اُدھار لین دین بغیر ضرورت شدید کے پسندیدہ نہیں۔

(۲) اُدھار لین دین میں بھول چوک، بددیانتی ، بے ایمانی اور جھگڑے کے احتمال کا دروازہ بند کرنے کی کوشش کی جائے اس کیلئے بہتر یہ ہے کہ اُدھار لین دین کی باقاعدہ دستاویز اور یاداشت تحریر کر لی جائے جس میں تمام شرائط وضاحت سے لکھی جائیں۔ کتنی رقم؟ کب واپس ہوگی؟ کب رقم دی؟ قرض دار خود لکھے یا کسی دوسرے سے لکھوالے، پھر اپنے دستخط کر دے یا انگوٹھا لگا دے۔

(۳) زیادہ قرض لینے دینے پر دو گواہ ضرور مقرر کرے' ان کے بھی دستخط کروالے۔

(۴) اُدھار لینے والا، ادھار لینے کے بعد بے فکر نہ ہو جائے۔ جلد از جلد ادائیگی کی فکر کرے اپنے غیر ضروری اخراجات میں کمی کرے، جونہی موقعہ ملے فوراً ادا کرے۔

(۵) ادھار لینے والا مقررہ مدت کے اندر اندر ہر حال میں ادا کر دے تاکہ آئندہ کے لیے اعتبار رہے۔

(۶) ادائیگی بروقت نہ کر سکے تو بجائے چھپنے اور شرمندہ ہونے کے قرض خواہ سے مہلت مانگ لے۔ اسے مطلع کر دے کہ کب دے سکوں گا؟ اب قرض خواہ ان ارشادات نبوی کو سامنے رکھے جو مہلت دینے پر اجر کا وعدہ ہیں۔

(۷) قرض کی ادائیگی خندہ پیشانی اور خوش اسلوبی سے کرے۔ قرض دار کا شکریہ ادا کرے قرض خواہ اس کا احسان مانے اس کے لیے دعا کرے۔

(۸) ادائیگی کے لیے رقم ہوتے ہوئے کبھی بھی نہ سوچے پھر دے دوں گا۔ نہ قرض خواہ کو ٹالے کیونکہ یہ بڑا ظلم ہے۔

(۹) ادھار دینے والا، لینے والے کو تنگ یا پریشان نہ کرے بلکہ اسے آسانی اور مہلت دے اگر ہو سکے تو اس کا قرض معاف کر دے۔

(۱۰) اگر ادھار لینے والا ادائیگی سے پہلے کوئی ہدیہ یا دعوت دے جس کا تعلق ادھار لین دین سے محسوس ہوتا تو اسے ہرگز قبول نہ کرے۔

(۱۱) ادھار لینے والا یہ دعا مانگتا رہے۔

﴿اللھم اکفنی بحلالک عن حرامك و اغننی بفضلك عمن سواك﴾

”اے اللہ مجھے اپنا حلال رزق ہی کافی کر دے، حرام سے بچا دے اور اپنے فضل وکرم سے مجھے اپنے ماسوا سے بے نیاز کر دے۔“ (حصن حصین)

(۱۲) جب ادھار دینے والا، لینے والے سے ادھار وصول کرے تو یہ دعا دے۔

﴿اوفیتنی اوفی اللّٰہ بكَ﴾

”تم نے میرا پورا قرضہ ادا کر دیا اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا پورا اجر دے۔“

اللہ رب العزت ہم سب کو ادھار لینے سے محفوظ رکھے اور اگر مجبوراً لینا پڑ جائے تو اللہ تعالیٰ خوش اسلوبی سے ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

تجارت میں نقل وحمل کی آزادی

(ہرشہری کا حق ہے)

﴿عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تلقوا الرکبان﴾(متفق علیہ)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم آگے جا کر غلہ لانے والے قافلہ سے نہ ملو۔''

اللہ تعالیٰ نے سورۂ قریش میں قریش مکہ کو اپنا ایک عظیم احسان یاد دلا کر اپنی عبادت کا حکم دیا اور وہ احسان یہ تھا کہ نقل وحمل کی آزادی اوراس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے دو ثمرات یاددلائے ایک بھوک سے نجات اور دوسرا خوف سے حفاظت۔

قریش مکہ سال میں دوتجارتی سفر کیا کرتے تھے موسم سرما میں یمن کا سفر کرتے اور موسم گرما میں شام کا تجارتی سفر کرتے۔سامان تجارت اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے عمل سے قریشی خاندان کو معاشی خوشحالی نصیب ہوتی۔

اسلام کے عادلانہ معاشی نظام میں انسانوں کے لیے باہمی تعاون اور خدمت خلق کی بہترین صورت تجارت ہے جس کے ذریعہ تجارت کرنے والے افراد اپنی تیارکردہ یا دور دراز سے لائی ہوئی اشیاء بیچتے اورخریدتے ہیں اور اس عمل میں نفع کمانا اہم مقصد نہیں بلکہ انسانی ہمدری اور خدمت خلق اولین مقصد ہونا چاہیے اس لیے کہ تجارت کا وجود ہی اس طرح ہوا کہ روئے زمین پر بسنے والے تمام انسان اپنی ضروریات زندگی پورا کرنے میں دوسرے انسانوں کے محتاج ہیں اور ایک ہی ملک یا ایک ہی علاقہ میں تمام ضروریات کا مہیا ہونا نقل و حمل میں آزادی کے بغیر ممکن نہیں۔اس لیے اسلام نے شہریوں کو نقل وحمل کی آزادی کا حق دیا۔ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نقل وحمل کو ثواب کا کام قرار دیا۔ارشاد نبوی صلی اللہ

علیہ وسلم ہے۔

﴿مامن جالب یجلب طعاما من بلدالی بلد فیبیعه بسعریومه الا کانت منزلته عند الله منزلة الشهداء﴾

''کہ جو تاجر مشقت اٹھا کر ایک شہر سے دوسرے شہر تک اناج لے جاتا ہے اور اس دن کے بھاؤ سے فروخت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا درجہ شہید کی طرح ہے۔''

ایک مرتبہ یہ ارشاد فرمایا کہ ''جو تاجر مشقت سے سامان اٹھا کر لائے اور اس دن کے بھاؤ سے فروخت کرے تو ایسا ہی ہے جیسا کہ اس نے صدقہ کیا ہو۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی یہی طریقہ تجارت اختیار کیا اور بعثت سے پہلے ۱۲ سال یہی پیشہ اختیار فرمایا۔ یہی تجارتی نقل وحمل کی آزادی تھی جس کی بنیاد پر مکہ کی امیر ترین تاجرہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے سامان تجارت کو بصریٰ کی منڈی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ منافع میں بیچ کر تشریف لائے۔ معاملات کی صفائی، سچائی اور تجارت دیانت کو پہچان کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نکاح کا پیغام بھجوایا اور ام المؤمنین کا لقب پایا۔

پھر آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے بھی اسلام کی عطا کردہ نقل وحمل کی آزادی کے پیش نظر معاشی کفالت کے لیے تجارت کو ذریعہ بنایا ہوا تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مدینہ منورہ میں سخ کے مقام پر کارخانہ اور کپڑے کا گودام تھا وہ شروع ہی سے کپڑے کے تاجر تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تجارتی کاروبار حجاز سے ایران تک پھیل گیا تھا حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کپڑے کی تجارت کرتے تھے ان کا کاروبار شام تک وسیع تھا، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ بھی کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ تیل اور چمڑا فروخت کرتے تھے، حضرت عباس رضی اللہ عنہ یمن سے عطر خرید کر لاتے اور موسم حج میں فروخت کرتے، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور

حضرت عمارہؓ کا تجارتی سلسلہ نجاشی حبشہ اور اس کے قریب تک تھا اور پھر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا تجارتی قافلہ جب مدینہ منورہ میں داخل ہوتا تھا ہر طرف دھوم مچ جاتی۔ اس تاریخی خاکے کو ذکر کرنے کا مقصد یہ تھا کہ نقل وحمل کی جو آزادی ایک بنیادی شہری کا حق ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہر میدان میں مسلمانوں کو تجارتی سربلندی عطا فرمائی تھی۔

اسلام نے قانون تجارت میں تجارتی کاروبار، تجارتی معاملات اور معاہدات کو آزادی دی ہے لیکن جہاں اسلامی ریاست کو تاجروں کے معاملات میں دخل اندازی کی اجازت دی گئی ہے اس کا مقصد خریداروں اور تاجروں کی بھلائی اور ان کے باہمی مفاد کا تحفظ کرنا ہے۔ مثلاً کاروباری مراکز کے لیے مخصوص جگہوں کا انتخاب، ناپ تول کا نظام اور اس کی کڑی نگرانی، راہداری کی سہولتیں، ذرائع نقل وحمل، ایکسچینج اور مارکیٹ کی نگرانی۔ ان باتوں کا مقصد تجارتی آزادی کو کم کرنا نہیں ہوتا اور اس کا مطلب یہ کبھی نہیں ہوتا کہ اسلام نے نقل و حمل کی آزادی دی ہے اس میں رکاوٹ ڈالی جا رہی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ پابندیاں ان تاجروں کے لیے ضرور رکاوٹ ہیں جو نقل وحمل کی آزادی سے اپنے ناجائز مقاصد کو پورا کرنا چاہتے ہیں مثلاً ایک جگہ سے دوسری جگہ سامان لے جانا تاکہ ذخیرہ اندوزی کر کے مصنوعی قلت پیدا کریں اور قیمتوں کو چڑھا کر خریداروں کو منہ مانگی قیمت دینے پر مجبور کریں ہر دور کے اپنے تقاضے اور طریقے ہوتے ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں نقل وحمل کی آزادی کو اختیار کرتے ہوئے دو صورتیں بہت اہم تھیں جن سے لوگوں کو تکلیف پہنچتی تھی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں صورتوں کو ممنوع قرار دیا۔ ارشادات نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ان دو صورتوں کے خاص نام آئے ہیں ایک ''تلقی الرکبان'' ہے اور دوسرا طریقہ ''بیع حاضر لباذ'' ہے۔

فقہاء نے ''تلقی الرکبان'' کی تشریح یہ کی ہے کہ جب شہر میں غلہ یا کھانے کی دوسری چیزوں کی قلت ہوتی اور قحط کے آثار نظر آنے لگتے تو شہر کے چالاک تاجر شہر سے باہر چلے جاتے اور دوسرے شہروں سے اس شہر کی طرف آنے والے تجارتی قافلوں کو راستے میں

روک کران سے تجارتی سامان خصوصاً کھانے پینے کی اشیاء خرید لیتے اور پھر بلیک مارکیٹنگ کر کے من مانی قیمت وصول کرتے۔ اب یہ تاجر دونوں طرف نقصان پہنچاتے' دوسرے شہروں سے آنے والے تاجروں کو اپنے شہر کا بھاؤ بتائے بغیر یا غلط نرخ بتا کر سستے داموں ان کی چیزوں کو خرید لیتے اور پھر اپنے شہر میں پہنچ کر قیمت خرید سے غافل کر کے مہنگا کر کے بیچ دیتے۔ اب ان تاجروں نے نقل وحمل کی آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقہ یعنی ''تلقی الرکبان'' سے منع فرمایا اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر شہر سے باہر آنے والے قافلوں سے سامان خرید کر اپنے شہر میں آ کر بیچنے سے شہریوں کو تکلیف نہ ہوتو یہ طریقہ پھر جائز ہوگا۔

نقل وحمل کی آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا دوسرا طریقہ اس دور میں وہ تھا جس کا نام حدیث میں ''بیع حاضر لباذ'' آیا ہے، اور طریقہ یہ تھا کہ ایک تاجر کا سامان ایک شہر میں موجود ہے اس شہر کے رہنے والوں کو ان اشیاء کی ضرورت ہے لیکن یہ تاجر محض نفع کمانے کی خاطر وہی سامان دیہات میں لے جا کر ان کی ناواقفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مہنگا کر کے بیچ دے۔ اس تاجر نے بھی ان شہریوں اور دیہاتیوں دونوں کو نقصان پہنچایا لہٰذا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا لیکن اگر شہر کی اشیاء دیہات میں جا کر فروخت کی جائیں لیکن نہ شہریوں کو مال کے جانے سے تکلیف ہو اور نہ دیہاتیوں کو ناجائز منافع کمانے کا ذریعہ بنایا جائے تو پھر یہ طریقہ برا نہ ہوگا۔

یہ تو تھا شہروں اور دیہاتوں کے درمیان نقل وحمل کی آزادی کا مسئلہ۔ لیکن جب بین الاقوامی نقل وحمل کی کیفیت کو دیکھا جائے تو وہاں دو قسم کے خیال ملتے ہیں۔ بعض لوگ آزادانہ تجارت کے قائل ہیں اور کسی قسم کی پابندیوں کے قائل نہیں' ان کے پاس بھی مضبوط دلائل ہیں۔ دوسری طرف کچھ لوگ محفوظ تجارت کے قائل ہیں ان لوگوں کا خیال ہے کہ اپنے ملک کے شہری زیادہ سے زیادہ اپنے ملک کی مصنوعات اور پیداور سے فائدہ اٹھائیں تاکہ ان کے ملک کی مصنوعات اور پیدوار بڑھے اور وہ ملک ترقی کرے لیکن ایسے ممالک اپنی پیداوار کو

مستحکم کر کے عالمی منڈیوں پر اجارہ داری قائم کر لیتے ہیں۔

لیکن اسلام نے جو کچھ سکھایا ہے اس کے مطابق ''الخلق عیال اللہ'' یعنی مخلوق اللہ کے پیدا کردہ ایک کنبے کی طرح ہے لہٰذا تمام انسان اللہ کی نعمتوں سے سرفراز ہونے چاہئیں اس لیے اسلام کی تعلیمات کے مطابق عالم اسلام میں مکمل تجارتی اتحاد ہونا چاہیے دوسری طرف غیر اسلامی ممالک سے تجارتی لین دین کے لیے اسلام نے مستقل آداب متعین کیے ہیں ان کا خیال رکھتے ہوئے ان سے تجارت کی جائے۔

دور جدید میں معاشی، معاشرتی اور اخلاقی بگاڑ کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں ان میں اہم سبب اسمگلنگ ہے اس لیے کہ معاشرہ میں سکون واطمینان معیشت میں برکت اور اخلاقی خوبیاں صرف اور صرف رزق حلال ہی سے نصیب ہوسکتی ہیں۔



تجارت میں سیل بڑھانے کے لیے قسموں کا سہارا نہ لیجئے

﴿عن ابی قتادۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایاکم وکثرۃ الحلف فی البیع فانہ ینفق ثم یمحق.﴾ (رواہ مسلم)

''حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم خرید وفروخت کے وقت زیادہ قسمیں کھانے سے بچو کیونکہ یہ قسمیں سودے کے زیادہ بکنے اور اس کے رواج کا ذریعہ بنتی ہیں پھر برکت کو مٹا دیتی ہیں۔''

تجارت ایسا بابرکت اور باعزت پیشہ ہے جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا اور بعثت سے پہلے بارہ سال اس پیشہ کو عزت بخشے رکھی۔ نبوت سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہرت کی ایک اہم وجہ معاملات کی صفائی اور سچائی تھی جو آپ کے ساتھ تجارتی معاملات کرنے والوں نے دیکھی یہاں تک کہ صادق وامین کا لقب پایا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں سچے اور ایمان دار تاجر کو قیامت کے دن عزت واکرام کی خوشخبری سنائی اور خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو اعتماد کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ بنا کر امت کے سامنے رکھا اور پھر انسان کو سکھایا کہ کن امور کو اختیار کرنے سے تجارت میں اعتماد حاصل کیا جا سکتا ہے اور کن باتوں کے اختیار کرنے سے اعتماد ختم ہو جاتا ہے۔ عام لوگ صرف وقتی فائدہ کی طرح گاہک کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے جو ناپسندیدہ طریقے اختیار کرتے ہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بھی نشاندہی فرمائی چنانچہ ان میں سے ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ گاہک کو اعتماد میں لینے کے لیے قسم کھائی جائے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی کہ تم خرید وفروخت کے وقت

زیادہ قسمیں نہ کھایا کرو کیونکہ اس سے بکری تو بڑھ جاتی ہے، سامان کی سیل زیادہ ہو جاتی ہے لیکن برکت ختم ہو جاتی ہے عام طور پر خرید وفروخت کے وقت مختلف انداز میں قسمیں کھائی جاتی ہیں کبھی قسم کے ساتھ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ چیز امپورٹڈ ہے فلاں ملک کی بنی ہوئی ہے اور کبھی اس بارے میں قسم کھائی جاتی ہے کہ یہ چیز ہم نے اتنے میں خریدی ہے۔ یا مینوفیکچر یعنی مال بنانے والے کو ادائیگی کے وقت قسم دے کر کہا جاتا ہے کہ سیل بالکل بند ہے' کاروبار میں مندا چل رہا ہے کہاں سے ادائیگی کریں گے۔

اب اگر یہ باتیں غلط ہوئیں تو جھوٹ بولنے کا گناہ الگ ہوگا اور جھوٹی قسم کھانے کا گناہ الگ ہوگا۔ صرف اپنا سامان بیچنے کے لیے جھوٹی قسمیں کھانا کتنا بڑا گناہ ہے۔ اس کا اندازہ اس ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتا ہے جو حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم میں منقول ہے فرمایا:

﴿ثلثة لا یکلمهم الله یوم القیامة ولا ینظر الیهم ولا یزکیهم ولهم عذاب الیم﴾

"یعنی تین قسم کے لوگ ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ ان سے کلام کرے گا نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کو پاکیزہ بنائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔"

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کون لوگ ہیں؟ یہ تو بڑی رسوائی اور گھاٹا پانے والے ہیں آپ نے فرمایا تکبر سے کپڑا لٹکانے والا، دوسرا احسان جتانے والا اور تیسرا وہ شخص ہے جو جھوٹی قسموں کے ذریعہ اپنا سامان بیچتا ہے۔

لیکن اگر خرید وفروخت کے وقت سچی قسم کھائی جائے تو بالکل درست ہے اور اگر قسمیں کھانے کی عادت بنا لی جائے تو اسلامی قانون تجارت میں منافع زیادہ کرنے کی خاطر اور سامان جلدی بیچنے کے لیے قسمیں کھانے سے منع فرمایا گیا ہے۔

ایسی قسموں سے اگرچہ بظاہر سامان تجارت کی بکری جلد ہو جاتی ہے لیکن اس سے تجارت کی برکات حاصل نہیں ہوتیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم منقول ہے:

﴿الحلف منفقة للسلعة ممحقة للبركة﴾

''یعنی قسم کھانے سے بکری یعنی سیل اور زیادہ ہو جاتی ہے مگر یہ تجارت کی برکت کو مٹا دیتی ہے۔''

جب انسان کے مال میں برکت ہوتی ہے تو پھر اللہ کی رحمت متوجہ ہوتی ہے ایک کماتا ہے سارا گھر کھاتا ہے، بیوی بچوں کی طرف سے سکون نصیب ہوتا ہے۔ دکھ، پریشانیاں ہر انسان کو ہیں لیکن جب اللہ کی رحمت اور برکت ساتھ ہوتی ہے تو ان مشکلات میں بھی دل کا سکون ختم نہیں ہوتا۔

باقی رہی یہ بات کہ آخر تاجر سیل بڑھانے کے لیے قسموں کا سہارا کیوں لیتا ہے تو اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ تاجر کی ایک فطری خواہش ہے کہ میں گاہک کا اعتماد حاصل کروں اس لیے وہ قسمیں کھانے کا طریقہ بھی استعمال کرتا ہے۔

لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت میں باہمی اعتماد حاصل کرنے کے لیے بنیادی طور پر دو اصول عطا فرمائے، سچائی اور دیانتداری اس لیے جو تاجر اپنے حلقہ میں دیانتدارانہ تجارت کی کوشش جاری رکھتا ہے اس کا بزنس میں ایک مقام ہوتا ہے اور گاہکوں میں وہ اعتماد کا نشان ہوتا ہے۔

اس لیے اگر تجارت میں اسلامی اصولوں کو اپنایا جائے تو تجارت صرف دنیوی مال و دولت کے حصول کا ذریعہ نہیں رہتی بلکہ تجارت میں لگنے والا ہر قابل اعتماد، سچا اور دیانتدار تاجر امت مسلمہ کی خیر خواہی کا ذریعہ بنتا ہے۔ مسلمان تاجروں کی ایک پوری تاریخ ریکارڈ میں موجود ہے۔ مسلمان تاجروں کی سچائی، دیانتداری اور ان کے کریمانہ اخلاق کی وجہ سے جس خطہ سے یہ تاجر گزرے وہاں کی آبادیاں آج بھی مسلمان ہیں۔

پھر ہند کی بندرگاہیں، بمبئی، سیلون، کراچی اور ہندوچین کے شہروں میں جہاں سے مسلمان تاجروں کے تجارتی قافلے گزرے وہاں کی آبادیاں آج بھی مسلمان ہیں چنانچہ چین اور کوریا کی ان آبادیوں میں آج تک مسلمان موجود ہیں۔ ان تجارتی راہوں پر باعمل مسلمان تاجروں کی لین دین کے معاملہ میں صفائی، اور ان کے کردار کی عظمت نے ان خطوں میں قبولیت اسلام کے دروازے کھول دیئے۔

اللہ رب العزت ہمیں تجارت میں دیانتداری اور سچائی اپنانے کی توفیق عطا فرمائے اور ان باتوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے جن سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے اور جن سے برکت نہیں ہوتی۔

اے اللہ ہم سب کو رزق حلال عطا فرما اور ہم سب کے رزق میں برکت نصیب فرما۔ آمین



معالج حضرات، ادویہ ساز اداروں اورادویہ فروخت کرنے والوں کے لیے لمحہ فکریہ

﴿عن ابی هريرة رضی الله عنه عن النبی صلی الله عليه وسلم قال من نفس عن مومن كربة من كرب الدنيا نفس الله عنه كربة من كرب يوم القيامة ومن يسر على معسر يسر الله عليه فی الدنيا والاخرة﴾(رواہ مسلم)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جس نے ایک مومن کے دنیوی غموں میں سے ایک غم دور کر دیا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کے غموں میں سے ایک غم دور کر دے گا اور جس نے کسی تنگ حال مسلمان پر آسانی کی تو اللہ تعالیٰ اس پر دنیا اور آخرت میں آسانی کرے گا۔''

اس حدیث کا تعلق تو ہر مسلمان سے ہے چاہے وہ زندگی کے کسی بھی شعبہ سے تعلق رکھتا ہو لیکن موجودہ معاشرتی حالات کے پیش نظر معالج حضرات' دوائیاں بنانے والے ادارے اور پھر ان ادویہ کو فروخت کرنے والے میڈیکل سٹور ان سب حضرات کے لیے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں چند آداب اختیار کرنے بہت ضروری ہو چکے ہیں۔ ورنہ ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ اسلامی اقدار تو ایک طرف اب تو انسانی قدریں بھی پامال ہوتی نظر آ رہی ہیں۔

(۱) اسلام نے اس بات کی تعلیم دی ہے کہ انسان کسی بھی پیشے سے تعلق رکھتا ہو اس میں خلوص ہونا ضروری ہے۔

(۲) اس لیے معالج چاہے وہ ڈاکٹر ہو یا حکیم، سرجن ہو یا فزیشن اس کے دل میں

مریض کے لیے خیر خواہانہ جذبات ہونے چاہئیں۔ دوا یا نسخہ یا مشورہ دیتے وقت کسی تساہل، غفلت یا جان چھڑانے والا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔

(۳) اپنی اجرت اور فیس وصول کرتے وقت مریض کی مالی حیثیت کو مدنظر رکھا جائے جیسا کہ آغاز میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ذکر کیا گیا ایسا نہ ہو کہ مریض مرض کی شدت میں ہو اور معالج کا ذہن اس بنیاد پر کام کر رہا ہو کہ اس سے کتنی دولت کما سکتا ہوں۔

(۴) مریض کے مرض کا معائنہ کرنے کے بعد ایسا علاج تجویز کیا جائے جس میں بلا ضرورت تاخیر نہ ہو تاکہ محض مریض سے پیسے وصول کرنے کی خاطر علاج کو طویل کرنے کا طریقہ ختم ہو جائے۔

(۵) اگر مریض کے مرض کے بارے میں یا تشخیص کے بارے میں معالج کا ذہن مطمئن نہ ہو تو پھر وہ کسی اپنے سے بہتر معالج کے پاس بھیج دے۔ محض معاصرانہ چپقلش کی بناء پر مریض کی جان سے نہ کھیلے۔

(۶) معالج کو چاہیے کہ اپنے میدان کے مطالعہ کو تازہ رکھے۔ جدید حالات وتحقیقات اور دنیائے طب میں ہونے والے نئے نئے انکشافات اور ایجادات سے باخبر رہے۔

(۷) ایک مثالی مسلمان معالج وہ ہوتا ہے جو اپنے فرض سے بخوبی آگاہ ہو اور اس کے بجا لانے میں کوئی کوتاہی نہ کرے۔

(۸) سرکاری ہسپتالوں کے معالجین قومی خزانوں سے تنخواہ لیتے ہیں، ہسپتالوں میں مریضوں کی قطاریں معالج کے انتظار میں ہوتی ہیں اس تاخیر سے مریض کے دکھ اور اذیت میں مزید اضافہ ہوتا ہے اور معالج کے لیے رزق حلال کے حصول میں رکاوٹ بھی ہے۔

(۹) بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ سرکاری معالج ہسپتالوں میں مریض پر توجہ نہیں دیتے اور

مختلف طریقوں سے اپنے پرائیویٹ کلینک میں آنے پر مجبور کرتے ہیں شرعی نقطہ نظر سے یہ ظلم ہے اس غیر انسانی حرکت سے وہ دنیا میں عیش وعشرت کا سامان کر لیتے ہوں گے لیکن آخرت تباہ کر لیتے ہیں۔

(۱۰) معالج کو مریض کا علاج کرتے وقت خوف خدا اور خشیت الٰہی دل میں رکھنی چاہیے۔ ارشاد باری تعالیٰ کے مطابق جو انسان تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے مشکل امور بھی آسان کر دیتے ہیں۔ لہٰذا شفاء دینے والا اللہ اس معالج کے نسخے میں بھی شفاء عطا فرمائے گا۔

(۱۱) مریض انتہائی دکھی انسان ہوتا ہے اور دکھی ہونے کی وجہ سے انتہائی حساس ہوتا ہے۔ مرض انسان کو چڑچڑا بنا دیتا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معالج کو مریض کی طرف سے ناگوار رویہ کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے اگر وہ اس سے جلد بازی میں اکتاہٹ کا اظہار کر دے تو وہ کامیاب معالج نہیں ہوسکتا۔ اگر مریض کے چڑچڑے پن کا جواب جھنجھلاہٹ سے دے گا تو گویا وہ معالج خود مریض ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق انسان کے بیان میں جادو کا سا اثر ہوتا ہے' معالج اپنی شیریں بیانی اور حسن خلق سے مریض کا آدھا مرض ٹھیک کر سکتا ہے۔

(۱۲) سورۂ حشر میں اللہ تعالیٰ نے ایثار کرنے والوں کا تذکرہ فرمایا کہ بہترین انسان وہ ہے جو اپنے آپ کو خسارے میں رکھ کر دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دے۔ ایک معالج کو اپنا آرام و راحت قربان کر کے دکھی انسانیت کی خدمت کرنا پڑتی ہے۔ معالج کلینک یا ہسپتال سے آیا ابھی آرام سے بیٹھا بھی نہ تھا کہ کسی سنجیدہ کیس کی اطلاع آجاتی ہے یہ لمحہ معالج کے لیے انتہائی صبر آزما ہوتا ہے اور یہی ایثار کا موقع ہوتا ہے۔

(۱۳) یہ اخلاقی تقاضے اور آداب اسلامی دوا ساز اداروں کے لیے بھی بہت اہم ہیں۔ ان اداروں کو بھی اخلاقی اقدار کا پاس کرنا چاہیے کہ وہ دوا سازی میں زیادہ منافع خوری

سے اجتناب کریں اور مریض کے لیے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق آسانی پیدا کریں۔

(۱۴) دور حاضر کا انتہائی سنگین مسئلہ جعلی ادویہ بنانے کا ہے جس سے مریض پیسہ خرچ کرنے کے باوجود دکھ اور تکلیف سے نجات نہیں پاتا یہاں تک کہ یہ ادویہ مریض کی موت کا ذریعہ بن جاتی ہیں لہٰذا ایسے دوا ساز اداروں کے ساتھ معالج کو بھی رابطہ نہ رکھنا چاہیئے نہ ان کی ادویات لکھ کر دینی چاہئیں۔

اگر کوئی جعلی ادویہ بناتا ہے تو پھر بنانے والا، بیچنے والا اور وہ معالج جو نسخہ تجویز کرتا ہے سب گنہگار ہوتے ہیں۔

اللہ رب العزت ہمیں اسلامی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے ایک دوسرے کے لیے ایسا بنا دے کہ وہ سب ایک دوسرے کی تکالیف دور کرنے میں لگ جائیں اور پھر اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ہماری تکالیف کو بھی دور فرما دے۔(آمین)



جج کے لیے مشعل راہ

﴿عن ابن عباس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لو یعطی الناس بدعواھم لادعی ناس دماء رجال واموالھم ولکن البینۃ علی المدعی والیمین علی من انکر.﴾ (رواہ البیہقی)

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر لوگوں کو محض دعویٰ ہی پر ان کا مدعا دے دیا جائے تو بہت سے لوگ اپنے آدمیوں کے خون اور مال کا دعویٰ کرنے لگیں گے لیکن دعویٰ کرنے والے کے ذمہ گواہ ہیں اور جو انکار کرے اس شخص پر لازم ہے کہ وہ قسم کھائے۔''

اللہ رب العزت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عدل و انصاف اور قوت فیصلہ کا بے مثال ملکہ عطا فرمایا تھا' جو مسائل بڑے بڑے مفکر حل نہ کر سکتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بظاہر معمولی باتوں ہی میں طے کر دیئے، الجھے ہوئے معاملات اور باہمی اختلافات کا فیصلہ اس خوبصورتی سے فرماتے کہ ہر فریق مطمئن ہو کر واپس جاتا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اسوہ حسنہ کے ذریعہ یہ سکھایا کہ ہر عادل و منصف جج کے لیے ضروری ہے کہ وہ ذاتی اغراض سے بے نیاز ہو' فریقین سے حسن سلوک کا برتاؤ کرے' کسی کی ناجائز جانب داری نہ کرے' مقدمہ والے بلا امتیاز مذہب وملت، قوم و نسل اس پر اعتماد کریں۔ وہ قرائن وشواہد سے خوب کام لے واقعات کی تحقیق کرے، گواہوں اور قسموں سے مقدمات میں وضاحت پیدا کرے، اپنی معاملہ شناس طبیعت سے مقدمات حل کرے، فیصلہ کے وقت اپنی طبیعت کو جوش اور غصہ سے الگ رکھے۔ اگر یہ تمام اوصاف کسی جج میں موجود ہوں تو یقیناً وہ جج کہلانے کا مستحق ہے ورنہ وہ صحیح معنوں میں جج، حاکم یا قاضی

نہیں کہلا سکتا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ نبوت سے پہلے ہی مکہ میں جج تسلیم کیے جا چکے تھے' آپ کو امین و صادق کا لقب دیا جا چکا تھا۔

ربیع بن خثیمؒ سے روایت ہے کہ اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانہ میں بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم مانے جاتے تھے، آپ کے پاس مقدمے آیا کرتے تھے اور آپ کے فیصلے تمام قبائل میں بنظر استحسان دیکھے جاتے تھے۔

چنانچہ دیگر مقدمات کے علاوہ حجر اسود کا اہم مقدمہ بھی آپ ہی کے ہاتھوں سے حل ہوا جس کی وجہ سے تمام قبائل میں عداوت کی آگ لگ چکی تھی قریب تھا کہ اس معاملہ پر جنگ و جدل ہوتا، لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خوبی سے جھگڑے کا حل فرما دیا کہ آپ کے فیصلے سے تمام قبائل خوش ہوئے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف علاقوں میں قاضی مقرر فرما دیئے تھے جو اپنے علاقوں کے مقدمات نمٹاتے تھے کوئی اہم مقدمہ ہوتا یا کسی فیصلہ کی اپیل کرنی ہوتی تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں پیش ہوا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ یہود و نصاری بھی اپنے مقدمات آپ کی عدالت میں لے جانے کی کوشش کرتے تھے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ وہاں سے انصاف ہی ملے گا۔ ایک مرتبہ ایک یہودی اور مسلمان کے درمیان جھگڑا ہو گیا تو یہودی نے کہا چلو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا فیصلہ کرا لیں مقدمہ پیش ہوا' شہادتیں لی گئیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ یہودی کے حق میں دے دیا۔ باہر نکل کر مسلمان نے یہودی سے کہا چلو عمر فاروقؓ کی کچہری بھی راستے میں ہے ان سے بھی فیصلہ لے لیں جب وہاں پہنچے مقدمہ پیش ہوا یہودی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کی تفصیل سنائی حضرت عمرؓ اٹھے اندر گئے اور تلوار لا کر مسلمان کا سر تن سے جدا کر دیا اور فرمایا کہ جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر اعتماد نہیں اس کی سزا یہی ہے۔ بعد میں وحی الٰہی کے ذریعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے کی توثیق

بھی ہوئی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو مقدمات آتے تھے ان کا جلد از جلد فیصلہ ہو جاتا تھا نہ تاریخیں پڑتی تھیں نہ کچھ خرچ ہوتا تھا۔ اگر گواہ موجود ہوتے تو مدعی سے فوراً طلب کیے جاتے اگر اس معاملہ میں کوئی عینی گواہ نہ ہوتا تو مدعا علیہ پر قسم دی جاتی اس کے بعد غور کر کے فیصلہ کر دیا جاتا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں کسی قسم کا کوئی تکلف نہیں ہوتا تھا۔ نہ دربان، نہ پہرہ دار، نہ وکیل، نہ محرر، نہ رشوت لی جاتی، نہ سفارش سنی جاتی، چنانچہ جب شرفائے قریش کی ایک عورت فاطمہ بنت الاسود چوری کے جرم میں پکڑی گئی مقدمہ پیش ہوا ثبوت ملنے پر ہاتھ کاٹنے کا حکم صادر ہوا لیکن جب شرافت نسب کی وجہ سے اہل خاندان نے سفارش کروائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم اللہ کی مقرر کردہ حدود میں سفارش کرتے ہو؟ تم سے پہلی قومیں اسی لیے ہلاک ہوئیں کہ جب کوئی بڑا آدمی جرم کا ارتکاب کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور غریبوں کو سزا دیتے، خدا کی قسم اگر فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ بھی ضرور کاٹا جاتا۔

ایک مرتبہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری میں کھیت کے پانی پر جھگڑا ہو گیا انصاری نے کہا کہ پہلے میں کھیت میں پانی دوں گا اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ پہلے میں دوں گا مقدمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا۔ آپ نے متنازعہ مقام کا نقشہ طلب فرمایا تو معلوم ہوا کہ اس پانی کے قریب حضرت زبیرؓ کا کھیت ہے اور اس کے بعد انصاری کا کھیت ہے اس لیے آپ نے یہ فیصلہ کر دیا کہ پہلے زبیرؓ اپنے کھیت کو پانی لگا لیں اس کے بعد انصاری کو دے دیں۔ انصاری نے کہا کہ آپ نے زبیر کے حق میں اس لیے فیصلہ دیا کہ یہ آپ کے رشتہ دار ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات ناگوار معلوم ہوئی تو فرمایا اے نادان اگر میں نے بھی انصاف نہ کیا تو پھر کون انصاف کرے گا۔ خدا کی قسم جس نے جانب داری سے کام لیا اور انصاف چھوڑ دیا وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اللہ رب العزت ہمیں اپنے معاشرے میں عدل و انصاف قائم فرمانے کی توفیق عطاءفرمائے آمین۔



بہترین کمائی

﴿عن رافع رضی اللہ عنہ قال قیل یا رسول اللہ ای الکسب اطیب قال عمل الرجل بیدہ و کل بیع مبرور﴾

(رواہ احمد)

''حضرت رافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عرض کیا گیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سب سے اچھی کمائی کون سی ہے؟ آپ نے فرمایا آدمی کا اپنے ہاتھ سے کام کرنا اور پھر وہ تجارت جو دیانتدارانہ ہونے کی وجہ سے مقبول ہو۔''

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیات طیبہ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے ۹ سال کی عمر تک آپ کی کفالت آپ کے دادا عبدالمطلب کے ذمہ رہی۔ دادا کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وراثت کا مال بھی اتنا نہ ملا کہ چچا ابو طالب پر ان کی پرورش کا بوجھ نہ ہوتا۔ ادھر چچا بھی غریب اور کثیر العیال تھے گھر کے حالات کے پیش نظر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بکریاں چرانی شروع کیں۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم جناب حلیمہ کے پاس تھے تو آپ نے حلیمہ کے بچوں کو بکریاں چراتے دیکھا تھا اور آپ نے ان کا ساتھ بھی دیا تھا اس لیے آپ نے مکہ میں بھی یہی کام اختیار فرمایا۔

جب ذرا بڑے ہوئے تو آپ نے مکہ کے تاجروں کے ہاں اجرت پر اور کبھی منافع میں شرکت پر کام شروع کر دیا۔ پھر چچا ابو طالب بھی آپ کو شام کی طرف تجارت کے سفروں میں ساتھ لے جاتے اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۲۵ سال کی عمر تک تجارت فرماتے رہے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مال تجارت لے کر آپ دو مرتبہ شام تشریف لے گئے اسی تجارت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمانداری اور فرض شناسی کی مثالیں قائم فرمائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشی زندگی کا تیسرا دور ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں رہنے لگے یہ دور ۲۷ سال تک رہا۔ جس میں ۱۰ سال تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجارت کا تذکرہ روایات میں ملتا ہے اس زمانے کے تین سفر تاریخ کا حصہ ہیں ایک یمن کی طرف۔ دوسرا نفوذ یعنی نجد کی طرف اور تیسرا نجران کی طرف یہ تینوں تجارتی سفر تھے۔ چالیس سال کی عمر میں وحی نازل ہوئی دعوت اسلام کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد تیرہ سالہ مکی زندگی اگرچہ فقرو فاقہ کی زندگی نہ تھی لیکن بہت خوشحال زندگی بھی نہ تھی۔ قریش کی مخالفت کا بازار گرم تھا اس حال میں عام سوداگری کہاں ممکن تھی۔ البتہ وقتی کاروبار اور موسم حج کی آمدن پر گزارا کر کے پاکیزہ زندگی گزاری۔

اپنے ہاتھوں سے کما کر کھانے کی سنت تمام انبیاء کی تھی۔ تاریخی روایات کا مطالعہ کیا جائے تو بہت سے ایسے کام جو آج کل کا سہل پسند انسان ناپسند کرتا ہے وہ کام سابقہ انبیاء نے اپنے ہاتھوں سے کیے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے کھیتی کی، آٹا پیسا روٹی پکائی۔ حضرت ادریس علیہ السلام نے لکھائی اور درزی کا کام کیا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی بنائی جو بڑھئی کا کام تھا ہود علیہ السلام تجارت کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی تعمیر کا کام کیا۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تیر بناتے تھے۔ حضرت اسحٰق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام اور ان کی آگے تمام اولاد بکریاں چراتے تھے۔

داؤد علیہ السلام زرہ بناتے جو لوہار کا کام ہے۔ زکریا علیہ السلام بڑھئی کا کام کرتے تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام ایک دکاندار کے پاس کپڑے رنگتے تھے اور آج بھی امت محمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بزرگوں کے حالات زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے کپڑا بنا' کسی نے چمڑے کا کام کیا، کسی نے جوتے سینے کا کام کیا' کسی نے مٹھائی بنائی۔

معلوم ہوا کہ انسان اپنے ہاتھ سے کما کر کھائے تو یہ انبیاء علیہ السلام اور بزرگوں کا طریقہ ہے۔ دوسروں کے ٹکڑوں پر پلنا اور دوسروں کے مال و دولت پر نظر رکھنا یا ان سے چھین

کر یا مانگ کر زندگی گزارنا قطعاً باعزت کام نہیں اور گداگری اور سودخوری کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ حوصلہ شکنی کی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً یہی سبق دیا۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے، اپنی مالی حالت کا ذکر کیا اور بتایا کہ اب تو کھانے کو بھی کچھ نہیں۔ ایسے لوگوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم صدقات وغیرہ عطا فرما دیا کرتے تھے لیکن ان صحابی سے پوچھا کہ گھر میں کوئی چیز ہے؟ صحابی نے عرض کیا ایک پیالہ اور ایک کمبل ہے آپ نے وہ نیلام کر دیا۔ اس سے جو رقم ملی اس کا ایک کلہاڑا خرید دیا اور فرمایا جاؤ جنگل سے لکڑیاں کاٹو اور بیچو اور چند روز تک میرے پاس نہ آنا۔ صحابیؓ نے کام شروع کر دیا، چند روز کے بعد حاضر ہوئے تو آپ نے حالت پوچھی۔ عرض کیا کہ الحمدللہ اب مناسب حالت ہوگئی ہے گھر میں کھانے کو بھی ہے۔ کچھ بچ بھی گیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا مانگنے والی حالت اچھی تھی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہیں قیامت کے دن، ذلت کے چہرہ سے اٹھاتا یا اب اپنے ہاتھ سے کما کر حلال و پاکیزہ کمائی اچھی ہے۔

اللہ رب العزت ہمیں اپنے ہاتھ سے حلال کا مال کھانے کی توفیق عطا فرمائے اور جو کچھ کمائیں اسی میں برکت نصیب فرمائے۔



سخاوت کا اعلیٰ ترین معیار

﴿عن ابی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله عليه وسلم لو كان لی مثل احد ذهبا لسرنی ان لايمر علی ثلث ليال وعندی منه شيئی الاشيئی ارصده لدين﴾

(رواه البخاری)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میرے پاس احد پہاڑ کے برابر سونا ہوتو مجھے یہ بات پسند نہ ہو کہ اس پر تین راتیں گزریں اور اس کے بعد اس میں سے کچھ میرے پاس رہے مگر صرف اتنا کہ اس سے قرض ادا کرسکوں۔''

اخلاق فاضلہ میں سے سخاوت ہی وہ سب سے بڑی صفت ہے جس کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصیت سے توجہ دلائی ہے اور فرمایا:

﴿مانقص مال عبد من صدقة﴾

''خیرات سے انسان کا مال کم نہیں ہوتا بلکہ جتنا وہ دیتا ہے اتنا ہی خدا اسے اور دے دیتا ہے۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے الگ الگ روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی سائل نے سوال نہیں کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نفی میں جواب دیا ہو اور کچھ نہ کچھ دے نہ دیا ہو۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک بار ایک سائل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنی بکریاں دیں کہ وہ گنی نہ جا سکتی تھیں اور دو پہاڑوں کے درمیان جو جگہ تھی وہ سب ان سے بھری ہوئی تھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر سائل کو اس کی حاجت کے مطابق

عطا فرمایا کرتے تھے اور اس سخاوت میں مسلم اور غیر مسلم میں امتیاز نہ فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی سائل جسے اس کی ساری قوم کے لیے اتنی بکریاں دے دی گئیں ابھی مسلمان نہیں ہوا تھا۔ جب اپنی قوم میں پہنچا اور ان کو بکریاں دکھا کر بھوک کی آگ سے نجات دلوائی اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ:

﴿یاقوم اسلموا فان محمدا یعطی عطاء من لا یخشی الفقر﴾

''اے میری قوم مسلمان ہو جاؤ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص کی مثل عطا کرتا ہے جس کو فقر کا کچھ خوف نہیں ہوتا۔''

جنگ حنین میں چھ ہزار قیدی اور ۲۴ ہزار اونٹ اور ۴۰ ہزار بکریاں اور ۴ ہزار اوقیہ چاندی غنیمت میں حاصل ہوئی تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں ایک چیز کو بھی نہیں چھوڑا سب کچھ صحابہ کرامؓ میں تقسیم فرما دیا اور خود خالی ہی واپس آئے۔

ایک دفعہ بحرین سے خراج کا مال آیا اور صحن مسجد میں زر و سیم کا انبار لگ گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز صبح کے لیے تشریف لائے۔ صحابہؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ڈھیر کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ نماز سے فارغ ہوئے تو انبار کے پاس آ بیٹھے اور تقسیم فرمانے لگے۔ جو آتا اسے بے حساب دیتے۔ تھوڑی دیر میں سب ختم ہو گیا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم دامن جھاڑ کر خالی ہاتھ تشریف لے گئے۔

ان روایات سے نہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت کا پتہ چلتا ہے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی استغناء، بے نفسی اور ایثار کا بھی اندازہ ہوسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیا کرتے تھے۔

ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک سائل آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ موجود نہ تھا۔ فرمایا، بیٹھ جا خدا دے گا۔ پھر دوسرا آیا۔ پھر تیسرا آیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو بٹھا لیا۔ اتنے میں ایک شخص آیا اور چار اوقیہ چاندی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک اوقیہ تو ان تینوں میں تقسیم فرما

دیا اور ایک اوقیہ کی بابت اعلان کر دیا مگر کوئی لینے والا نہ اٹھا' رات ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ اپنے سرہانے رکھ لی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نیند نہیں آئی۔ اٹھتے ہیں تو نماز پڑھنے لگتے ہیں۔ پھر ذرا لیٹ کر اٹھتے ہیں اور نماز پڑھنے لگ جاتے ہیں۔ ام المؤمنینؓ نے پوچھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آج کوئی تکلیف ہے؟ فرمایا نہیں۔ انہوں نے پھر پوچھا کہ کیا کوئی خدا کا خاص حکم آیا ہے جس کی وجہ سے یہ بیقراری ہے؟ فرمایا نہیں۔ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے کہا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم آرام کیوں نہیں فرماتے؟ تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ چاندی نکال کر دکھائی اور فرمایا کہ یہ ہے جس نے مجھے بے قرار کر رکھا ہے مجھے ڈر ہے کہ مبادا یہ میرے پاس ہی ہو اور مجھے موت آ جائے۔

ایک دفعہ فدک سے غلہ کے چار اونٹ آئے جو آتے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تقسیم کرنے شروع کر دیئے۔ یہاں تک کہ کوئی لینے والا باقی نہ رہا اور غلہ بچ رہا' شام ہو گئی مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر نہ گئے، کسی نے کہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے چلئے پھر تقسیم ہو جائے گا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تک یہ دنیا کا مال باقی ہے میں گھر نہیں جا سکتا۔ چنانچہ رات مسجد ہی میں بسر فرمائی صبح کچھ حاجت مند آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں سارا غلہ دے کر پھر گھر تشریف لائے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب مرض الموت میں بستر پر لیٹے ہوئے تھے تو کسی نے چند اشرفیاں لا کر دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انہیں خیرات کر دو۔ یہ زیبا نہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خالق کی بارگاہ میں جائے اور اس کے گھر میں اشرفیاں پڑی ہوں۔

ایک دفعہ ایک سائل آیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ موجود نہ تھا، گھر میں پیغام بھیجا کہ کچھ ہو تو اسے دے دو۔ جواب آیا کہ صرف تھوڑا سا آٹا ہے جو رات کے لیے رکھا ہے۔ کہلا بھیجا کہ سائل کو دے دو یہ بھوکا ہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ہم نے وہ آٹا سائل کو دے دیا اور خود ساری رات فاقہ میں بسر کی۔

ایک اور موقعہ پر ایک حاجت مند آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو

اتفاقاً اس وقت بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ موجود نہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے نصف وسق غلہ قرض لیا اور اسے دے دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد قرض خواہ تقاضا کرنے لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایک وسق عطا فرمایا اور کہا کہ آدھا قرض ہے اور آدھا عطاء۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جود وسخا کا یہ عالم زمانہ نبوت کے ساتھ ہی مختص نہ تھا بلکہ قبل از بعثت بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے ہی سخاوت فرمایا کرتے تھے اور جو کچھ کماتے تھے وہ سب غرباء و مساکین میں تقسیم فرما دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ورقہ بن نوفل کہتے ہیں کہ قبل از نبوت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کمائی اور دولت صرف اپنے ہی لیے نہ ہوا کرتی تھی بلکہ ہر عیالدار اور ناتواں شخص کے بار کے متحمل بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف اپنے لیے مال نہ کماتے تھے بلکہ محتاجوں اور مفلسوں اور تہی دستوں کے لیے کمایا کرتے تھے۔

معوذ بن عفرا رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ ایک طباق میں کچھ تازہ کھجوریں اور چند چھوٹے چھوٹے روئیں دار کھیرے بطور ہدیہ کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لیکر پیش ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے واپسی پر ایک تھیلہ درہم و دینار کا بھر کر عطا فرمایا جس میں کچھ زیور بھی شامل تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت و سماحت صرف مساکین اور سائلین پر ہی موقوف نہ تھی بلکہ دوستوں اور رشتہ داروں کے ساتھ بھی یہی حال تھا۔ جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ذرا نرم حالت میں دیکھتے کسی نہ کسی طریقہ سے اس کی معاونت فرما دیتے۔

حضرت عمر بن خطابؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میری حالت کچھ نرم ہو گئی تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کچھ دینا چاہا۔ میں نے عرض کیا کہ مجھ سے زیادہ محتاجوں کو دیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو اس کو لے کر رکھ لے اور جہاں چاہے خرچ کر دے، جو چیز بغیر طلب کے آئے اسے لے لینا چاہیے اور جو نہ آئے اس کے پیچھے نہ پڑنا چاہیے۔

ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نوے ہزار درہم لائے گئے اور ایک بوریہ پر ڈال دیئے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں صحابہ کرام میں تقسیم فرمانا شروع کر دیا۔ جس نے سوال کیا اس کو بھی دے دیا اور جس نے انکار کیا اس کو بھی دیا یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تقسیم سے فارغ ہو گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ان میں سے ایک درہم بھی باقی نہ رہا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص مقروض ہو جائے اور کوئی وارث نہ چھوڑے تو ہم اس کا قرضہ ادا کریں گے اور اگر کوئی ورثہ چھوڑ کر مرے تو اسکی وراثت وارثوں کو دے دی جائے گی مگر قرضہ ہم ہی ادا کریں گے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم گو بہت سخی تھے مگر ہر سائل کو اس کی ضرورت کے مطابق دیا کرتے تھے اور اسی سائل کو دیا کرتے تھے جو مستحق ہوتا تھا۔ ہماری طرح بلا دیکھے سمجھے نہ دیا کرتے تھے جو ضعیف، بیمار، کمزور یا معذور ہوتا اسی کو دیتے۔ اور جو تندرست، توانا ہوتا اسے گداگری سے منع فرماتے' کسب حلال کی تلقین کرتے اور دربدر مانگتے پھرنے سے روکتے اور نرمی سے سمجھاتے کہ یہ کام تیری شان کے لائق نہیں ہے۔

ایک دفعہ ایک سائل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا وہ جوان اور تندرست آدمی تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سمجھایا کہ طاقت والے کے لیے مانگنا حلال نہیں ہے جو شخص اپنی روزی پیدا کرنے کی طاقت رکھتا ہو اس کے لیے سوال کرنا حرام ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ تیرے گھر میں کچھ ہے؟ کہا ہاں، ایک کملی ہے اور ایک پیالہ۔ فرمایا جا لے آ۔ جب لایا تو انہیں ہاتھ میں لے کر فرمایا ان کو کون خریدتا ہے؟ ایک شخص نے کہا، میں ایک درہم میں خریدتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ نے فرمایا کہ کوئی اس سے زیادہ دیتا ہے۔ ایک شخص نے کہا میں دو درہم میں لیتا ہوں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ دونوں چیزیں اسے دے کر دو درہم اس سے لے لیے اور سائل کو دے کر فرمایا کہ ایک درہم کی تو ضروریات خرید کر گھر میں اپنے اہل وعیال کو دے دے اور دوسرے درہم کا ایک کلہاڑا خرید کر میرے پاس

لے آ جب وہ کلہاڑا لے آیا' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے ایک لکڑی اس میں ٹھونک دی اور فرمایا کہ جا لکڑیاں جمع کر اور بیچ اور پندرہ دن کے بعد آ۔ وہ لکڑیاں جمع کرتا اور بیچتا رہا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو دس درہم اس کے پاس جمع تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا تو کپڑا اور غلہ خرید لے اور آئندہ بھی اسی طرح قوت بازو سے کام لے یہ تیرے لیے سوال کرنے سے بہت ہی بہتر ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو سوال کرنے سے سخت منع فرمایا ہے۔

مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ:

"جو شخص مال جمع کرنے کے لیے لوگوں سے مانگتا پھرتا ہے گویا وہ آگ کی چنگاریاں مانگتا ہے چاہے اسے کم ملے یا زیادہ۔"

پھر فرمایا کہ:

"جس شخص کے پاس حسب حاجت کچھ ہو پھر باوجود اس کے سوال کرتا ہے تو گویا وہ آگ جمع کرتا ہے۔"

پھر فرمایا کہ:

سوال کرنا صاحب حیثیت کے لیے حلال نہیں ہے۔ نہ توانا اور تندرست آدمی کے لیے۔ البتہ سوال ایسے شخص کے لیے جائز ہے جو اس درجہ محتاج ہو گیا ہو کہ مارے فاقوں کے زمین پر گر گیا ہو یا اس پر اس قدر قرضہ کا بار ہو کہ وہ اس کو ادا نہ کر سکتا ہو اور اس کی وجہ سے وہ خلقت میں رسوا ہو گیا ہو۔ (جیسا کہ آج کل عام گداگر کرتے پھرتے ہیں اس کا منہ قیامت کے دن کھرچا ہوا ہو گا اور نار جہنم کے گرم گرم پتھر وہ کھاتا ہو گا)۔

اس لیے یہ ضرور دیکھ لیں، کہ کہاں دے رہے ہیں؟ اگر مستحق کو دیں گے تو یقیناً اجر پائیں گے کیونکہ سخاوت کے ساتھ انسداد گداگری بھی تو ہمارے فرائض میں داخل ہے۔



حدود فراموشی اللہ کی ناراضگی کا سبب ہے

﴿عن عبدالله بن عمر قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول من حالت شفاعته دون حد من حدود الله فقد ضاد الله﴾ (رواه ابوداؤد)

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص اللہ کی مقرر کردہ حدود میں حائل ہو۔ (یعنی اللہ کی مقرر کردہ حدود میں سفارش کر کے یا کسی اور طریقے سے رکاوٹ بنے) تو اس نے اللہ سے ضد کی۔''

لفظ حدود، حد کی جمع ہے اور فراموشی کا معنی ہے بھول جانا۔ لہٰذا حدود فراموشی کا معنی ہوا حدوں کو بھول جانا اور ان کا خیال نہ رکھنا۔

قرآن و حدیث میں حد کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوا ہے ایک لغوی معنی ہے اور دوسرا اصطلاحی معنی ہے۔

حد کا لغوی معنی ہے ''الحاجز بين شيئين'' یعنی دو چیزوں کے درمیان جو رکاوٹ ہوتی ہے اسے حد کہتے ہیں جسے ہم آسان الفاظ میں ایک کنارا یا سرحد یا انتہا کہہ سکتے ہیں۔

اسلامی اصطلاح میں حد کہتے ہیں عقوبة مقدرة تجب حقالله۔ یعنی حد اس سزا کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حق کے طور پر واجب ہوتی ہے جیسے حد سرقہ یعنی چوری کی سزا، حد

قذف یعنی تہمت لگانے کی سزا۔

گویا کہ حدود اللہ کی طرف سے مقرر کردہ وہ ضابطے ہیں جو سزا کی صورت میں یا حلال وحرام کے احکامات کی صورت میں ہیں۔

ان حدود کو مقرر کرنا اس لیے ضروری ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خیر و شر میں سے کسی بھی راستہ پر چلنے کا اختیار دیا ہے اب انسان اسی فطرت کی وجہ سے اپنی خواہش، اپنی چاہت، اپنی مرضی کو پورا کرنا چاہتا ہے اس لیے انسان کو حدود و قیود پسند نہیں' وہ ہر قسم کی بندشوں سے آزادی چاہتا ہے۔ اگر انسان کو اسی طرز پر چلنے کی اجازت دے دی جائے تو ظاہر ہے کہ انسان من مانی کرے گا اور اس طرح زندگی کا پورا نظام تباہ ہو کر رہ جائے گا اس لیے کہ انسان خود اپنے بارے میں یہ چاہے گا کہ مجھے یہ چیز مل جائے' میری یہ بات پوری ہو جائے۔ حالانکہ انسان کو معلوم نہیں کہ آخر کار اس کے لیے یہ اچھا ہے یا برا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿عسی ان تکرھوا شیئا وھو خیرلکم و عسی ان تحبوا شئیا و ھو شرلکم واللہ یعلم وانتم لا تعلمون﴾

یعنی ''ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو اور ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرتے ہو اور وہ تمہارے لیے بری ہو اور اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے۔''

انسان نے جو اپنے اچھے اور برے کو سوچ کر خود بھی ضابطے بنائے قوانین بنائے اور اپنے لیے اور دوسروں کے لیے کچھ حدیں مقرر کی ہیں۔ اب انسان کی مقرر کردہ حدود اور اللہ کی مقرر کردہ حدود میں فرق یہ آجاتا ہے کہ انسان کی سوچ محدود ہے۔ وہ جب بھی قوانین بنائے گا تو اگر اپنے ملک کے لیے بنائے گا تو اپنے ملکی مفادات کو سوچے گا۔ علاقے کے لیے ضابطے اور حدود مقرر کرے گا تو علاقائی مفادات کو سامنے رکھے گا۔

لیکن خالق کائنات اللہ جل جلالہ نے جب حدود مقرر فرمائیں تو پوری کائنات کے حالات اس کے سامنے تھے۔ وہ علیم ہے خبیر ہے اس کی مقرر کردہ حدود میں پوری انسانیت کی فلاح اور کامیابی ہے۔

لہٰذا اللہ رب العزت نے زندگی کے ہر مرحلے کے لیے احکام و آداب سکھائے۔ پیدائش سے لے کر موت تک کے ہر مرحلے کے لیے حدود مقرر فرمائیں یہاں تک کہ انسان اکثر خوشی اور غم کے موقع پر اللہ کی مقرر کردہ حدود کو فراموش کر بیٹھتا ہے۔ خوشی کے مرحلے میں سب کچھ کر بیٹھتا ہے اور کہتا ہے خوشی کا موقع ہے اب سب جائز ہے غم کا وقت آ جائے تو نہ معلوم کیا کچھ کرتا ہے اور کہتا ہے بس جی غم کا موقع ہے کیا کریں۔ حالانکہ اللہ نے غم اور خوشی کے موقع پر حدود مقرر فرمائی ہیں۔ حتیٰ کہ نماز، روزہ اور دیگر عبادات کی حدود بھی بتائی ہیں تا کہ انسان وہاں بھی حد سے آگے نہ بڑھے۔

﴿یاایھاالذین آمنو لا تقدموا بین یدی الله ورسوله﴾

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے مت بڑھو۔''

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حدود سے آگے بڑھنے اور ان حدود کو فراموش کرنے سے منع کرنے کے ساتھ اس سے بچنے کے طریقے بھی بتائے۔ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ:

﴿ان الحلال بین وان الحرام بین وبینهما امور مشتبهات لا یعلمهن کثیر من الناس فمن اتقی الشبهات فقد استبرأ لدینه وعرضه﴾

''فرمایا کہ بے شک حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ باتیں ہیں جنہیں بہت سے لوگ نہیں جانتے پس جو شخص مشتبہ چیزوں سے بچ گیا اس نے اپنا دین اور اپنی عزت بچا لی۔'' پھر فرمایا:

﴿ومن وقع فی الشبهات وقع فی الحرام کالراعی یرعی حول الحمی یوشك ان یرتع فیه﴾

یعنی ''جو شخص شبہ والی چیزوں میں پڑ جائے وہ حرام میں جا پڑے گا جیسے

کہ چرواہا ممنوعہ چراگاہ کے اردگرد مویشی چرانے لگے تو ہوسکتا ہے کہ وہ ممنوعہ چراگاہ میں چرنے لگے۔'' پھر فرمایا:

﴿الا وان لكل ملك حمى وان حمى الله محارمه﴾

یعنی ''آگاہ رہو ہر بادشاہ کی ایک ممنوعہ چراگاہ ہوتی ہے اور اللہ کی وہ ممنوعہ چراگاہ اس کی حرام کی ہوئی چیزیں ہیں۔''

اس ارشاد سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم دی کہ حدود فراموشی سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان حلال وحرام کو واضح طور پر اپنے سامنے رکھے اور جن چیزوں میں شبہ ہو ان سے بچتا رہے۔

انسان حدود فراموشی یعنی اللہ کی مقرر کردہ حدوں کو بھلا دینے کا مرتکب اس وقت ہوتا ہے جب خوف خدا نہ رہے یا حساب آخرت کا خوف نہ رہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے جو حکیم وخبیر ہے جب قرآن حکیم میں انسان کے لیے ضابطے اور حدود بیان فرمائی ہیں تو وہاں انسانوں کو حدود کی پابندی کے لیے تین طرح کے جملے فرمائے۔

ایک تو قیامت کے دن کے حساب اور جرائم کی سزا سے ڈرا کر انسان کو ان حدود کی پابندی کے لیے آمادہ کیا پھر اس کے ساتھ اس قانون کی خلاف ورزی میں انسان کے لیے جو نقصانات ہیں ان کو واضح کیا۔ پھر بتایا کہ تمہاری اپنی بھلائی صرف اسی میں ہے کہ تم ان حدود کی پابندی کرو۔

لہٰذا انسان اگر پابندی سے قرآن مجید کی تلاوت کرتا رہے اور اس کے احکامات کو ذہن میں رکھے اور پھر زندگی کے ہر مرحلے میں یہ آگاہی حاصل کرتا رہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں کیا ہدایات ارشاد فرمائی ہیں تو پھر انشاء اللہ یہ انسان زندگی کے کسی مرحلے میں حدود فراموشی کا مرتکب نہ ہو سکے گا اور یوں اسے دنیا وآخرت دونوں میں فلاح وکامیابی نصیب ہوگی۔



دوسرے فریق کی بات سنے بغیر فیصلہ عدل وانصاف کے منافی ہے

﴿عن علی رضی الله عنه قال بعثنی رسول الله صلی الله علیه وسلم الی الیمن قاضیا فقلت یا رسول الله ترسلنی وانا حدیث السن ولا علم لی بالقضاء فقال ان الله سیهدی قلبك ویثبت لسانك اذا تقاضی الیك رجلان فلا تقض للاول حتی تسمع کلام الاخر فانه احری ان یتبین لك القضاء قال فما شککت فی قضاء بعد.﴾

(رواه الترمذی و ابوداؤد)

’’حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے عامل بنا کر یمن بھیجا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ مجھے حاکم بنا کر بھیج رہے ہیں میں نوجوان ہوں اور حکومت کرنے کا طریقہ بھی مجھے معلوم نہیں ہے آپ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ تیرے دل کی راہنمائی کرے گا اور تیری زبان کو ثابت رکھے گا۔ اس کے بعد فرمایا جب دو شخص کوئی معاملہ لے کر تیرے پاس آئیں تو پہلے شخص یعنی مدعی کے حق میں اس وقت تک فیصلہ نہ کر جب تک کہ دوسرے کے بیان کو نہ سن لے۔ اس لیے کہ مدعی علیہ کا بیان تجھے فیصلہ کرنے میں مدد دے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے اس (دعا اور نصیحت) کے بعد کسی معاملہ میں فیصلہ کرنے میں شک نہیں کیا۔‘‘

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿یـایھا الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شھدآء للہ ولوعلی انـفسکم اوالوالدین والا قربین ان یکن غنیا اوفقیراً فاللہ اولی بھـمـا فلا تتبعوا الھوی ان تعدلوا وان تلو' اوتعرضوا فان اللہ کان بما تعملون خبیرا. (الآیۃ﴾

''اے ایمان والو! انصاف پر خوب اچھی طرح قائم رہنے والے ہو جاؤ اور اللہ کے لیے گواہی دینے والے ہو جاؤ اگر چہ وہ گواہی تمہاری اپنی ذات ہی کے خلاف ہو یا وہ گواہی والدین اور رشتہ داروں کے مقابلے میں ہو اگرچہ کوئی امیر ہو یا غریب۔ پس اللہ ان کا تم سے زیادہ خیر خواہ ہے تم انصاف میں اپنی خواہش کی پیروی نہ کرو اور اگر تم غلط بیانی کرو گے یا اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرو گے تو اللہ تمہارے سب کاموں سے واقف ہے۔''

سورۂ نساء کی اس آیت میں تمام مسلمانوں کو عدل و انصاف پر قائم رہنے اور سچی گواہی دینے کی ہدایت کی ہے اور جو چیزیں عدل کے حصول میں رکاوٹ ہیں یا سچی گواہی دینے میں رکاوٹ ہوسکتی ہیں ان کو دور کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا ہے۔

عدل وانصاف کی حقیقت یہ ہے کہ ہر صاحب حق کا حق پورا ادا کیا جائے۔ اس میں اللہ کے حقوق بھی شامل ہیں اور ہر قسم کے انسانی حقوق بھی۔ عدل و انصاف کا حصول تب ممکن ہو گا جب کوئی کسی پر ظلم نہ کرے اور ظالم کو ظلم سے روکا جائے' مظلوم کی حمایت کی جائے اور حقدار کو حق حاصل کرنے میں گواہی کی ضرورت پیش آئے تو گواہی سے گریز نہ کیا جائے گواہی دیتے وقت حق اور حقیقت کو بیان کیا جائے خواہ گواہی کسی کے حق میں جائے یا مخالفت میں۔

عدل و انصاف کی راہ میں عام طور پر ابتداء میں دو چیزیں رکاوٹ ڈالتی ہیں ایک محبت اور دوسری عداوت۔ محبت قرابت داری اور دوستی کا تعلق اگر گواہ کے ذہن میں چھا جائے تو اس کی کوشش ہوتی ہے کہ گواہی ان کے موافق دی جائے اور یہی خیال اگر فیصلہ کرنے

والے کے دل میں آ جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ فیصلہ اپنی ذات کے مطابق کرے گا۔ دوسری عداوت اور دشمنی ایسی چیز ہے جو غلط شہادت دینے پر آمادہ کرسکتی ہے اور فیصلہ کرنے پر اثر انداز ہوسکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء میں پہلی رکاوٹ یعنی دوستی اور رشتہ داری والی رکاوٹ کو دور کرنے کی ہدایت دی اور فرمایا کہ اگرچہ تمہاری گواہی اپنے ماں باپ یا قریبی رشتہ دار کے خلاف پڑے تو بھی حق بات کہنے اور سچی گواہی دینے میں کسی کا لحاظ نہ کرو اور پھر دوسری رکاوٹ کو دور کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

﴿لایجرمنکم شنان قوم علی ان لاتعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی﴾

یعنی ''کسی قوم سے بغض وعداوت بھی تمہارے لیے اس بات کا باعث نہ بنے کہ تم عدل نہ کرسکو۔''

اسلام نے شہریوں کو جو حقوق عطا فرمائے ہیں ان میں سے عدل و انصاف کے حصول کا حق ایک اہم حق ہے۔ایک انسان معاشرتی طور پر عدل کا طالب ہے۔ اگر معاشرہ میں زندگی گزارنے کے لیے بنیادی حقوق حاصل ہوں تو پھر یہی معاشرہ بے سکونی اور اضطراب کا شکار ہو جاتا ہے۔ گھریلو زندگی میں میاں بیوی ایک دوسرے سے عدل وانصاف کے طلبگار ہیں۔ گھریلو زندگی میں کامیابی کا راز یہی ہے کہ شوہر بیوی کے حقوق انصاف کے ساتھ ادا کرے اور بیوی بھی خاوند کے حقوق کے بارے میں عدل و انصاف کے تقاضوں کو سامنے رکھے۔اسی طرح والدین اور اولاد کے درمیان بھی عدل وانصاف کی کمی خانگی زندگی کی تباہی کا باعث بن جاتی ہے ضروریات زندگی کے حصول کے لیے جب انسان بازار جاتا ہے تو تجارتی لین دین میں عدل و انصاف چاہتا ہے۔ آج معاشرہ کے سامنے ناپ تول کے شعبہ میں جدید ترین مشینیں، جدید طریقے اور جدید اوزان وجود میں آ چکے ہیں لیکن اس کے باوجود تجارت میں باہمی اعتماد نہ رہا یہ صرف اس لیے ہوا کہ تاجر سے خریدار عدل چاہتا تھا وہ نہ ملا

جب کہ اللہ تعالیٰ نے واضح احکامات عطا فرمائے۔

﴿واوفوا الکیل اذا کلتم وزنوا بالقسطاس المستقیم﴾
''یعنی جب تم کوئی چیز ناپ کر دو تو پیمانہ پورا کر کے دو اور جب تولو تو درست ترازو سے تولو۔''

عدل وانصاف مہیا نہ کرنے والوں کے بارے میں فرمایا:

﴿ویل للمطففین الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون واذا کالوھم اووزنوھم یخسرون﴾
یعنی'' بڑی خرابی اور بہت برا انجام ہے ناپ تول میں بددیانتی کرنے والوں کے لیے کہ جب لوگوں سے اپنے لیے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں اور وہ جب دوسروں کے لیے ناپتے یا تولتے ہیں تو کم کر دیتے ہیں۔''

اسی طرح اسلام نے معاشرے کے کمزور افراد کو خاص طور پر عدل وانصاف فراہم کرنے کا حکم فرمایا جیسے سورۂ نساء کی ۱۲۷ ویں آیت میں یتیموں کے ساتھ انصاف کا حکم فرمایا۔

''وان تقوموا للیتامی بالقسط'' (الآیۃ)
یعنی تم ان یتیموں کے حقوق کی ادائیگی میں انصاف کرو۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے انصاف کے حصول کے طریقے بھی بتائے۔ مثلاً قرض لینے دینے کے بارے میں ناانصافی کا بڑا امکان ہوتا ہے اس لیے سورۂ بقرہ کی ۲۷۲ ویں آیت میں قرض کے معاملات کو عدل وانصاف کے ساتھ لکھنے کا حکم فرمایا۔ پھر لکھنے والے کو انصاف کے ساتھ لکھنے کی تلقین کی۔ قرض لینے والے کو انصاف کے ساتھ لکھوانے کی ہدایت دی اور اس دستاویزات کے بارے میں گواہ کو انصاف کے ساتھ گواہی دینے کی ہدایات دیں اور پھر اس طریقہ کار کو ذکر فرمانے کے بعد فرمایا۔

﴿ذلك اقسط عندالله﴾

''یہ اللہ کے نزدیک انصاف کو زیادہ قائم رکھنے والا ہے۔''

اس لیے اللہ تعالیٰ نے انصاف کے حصول کے لیے آسان تر طریقے اختیار کرنے کا سلیقہ سکھایا اور انصاف پہنچانے کے لیے یقینی راستوں کو اختیار کرنے کی ہدایت دی اور انصاف کو تمام تکلفات سے پاک کر کے صرف حق دار کو حق پہنچانے کی فکر کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں کسی قسم کا تکلف نہ ہوتا' نہ دربان ہوتا نہ پہرہ دار، نہ وکیل، نہ محرر، نہ رشوت کا تصور، نہ سفارش قبول ہوتی ۔خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ خصوصاً خلفائے راشدین کے فیصلے آج تاریخ اسلام کا روشن باب ہیں۔

لیکن تاریخ گواہ ہے جب بھی کسی معاشرہ کے شہریوں کو انصاف حاصل کرنے میں دقت پیش آئی یا عدل و انصاف کا حصول مشکل ہوتا چلا گیا وہاں معاشرہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک طرف بے بس لوگ جو اپنی بے بسی پر صبر کے علاوہ کچھ نہ کر سکے اور دوسری طرف طاقتور جو جسمانی طاقت یا مالی طاقت کے بل پر دوسروں کے حقوق پر قابض رہے اور قانون ان کے ہاتھوں میں رہا' یہی معاشرہ پھر سکون نہیں پاتا۔

جب عدل و انصاف کا حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے تو پھر جرائم کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ انسانی فطرت میں موجود خواہشات کا انبار ایک سلیم الفطرت کو بھی شیطان بنانے پر آمادہ کر دیتا ہے لیکن جب ایک عام شہری بھی یقین رکھتا ہے کہ اسے عدل و انصاف ضرور ملے گا تو پھر مجرم جرم کرنے سے پہلے کئی بار انجام سوچے گا۔ خواہشات کو جائز طریقوں سے حاصل کرنے والے اپنی خواہشات کو ضرور جائز راستوں ہی سے پورا کریں گے اور پھر وہ دور دیکھنے کو ملتا ہے جب ایک تنہا عورت طویل سفر کرتی ہے اور منزل تک عزت و آبرو کے ساتھ پہنچتی ہے۔


☆☆☆

رشوت کی لعنت کے اثرات

﴿عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعنۃ اللہ علی الراشی والمرتشی﴾

(رواہ ابن ماجہ)

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رشوت لینے اور دینے والے پر اللہ کی لعنت برستی ہے۔''

''لعنت کے معنی ہیں پھٹکارنا''

رحمت الٰہی جو ہر چیز سے وسیع وعظیم ہے اس کے دائرہ سے نکال کر کوسوں دور پھینک دینا رحمت سے دور کر دینا ہے' دنیا کی ذلت اور آخرت کے عذاب میں مبتلا کر دینا۔ دنیا لعنت کو ایک معمولی چیز سمجھتی ہے' لیکن حرام میں جتنی لذت ہوتی ہے' عذابِ لعنت میں اتنی ہی شدت ہوتی ہے اس سے جنت کے دروازے بند اور دوزخ کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ لعنت دراصل حدود اللہ توڑنے والوں کے لیے ایک شدید وسنگین سزا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ

ہے:

﴿اولئك جزاؤ هم ان عليهم لعنة الله﴾

''ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ کی لعنت (برستی) ہے۔''

﴿ومن يلعن الله فلن تجدله نصيراً﴾

''اور جس پر اللہ لعنت کرے تو آپ اس کا کوئی مددگار ہرگز نہ پائیں گے۔''

جو اسے عذاب الٰہی سے بچا سکے یا اس میں کچھ کمی کر سکے یہاں تک کہ لعنتی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے بھی محروم رہے گا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لیے اللہ سے کوئی سفارش نہیں کریں گے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود اس کے لیے لعنت کی بددعا کر چکے ہیں۔ غرض کہ لعنتی کا دنیا و آخرت میں کوئی بھی حامی و مددگار نہیں ہوگا۔

لعنت اتنی سنگین اور شدید سزا یا عذاب ہے جیسے موروثی بیماریاں ہوتی ہیں کہ نسلاً بعد نسل چلتی ہیں اسی طرح جو جتنی زیادہ حرام کی آمدنی کھاتا ہے اتنی ہی وسعت سے حرام اثرات اس کی نسل میں منتقل ہوتے ہیں۔

لعنت کے اثرات جو شکل وصورت اختیار کرتے ہیں وہ بھی بڑے بھیانک، خوفناک اور ہمہ گیر ہوتے ہیں مثلاً:

(۱) کبھی مال کی فراوانی دے کر قارون کی طرح آزمائش میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔

(۲) کبھی مال کے ساتھ جاہ دے کر فرعون کی طرح فتنوں میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔

(۳) کبھی اولاد کی پریشانی میں مبتلا کر کے تنگدستی اور فاقہ دے دیا جاتا ہے۔

(۴) کبھی دل پر قفل لگا کر نیک کاموں کی توفیق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

(۵) کبھی ذہنی سکون اور قلبی اطمینان چھین لیا جاتا ہے۔

(۶) کبھی تنگ دست اور دوسروں کا محتاج بنا دیا جاتا ہے۔

(۷) کبھی عیش وعشرت کا سامان مہیا کر کے گناہوں میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔

(۸) کبھی لوگوں کے دلوں میں اس کے خلاف نفرت وحقارت کے جذبات پیدا کر دیئے جاتے ہیں۔
(۹) کبھی قرآن وحدیث کے متعلق دل میں تشکک اور تذبذب پیدا کر دیا جاتا ہے۔
(۱۰) کبھی ذہن اور دماغ پر سہو ونسیان کا غلبہ طاری کر دیا جاتا ہے۔
(۱۱) کبھی صبر وقناعت سے محروم کر کے حرص وہوس کے جال میں پھنسا دیا جاتا ہے۔
(۱۲) کبھی ظالم حاکم مسلط کر کے ان کے ظلم کا شکار بنا دیا جاتا ہے۔
(۱۳) کبھی دل ودماغ میں فضول اور بے جا وسوسے اور اندیشے پیدا کر دیئے جاتے ہیں۔
(۱۴) کبھی جسمانی یا روحانی مقدمہ بازی میں پھنسا دیا جاتا ہے۔
(۱۵) کبھی اتفاقی حادثات اور ناگہانی آفات کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔
(۱۶) کبھی رزق حلال کے دروازے بند کر کے غیر شرعی وناجائز اور حرام کاروبار پر لگا دیا جاتا ہے۔
(۱۷) کبھی حلال پر حرام کو ترجیح دینے کا عادی بنا دیا جاتا ہے۔
(۱۸) کبھی خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وعظمت کی بجائے غیر اللہ کی محبت و عقیدت میں پھنسا دیا جاتا ہے۔
(۱۹) کبھی اسے مکر وفریب اور منافقت والی سیاست کے میدان کا کھلاڑی بنا کر جوڑ توڑ میں لگا دیا جاتا ہے۔
(۲۰) کبھی خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے غیر اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے راعی اور رعایا کے درمیان واسطہ بنا دیا جاتا ہے۔
(۲۱) کبھی مسند اختیار واقتدار پر بٹھا کر حق وانصاف کی قوت سلب کر لی جاتی ہے۔

رشوت جتنی لذیذ غذا ہے اس کے لیے اتنی شدید سزا ہے راشی پیسے لے کر صرف اپنا ضمیر وایمان ہی نہیں بیچتا اپنے بھائی کا گوشت بھی کاٹ کر کھاتا ہے۔ جس کی اسے کچھ سزا اسی دنیا میں دی جاتی ہے اور کچھ آخرت پر موخر کر دی جاتی ہے۔

رشوت کا وبال مندرجہ ذیل صورتوں میں آ تا ہے:
راشی پر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی لعنت برستی رہتی ہے جس کی سزا اس کی سات پشتوں تک کو بھگتنی پڑتی ہے۔
ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:
﴿لعنة الله على الراشي والمرتشي﴾(ابن ماجه)
''رشوت لینے اور دینے والے پر اللہ تعالیٰ کی لعنت برستی ہے۔''
رشوت کی نحوست ساری قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور اسے بزدل بنا کر اس پر غیروں کی ہیبت بٹھا دی جاتی ہے۔
ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:
﴿مامن قومٍ يظهر فيهم الربا الا اخذوا بالسنة ومامن قومٍ تظهر فيهم الرشا الا اخذوا بالرعب﴾
''جس قوم میں سود پھیل جائے وہ قحط اور گرانی کی مصیبت میں ڈال دی جاتی ہے اور جس قوم میں رشوتیں پھیل جائیں اس پر رعب ڈال دیا جاتا ہے۔''
ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:
﴿من اكل لقمةً من حرام لم يقبل منه صلوٰة اربعين ليلة﴾
''جو حرام کا ایک لقمہ بھی کھائے گا اس کی چالیس راتوں کی نماز قبول نہ ہوگی۔''
ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:
''جو بندہ حرام لقمہ اپنے پیٹ میں ڈالتا ہے اس کے چالیس دنوں کا کوئی نیک عمل قبول نہیں ہوتا۔''
جس کا کھانا حرام پینا، حرام، لباس حرام اور غذا حرام ہو تو ان کی وجہ سے اس کی دعا

کیسے قبول کی جا سکتی ہے؟

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿الرشوة فی الحکم کفرو ھی بین الناس سحتاً﴾

"فیصلہ کرنے میں رشوت لینا کفر کے قریب ہے اور لوگوں کے درمیان خالص حرام ہے۔"

رشوت، راشی اور جنت کے درمیان حائل ہو جائے گی اور اسے جنت میں داخل نہ ہونے دے گی۔ حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿لعن من اخذ رشوة فی الحکم کانت ستراً بینه وبین الجنة﴾

"مقدمے میں رشوت لینے والے پر لعنت فرمائی گئی ہے یہ رشوت اس کے اور جنت کے درمیان حجاب بن جائے گی۔"

امام بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿لایدخل الجنة جسد غذی بالحرام﴾

"جنت میں وہ جسم نہ جائے گا جس نے حرام غذا سے پرورش پائی۔"

حضرت ابو سما بن عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"رشوت لینے اور رشوت دینے والا دوزخ کی آگ میں ڈالے جائیں گے۔"

اللہ رب العزت ہمیں اور ہمارے معاشرے کو رشوت کی لعنت سے پاک فرمائے۔

آمین



آنحضرت ﷺ کے پسندیدہ کھانے

﴿عن انس بن مالك يقول ان خياطاً دعا رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم بطعام صنعه فقال انس فذهبت مع رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم الى ذالك الطعام فقرب الىٰ رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم جزأ من شعير ومرقاً فيه دُبّاءٌ وقديد قال انس فرأيت النبى صلى اللّٰه عليه وسلم يتتبع الدباء حوالى الصحفة فلم ازل احب الدّبّاء من يومئذٍ﴾ (رواہ الترمذی)

''حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک درزی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی میں بھی آپ کے ساتھ حاضر ہوا' اس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جو کی روٹی اور کدو گوشت کا شوربا پیش کیا' میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ پیالے میں ہر طرف سے کدو کے ٹکڑے تلاش فرما کر تناول فرما رہے ہیں اس وقت سے مجھے کدو مرغوب ہوگیا۔''

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں کھانوں کے بارے میں واضح طور پر دو باتیں سامنے آتی ہیں ایک سادگی اور دوسرے حالات کے مطابق کھانے کا معیار۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک آپ کے اہل وعیال نے دو دن کبھی جو کی روٹی سے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے گھر والے کئی کئی

راتیں پے در پے بھوکے گزار دیتے تھے کہ رات کو کھانے کے لیے کچھ موجود نہیں ہوتا تھا اور اکثر غذا جو کی روٹی ہوتی تھی۔

لیکن جب اچھا کھانا میسر ہوتا تو آپ وہ بھی تناول فرما لیتے اور صرف سرکہ بھی ہوتا تو اسی سے کھانا تناول فرما لیتے۔ ایک مرتبہ فرمایا ''سرکہ بھی کیسا اچھا سالن ہے'' ایک حدیث میں ہے فرمایا کہ پہلے انبیاء کا سالن بھی سرکہ رہا ہے۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا جس گھر میں سرکہ ہو وہاں سالن کی ضرورت نہیں رہتی۔ ترمذی میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے میں نے خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مرغی تناول فرماتے ہوئے دیکھا ہے۔ ترمذی میں روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام سفینہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حباری کا گوشت کھایا ہے حباری ایک پرندہ ہے اس کے ترجمہ میں مختلف اقوال ہیں تغذری، بٹیر، سرخاب، چکا چکوئی بہرصورت حباری ایک جنگلی پرندہ ہے جس کا رنگ خاکی، گردن بڑی، پاؤں لمبے، اور چونچ میں تھوڑی سی لمبائی ہوتی ہے بہت تیز اڑتا ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو میٹھا اور شہد پسند تھا' روایت میں عربی لفظ ''الحلو اء'' ہے' محدثین فرماتے ہیں کہ اس سے ہر میٹھی چیز مراد ہے' حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ خصائل نبوی شرح شمائل ترمذی میں فرماتے ہیں سب سے پہلے حلوا حضرت عثمانؓ نے بنوا کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا تھا تو آپؐ نے اسے پسند فرمایا تھا' یہ حلوا آٹے، شہد اور گھی سے بنایا گیا تھا حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ انہوں نے پہلو کا بھنا ہوا گوشت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا تو آپ نے وہ تناول فرمایا۔ عبداللہ بن الحارثؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھنا ہوا گوشت مسجد میں کھایا۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کہیں سے گوشت آیا اس میں سے دستی کا گوشت (بونگ) آپ کی خدمت میں پیش ہوئی' آپ کو دستی کا گوشت پسند بھی تھا' آپ نے اسے دانتوں سے کاٹ کر تناول فرمایا۔ ترمذی میں ابوعبیدہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہانڈی پکائی چونکہ آپ کو بونگ کا گوشت زیادہ پسند تھا' اس لیے میں نے ایک بونگ پیش کی پھر رسول اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم نے دوسری طلب فرمائی میں نے دوسری پیش کی آپ نے اور طلب فرمائی میں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بکری کی دو ہی بونگیں (دستیاں) ہوتی ہیں' آپ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر تو چپ رہتا تو میں جب تک مانگتا رہتا اس دیگچی میں سے بونگیں نکلتی رہتیں' محدثین فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ بونگ کا گوشت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف کسی لذت کی وجہ سے پسند نہ تھا بلکہ گوشت کبھی کبھی پکتا تھا اور یہ گوشت جلدی گل جاتا تھا اس لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسے پسند فرماتے تھے تاکہ جلدی سے فارغ ہوکر اپنے مشاغل میں مصروف ہوجائیں حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پشت کا گوشت بہترین گوشت ہے۔

حضرت سلمیٰؓ فرماتی ہیں کہ حضرت حسنؓ اور عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن جعفرؓ ان کے پاس تشریف لائے اور یہ فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کھانا پسند تھا اور اسے رغبت سے تناول فرماتے تھے وہ ہمیں پکا کر کھلائیں۔ حضرت سلمیٰؓ نے فرمایا پیارے بچو! اب وہ کھانا تمہیں پسند نہیں آئے گا (محدثین نے اس جملہ کا مطلب یہ لکھا ہے کہ آئندہ ذکر کیا جانے والا کھانا ظاہر ہے تنگی کی حالت ہی میں اچھا لگتا ہے) انہوں نے فرمایا نہیں، ضرور پسند آئے گا چنانچہ وہ اٹھیں اور تھوڑے سے جو ہانڈی میں ڈالے اور اس پر ذرا سا زیتون کا تیل ڈالا اور کچھ مرچیں اور زیرہ وغیرہ مسالہ ڈالا اور پکا کر لاکر رکھ دیا اور فرمایا کہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند تھا۔ حضرت یوسفؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مرتبہ دیکھا کہ آپؐ نے ایک روٹی کا ٹکڑا لے کر اس پر ایک کھجور رکھی اور فرمایا کہ یہ اس کا سالن ہے اور تناول فرمایا۔

ان تمام روایات سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کھانا عموماً سادہ ہوتا اور حالات کے مطابق جو بھی میسر آتا تناول فرما لیتے۔

سرکارِ دو عالم ﷺ کی سیرت پہ اجمالی نظر

﴿عَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الْاَسْقَعِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰه صلی اللّٰه علیہ وسلم یَقُوْلُ اِنَّ اللّٰه اصْطَفٰی کِنَانَةَ مِنْ وُلْدِاِسْمٰعِیْلَ واصْطفٰی قُرَیْشاً مِنْ کِنَانَةَ وَاصْطفٰی مِنْ قُرَیْشٍ بَنِیْ هَاشِمٍ وَاصْطَفَانِیْ مِنْ بَنِیْ هَاشِمٍ﴾ (رواہ مسلم)

''حضرت واثلة بن الاسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد اسمعیل میں سے کنانہ کو منتخب فرمایا اور کنانہ میں سے قریش کو منتخب فرمایا اور قریش میں سے بنو ہاشم کو منتخب فرمایا اور بنو ہاشم میں سے مجھے منتخب فرمایا''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم شہر مکہ میں سردار قریش حضرت عبدالمطلب کے گھر پیدا ہوئے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد کا نام نامی عبداللہ اور والدہ محترمہ کا اسم گرامی آمنہ تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سراپا بشارت ربیع الاول کے مہینہ میں دوشنبہ کے دن صبح صادق کے وقت آٹھویں یا نویں تاریخ کو ہوئی' انگریزی تاریخ ۲۰ اپریل ۵۷۱ء بیان کی گئی ہے اس وقت ایران میں نوشیروان عادل کی حکومت تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت بابرکت کے وقت بہت سے عجائب قدرت کا ایسا ظہور ہوا کہ کبھی دنیا میں وہ باتیں نہیں ہوئیں، بے زبان جانوروں نے انسانی زبان میں آپ کی خوشخبری سنائی، درختوں سے آوازیں آئیں' بت پرستوں نے بتوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشخبری سنی، دنیا کے دونوں بڑے بادشاہوں یعنی شاہ فارس اور شاہِ رُوم کو بذریعہ خواب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ورفعت سے آگاہی دی گئی اور یہ بھی ان کو بتایا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سطوت و جبروت کے سامنے نہ صرف کسریٰ و قیصر بلکہ ساری دنیا کی شوکتیں سرنگوں ہو جائیں گی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم شکمِ مادر میں تھے کہ والد ماجد کا انتقال ہو گیا اور چار برس کی عمر میں مادرِ مہربان کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔

بچپن میں عجیب وغریب حالات مشاہدے میں آئے' ایک بڑا حصہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کم سنی کے حالات کا حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے' حق یہ ہے کہ بڑی خوش نصیب تھیں۔ بت پرستی اور بے حیائی کے کاموں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ پرہیز کرتے رہے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور امانت قبل از نبوت بھی تمام مکہ میں مشہور اور مسلم الکل تھی حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا لقب صادق اور امین زبان زدِ خلائق تھا۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر گرامی پچیس سال کی ہوئی تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح ہوا جو خاندانِ قریش میں ایک بڑی دانشمند اور دولت مند خاتون تھیں' نکاح کے وقت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر چالیس سال تھی۔

جب آپ کی عمر شریف چالیس سال کی ہوئی تو دوشنبہ کے دن ۱۷ رمضان کو اور ایک قول کے مطابق ۲۴ رمضان کو جب کہ خسرو پرویز بادشاہ ایران کے جلوس کا بیسواں سال تھا' وہ دولت عظمیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوئی جو روزِ ازل سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نامزد ہو چکی تھی جس کی دعا حضرت خلیل علیہ السلام نے مانگی جس کی بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی یعنی حق تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا رسول بنایا اور سارے عالم کی طرف مبعوث کیا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

نبوت کے بعد تیرہ برس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام مکہ معظّمہ میں رہا پھر ہجرت کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے' دس برس مدینہ میں قیام رہا' اس دس سال کے عرصہ میں انیس لڑائیاں بھی آپ کو کافروں سے لڑنی پڑیں۔

بکثرت معجزات وخوارق عادات کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ظہور ہوا۔ سب سے بڑا معجزہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن شریف ہے جس میں فصاحت و بلاغت کا اعجاز بھی ہے اور اخبارِ غیب کا بھی اور قوتِ تاثیر وسرعت تاثیر بھی۔

نبوت کے بارہویں سال جب کہ عمر شریف اکیاون سال نو ماہ کی تھی، حق تعالیٰ نے آپ ﷺ کو معراج عطا فرمائی، یعنی آپ ﷺ کو آسمانوں پر بلایا گیا، جنت و دوزخ کی سیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کرائی گئی اور عالم ملکوت کے عجائب اور اللہ تعالیٰ کی آیاتِ کبریٰ کا مشاہدہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کرایا گیا۔

جب عمر شریف تریسٹھ برس کی ہوئی اور ہجرت کا گیارہواں سال شروع ہوا تو بارہویں ربیع الاول کو دوشنبہ کے دن بوقت چاشت چودہ دن بیمار رہ کر اس عالم سے رحلت فرمائی: **انا للّٰہ وانا الیہ راجعون** ۔آخری وصیت جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو فرمائی وہ یہ تھی کہ نماز کی حفاظت کرنا اور اپنے لونڈی غلاموں کے ساتھ نیک سلوک کرنا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں جس جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تھی وہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف بنائی گئی جو زیارت گاہِ عالم ہے۔



بعثت نبوت (مکی زندگی)

اکتالیسویں سال کے پہلے دن اعلان نبوت فرمایا، وحی الٰہی کا نزول ہوا۔

۱ـــہ نبوت میں سیدنا ابوبکر صدیقؓ، سیدنا علی المرتضیٰؓ، ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ اور حضرت زیدؓ نے ایمان واسلام کی سعادت حاصل کی۔

صدیق اکبرؓ کی دعوت پر عثمان غنیؓ، عبدالرحمٰنؓ بن عوف، سعد بن ابی وقاصؓ، طلحہؓ وزبیرؓ نے اسلام قبول کیا' ارقم بنؓ ارقم، بلال حبشیؓ، صہیب رومیؓ اور حضرت سمیہؓ نے اسلام کی سعادت حاصل کی، ابوعبیدہؓ بن الجراح، سعیدؓ ابن زید، عبدؓ اللہ ابن مسعود ایمان لائے اور شرفِ صحابیت کے لیے پہلا مدرسہ قائم کیا گیا یہاں ۳ـــہ نبوت تک چپکے چپکے لوگوں کو اسلام کی تعلیم دی گئی۔

۴ـــہ نبوت سے کھلم کھلا دین سکھلایا جانے لگا' آزمائشوں کا دروازہ کھلا، ساحرو کاہن کے نام سے پکارے گئے، حقیقی چچی ام جمیل زوجہ ابولہب نے راہ میں کانٹے بچھائے، نماز پڑھتے ہوئے گردن مبارک میں چادر ڈال کر بل دیئے گئے، حضرت سمیہؓ کی ران پر نیزہ مار کر شہید کیا گیا' حضرت زبیرؓ کو کھجور کی چٹائی میں لپیٹ کر کوٹھری میں بند کر کے دھواں دیا گیا' بلال حبشیؓ کو گرم گرم پتھروں پر لٹایا گیا' پیروں میں رسی ڈال کر گھسیٹا گیا۔

۵ـــہ نبوت رجب کے مہینے میں انفرادی ہجرت کا حکم ہوا، حضرت عثمانؓ اور حضرت رقیہؓ بنت رسول اللہ ﷺ نے حبشہ کی جانب ہجرت فرمائی۔

۶ـــہ نبوت میں حضرت حمزہؓ نے اور پھر تین دن کے بعد حضرت عمرؓ نے اسلام قبول کیا' کعبہ میں نماز پڑھی گئی۔

۷ـــہ نبوت میں شعب ابی طالب میں نظر بند کئے گئے' قریش نے آپ پر عرصہ حیات تنگ کرنے کا معاہدہ کیا، اوائل ۱۰ـــہ نبوت تک ہمہ قسم کے مظالم ڈھائے گئے اور ایمان لانے والوں کو بری طرح ستایا گیا۔

۱۰ھ نبوت میں شعب ابی طالب کی اسیری سے رہائی کے بعد طائف کا سفر فرمایا۔ دعوت حق میں جسم اطہر کو لہولہان کرایا اور خون کے پیاسوں کے لیے ہدایت کی دعا فرمائی۔

۱۱ھ نبوت میں مدینہ منورہ کے پہلے قافلے نے ایمان کی دولت پائی۔

۱۲ھ نبوت میں ۲۷ رجب المرجب روز دوشنبہ معراج عطا ہوئی' پانچ وقت کی نماز فرض ہوئی۔

۱۳ھ نبوت میں ۲۷ صفر المظفر شب جمعۃ المبارک کو سیدنا صدیق اکبرؓ کی معیت میں مکہ بہ عزم ہجرت چھوڑا۔



بعد ہجرت (مدنی زندگی)

۱ھ ہجری میں یکم ربیع الاول دوشنبہ کے دن غارِ ثور سے باہر تشریف لائے ۸ ربیع الاول دوشنبہ کے دن رونق افروز قبا ہوئے۔

۲۲ ربیع الاول دوشنبہ کے دن، قبا میں چودہ یوم قیام کے بعد نور افزائے مدینہ منورہ ہوئے مدینہ منورہ کا نام صدیوں سے یثرب تھا' اس یثرب نے آپکے قدموں کی برکت سے مدینۃ الرسول ﷺ ہونے کا شرف حاصل کیا' مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کی بنیاد رکھی گئی۔

۲ھ ہجری میں اذان کا حکم ہوا' کعبہ مکرمہ قبلہ قرار پایا، رمضان المبارک کے روزے فرض ہوئے تین سو تیرہ اصحابؓ رسول رب العالمین نے رسول رب العالمین کی معیت میں غزوۂ بدر میں شرکت کی ایک ہزار کا تین تیرہ کیا، امت محمدیہ ﷺ کا فرعون ابوجہل مارا گیا۔

۳ھ ہجری میں زکوٰۃ فرض ہوئی' ماہ شوال میں غزوۂ اُحد پیش آیا' حضرت حمزہ عم النبی صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہوئے' زبان رسالت نے سید الشہداء کا خطاب مرحمت فرمایا۔

۴ھ ہجری میں شراب کا پینا حرام قرار پایا۔

۵ھ ہجری میں عورتوں کو پردے کا حکم دے دیا گیا' آیت حجاب نازل ہوئی۔ ماہِ شوال میں غزوۂ خندق پیش آیا۔

۶ھ ہجری میں قریش سے تاریخی معاہدہ ہوا جو صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اسی سن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وقت کے مشہور بادشاہوں کے پاس سفیر روانہ فرمائے اسلام کی دعوت پیش کی۔

۷ھ ہجری میں غزوۂ خیبر (ماہِ محرم و ماہِ صفر میں) ثمامہؓ والئ نجد، جبلہؓ شاہ غسان، فردہؓ بن عمرو خزاعی گورنر شام نے اسلام قبول کیا۔

۸ھ ہجری میں فتح مکہ رمضان المبارک میں، عام معافی کا اعلان، غزوۂ حنین،

بعد فتح مکہ خالدؓ بن ولید، عثمانؓ بن ابوطلحہ اور عمروؓ بن عاص نے مدینہ حاضر ہو کر اسلام کی سعادت حاصل کی، عکرمہؓ بن ابوجہل مسلمان ہوئے۔

۹ھ ہجری ماہِ رمضان میں غزوۂ تبوک پیش آیا، حج فرض ہوا، صدیقؓ اکبر کو امیر الحج مقرر فرمایا، عدیؓ بن حاتم طائی، اکیدرؓ روالی دومتہ الجندل، ذی الکلاعؓ بادشاہ قبائل حمیر نے اسلام قبول کیا۔

۱۰ھ ہجری ایک لاکھ چوالیس ہزار شاگردوں (صحابیوں) کو ساتھ لے کر فریضۂ حج ادا فرمایا اور اسلام کے تمام اصول سمجھا کر اُمت کو ''وداع'' کیا۔



رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کا مستحق کون؟

﴿عن ابی هريرة رضی الله عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم قال اسعد الناس بشفاعتی یوم القیمة من قال لا اله الا اللّٰه خالصا من قلبه او نفسه﴾

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن میری شفاعت سے سعادت پانے والا لوگوں میں سے وہ شخص ہوگا جس نے خلوص قلب سے لا الہ الا اللہ کہا ہو۔''

محشر میں پیش آنے والے جن واقعات کی اطلاع احادیث میں وضاحت کے ساتھ دی گئی ہے اور جن پر ایک مومن کو یقین رکھنا ضروری ہے ان میں سے ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت بھی ہے۔

لیکن اس بارے میں بہت سے جاہل عوام سخت غلو اور افراط میں مبتلا ہو کر اعمال میں اس قدر کوتاہی کرنے لگے کہ شفاعت کا تصور ہی مسخ ہو کر رہ گیا۔ دوسری طرف دور جدید کے بعض اچھے خاصے تعلیم یافتہ حضرات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے بارے میں انتہائی تفریط میں مبتلا ہیں۔

مولانا محمد منظور نعمانی صاحب معارف الحدیث جلد اول ص ۲۴۲ میں لکھتے ہیں کہ ''شفاعت کے متعلق احادیث اتنی کثرت سے وارد ہوئی ہیں کہ سب ملا کر تواتر کی حد کو پہنچ جاتی ہیں۔''

شفاعت کی ان احادیث کے پیش نظر محدثین نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کئی قسم کی ہوگی اور بار بار ہوگی۔ سب سے پہلے جب کہ سارے اہل محشر اللہ تعالیٰ کے جلال سے خوف میں مبتلا ہوں گے کسی کو ہونٹ ہلانے کی جرأت اور ہمت نہ ہو گی۔ آدم علیہ السلام سے لے کر عیسی علیہ السلام تک تمام پیغمبر بھی کسی کے لیے شفاعت کی

جرأت نہ کر سکیں گے تو اس وقت عام اہلِ محشر کی درخواست پر اور ان کی تکلیف سے متاثر ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے لطف و کرم پر اعتماد کرتے ہوئے نیاز مندی اور حسن ادب کے ساتھ بارگاہ رب العزت میں اہلِ محشر کے لیے سفارش فرمائیں گے کہ ان کو اس فکر اور بے چینی کی حالت سے نجات دے دی جائے اور ان کا حساب و کتاب اور فیصلہ فرما دیا جائے۔ اور یہ شفاعت صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی فرمائیں گے اس کے بعد حساب اور فیصلہ کا کام شروع ہو گا چونکہ یہ شفاعت عام اہلِ محشر کے لیے ہو گی اس لیے اسے شفاعت عظمیٰ بھی کہتے ہیں اس کے بعد آپ اپنی امت کے مختلف درجہ کے ان گنہگاروں کے بارے میں جو اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے جہنم کے مستحق ہوں گے یا جہنم میں ڈالے جا چکے ہوں گے ان کے بار ے میں آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ اسی طرح اپنے بہت سے امتیوں کے حق میں آپ ترقی درجات کی بھی اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں گے احادیث میں شفاعت کی ان تمام اقسام اور واقعات کی تفصیل مذکور ہے۔

(تفصیل کے لیے دیکھئے معارف الحدیث جلد اول ص ۲۴۴ تا ۲۵۷)

احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ شفاعت کا دوران نکل جانے کے بعد دیگر انبیاء علیہم السلام، فرشتے، اللہ تعالیٰ کے دیگر صالح اور مقرب بندے، اہل ایمان کے حق میں شفاعت کریں گے۔ یہاں تک کہ کم عمری میں فوت ہونے والے اہل ایمان کے معصوم بچے بھی اپنے ماں باپ کے لیے سفارش کریں گے۔ بعض نیک اعمال خود ان عمل کرنے والوں کے لیے سفارش کریں گے۔ یہ شفاعتیں قبول بھی کی جائیں گی۔ بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہو گی جن کی نجات اور بخشش ان ہی سفارشات کے بہانے ہو گی۔

لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ سب شفاعتیں اللہ کے اذن، اس کی مرضی اور اجازت سے ہوں گی ورنہ کسی نبی یا فرشتہ کی بھی یہ مجال نہیں کہ وہ اللہ کی مرضی کے بغیر کسی ایک آدمی کو بھی دوزخ سے نکال سکے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿من ذالذی یشفع عندہ الا باذنہ﴾ (البقرہ آیت ۵)

''کون ہے جو اس کی بارگاہ میں بغیر اس کی اجازت کے کسی کی سفارش کر سکے۔''

اور سورۂ انبیاء آیت ۲۸ میں فرمایا:

﴿ولا یشفعون الا لمن ارتضی﴾

''اور وہ سفارش نہیں کر سکیں گے مگر صرف اس کے لیے جس کے لیے اس کی رضا مندی ہو گی۔''

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ آیۃ الکرسی کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا مالک ہے کوئی اس سے بڑا اور اس کے اوپر حاکم نہیں۔ کوئی اس کے بارے میں باز پرس کرنے کا بھی حق دار نہیں۔ ہاں اللہ کے کچھ مقبول بندے ہیں جن کو خاص طور پر کلام اور شفاعت کی اجازت دی جائے گی۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا محشر میں سب سے پہلے میں ساری امتوں کی شفاعت کروں گا اسی کا نام ''مقام محمود'' ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے۔ (معارف القرآن: جلد اول ص ۶۱۴)

صحیح بخاری میں حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک گروہ میری امت میں سے میری شفاعت سے دوزخ سے نکالا جائے گا جن کو ''جہنمیوں'' کے نام سے یاد کیا جائے گا۔ اس نام سے ان نکالے جانے والوں کی توہین نہ ہو گی بلکہ جہنم سے نکالے جانے کی وجہ سے ان کا یہ نام پڑ جائے گا کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی یاد دلائے گا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری شفاعت میری امت کے ان لوگوں کے حق میں ہو گی جو گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوئے ہوں گے۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قیامت کے دن میری شفاعت سے صرف وہی سعادت پائیں گے جنہوں نے خلوص قلب سے لا الہ الا اللہ کہا ہو۔ (رواہ البخاری)

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص شرک کی بیماری میں مبتلا ہو گا اس کو

شفاعت سے فائدہ نہ ہوگا۔ البتہ اگر شرک سے پاک ہوگیا ہے لیکن دوسری قسم کے گناہ ہیں تو اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے فائدہ ہوگا لیکن گناہوں کے باوجود شفاعت کے تذکرہ سے نڈر اور بے خوف ہوکر گناہوں پر اور زیادہ جری ہو جانا اور کھلم کھلا خلاف سنت زندگی گزارتے ہوئے اور بدعات سے بھرپور اعمال کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا مستحق سمجھنا یہ تو قطعاً ارشادات نبویہ کا تقاضا نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا تو یہ مطلب ہے کہ جن لوگوں سے گناہ ہو جائیں تو وہ بھی مایوس اور ناامید نہ ہوں۔ یہاں تک کہ آپ کی امت میں سے بھی بعض لوگوں کو شفاعت کرنے کا حق دیا جائے گا۔ جیسا کہ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میری امت میں سے بعض افراد وہ ہوں گے جو جماعتوں اور قوموں کی شفاعت کریں گے، بعض وہ ہوں گے جو عصبہ (یعنی دس سے چالیس تک کی تعداد والی جماعت) کے بارے میں شفاعت کریں گے اور بعض وہ ہوں گے جو ایک آدمی کی شفاعت کریں گے یہاں تک کہ سب جنت میں پہنچ جائیں گے۔ (رواہ الترمذی)

اللہ رب العزت ہمیں گناہوں سے محفوظ فرمائے، جو گناہ ہو جائیں ان سے دنیا میں توبہ کی توفیق نصیب فرمائے اور آخرت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت نصیب فرمائے۔



بیعت

(حقیقت' اہمیت' ضرورت اور شیخ کامل کی علامات)

﴿عَنْ عَوْفِ بنِ مَالِكٍ الْاَ شْجَعِی قَالَ کُنَّا عِندَ النَّبیّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم تِسْعَةٌ اَوْ ثَمانِیةٌ اَوْسَبْعَةٌ فَقَالَ اَ لَا تُبَایعُوْنَ رَسُولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فَبَسَطْنَا اَیدِیَنَا وَقُلْنَا عَلی مَا نُبایعُكَ یَارَسُوْلَ اللّٰہ قَالَ عَلی انْ تَعْبُدُوا اللّٰہ وَلَا تُشْرِکُوْا به شَیئًا وَتُصَلُّوا الصَّلَوَاتِ الْخَمْس وَتَسمَعُوْا وَتُطِیعُوْا﴾

(مسلم، ابو داؤد)

''حضرت عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے۔نو آدمی تھے یا آٹھ یا سات۔آپ نے ارشاد فرمایا تم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کیوں نہیں کرتے؟ ہم نے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے اورعرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس بات پر ہم آپ سے بیعت کریں آپ نے فرمایا ان باتوں پر کہ تم اللہ کی عبادت کرنا' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، پانچوں نمازیں پڑھنا اور بات کو سننا اور ماننا۔''

صوفیاء کرام میں جو بیعت کا معمول ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ التزام احکام یعنی اعمال ظاہری اور باطنی پر استقامت اور اہتمام کا معاہدہ کرنا اسے بیعت طریقت کہتے ہیں۔

بعض لوگ بیعت کو اس بنا پر بدعت کہتے ہیں کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں۔صرف کافروں سے بیعت اسلام اور مسلمانوں سے بیعت جہاد کرنا معمول تھا لیکن آغاز میں دی گئی حدیث میں اس کا واضح ثبوت موجود ہے اس لیے کہ مخاطبین صحابہ کرام رضی اللہ عنہ

ہیں لہٰذا یہ بیعت اسلام یقیناً نہیں ہے اور بیعت کے مضمون سے بھی ظاہر ہے کہ بیعت جہاد بھی نہیں ہے بلکہ الفاظ اس بات پر دلالت کر رہے ہیں کہ یہ التزام اور اہتمام اعمال کے لیے ہے اس لیے بیعت کے سنت ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ تعلیم الدین ص ۲۷ میں فرماتے ہیں:

''بیعت کے سنت ہونے میں کوئی شک نہیں، بعدہ بوجہ اشتباہ خلافت کے سلف نے صحبت پر اکتفا کیا پھر خرقہ کی رسم کی بجائے بیعت جاری ہوئی جب وہ رسم خلفاء میں نہ رہی صوفیہ نے اس سنت مردہ کو زندہ کیا۔''

پیری و مریدی یا بیعت کی حقیقت اور ضرورت میں بہت افراط وتفریط سے کام لیا گیا ہے۔ ایک طرف بعض نے مکمل طور پر اس کو بدعت سمجھ رکھا ہے اور دوسری طرف بعض نے اس کو صرف ایک رسم بنا رکھا ہے۔ بس دست بوسی اور قدم بوسی کر لی باقی خود کچھ کرنے یا کرانے کی ضرورت نہیں حالانکہ صرف پیری مریدی میں کچھ نہیں رکھا' اصل کام خود چلنا ہے اور کسی راہبر کا ہاتھ پکڑنا۔ اگرچہ رسمی طور پر کسی سے بیعت نہ بھی کرے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ سلسلہ بیعت میں داخل ہونے کی کچھ برکات نہیں لیکن صرف بیعت ہی کو اصل الاصول (کہ بس یہی سب کچھ ہے) سمجھنا بڑی غلطی ہے حضرت تھانویؒ قصدالسبیل ص ۸ میں فرماتے ہیں کہ اصلی غرض اور مقصود سلوک کا (یہ ہے کہ) رضائے حق کو سمجھے جس کا طریق احکام شرعیہ کا بجالانا اور ذکر پر مداومت کرنا ہے۔ شیخ اس کی تعلیم وتلقین کرتا ہے اور مرید اس پر کاربند ہوتا ہے اگرچہ کوئی کیفیت معلوم نہ ہو اور نہ کوئی کمال اس کے زعم میں حاصل ہو تب بھی آخرت میں اس کا ثمرہ جو کہ رضائے الٰہی ہے ظاہر ہوگا اور رضاء سے دخول جنت ولقائے حق اور دوزخ سے نجات میسر ہوگی۔

بیعت کے وقت ہاتھ میں ہاتھ لینا یا عورت کو کوئی کپڑا وغیرہ پکڑا دینا، یہ محض ایک معاہدہ کے لیے عادت صالحہ مستحسنہ ہے اور معاہدہ کا جزو نہیں نہ مقصود ہے نہ کوئی اور مقصود اس پر موقوف ہے۔

بیعت کا سنت ہونا تو معلوم ہوا لیکن یہ کس قدر ضروری ہے اس پر حضرت تھانویؒ ''انفاس عیسی'' ص ۱۶ میں فرماتے ہیں ''یہ یقینی ہے کہ بیعت طریقت کی ضرورت عام نہیں لیکن باوجود اس کے پھر بھی نفس میں بعض امراض خفیہ ہوتے ہیں کہ وہ بدون تنبیہ شیخ محقق عارف کے سمجھ میں نہیں آتے اور اگر سمجھ میں آ بھی جاتے ہیں تو ان کا علاج سمجھ میں نہیں آتا۔ ایک جگہ ''الباطن'' ص ۵۹ میں فرماتے ہیں'' کیونکہ خود انہی حالات کو سمجھنا آسان نہیں ہے اور شیخ کو بصیرت ہوتی ہے کیونکہ وہ بہت سے مغالطے دیکھ چکا ہے اور بہت سے گرم و سرد چکھ چکا ہے' جو پریشانی تم کو پیش آتی ہے وہ اس کو بارہا پیش آ چکی ہے' اس کو بھی کسی صاحب بصیرت نے سنبھالا تھا' بار بار تجربہ ہونے سے اس کو پوری بصیرت حاصل ہوگئی ہے تو وہ ہر حالت کو پہچانتا ہے۔''

جس طرح ظاہری مرض کے علاج کے لیے ایسے طبیب کی ضرورت ہے جو خود بھی صحیح ہو تندرست ہو مریض نہ ہو اور دوسروں کا علاج بھی کر سکے کیونکہ اگر خود مریض ہے تو پھر بیمار کی رائے بھی بیمار ہے۔ اگر وہ خود تندرست ہو مگر علاج کا طریقہ نہیں جانتا تو مریض کے لیے کارآمد نہیں۔ اسی طرح باطنی امراض کے علاج کے لیے ایسے مرشد، پیر اور راہنما کی ضرورت ہے جو خود بھی متقی اور صالح ہو' بدعتی اور فاسق نہ ہو کیونکہ بدعقیدہ اور بے عمل سے توقع نہیں کہ وہ خیر خواہی سے تعلیم دے گا بلکہ عقیدہ میں اپنے جیسا بنانے کی کوشش کرے گا لہٰذا یہ خیال رکھنا ہوگا کہ وہ شیخ کامل ہو۔

آج کل اللہ کے ولی کہاں، اور شیخ کامل کہاں نصیب ہوتے ہیں؟ چنانچہ یہی سوچ کر لوگ بیعت سے محروم رہتے ہیں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے شیخ کامل کی خصوصیات مختلف مقامات میں بیان فرمائی ہیں ان کو پیش نظر رکھا جائے تو شیخ کی تلاش میں آسانی ہو جاتی ہے۔ ان خصوصیات کا خلاصہ یہ ہے:

☆ شیخ علم شریعت سے بقدر ضرورت واقف ہو خواہ تحصیل سے یا صحبت علماء سے تاکہ فساد عقائد و اعمال سے محفوظ رہے اور طالبین کو محفوظ رکھ سکے۔

☆ عقائد، اخلاق و اعمال میں شرع کا پابند ہو۔

☆ تارک دنیا' راغب آخرت ہو' ظاہری و باطنی طاعت کی پابندی کرتا ہو۔

☆ کمال کا دعویٰ نہ کرتا ہو کہ یہ بھی شعبہ دنیا ہے۔

☆ بزرگوں کی صحبت اٹھائی ہوان سے فیوض و برکات حاصل کی ہوں۔

☆ تعلیم و تلقین میں اپنے مریدوں کے حال پر شفقت رکھتا ہو اور ان کی کوئی بری بات سنے یا دیکھے تو ان کو روک ٹوک کرتا ہو یہ نہ ہو کہ اس کی مرضی پر چھوڑ دے۔

☆ جو لوگ اس شیخ سے بیعت ہیں ان میں سے اکثر کی حالت باعتبار اتباع شرع شریعت، اور حرص کی کمی کے اچھی ہو۔

☆ اس زمانے کے منصف علماء و مشائخ اس کو اچھا سمجھتے ہوں۔

☆ بہ نسبت عوام کے خواص یعنی فہیم دیندار لوگ اس کی طرف زیادہ مائل ہوں۔

☆ اس کی صحبت میں چند بار بیٹھنے سے دنیا کی محبت میں کمی اور حق تعالیٰ کی محبت میں ترقی محسوس ہوتی ہو۔

☆ خود بھی ذاکر و شاغل ہو کیونکہ بدون عمل یا عزم عمل، تعلیم میں برکت نہیں ہوتی۔

☆ مصلح (اصلاح کرنے والا) ہو۔ صرف صالح ہونا کافی نہیں۔ شیخ کے لیے دونوں ضروری ہیں۔

(مندرجہ بالا علامات شیخ درج ذیل کتب سے ماخوذ ہیں۔ علامت نمبر ۱، ۳ از تعلیم الدین ص ۲۷ نمبر ۲' ۴، ۶ تا ۱۱ از قصد السبیل ص ۵، نمبر ۱۲ از کمالات اشرفیہ ص ۱۲۶)

حضرت تھانویؒ قصد السبیل ص ۶ میں فرماتے ہیں کہ "جس شخص میں یہ علامات ہوں پھر یہ نہ دیکھے کہ اس سے کوئی کرامت بھی صادر ہوتی ہے یا نہیں۔ یا یہ شخص صاحب تصرفات ہے یا نہیں۔ یا اس کو کشف ہوتا ہے یا نہیں۔ یا یہ جو دعاء کرتا ہے وہ قبول ہوتی ہے یا نہیں۔ اس طرح یہ نہ دیکھے کہ اس کی توجہ سے لوگ مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگتے ہیں یا نہیں۔ کیونکہ یہ شیخ کے لوازم میں سے نہیں۔"

اللہ تعالیٰ ہم سب کو امراض باطنی سے محفوظ فرمائے اور اگر لاحق ہو جائیں تو ان کا علاج کرانے کی توفیق عطاء فرمائے۔



فضائل حرم مکہ

ارشادت نبویہ ﷺ کی روشنی میں

﴿عن عیاش بن ربیعة المخزومی قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم لا تزال هذه الامة بخیر ماعظموا هذه الحرمة حق تعظیمها فاذا ضیعوا ذالك هلكوا﴾

(رواہ ابن ماجه)

حضرت عیاش بن ربیعہ مخزومی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میری امت جب تک اس حرم مقدس کا پورا احترام کرتی رہے گی ادائیگی وحرمت وتعظیم کا حق ادا کرے گی' خیریت سے رہے گی اور جب وہ اس کے احترام کو ضائع کر دے گی تو برباد ہو جائے گی۔''

خانہ کعبہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنا مقدس بیت (گھر) قرار دیا۔ اسی نسبت سے شہر مکہ کو جس میں بیت اللہ واقع ہے ''بلد اللہ الحرام'' قرار دیا گیا ہے۔ گویا جس طرح دنیا بھر کے گھروں میں کعبہ مکرمہ کو اللہ تعالیٰ سے خاص نسبت ہے اسی طرح دنیا بھر کے شہروں میں مکہ معظّمہ کو اللہ تعالیٰ کی نسبت کا خاص شرف حاصل ہے۔ پھر اسی نسبت سے اس کی ہر سمت میں کئی کئی میل کے علاقہ کو حرم (یعنی واجب الاحترام) قرار دیا گیا اور اس کے خاص آداب و احکام مقرر کیے گئے ہیں۔ اسی ادب و احترام کی بناء پر بہت سی ان باتوں کی بھی اس جگہ ممانعت ہے جن کی باقی ساری دنیا میں اجازت ہے۔ مثلاً حدودِ حرم میں کسی کو شکار کی اجازت نہیں' جنگ اور قتال کی اجازت نہیں، درخت کاٹنے اور درختوں کے پتے جھاڑنے کی اجازت نہیں۔

اس علاقہ حرم کی حدود پہلے حضرات ابراہیم علیہ السلام نے معین فرمائی تھیں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں انہی کی تجدید فرمائی۔ اب یہ پورا علاقہ گویا بلد اللہ الحرام کا صحن ہے اور اس کا وہی ادب و احترام واجب ہے جو اللہ کے مقدس شہر مکہ معظّمہ کا۔ آغاز میں مذکور ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ جب تک حرم کی تعظیم اجتماعی حیثیت سے امت میں باقی رہے گی اللہ تعالیٰ اس امت کی نگہبانی فرمائے گا اور جب امت کا رویہ مجموعی حیثیت سے اس بارے میں بدل جائے گا تو اس کے نتیجہ میں تباہیاں اور بربادیاں اس امت پر مسلط ہو جائیں گی۔

آج کے دور میں سفر کی سہولتوں اور بعض دوسری وجوہات کی بنا پر اگرچہ حج کرنے والوں کی تعداد بڑھ گئی ہے لیکن وہاں ساری دنیا سے جو مسلمان آتے ہیں ان کا طرز عمل بتاتا ہے کہ بیت اللہ اور حرم مقدس کے ادب و احترام میں امت کے اندر بحیثیت مجموعی کمی اور کوتاہی آ گئی ہے اور بلاشبہ یہ بھی ان اسباب میں سے ایک اہم سبب ہے جن کی وجہ سے امت مشرق و مغرب میں اللہ کی نصرت اور نگہبانی سے محروم نظر آتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے بخاری اور مسلم میں طویل روایت منقول ہے جس میں تفصیلاً حرم کے آداب بیان کیے گئے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی اعلان فرمایا کہ یہ شہر مکہ ،اللہ نے اس کو اسی دن سے محترم قرار دیا جس دن زمین و آسمان کی تخلیق ہوئی پس یہ علاقہ اللہ کے حکم سے قیامت تک واجب الاحترام رہے گا اور مجھ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی بندے کو یہاں قتال کی اجازت نہیں دی اور مجھے بھی دن کے تھوڑے سے وقت کے لیے اس کی عارضی اور وقتی اجازت دی گئی تھی اور وقت ختم ہو جانے کے بعد اب قیامت تک یہاں قتال حرام ہے' اس علاقہ کی خاردار جھاڑیاں بھی نہ کاٹی جائیں' یہاں کسی شکار کے قابل جانور کو پریشان بھی نہ کیا جائے۔ اور اگر گری پڑی چیز پر نظر پڑے تو اس کو وہی اٹھائے جو قاعدہ کے مطابق اس کا اعلان اور تشہیر کرتا رہے اور یہاں کی سبز گھاس بھی نہ کاٹی جائے نہ اکھاڑی جائے۔

ان ارشادات نبویہ کے سننے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اذخر'' گھاس کو مستثنیٰ فرما دیجیے کیونکہ یہاں کے لوہار اس کو استعمال کرتے ہیں اور گھر کی چھتوں کے لیے بھی اس کی ضرورت ہوتی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اذخر گھاس کو مستثنیٰ فرما دیا۔

حرم مکہ کی حدود مختلف اطراف سے کچھ اس طرح ہیں۔ مدینہ منورہ کی جانب سے مکہ معظّمہ سے تین میل کے فاصلے پر مقام تنعیم ہے، بعض نے یہ فاصلہ چار میل لکھا ہے۔(جیسا کہ ابو محمد بن ابی زید مالکی نے ''النوادر'' میں لکھا ہے) یمن کے راستہ پر مقام اضاۃ کے کنارے تک چھ میل کا فاصلہ ہے طائف کے راستہ عرفہ کے طریق سے بطن نمرہ سے گیارہ میل ہے۔ عراق کے راستہ سے خل گھاٹی تک (جو مقطع پہاڑ واقع ہے) سات میل ہے۔

جعرانہ کے راستے آل عبداللہ بن خالد بن اسید سے نو میل کے فاصلہ پر ہے اور جدہ کے راستے اعشاش کی انتہاء تک دس میل کا فاصلہ ہے۔ اور جدہ کے راستے حدیبیہ کی انتہاء تک دس میل ہے۔ (بحوالہ اخبار مکہ جلد۲ ص ۱۳۱)

سب سے پہلے حضرات ابراہیم علیہ السلام نے حدود حرم پر پتھر نصب فرمائے پھر عہد نبوی میں قریش نے انہیں اکھاڑ دیا۔ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت ناگوار گزری پھر جبرئیل تشریف لائے اور خوشخبری دی کہ وہ عنقریب ان پتھروں کو دوبارہ نصب کریں گے۔ پھر لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات پیدا فرما دی اور انہی لوگوں نے دوبارہ حدود حرم کے پتھروں کو نصب کر دیا۔ (اخبار مکہ جلد۲ ص ۱۲۸)

زہریؒ سے روایت ہے کہ وہ عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ سے بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حرم کے پتھر رکھے' آپ کو ان کے نصب کرنے کی جگہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے بتائی تھی۔ پھر قصی کے زمانہ تک ان میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی قصی نے نئے پتھر لگوائے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے سال تمیم بن اسد خزاعی کو بھیجا انہوں نے نئے پتھر لگائے پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں چار آدمی ان

پتھروں کی تجدید کے لیے بھیجے۔ (۱) مخرمہ بن نوفل، (۲) سعید بن یربوع (۳) حویطب بن عبدالعزی، (۴) زہرہ بن عبد مناف۔ ان کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اور ان کے بعد عبدالملک بن مروان نے حدودِ حرم کے نئے پتھر نصب کروائے۔

(اخبار مکہ جلد۲ ص ۱۲۹)

حرم مکہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبی لگاؤ کا اندازہ جامع ترمذی اور سنن ابوداؤد کی اس روایت سے ہوتا ہے جو کہ حضرت عبداللہ بن عدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں حزورہ (ایک ٹیلہ) پر کھڑے دیکھا' آپ مکہ سے مخاطب ہو کر فرما رہے تھے خدا کی قسم تو اللہ کی زمین میں سب سے بہتر جگہ ہے اور اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہے اگر مجھے یہاں سے نکلنے (ہجرت) پر مجبور نہ کیا گیا ہوتا تو میں ہرگز تجھے چھوڑ کر نہ جاتا۔

جامع ترمذی میں ایک روایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تو کس قدر پاکیزہ اور دل پسند شہر ہے اور تو مجھے کتنا محبوب ہے اگر میری قوم نے مجھے نہ نکالا ہوتا تو میں تجھے چھوڑ کر کسی اور جگہ نہ بستا۔

اللہ رب العزت ہمیں بار بار حرمین شریفین کی زیارت نصیب فرمائے۔ آمین



کتاب اللہ کی شرح

(سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

﴿عن جابر رضی اللّٰہ عنہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اما بعد فان خیر الحدیث کتاب اللّٰہ و خیر الھدی ھدی محمد (صلی اللّٰہ علیہ سلم)﴾ (رواہ مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خدا کی حمد کے بعد! معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے بہتر بات کتاب اللہ ہے اور بہترین ہدایت (راہنمائی) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے پہلے پارہ کے آغاز میں قرآن مجید کی حقیقت اور مقصد بتایا:

﴿ذالك الکتاب لاریب فیه ھدی للمتقین﴾

''اس کتاب میں کوئی شک نہیں یہ پرہیزگاروں کے لیے راہنمائی ہے۔''

اور پھر قرآن مجید نے زندگی کے ہر مرحلے میں راہنمائی فرمائی چاہے معاشرتی امور ہوں یا معاشی۔ گھریلو زندگی، تجارتی زندگی، اخلاقی اصول و آداب، فائدہ اور نقصان کے بنیادی اصول، حلال و حرام کی تمیز، الغرض زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں راہنمائی اس کتاب مبین میں موجود ہے۔

لیکن ایک پڑھا لکھا شخص یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ کسی فن کی کتاب کے مفہوم اور مطلب کو سمجھنے کے لیے صرف اس کتاب کی زبان کو جاننا کافی نہیں، بلکہ اس فن کو کسی ماہر استاذ سے حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً بیماری کے علاج کے بارے میں میڈیکل کی کتابیں بازار میں ملتی ہیں لیکن صرف انگریزی زبان میں مہارت پیدا کر لینے اور میڈیکل کی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے کوئی شخص ڈاکٹر نہیں بن سکتا۔ اگر زبان میں مہارت حاصل ہونے سے

کتابیں پڑھ کر علوم وفنون حاصل ہو جاتے تو دنیا کے سب علوم اس شخص کو حاصل ہو جاتے جو اس زبان کو سمجھتا ہو۔ اسی طرح اگر عربی زبان سیکھ کر کوئی شخص قرآن حکیم کا مطالعہ کر کے خود قرآن حکیم کے احکام کو سمجھنے کی کوشش کرے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح کو سامنے نہ رکھے تو پھر وہ شخص قرآن حکیم سے ہدایت حاصل نہیں کر سکے گا اور یہ بات خود صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ساتھ پیش آئی۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا:

﴿فان لم تجدوا ماء فتيمموا صعيدا طيبا فامسحوا بوجوهكم وايديكم﴾

''یعنی اگر تمہیں وضوء یا غسل کے لیے پانی نہ ملے تو پھر تم پاکیزہ مٹی سے تیمّم کرلو اور اپنے چہروں اور ہاتھوں کو مل لو۔''

اب ایک صحابی کو تیمّم کی ضرورت محسوس ہوئی تو مشکل میں پڑ گئے، بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیمّم کا طریقہ بتایا اور یوں ان حضرات کے لیے آسانی ہوئی۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران اور سورۂ جمعہ کی آیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا میں آنے کے تین مقاصد بیان فرمائے ہیں:

﴿يتلوا عليهم ايتك ويعلمهم الكتاب والحكمة ويزكيهم﴾

اور ان آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجنے کا ایک مستقل مقصد کتاب اللہ کی تعلیم دینا بھی بیان کیا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ تعلیم رسول ہی کے ذریعہ قرآنی تعلیم کا صحیح علم حاصل ہوسکتا ہے اور قرآن کو تعلیمات رسول سے جدا کر کے خود سمجھنے کی کوشش کرنا اور رسول کی تشریحات سے رخ موڑ کر اپنی تشریحات کو زندگی کی بنیاد بنانا ہدایت کے بجائے کھلی گمراہی ہے۔

یہ بات بالکل درست ہے کہ قرآن حکیم کتاب مبین ہے واضح کتاب ہے۔ اگر مضامین قرآن کو بتانے اور سکھانے کی ضرورت نہ ہوتی تو رسول بھیجنے کی ضرورت ہوتی' اللہ کی

یہ کتاب کسی اور طریقے سے بھی انسانوں تک پہنچائی جا سکتی تھی لیکن تعالیٰ تو علیم اور حکیم ہے وہ جانتا ہے کہ مضامین قرآن کی تعلیم کے لیے معلم ضرورت ہے اور اس کے لیے عام استاذ کافی نہیں بلکہ مضامین قرآن کی تعلیم اور تفہیم کے لیے احادیث مبارکہ کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے ”الادق السارقة فاقطعوا ایهما“ (چوری کرنے والیمر داور عورت کا ہاتھ کاٹ دو) اب عربی زبان میں کندھوں سے انگلیوں تک پورے بازو کو (ید) کہتے ہیں اب کون بتائے گا کہ ہاتھ کہاں تک کاٹنا ہے؟ اور پھر آخر ہاتھ کتنا مال چوری کرنے پر کاٹا جائے گا اور یہ کہ کون کاٹے گا؟ شارح کتاب اللہ صلوا علیہ وآلہ نے ایک ایک باریک سے باریک بات کی وضاحت فرما دی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حلال وحرام چیزوں کے بارے میں ایک اصول ارشاد فرمایا:

﴿ویحل لهم الطیبات ویحرم علیهم الخبائث﴾

”اور وہ لوگوں کے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے اور ناپاک
گندی چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے۔“

لیکن اب اس کی تفصیل کہ کون سی چیزیں حلال اور کون سی حرام ہیں اس کی تشریح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی۔

اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب بین کا شارح اور مفسر بنا کر بھیجا۔ اپنے قول وعمل کے ذریعہ احکام قرآنی کی وضاحت اور تشریح فرمائی اور یہی تشریح سنت رسول کہلاتی ہے لہٰذا قیامت تک احکام قرآنی کی صرف وہی تشریح معتبر ہوگی جو شارح کتاب اللہ نے فرمائی۔

اللہ رب العزت ہمیں قرآن حکیم کے احکامات پر اسی مفہوم اور طریقے کے ساتھ عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے جس کی تعلیم وتشریح رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی۔

☆☆☆

مسلمان قائد کی خصوصیات

﴿عن معقل بن یسار قال سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول ما من وال یلی رعیة من المسلمین فیموت وھو غاش لھم الا حرم اللّٰہ علیہ الجنة﴾ (متفق علیہ)

حضرت معقل رضی اللہ عنہ بن یسار فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا'' جو حاکم مسلمانوں کی سرداری اپنے ہاتھ میں لے اور اس حالت میں مرے کہ وہ خائن اور ظالم ہو تو اللہ اس پر جنت حرام کرے گا۔''

اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران آیت ۱۵۹ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قائدانہ خصوصیات کا ذکر فرما کر جہاں رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور عظمت بیان فرمائی وہاں امت کو یہ سبق بھی دیا کہ مومن کی قائدانہ خصوصیات کیا ہوتی ہیں۔

ارشاد باری ہوا: ''یہ بھی اللہ کی رحمت ہے کہ جو آپ نے نرمی سے برتاؤ کیا۔ اور اگر آپ تندخو اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے پاس سے بکھر جاتے۔ پس آپ ان کو معاف کر دیں، ان کے لیے بخشش مانگیں اور ان سے مشورہ لیتے رہا کریں۔ پھر جب آپ ایک رائے پختہ کر لیں تو پھر اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اس کو کر ڈالیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ ایسے اعتماد کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کو ''اسوہ حسنہ'' بہترین نمونہ زندگی قرار دیا۔ جس طرح زندگی کے مختلف پہلوؤں میں مومنین کی راہنمائی فرمائی اسی طرح قیادت کا اعلیٰ ترین معیار بھی عطا فرمایا۔

مومن قائد کی پہلی خصوصیت تو اس کے ایمان سے جھلکتی ہے۔ ارشاد باری ہے:

﴿انتم الاعلون ان کنتم مومنین﴾

''اور تم ہی بلند ہو اگر تم ایمان والے ہو۔''

اور یہ عزت و شرف جو ایمان کی دولت نصیب ہونے سے ملتا ہے۔ جتنا ایمان پختہ ہوتا چلا جاتا ہے اتنا اس قائد کے اندر تقویٰ اور پرہیزگاری کا جذبہ پیدا ہوتا جاتا ہے اس لیے کہ ایک مومن یقین رکھتا ہے کہ اللہ اس کے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے پھر یہ مومن قائد شجاعت و بہادری سے اس طرح مزین ہوتا ہے کہ وہ صرف اللہ سے ڈرتا ہے اس لیے کہ نفع اور نقصان کا مالک صرف اللہ ہے عزت اور ذلت صرف اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے یہی ایمان جب ایک مومن قائد کو بہادری اور شجاعت کا جوہر عطا کرتا ہے تو یہ قائد اپنے اعلیٰ مقاصد کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے پر آمادہ رہتا ہے اور خود داری تو اتنے اعلیٰ درجے کی ہوتی ہے کہ خدا کے علاوہ کسی کے سامنے نہیں جھکتا' دوسری طرف مخلوق خدا کے سامنے انکساری سے رہتا ہے۔

اگر انسان غرور اور تکبر میں مبتلا ہو جائے تو خدائی کا دعویٰ کرنے لگتا ہے' دوسرے انسانوں کو حقیر سمجھ کر ان پر ظلم و ستم ڈھاتا ہے لیکن ایمان کی دولت سے آراستہ قائد عجز و انکساری' ہمدردی اور خدمت کے جذبات سے سرشار ہوتا ہے یہی چیز اسے بہترین قائدانہ

صلاحیتوں کا مالک بنا دیتی ہے۔

خدائے برتر پر ایمان رکھنے والا قائد مشکل ترین حالات میں بھی مایوس نہیں ہوتا' اس لیے کہ اسے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی ہر مشکل کو آسان کرنے پر قدرت رکھتا ہے' جب یہ قائد اتنی بڑی قدرت والے پر یقین رکھتا ہے تو وہ پھر تنگ نظر نہیں ہوتا وہ ہر طرح کے امتیاز سے بالاتر ہوکر مخلوق کی خدمت کو اپنا شعار بنا لیتا ہے۔

تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے عرب قوم کی حالت کیا تھی؟ اتحاد اور تنظیم تو بڑے دور کی بات تھی یہ قومیں تو اپنی تمام صلاحیتیں خانہ جنگیوں اور لوٹ مار کے بعد عیش وعشرت میں صرف کر دیتی تھیں لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ سال کی تھوڑی سی مدت میں اعلیٰ ترین قائدانہ صلاحیتوں کی بدولت اس قوم کو اس طرح جوڑ دیا کہ یہ قوم بنیان مرصوص (سیسہ پلائی ہوئی دیوار) بن گئی پھر یہی قوم صرف خود ہی منظّم نہیں ہوئی بلکہ اس نے پوری انسانیت کو اتحاد و تنظیم کا پیغام دیا' یہی قوم شتر بانی کے مقام سے جہاں بانی کے مقام پر پہنچ گئی۔

اس لیے کہ یہ اتحاد اور تنظیم انسانی اصولوں پر مبنی تھی' اس اعلیٰ ترین قائدانہ دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علاقائی، نسلی، لسانی اور جغرافیائی تعصّبات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ نہ دنیاوی مفادات کا کسی کو لالچ دیا بلکہ آپ نے مادہ پرست قیادت کے ان طریقوں کو جڑ سے ختم فرما دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کو بیدار فرمایا تو اللہ کی بندگی کی دعوت کے ذریعہ، عالمگیر انسانی اخوت اور بھائی چارے کے رشتوں میں جوڑ کر، عدل و انصاف کو عام کر کے خوف خدا اور خوف آخرت دلوں میں پیوستہ کر کے بہترین امت کے لیے بہترین قائدانہ خوبیان فراہم کیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پاکیزہ زندگی سے امت کو یہ سبق دیا کہ ایمانداری اور سچائی جس طرح انفرادی زندگی میں ایک شخص کی خوبی ہے اس طرح ایک مومن قائد کی بھی یہ خصوصیت ہے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عام شخص کے جھوٹ کے

مقابلہ میں ایک امیر اور قائد کے جھوٹ کو انتہائی سنگین قرار دیا۔ ایک قائد کی زندگی میں جو مراحل آتے ہیں وہ سب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آئے لیکن آپ نے اسلامی اصولوں کے معاملے میں کبھی لچک نہیں آنے دی، کسی اصول کے بدلے سمجھوتہ نہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مال و دولت کی پیشکش ہوئی، قبائل کے اقتدار کو قدموں میں ڈالا گیا لیکن آپ نے اصول کی قربانی نہیں دی۔

اس وقت کے غیر مسلم اس جستجو میں رہے کہ ان مسلمان لوگوں میں کون سی ایسی خصوصیات ہیں چنانچہ دور فاروقی میں ایک مسلمان شخص کسی عیسائی سلطنت میں گیا تو وہاں کے سربراہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں پوچھا تمہارا قائد کیسا ہے؟ اس نے مختصر سا جواب دیا اور اپنے قائد کی خوبیوں کو کھول کر رکھ دیا ہمارا امیر نہ کسی کو دھوکہ دیتا ہے اور نہ کسی کے دھوکہ میں آتا ہے یعنی اتنا نیک اور شرافت کا پیکر کہ کسی کو دھوکہ نہیں دیتا اور اتنا ہوشیار کہ کسی سے دھوکہ کھاتا نہیں۔

اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی قائدانہ خصوصیات میں صحابہ کرام کو بھی رنگ دیا تھا۔ آج پوری دنیا کے سامنے ایک تاریخی حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس سالہ مدنی دور میں دس لاکھ مربع میل فتح فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد مومن قائدین نے عرب سے نکل کر آس پاس کے دوسرے ممالک میں قدم رکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کرہ ارض کے تین براعظموں میں اسلام کے جھنڈے گاڑ دیئے۔

انہی قائدین کی بدولت برصغیر میں مسلمانوں کو مومنانہ خصوصیات سے آراستہ قیادت ملی، تحریک پاکستان کا آغاز ہوا، تعمیر پاکستان کا مرحلہ آیا، اتحاد، تنظیم اور یقین محکم پر عمل پیرا قائد ملا، اللہ تعالیٰ انہی مومنانہ قائدانہ اوصاف کی بدولت پاکستان کی حفاظت فرمائے اور ایک بار پھر اتحاد و تنظیم کا اعلیٰ ترین نمونہ بنا دے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللّٰہ رب العالمین



احادیث نبوی کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کی قوت باصرہ، سامعہ، شامہ، ذائقہ، لامسہ کی امتیازی خصوصیات

﴿عن انس رضی اله عنه قال اقیمت الصلوٰة فاقبل علینا رسول الله صلی الله علیه وسلم بوجهه فقال اقیموا صفوفکم وتراصوا فانی اراکم من وراء ظهری﴾(رواہ البخاری)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ جماعت کھڑی ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری طرف اپنا رخ پھیر کر فرمایا، اپنی صفیں سیدھی کرو اور خوب مل مل کر کھڑے ہو کیونکہ میں تمہیں اپنی پشت کی طرف سے بھی دیکھتا ہوں۔''

اللہ رب العزت نے انبیاء علیہم السلام میں ایسی صفات کا اظہار قرآن مجید میں بھی فرمایا جن سے ان کی بشریت کا بدیہی ثبوت ملتا ہے۔ دوسری طرف ان انبیاء میں وہ صفات بھی موجود ہوتی ہیں جو عام انسانوں سے ان کی فوقیت کا بدیہی ثبوت ہوتی ہیں حضرت مولانا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمان السنہ جلد ۳ ص ۲۴۸ میں ایک باب کا عنوان قائم فرمایا:

﴿الانبیاء علیهم السلام لهم ممیزات ومزایا یمتا زون بها

عن سائر البشر﴾

''انبیاء علیہم السلام میں بہت سی خصوصیات ایسی ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ تمام نوع بشر سے ممتاز بھی ہوتے ہیں۔''

صفحہ ۲۴۹ میں فرماتے ہیں ''انبیاء علیہم السلام بھی نفس بشریہ میں گو سب انسانوں کے ساتھ شریک ہوتے ہیں لیکن پھر ان سے مشک کی طرح ممتاز بھی ہوتے ہیں صرف اپنی سیرت میں نہیں بلکہ اپنے جسم و جوارح میں بھی اور ان کے خواص میں بھی، انبیاء علیہم السلام کی شان رفیع تو بہت بلند ہے۔''

قوت باصرہ (دیکھنے کی قوت) کی امتیازی خصوصیت:

ابتداء میں ذکر کی گئی حدیث سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت باصرہ (دیکھنے کی قوت) کی امتیازی خصوصیت معلوم ہو رہی ہے یہاں یہ الفاظ ہیں:

﴿اراکم من وراء ظهری﴾

''بے شک میں تمہیں دیکھتا ہوں اپنی پشت کی طرف سے''

(رواہ البخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے:

﴿والله انی لا ری من خلفی کماا ری من بین یدی﴾

(رواہ احمد)

''خدا کی قسم جیسا میں اپنے سامنے دیکھتا ہوں اسی طرح پشت کی جانب دیکھتا ہوں۔''

اسی مفہوم کی روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ابوداؤد میں بھی منقول ہے اپنے سامنے کی چیز دیکھ لینا تو ہر انسان کا خاصہ ہے لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے سامنے اور پیچھے دیکھنے کی یکساں طاقت عنایت فرمائی تھی۔

حضرت مولانا بدر عالم صاحب فرماتے ہیں ''راہ اعتدال یہ ہے کہ حدیثوں میں جو صفات جس حد تک ثابت ہوں ان کو بے چوں چرا تسلیم کرلیا جائے نہ ان میں تاویلات کی جائیں

اور نہ ان میں اپنی جانب سے مبالغے کئے جائیں۔ (ترجمان السنۃ جلد۳ ص ۲۵۵)

قوت سامعہ (سننے کی قوت) کی امتیازی خصوصیت:

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنونجار کے کسی باغ میں ایک خچر پر سوار تھے اس وقت ہم لوگ بھی آپ کے ہمراہ حاضر تھے اچانک آپ کی سواری اس زور سے بدکی کہ قریب تھا کہ آپ گر جاتے دیکھا تو وہاں پانچ چھ قبریں تھیں، آپ نے پوچھا یہ مردے کس زمانے کے ہیں اور کون ہیں؟ جواب دیا گیا کہ شرک کے زمانہ کے۔ پھر آپ نے فرمایا اس امت کا قبر میں امتحان ہوتا ہے۔ اگر کہیں یہ خطرہ نہ ہوتا کہ دہشت کے مارے تم مردوں کو دفن کرنا ہی بھول جاؤ تو میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ان یسمعکم من عذاب القبر الذی اسمع منه کہ جو عذاب قبر میں سنتا ہوں وہ تمہیں بھی سنا دے۔ (رواہ مسلم)

قوت ذائقہ (چکھنے کی قوت) کی امتیازی خصوصیت:

ایک انصاری صحابی کہتے ہیں کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے آپ کے سامنے کھانا پیش کیا گیا حسب دستور کھانے کے لیے پہلے آپ نے ہاتھ بڑھایا اس کے بعد صحابہؓ نے ہاتھ بڑھائے اور کھانا شروع کیا، ہم نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لقمہ چبا رہے ہیں لیکن نگلتے نہیں۔ اس کے بعد فرمایا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ گوشت کسی ایسی بکری کا ہے جو مالک کی اجازت کے بغیر حاصل کی گئی ہے۔ میت کی بیوی نے جواباً کہہ بھیجا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، میں نے مقام نقیع کے بازار میں جہاں بکریاں فروخت ہوتی ہیں ایک آدمی بھیجا تھا تا کہ وہ میرے لیے ایک بکری خرید لائے جب وہاں بکری نہ ملی تو میں نے اپنے ایک پڑوسی کے پاس آدمی بھیجا اس نے بکری خریدی تھی میں نے کہا جس قیمت میں خریدی ہو اسی قیمت میں وہ مجھے بیچ دے اتفاقاً وہ نہ ملا پھر میں نے اس کی بیوی کے پاس آدمی بھیجا اس نے مجھے یہ بکری دے دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو پھر یہ کھانا قیدیوں کو کھلا دو۔" (رواہ ابوداؤد والبیہقی فی دلائل النبوۃ)

تلخ وشیریں کا احساس تو زبان بھی کر لیتی ہے لیکن اللہ کے محبوب بندوں کی زبان حلال وحرام کا احساس بھی کرتی ہے۔

قوت لامسہ (چھونے کی قوت) کی امتیازی خصوصیت:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ جب بیمار ہوتے تو پہلے اپنے ہاتھ پر آپ معوذات پڑھ کر دم کرتے اس کے بعد ان کو اپنے سارے جسم پر پھیر لیتے پھر جب آپ اس مرتبہ بیمار ہوئے جس میں انتقال ہوا تو میں یوں کرتی کہ معوذات پڑھ کر دم تو خود کرتی لیکن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ مبارک لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اطہر پر پھیر دیتی۔(رواہ البخاری ومسلم)

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ مبارک میں شفا کی خصوصیت بھی تھی۔ یہاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی فہم کتنی قابل داد ہے کہ وہ اس اہم بات کا خیال رکھتیں کہ معوذات تو خود پڑھ لیتیں لیکن دست مبارک کی خصوصیت کے پیش نظر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن مبارک پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ہاتھ پھیر دیتیں۔معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں کوئی امتیازی خاصیت ہے۔

قوت شامہ (سونگھنے کی قوت) کی امتیازی خصوصیت:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی لہسن یا پیاز کھائے وہ ہماری مجلس سے دور رہے۔ایک مرتبہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک ہانڈی لائی گئی جس میں سبزیاں تھیں ''**فوجدلهاريحا**'' پس اس میں آپ نے بدبو محسوس کی پھر فرمایا اس ہانڈی کو قریب کر دو ان صحابہ کے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فرمایا کھا لو۔

﴿**فانی اناجی من لا تناجی**﴾

یعنی ''میں اس سے سرگوشی کرتا ہوں جن سے تم سرگوشی نہیں کرتے۔''(رواہ البخاری ومسلم)

اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ بدبودار چیز کھا کر مسجد میں جانا مکروہ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بدبودار چیزوں کے کھانے سے اس لیے رکتے تھے کہ وحی لے کر آنے والے فرشتہ کو اس سے تکلیف نہ ہو اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیازی وصف تھا۔

لباس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا معمول

﴿عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذاستجد ثوبا سماہ باسمہ عمامۃ او قمیصااورداء ثم یقول اللھم لک الحمد کما کسوتنیہ اسالک خیرہ وخیر ماصنع لہ واعوذبک من شرہ و شر ماصنع لہ﴾ (رواہ الترمذی)

''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی نیا کپڑا پہنتے تو اظہار مسرت کے طور پر اس کا نام لیتے (مثلاً اللہ تعالیٰ نے یہ کرتہ مرحمت فرمایا) ایسے ہی عمامہ اور چادر وغیرہ پھر آپ یہ دعا پڑھتے: اے اللہ! تیرے ہی لیے تمام تعریفیں ہیں اور اس کپڑے کے پہنانے پر تیرا ہی شکر ہے یا اللہ میں تجھ ہی سے اس کپڑے کی بھلائی چاہتا ہوں اور ان مقاصد کی خوبی اور بھلائی چاہتا ہوں جن کے لیے یہ کپڑا بنایا گیا ہے اور تجھ ہی سے اس کپڑے کے شر سے پناہ مانگتا ہوں اور ان چیزوں کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جن کے لیے یہ کپڑا بنایا گیا۔''

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کریمہ لباس مبارک میں وسعت اور تکلف نہ کرنے کی تھی یعنی جو مل جاتا پہن لیتے اور خاص لباس کی جستجو نہ فرماتے اور کسی حال میں نفیس کی خواہش نہ فرماتے اور نہ ادنیٰ اور حقیر خیال فرماتے تھے۔

اکثر حالات میں آپ کا لباس مبارک چادر اور ازار (تہبند) ہوتا جو کچھ سخت اور موٹے کپڑے کا ہوتا، اور کبھی پشمینہ (اونی) لباس بھی زیب تن فرماتے۔

روایات میں ہے کہ آپ کی چادر مبارک میں متعدد پیوند لگے ہوتے تھے اور فرماتے کہ میں بندہ ہی ہوں اور بندوں جیسا لباس پہنتا ہوں۔ (رواہ الشیخان)

حضرت ابن عمر سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک مومن کی تمام خوبیوں میں لباس کا صاف ستھرا رکھنا اور کم پر راضی ہونا پسند ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم تکبر اور غرور کی مذمت فرماتے تو صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آدمی پسند کرتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں اور اس کی جوتیاں عمدہ ہوں (کہا یہ تکبر تو نہیں؟) اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

﴿ان اللہ جمیل یحب الجمال﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔''

چنانچہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم وفود کے آنے پر ان کے لیے تجمل (آراستگی) فرماتے اور جمعہ وعیدین کے لیے آرائش فرماتے اور اس کے لیے مستقل جدا لباس محفوظ رکھتے تھے۔ (مدارج النبوۃ)

حضرت ام سلمہؓ سے منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا محبوب ترین لباس قمیص تھا اگرچہ تہبند اور چادر بھی بکثرت زیب تن فرماتے تھے لیکن قمیص کا پہننا زیادہ پسند تھا۔ (شمائل ترمذی)

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کرتا سوتی رنگ کا دامن آستین والا ہوتا تھا اور آپ کی قمیص مبارک میں گھنڈیاں (بٹن کے طور پر) لگی ہوئی تھیں اور قمیص مبارک میں سینہ کے مقام پر گریبان تھا اور یہی قمیص کی سنت ہے۔ (مدارج النبوۃ)

ایک صحابی فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس حال میں دیکھا کہ

میرے جسم پر کم قیمت کپڑے تھے فرمایا کہ کیا تیرے پاس مال ہے میں نے عرض کیا ہاں اللہ نے مجھے ہر قسم کے مال و دولت سے نوازا ہے پھر فرمایا کہ خدا کی نعمت اور اس کی بخشش کو تمہارے جسم سے ظاہر ہونا چاہیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کو دیکھا کہ جس کے میلے اور غلیظ کپڑے تھے فرمایا کہ یہ شخص کوئی ایسی چیز نہیں پاتا جس سے اپنے کپڑوں کو دھو لے۔ (مدارج النبوۃ)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دن مکہ میں داخل ہوئے تو سر مبارک پر سیاہ عمامہ تھا۔ (مدارج النبوۃ)

حضرت تھانویؒ کے خلیفہ ڈاکٹر عبدالحئیؒ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں میں سے اطیب اور الطف تھے اس لیے اس کی علامت آپ کے بدن مبارک میں ظاہر تھی کہ آپ کے جسم اطہر سے لگنے کی وجہ سے آپ کے کپڑے میلے نہیں ہوتے تھے اور نہ آپ کے لباس میں جوں پڑتی تھی اور نہ آپ کے کپڑوں اور جسم پر مکھی بیٹھتی تھی۔ (مدارج النبوۃ) (اسوہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صفحہ ۱۲۱)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چمڑے کے موزے پہنے ہیں اور ان پر مسح فرمایا ہے۔ (مدارج النبوۃ)

حضرت ڈاکٹر عبدالحئیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ لباس کے معاملہ میں سب سے بہترین طریقہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ہے جس کا آپ نے حکم دیا یا ترغیب دی یا خود اس پر عمل فرمایا۔ آپ کا طریقہ (سنت) لباس یہ ہے کہ

کپاس کا بنا ہوا، یا صوف (اون) یا کتان کا بنا ہوا کوئی لباس جو میسر آئے پہن لیا جائے آپ نے یمنی چادر، جبہ، قبا، قمیص، پاجامہ، تہبند، چادر، موزہ، جوتا، ہر چیز استعمال فرمائی۔ (اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صفحہ ۲۲۱)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پاجامہ بھی خریدا اور اصحابہ کرام آپ کی اجازت سے پہنا بھی کرتے تھے۔ (زادالمعاد)

ملا علی قاری نے دمیاطی سے نقل کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کرتا مبارک سوت کا بنا ہوا تھا جو زیادہ لمبا نہ تھا اور اس کی آستین بھی زیادہ نہ تھی۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ آپ کا کرتہ ٹخنوں سے اونچا ہوتا تھا۔

(شمائل ترمذی، خصائل نبویؐ)

حضرت اسماء فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کرتہ کی آستین پہنچے تک ہوتی تھی۔ (شمائل ترمذی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم قمیص کی آستین نہ بہت تنگ رکھتے تھے اور نہ بہت کشادہ بلکہ درمیانی ہوتی تھی اور آستین ہاتھ کے گٹے تک رکھتے اور چوغہ وغیرہ نیچے تک مگر انگلیوں سے آگے بڑھا ہوا نہیں ہوتا تھا۔ (اسوہ رسول اکرمؐ صفحہ ۱۲۲)

جب آپ قمیص زیب تن فرماتے تو پہلے سیدھے ہاتھ سیدھی آستین میں ڈالتے اور پھر بایاں ہاتھ بائیں آستین میں۔ (زاد المعاد)

ایاس بن جعفر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک رومال تھا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم وضو کرتے تو اسی سے پونچھ لیتے۔ (ابن سعود)

عمامہ باندھنا سنت مستحب ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عمامہ باندھنے کا حکم بھی نقل کیا گیا ہے فرمایا: ''عمامہ باندھا کرو اس سے حلم میں بڑھ جاؤ گے۔'' (فتح الباری)

لیکن آج کل یہ جو مشہور ہو رہا ہے کہ جو امام عمامہ نہ باندھے اس کے پیچھے نماز نہیں ہوتی یہ بات قرآن وسنت سے ثابت نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفید ٹوپی اوڑھا کرتے تھے وطن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفید کپڑے کی چپٹی ہوئی ٹوپی اوڑھا کرتے تھے۔ (السراج المنیر)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوزنی نما سلے ہوئے کپڑے کی گاڑھی ٹوپی بھی اوڑھی۔

(اسوہ رسول اکرمؐ بحوالہ السراج المنیر صفحہ ۱۲۴)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کی تہبند (پاجامہ وغیرہ) آدھی پنڈلی

تک ہونا چاہیے اوراس کے نیچے ٹخنوں تک بھی کچھ مضائقہ نہیں لیکن ٹخنوں سے نیچے جتنے حصہ پر لنگی (تہبند) لٹکے گی وہ آگ میں جلے گا اور جو شخص متکبرانہ کپڑے کو لٹکائے گا قیامت میں حق تعالیٰ شانہ اس کی طرف نظر بھی نہیں کریں گے۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ، زاد المعاد)

حضرت ابوسعید خدری فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب نیا لباس پہنتے تو جمعہ کے دن پہنتے۔



سر کے بال، کنگھا، تیل اور خضاب

﴿عن ابی ھریرۃؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من کان لہ شعر فلیکرمہ﴾ (رواہ ابوداؤد)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کے بال ہوں تو اسے چاہیے کہ ان کا اکرام کرے یعنی اچھی طرح رکھے۔''

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک کے بالوں کی لمبائی کانوں کے درمیان تک اور دوسری روایات میں کانوں اور تیسری قسم کی روایت کے مطابق کانوں کی لو تک تھی اور چند مرتبہ بال منڈانا بھی ثابت ہے۔

ان سب روایتوں کے بارے میں محدثین فرماتے ہیں کہ ان روایات میں کوئی تعارض نہیں اس لیے کہ بال بڑھنے والی چیز ہے۔ بال ترشوانے سے پہلے لمبے ہوتے تھے اور ترشوانے کے بعد چھوٹے ہوتے تھے۔ حضرت تھانویؒ کے خلیفہ مجاز حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ لکھتے ہیں کہ ''مواہب لدنیہ اور اس کے مطابق مجمع البحار میں مذکور ہے کہ جب بال ترشوانے میں طویل وقفہ ہو جاتا تو بال لمبے ہو جاتے اور جب ترشواتے تو چھوٹے ہو جاتے۔ اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بالوں کو ترشواتے تھے منڈاتے نہ تھے لیکن بال منڈوانے کے بارے میں خود فرماتے ہیں کہ آپ حج وعمرہ کے دو موقعوں کے سوا بال نہیں منڈواتے تھے (مدارج النبوۃ) (اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بعنوان، سر کے موئے مبارک) بالوں میں کنگھا کرنا سنت یا مستحب ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کنگھا کرنے کی ترغیب بھی فرمائی اور خود بھی اپنے بالوں میں کنگھا کیا کرتے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں میں کنگھا کرتی تھی۔ (شمائل ترمذی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وضو کرنے میں کنگھی کرنے میں جوتا پہننے میں دائیں طرف کو مقدم رکھتے تھے (شمائل ترمذی) یعنی پہلے دائیں جانب کنگھا کرتے تھے پھر بائیں جانب۔

آج کل بعض لوگ اس بات کو بہت پوچھ رہے ہیں کہ کیا ہر روز بالوں میں کنگھا کرنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے؟

اس بارے میں وضاحت یہ ہے کہ یہ حضرات جس روایت کو دلیل بناتے ہیں وہ ابوداؤد اور شمائل ترمذی میں موجود ہے اصل عبارت یہ ہے کہ

﴿عن عبداللہ بن مغفل قال نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الترجل الاغبا﴾ (رواہ ابوداؤد، شمائل ترمذی)

''شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ نے اس کا ترجمہ یہ فرمایا کہ ''حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کنگھی کرنے کو منع فرماتے تھے مگر گاہے گاہے (کبھی کبھی)''

اس کے بعد شیخ الحدیثؒ نے لکھا کہ ''قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ گاہے گاہے سے مراد تیسرا دن ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ یہ ممانعت جب ہے جب کہ کوئی ضرورت اس کی مقتضی نہ ہو ورنہ کچھ مضائقہ نہیں''۔ (خصائل نبوی شرح شمائل ترمذی صفحہ ۲۸)

حضرت ڈاکٹر عبدالحئیؒ صاحبؒ مدارج النبوۃ کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں کہ ''حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے کنگھی کیا کرتے تھے آپ جس کسی کے پراگندہ اور بکھرے ہوئے بال دیکھتے تو کراہت سے فرماتے کہ تم میں سے کسی کو وہ نظر آیا۔ اشارہ شیطان کی طرف ہے۔ اس طرح آپ بہت زیادہ بننے سنوارنے اور لمبے بالوں والے سے بھی کراہت فرماتے۔ اعتدال اور میانہ روی آپ کو بہت پسند تھی۔''

(اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بعنوان سر کے موئے مبارک)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سوتے وقت مسواک کرتے وضو کرتے اور سر کے بالوں

اور داڑھی مبارک میں کنگھا کرتے۔ (اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں ہوتے یا حضر میں ہمیشہ سوتے وقت آپ کے سرہانے سات چیزیں رکھی رہتیں۔ تیل کی شیشی، کنگھا، سرمہ دانی، قینچی، مسواک، آئینہ اور لکڑی کی ایک چھوٹی سی سیخ جو سر کھجانے کے کام آتی تھی۔ (زادالمعاد)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے داڑھی مبارک اور سر میں تیل لگاتے اور پھر کنگھا کرتے۔ (اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم)

ابن جریج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھی دانت کا کنگھا تھا جس سے آپ کنگھا کرتے تھے۔ (ابن سعد)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پانی لگا کر بھی داڑھی مبارک میں کنگھا کیا کرتے تھے۔ (اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم))

آپ جب آئینہ میں چہرہ انور کو دیکھتے تو یہ الفاظ زبان مبارک پر ہوتے:

﴿اللھم حسنت خلقی فحسن خلقی واوسع علی فی رزقی﴾

''اے اللہ جس طرح تو نے میری تخلیق کو بہتر بنایا ایسے ہی میرے خلق یعنی عادت کو بہتر بنا اور میرے رزق میں وسعت دے۔''

(نشر الطیب، شمائل ترمذی)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب سر میں تیل لگانے کا ارادہ فرماتے تو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی میں تیل رکھتے اور پہلے ابروؤں میں تیل لگاتے پھر آنکھوں پر پھر سر پر تیل لگاتے۔ (زادالمعاد)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سر مبارک میں اکثر تیل کا استعمال فرماتے تھے اور اپنی داڑھی میں اکثر کنگھی کیا کرتے تھے اور اپنے سر مبارک پر ایک کپڑا ڈال لیا کرتے تھے جو تیل کے کثرت استعمال سے ایسا ہوتا تھا جیسے تیل والے کا کپڑا۔ (شمائل ترمذی۔ زادالمعاد)

اس حدیث کی تشریح میں حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب لکھتے ہیں کہ ''تیل

سے چونکہ کپڑے خراب ہو جاتے ہیں جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظافت کے خلاف ہے اس لیے اس کی حفاظت کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک کپڑا سر پر ڈال لیتے تھے کہ عمامہ وغیرہ خراب نہ ہو۔ (خصائل نبوی صفحہ ۲۷)

قتادہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم خضاب کرتے تھے انہوں نے فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں کی سفیدی اس مقدار ہی کو نہ پہنچی تھی کہ خضاب کی نوبت آتی۔ سفیدی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف دونوں کنپٹیوں میں تھوڑی سی تھی البتہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حنا اور کتم کا خضاب فرمایا کرتے تھے۔ (شمائل ترمذی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں کو خضاب کیا ہوا دیکھا۔ (شمائل ترمذی)

محدثین لکھتے ہیں کہ یہ دونوں روایتیں صحیح مان لی جائیں تو مختلف اوقات پر محمول ہو سکتی ہیں۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

”ان ہی روایات مختلفہ کی بنا پر علماء میں بھی اختلاف ہوا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خضاب فرمایا یا نہیں۔ اکثر حضرات کے نزدیک امام ترمذیؒ کا میلان خضاب نہ کرنے کی طرف ہے، حنفیہ بھی اسی طرف مائل ہیں چنانچہ درمختار میں اس کی تصریح موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خضاب نہ کرنا زیادہ صحیح ہے اور علامہ شامیؒ نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی اور سر مبارک میں بخاری وغیرہ کی روایت کے موافق صرف سترہ بال سفید تھے۔

بیجوری شافعی شارح شمائل ترمذی اس کے قائل ہوئے کہ آپ نے کبھی کبھی خضاب فرمایا اکثر نہیں کیا۔

مسئلہ یہ ہے کہ علماء حنفیہ کے نزدیک خضاب مستحب ہے لیکن مشہور قول کے موافق

سیاہ خضاب مکروہ ہے اور علماء شافعیہ کے نزدیک خضاب سنت ہے مگر سیاہ خضاب حرام ہے۔‘‘
(خصائل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ۳۲)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حنا اور کتم سے خضاب فرمایا کرتے تھے اس کے بارے میں حضرت مولانا زکریا صاحب لکھتے ہیں کہ:

کتم ایک گھاس کا نام ہے جس سے خضاب کیا جاتا ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ صرف کتم کا خضاب سیاہ ہوتا ہے اور مہندی کے ساتھ ملا کر سرخ ہوتا ہے اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ صرف کتم کا خضاب سبز (سبزی مائل) ہوتا ہے اور مہندی ملا کر مائل بسیاہی ہو جاتا ہے ملا علی قاری کہتے ہیں کہ غلبہ کا اعتبار ہوتا ہے اگر غلبہ کتم کا ہوتا ہے تو خضاب سیاہ ہو جاتا ہے اور اگر غلبہ مہندی کا ہوتا ہے تو سرخ۔ الغرض خضاب دونوں سے جائز ہے مگر سیاہ نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ سیاہ خضاب کی ممانعت احادیث سے ثابت ہے۔ (خصائل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم صفحہ ۲۹)

اس لیے آج کل بازار میں جو خضاب ملتے ہیں ان میں بھی غور کر لیا جائے کہ جو بالوں کو بالکل سیاہ کر دیتا ہے اس سے بچا جائے اور جو نسواری اور براؤن کر دے تو اس کی گنجائش ہے۔



اہل و عیال پر خرچ کرنا بھی صدقہ ہے

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

﴿عن ابی مسعود رضی اللّٰہ عنہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا انفق المسلم نفقۃ علی اھلہ وھو یحتسبھا کانت لہ صدقۃ﴾ (متفق علیہ)

حضرت ابومسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’جو مسلمان اپنے اہل و عیال پر کچھ خرچ کرتا ہے اور

اسے ثواب کا کام سمجھتا ہے تو اس کا یہ خرچ کرنا اس کے لیے صدقہ ہے۔“

اللہ رب العزت نے انسان کو عبادت کے لیے پیدا فرمایا اور پھر زندگی گزارنے کا ایسا سلیقہ اور ایسے آداب سکھائے کہ انسان کی زندگی کا ہر مرحلہ عبادت بن جائے۔

انسان جب مل جل کر زندگی گزارتا ہے تو ظاہر ہے کہ اسے اپنی بیوی بچوں کے لیے رہائش، کھانا، لباس اور دیگر ضروریات زندگی کا بھی انتظام کرنا ہے' اللہ تعالیٰ نے اس عمل کو بھی نیکی اور صدقہ شمار فرمایا۔ یہاں تک کہ صحیح مسلم کی ایک روایت جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اس میں ارشاد نبوی ہے ایک دینار وہ جو کہ تم اللہ کے راستہ میں خرچ کرو اور ایک دینار وہ جسے تم غلام آزاد کرنے میں خرچ کرو، ایک دینار وہ جو تم کسی مسکین کو خیرات کرو اور ایک وہ دینار جو تم اپنے اہل وعیال پر خرچ کرو تو ان سب دیناروں میں سے اجر وثواب کے اعتبار سے زیادہ بڑا دینار وہ ہے جو تم اپنے اہل وعیال پر خرچ کرو۔

یہاں لفظ صدقہ کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ قرآن وسنت میں لفظ صدقہ، زکوٰۃ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور خیرات کے لیے بھی اور عام نیکی کے معنی میں بھی، چنانچہ صدقہ سے مراد اگر زکوٰۃ یا خیرات ہو تو ایسا مال خاص مستحق افراد کو دینے کی ہدایت دی گئی ہے، سورۂ توبہ کی آیت ۶۰ میں اللہ تعالیٰ نے آٹھ صارف بیان فرمائے ہیں لیکن یہاں اس حدیث میں اہل وعیال پر خرچ کرنے کو جو صدقہ کہا گیا ہے اس سے مراد عام نیکی کا کام ہے۔

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق اہل وعیال پر خرچ کرنا صدقہ ہے تو پھر ایک اور ارشاد نبوی بھی ذہن میں رہنا چاہیے۔

﴿لا یقبل اللّٰہ الا الطیب﴾

”یعنی اللہ تعالیٰ صرف پاکیزہ اور حلال چیز کو قبول فرماتا ہے۔“

لہٰذا انسان اگر حلال مال سے اپنے اہل وعیال پر خرچ کرے تو یہ صدقہ شمار ہوگا اس

لیے کہ صرف وہی صدقہ قبول ہوتا ہے جو حلال مال سے ہو۔

صحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کے آداب کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا:

﴿خیر الصدقه ماکان عن ظهر غنی وابدأ من تعول﴾

اس ارشادِ نبوی میں یہ سمجھایا گیا کہ صدقہ کا مال اس انداز سے دو کہ تم خود فقیر اور مفلس نہ بن جاؤ بلکہ کچھ غناء، باقی رہے، یعنی اپنے اہل وعیال کی ضروریات زندگی کے بقدر مال واسباب رکھ لو اس کے بعد جو کچھ بچ رہے اسے خدا کے نام پر خیرات کر دو اور پھر خیرات کرنے میں یہ بھی بات پیش نظر رہے کہ صدقہ کا مال پہلے ان لوگوں کو دو جن کی ضروریات زندگی تمہاری ذات سے وابستہ ہیں۔

اہل وعیال کی ضروریات کہاں تک پورا کرنا نیکی ہے اس کے لیے قرآن حکیم سے ایک اصول تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ

﴿کلوا واشربوا ولا تسرفوا﴾

''کھاؤ پیو لیکن فضول خرچی نہ کرو۔''

انسان کے پاس جس قدر آمدنی کے وسائل ہوں ان کے ذریعہ حلال مال کما کر اہل وعیال پر خرچ کرتا رہے لیکن اس خرچ میں بھی اعتدال اور میانہ روی شامل رہے، سورۃ الفرقان میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کے اوصاف بیان فرماتے ہوئے یہ خوبی بھی بیان فرمائی:

﴿والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذالك قواما﴾

''اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں کہ جب وہ خرچ کریں تو نہ فضول خرچی کریں اور نہ تنگی کریں بلکہ ان کا خرچ اس کے درمیان اعتدال کے ساتھ ہوتا ہے۔''

اس سے انسان کو ایک طرف تو سکون ملے گا اور دوسری طرف بیوی بچوں کے اندر

قناعت پسندی پیدا ہو گی جو آئندہ چل کر اولاد کی تربیت کا حصہ بن جاتی ہے کہ وہ اولاد خود بھی فضول خرچی سے بچتی ہے لہٰذا انسان اپنے اہل وعیال کے لیے رہائش میں خرچ کرے، ان کے کھانے، پینے، لباس کے لیے خرچ کرے اور پھر اللہ توفیق دے تو ان کے لیے آسائش بھی مہیا کرے یعنی گھریلو سہولیات کا انتظام کرے جس سے زندگی آرام و راحت سے گزرے اور اسلام نے جائز حد تک زیب و زینت اختیار کرنے کی بھی اجازت دی ہے اس لیے اہل و عیال پر شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے آرائشکی مد میں بھی خرچ کر سکتا ہے۔ الغرض انسان اپنے اہل وعیال کی رہائش، آسائش اور آرائش پر تو خرچ کر سکتا ہے لیکن ایک چیز سے اسلام نے قطعی طور پر روکا ہے اور وہ ہے نمائش، دکھاوا۔ دوسروں کے اہل وعیال پر اپنے اہل وعیال کی امارت اور اپنی دولت ظاہر کرنا۔ قرآن وسنت میں اس سے سختی سے منع فرمایا گیا ہے۔

دور جدید میں نمود و نمائش ایک ایسی بیماری جس کی خاطر انسان حلال وحرام کی تمیز کیے بغیر دولت کے حصول میں سرگرداں ہے اور اس ریتلے، تپتے سراب زدہ صحراء کا کوئی کنارہ نہیں ہے جس کا نتیجہ بے سکونی اور جرائم کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

فلاں کے بچے ایسے کپڑے پہنتے ہیں میں اپنے بچوں کو اس سے بڑھ کر پہناؤں گا' فلاں کے اہل وعیال کے پاس ایسی سواری، میں اس سے عمدہ سواری لاؤں گا۔ یہ دوڑ نہ ختم ہونے والی ریس ہے اس لیے اسلام نے ہمیں قناعت، صبر اور شکر کی تعلیم دی۔ بس انسان حلال مال کمانے کی فکر کرے اور اہل وعیال پر فضول خرچی اور نمائش کے جذبہ سے پاک ہو کر خرچ کرے اور ہر وقت اہل وعیال کے اندر اخلاقی اوصاف پیدا کرنے کی فکر رکھے بیوی بچوں پر خرچ کرنے کے دوران اگر بے جا فرمائشیں کرنے کا جذبہ نظر آنے لگے تو انہیں اپنے سے کمتر افراد کا سامنا کرائے اور پھر اللہ کا شکر ادا کرنے کی تعلیم دے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اولاد کو بالکل اس طرح تعلیم دی۔ دربار نبوی میں چند غلام آئے آپ کی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے گزارش آئی کہ ایک غلام کام کاج کرنے کے لیے عطا فرما دیں، اس لیے کہ کام کرتے کرتے ہاتھوں پر نشان اور

پانی کا مشکیزہ لادنے سے کندھوں پر نشان پڑ گئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے بیٹی فاطمہ! کیا میں تمہیں غلام اور یہ دنیا اور جو کچھ اس دنیا میں ہے اس سے بہتر چیز نہ دوں؟ عرض کیا ضرور فرمایا جب تم بستر پر لیٹا کرو تو ۳۳ بار سبحان اللہ، ۳۳ بار الحمدللہ اور ۳۴ بار اللہ اکبر کہہ لیا کرو غور فرمایئے! بیٹی نے ملازم کام کرنے کے لیے مانگا لیکن جواب میں باپ نے مشفقانہ انداز میں کتنی عمدہ تربیت فرمائی۔

اہل وعیال پر خرچ کرنے کے بعد ان کو جتلانا نہیں چاہیے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿یایھا الذین امنوا لا تبطلوا صدقاتکم بالمن الاذی﴾

”اے ایمان والو! تم اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور تکلیف پہنچا کر ضائع نہ کرو۔“

اہل وعیال پر خرچ کرنے کے دوران یہ بات بھی معاشرہ میں سامنے آتی ہے کہ لوگ بیٹوں کو بیٹیوں پر ترجیح دیتے ہیں ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے لیے جنت کی بشارت دی ہے جو اپنی بیٹیوں کو بیٹوں پر ترجیح دیتا ہے۔ لہٰذا انسان معاشرہ میں رہتے ہوئے اپنے اہل وعیال پر خرچ تو کرتا ہی ہے لیکن اگر یہ خرچ قرآن وسنت کی ان تعلیمات کے ساتھ ثواب سمجھ کر کیا جائے تو یہی اجر وثواب کا باعث ہوگا۔ اور سورۂ فرقان میں اللہ تعالیٰ نے جو دعا سکھائی ہے وہ اپنے بیوی بچوں کے لیے خوب مانگے۔

﴿ربنا ھب لنا من ازواجنا وذریتنا قرۃ اعین واجعلنا للمتقین اماما﴾

”اے اللہ ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں متقین کا راہنما بنا دے۔“

واخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

☆☆☆

ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حقوق

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم

﴿عن ابی هریرة رضی اللّٰه عنه قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم للمومن علی المومن ست خصال یعوده اذا مرض، ویشهده اذامات، ویجیبه اذا دعاه ویسلم اذا لقیه، ویشمته اذا عطس وینصح له اذاغاب اوشهد﴾

(رواہ فی جامع الاصول بروایۃ النسائی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' مسلمان کے مسلمان پر چھ حق ہیں۔ایک حق تو یہ ہے کہ جب کوئی مسلمان بیمار ہوتو دوسرا مسلمان اس کی عیادت کرے' دوسرا حق یہ ہے کہ جب کوئی مسلمان انتقال کر جائے تو دوسرا مسلمان اس کی نماز جنازہ میں شریک ہو' تیسرا حق یہ ہے کہ جب کوئی مسلمان کھانے کی دعوت دے تو دوسرا مسلمان اسے قبول کر لے' چوتھا حق یہ ہے کہ جب کوئی مسلمان ملے تو اس کو سلام کرے' پانچواں حق یہ ہے کہ جب کوئی مسلمان چھینکے تو اس کا جواب یرحمک اللہ کہہ کر دے اور چھٹا حق یہ ہے کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے ہر حالت میں خیر خواہی کرے

چاہے دوسرا مسلمان موجود ہو یا نہ ہو۔''

ہر سمجھدار انسان معاشرہ میں رہتے ہوئے سوچتا ہے کہ مجھے ایک اچھے انسان کی طرح معاشرہ میں رہنا چاہیے اور یہ فکر اسے لاحق رہتی ہے کہ میں کون سے ایسے کام کروں کہ لوگ مجھ سے محبت کریں' مجھے اچھا سمجھیں، اسی فکر میں انسان مختلف طریقے اختیار کرتا ہے کبھی بہت قیمتی لباس، قیمتی سواری استعمال کرتا ہے، کبھی دوست واحباب کی لمبی چوڑی دعوتیں کرتا ہے' اپنی چیزوں کی نمائش کرتا ہے' بڑوں بڑوں سے اپنے تعلقات بیان کر کے دوسروں پر ایک تاثر قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

لیکن یہ تمام طریقے معاشرہ میں محبت و الفت کی فضا قائم کرنے کی بجائے مزید باہمی نفرت اور حسد و بغض جیسے منفی جذبات کی راہ پر ڈال دیتے ہیں اس لیے کہ محبت اور باہمی ہمدردی کے جذبات تو صرف ان طریقوں سے پیدا ہو سکتے ہیں جن کی تعلیم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی۔

خصوصاً اس حدیث مبارکہ میں ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر جو چھ حقوق بیان کیے گئے ہیں اگر صرف انہی حقوق کی ادائیگی معاشرہ میں عام ہو جائے تو محبت والفت کی فضا مہک اٹھے گی۔ان میں سے پہلا حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ جب کوئی مسلمان بیمار ہو جائے تو دوسرے مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کی بیمار پرسی کے لیے جائے اور یہ کتنا مقدس کام ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی شام کو عیادت کرتا ہے تو صبح تک فرشتے اس کی مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنے دین اور اپنی جان کے دشمن یہودیوں کی بھی بیمار پرسی کے لیے تشریف لے جاتے تھے۔

آخرت کے ثواب کے ساتھ ساتھ مریض کی عیادت سے یہ بھی فائدہ ہوتا ہے کہ ہمدردی اور غمگساری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے مریض کی دلجوئی ہو جاتی ہے۔ بسا اوقات مریض کی ضروریات دیکھ کر عیادت کرنے والا کھانا اور ادویات مہیا کرنے میں تعاون کر دیتا ہے مالی

تعاون کرتا ہے اور اس طرح مریض کی مشکلات میں کمی آجاتی ہے اور دوسری طرف مریض اور بیمار پرسی کرنے والے کے درمیان اخوت ومحبت کے پُرخلوص جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

دوسرا حق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمایا کہ جب کوئی مسلمان فوت ہو جائے تو دوسرے مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس کی تجہیز وتکفین میں تعاون کرے اور اس کی نماز جنازہ میں شریک ہو۔ بخاری شریف کی کتاب الایمان میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے ایمان واخلاص کے ساتھ کسی مسلمان کے جنازہ میں شرکت کی نماز جنازہ اور دفن تک شریک رہا تو اسے دو قیراط اجر ملے گا جن میں سے ہر قیراط احد پہاڑ کے برابر ہوگا۔

تیسرا حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ اگر کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کو دعوت دیتا ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ دعوت قبول کرلے۔ معاشرہ میں اس حق کی ادائیگی میں دو طرح رکاوٹ پیش آئی۔ ایک طرف تو دعوتوں میں سادگی کی جگہ تکلف نے لے لی اور دوسری طرف اخلاص کی جگہ نمود ونمائش آگئی' تکلفات اور نمود ونمائش نے دعوتوں کی افادیت کو ختم کر کے رکھ دیا۔ جس دعوت کے قبول کرنے کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا اس کا فائدہ تو یہ تھا کہ مسلمانوں کے درمیان محبت بڑھتی تھی اور آپس میں قرب بڑھ جاتا تھا کدورت اور رنجش ختم ہو جاتی تھی۔ لوگ ایک دوسرے کے خیر خواہ بن جاتے، بخل کا مرض ختم ہو جاتا اور پُرخلوص معاشرتی تعلقات استوار ہو جاتے۔ اب دعوتیں کسی نہ کسی دنیاوی مقصد کے حصول پر دی جاتی ہیں جس کے نتیجہ میں وہ مفید نتائج نظر نہیں آتے۔

چوتھا حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمایا کہ جب کوئی مسلمان دوسرے مسلمان سے ملے تو اسے چاہیے کہ دوسرے کو سلام کرے۔ ارشاد نبوی ہے:

﴿البادی بالسلام برٌ من الکبر﴾

''سلام میں پہل کرنے والا تکبر سے پاک ہوتا ہے۔''

معاشرہ میں عموماً یہ نظر آتا ہے کہ ہر وہ شخص جو عمر میں، مال میں، علم میں یا مرتبہ میں بڑا ہو وہ چاہتا ہے کہ لوگ اسے سلام کریں اور وجہ بنیادی تکبر میں مبتلا ہونا ہے اور پھر متکبر شخص

کو لوگ سلام بھی کریں تو وہ سلام محبت کی بنا پر نہیں ہوتا۔ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہ کرام سے فرمایا کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں کہ جب تم اسے کرو تو تمہارے درمیان محبت پیدا ہو جائے پھر فرمایا تم آپس میں سلام خوب کیا کرو اس لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف تو یہ تعلیم دی کہ تکبر کو ختم کرنے کے لیے پہلے خود سلام کر دیجیے اور ادب سکھاتے ہوئے یہ سکھایا کہ ادب کے خیال سے چھوٹا بڑے کو سلام کرے، گزرنے والا بیٹھے ہوئے کو، اور چھوٹی جماعت بڑی جماعت کو' سوار پیدل کو سلام کرے۔

پانچواں حق ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر یہ بیان فرمایا کہ جب کسی شخص کو چھینک آئے تو چھینکنے والا الحمدللہ کہے اور دوسرا مسلمان یرحمک اللہ کہے۔ یعنی اللہ تجھ پر رحم کرے لیکن اگر کسی شخص کو نزلہ زکام کی وجہ سے زیادہ چھینکیں آ رہی ہوں تو پھر یہ جواب دینے کا حق ضروری نہیں رہتا۔

چھٹا حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سکھایا کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے خیر خواہی کرے چاہے وہ دوسرا مسلمان سامنے موجود ہو یا موجود نہ ہو۔

معاشرہ میں عام طور پر جب دوسرا شخص موجود ہوتا ہے تو پھر اس کو خوش کرنے کے لیے اس کے منہ پر اس کی خوب تعریف کی جاتی ہے اس کو خوشامد کہہ لیجیے یا چاپلوسی، لیکن اس کے جانے کے بعد اس کی برائیاں شروع ہو جاتی ہیں جب اس انسان کو پتہ چلتا ہے کہ میری غیر موجودگی میں میرے ساتھ یہ سلوک کیا گیا تو یقین جانئے کہ اب اس انسان کے دل میں دوسرے مسلمان بھائی کی قدر و منزلت خاک میں مل جاتی ہے۔

اس لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم دی کہ رشتہ اخوت کو مضبوط کرنے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے بھلا چاہے۔ کسی مسلمان کو پتہ چلے کہ میرا مسلمان بھائی میری غیر موجودگی میں میرے لیے بھلائی چاہتا ہے تو پھر اس کے دل میں محبت کے انمٹ نقوش پیدا ہو جاتے ہیں۔

اللہ رب العزت ہمیں یہ تمام حقوق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

تکبر کا ایک بہترین علاج

﴿عن عبداللّٰہ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال البادیٔ بالسلام بریٔ من الکبر﴾(رواہ البیھقی فی شعب الایمان)

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''سلام میں پہل کرنے والا تکبر سے پاک ہو جاتا ہے۔''

تکبر میں مبتلا ہونے والے شخص کو اللہ تعالیٰ بھی پسند نہیں فرماتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس شخص کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں نہیں جائے گا۔

تکبر کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو کمال اور صفات میں دوسروں سے زیادہ سمجھے، ظاہر ہے کہ جب انسان کا اپنے متعلق ایسا خیال ہوتا ہے تو پھر تکبر کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں مثلاً راستہ میں دوسروں سے آگے قدم رکھنا، مجلس میں اہم جگہ بیٹھنے کی کوشش کرنا، دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھنا، اگر کوئی سلام کرنے میں پہل نہ کرے تو اس پر غصہ ہونا، کوئی تعظیم نہ کرے تو ناراض ہونا، کوئی نصیحت کرے تو ناراضگی کا اظہار کرنا' حق بات معلوم ہونے کے بعد بھی اسے نہ ماننا۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب اربعین میں لکھا ہے کہ تکبر کی وجہ سے حق بات کے انکار کی نوبت آ جاتی ہے اس لیے تکبر کرنے والے کے لیے دینی سعادت کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور متکبر شخص اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے اور یہ بات اللہ تعالیٰ کو انتہائی ناگوار ہوتی ہے۔ امام غزالیؒ نے مزید یہ لکھا ہے کہ تکبر کرنے والا تواضع سے محروم رہتا ہے، ایسا شخص حسد اور غصہ میں ہر وقت مبتلا رہتا ہے' ریاکاری یعنی نمود و نمائش اور دکھلاوا اس کی زندگی کا مقصد بن جاتا ہے' دوسروں سے شفقت اور مہربانی کا سلوک اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ دوسرے مسلمان بھائی کی خیر خواہی اس سے ہو ہی نہیں سکتی۔ یقین جانئے ایسے شخص سے لوگ بھی محبت نہیں کرتے اور اگر ظاہری طور پر اس کا احترام

کرتے نظر آئیں تو صرف اس شخص کے شر سے بچنے کی خاطر اس کی تعظیم کرتے ہوں گے۔

جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایسے اصول سکھائے ہیں جن کی بدولت ایک انسان کی سچی محبت دوسرے کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم جنت میں داخل نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ تم ایمان لاؤ اور تم ایمان نہیں لا سکتے یہاں تک کہ تم آپس میں محبت کرنے لگو'' پھر فرمایا:

﴿اولا ادلکم علی شئی اذا فعلتم تحاببتم﴾

''کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں کہ جب تم اسے کرنے لگو تو آپس میں محبت ہو جائے۔''

پھر فرمایا:

﴿افشوا السلام بینکم﴾

''تم اپنے درمیان سلام کو پھیلاؤ''

لیکن سلام کو پھیلانے میں ایک بڑی رکاوٹ تکبر ہے جس کی وجہ سے انسان دوسرے کو سلام نہیں کرتا اور یہ سوچتا ہے کہ میں بڑا ہوں اس لیے لوگ مجھے سلام کریں۔ اور یہ خیال عموماً چار باتوں کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے علم کی وجہ سے دوسرے تقویٰ اور پرہیز گاری کی وجہ سے اور تیسرے حسب ونسب یعنی بڑے خاندان سے تعلق ہونے کی بنا پر اور چوتھے مال و جمال پر۔

لیکن انسان ان چیزوں کے ہوتے ہوئے اگر ان طریقوں پر بھی عمل کرے جن سے تکبر ختم ہو جاتا ہے تو پھر علم، تقویٰ، حسب ونسب اور مال و جمال یہ سب اللہ کی عطا کردہ نعمتیں خیر کا باعث بن جاتی ہیں لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تکبر کا آسان علاج یہ بیان فرمایا کہ ''سلام میں پہل کر لیا کرو تکبر سے محفوظ رہو گے۔''

انسانی جذبات اور اس کی سوچ کچھ اس طرح کی ہے کہ کبھی بھی انسان بہتر حالت میں ہو تو وہ اپنے سے کم حالت والے شخص کو حقیر سمجھ بیٹھتا ہے۔ سواری پر سوار شخص پیدل چلنے

والے کو کبھی کبھی حقیر سمجھ بیٹھتا ہے اور پھر اگر اس کی سواری دوسرے کی سواری سے بہتر ہے تو کبھی کبھی اس وقت بھی سوچ کا رخ تکبر کی طرف مڑ جاتا ہے اسی وجہ سے پیدل چلنے والوں کو بسا اوقات راستے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور سواریوں والے آپس میں قلبی تعلق محسوس نہیں کرتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے انسانی جذبات کی خوب اصلاح فرمائی فرمایا:

﴿یسلم الراکب علی الماشی والماشی علی القاعد والقلیل علی الکثیر﴾

”یعنی سوار پیدل کو سلام کرے اور پیدل چلنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے اور تھوڑے افراد زیادہ کو سلام کریں۔“

معلوم ہوا کہ جب سوار پیدل چلنے والے کو سلام کرے گا تو اس کے دل میں اول تو تکبر کا خیال نہ رہے گا اور دوسرے یہ کہ پیدل چلنے والے کے دل میں محبت پیدا ہو جائے گی۔ اب ایسا تو نہیں ہوگا کہ سوار شخص پیدل چلنے والے کو سلام کرے اور وہ راستہ نہ دے بلکہ یہ پیدل چلنے والا سوار کے حقوق کا یقیناً تحفظ کرے گا۔

اس لیے کہ جب انسان دوسرے کو سلام کرتا ہے تو کہتا ہے السلام علیکم، یعنی تم پر سلامتی ہو یہ دراصل دوسرے انسان کے لیے سلامتی کی دعاء مانگ رہا ہوتا ہے اب ایک طرف وہ دوسرے مسلمان کے لیے دعاء مانگے اور دوسری طرف وہ اسے تکلیف پہنچائے یہ کیسے ممکن ہے۔

چنانچہ ایک طرف تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام میں پہل کر کے تکبر سے بچنے کی تعلیم دی اور دوسری طرف چھوٹوں کو بھی یہ تعلیم دی کہ وہ بڑوں کو سلام کیا کریں۔

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿یسلم الصغیر علی الکبیر﴾

”یعنی چھوٹے کو چاہیے کہ وہ بڑے کو سلام کرے۔“

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ سلام کرنا سنت ہے اور سلام میں پہل کرنا سنت ہے اور سلام میں پہل کرنے کے فضائل بھی تفصیل سے معلوم ہوئے لیکن اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء کی آیت ۸۶ میں فرمایا:

﴿و اذاحییتم بتحیۃ فحیوا باحسن منھا اوردوھا﴾

"اور جب تمہیں سلام کیا جائے تو تم اس سے بہتر طریقے سے سلام کرو یا اسی کو لوٹا دو۔"

یہاں اللہ تعالیٰ نے **فحیوا** اور **ردوھا** امر کے صیغے استعمال فرمائے اس سے معلوم ہوا کہ سلام کا جواب دینا واجب یعنی انتہائی ضروری ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص نے کہا السلام علیکم اور دوسرے شخص نے بھی آگے سے کہا السلام علیکم۔ اب دونوں نے سلام کر دیا حالانکہ جس شخص نے پہلے سلام کیا اس نے سنت پر عمل کیا اب دوسرے شخص پر سلام کا جواب دینا واجب ہوا لہٰذا اسے چاہیے کہ کہے وعلیکم السلام۔

سلام کرنے میں بھی جس قدر خلوص کا اظہار ہو اس قدر سلام کرنے والے میں تکبر کم ہو جاتا ہے اور جسے سلام کیا جائے اس کے دل میں اس کے بقدر محبت پیدا ہوتی ہے اور نیکیوں میں اضافہ کا باعث بھی بنتا ہے۔ جیسا کہ ترمذی اور ابوداؤد میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا کہا السلام علیکم۔ آپ نے جواب دیا اور پھر فرمایا اس کے لیے دس نیکیاں ہیں پھر ایک اور شخص آیا اس نے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ تو آپ نے اس کا بھی جواب دیا اور فرمایا کہ اس کے لیے بیس نیکیاں ہیں پھر ایک اور شخص آیا اس نے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ تو آپ نے اس کا بھی جواب دیا اور فرمایا اس کے لیے تیس نیکیاں ہیں۔

لہٰذا جب بھی انسان سلام کرے تو پرخلوص انداز میں سلام کرے اس سے جہاں نیکیوں میں اضافہ ہوگا وہاں آپس میں محبت و الفت کی فضا پیدا ہو جائے گی اور جب معاشرہ میں علم وتقویٰ، حسب ونسب اور مال و جمال میں بہتر ہونے کے باوجود خود پہلے سلام کرنے کی

عادت اپنا لے تو ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق یقیناً وہ انسان تکبر جیسی چیز سے محفوظ رہے گا۔ اللہ رب العزت ہم سب کو تکبر اور دیگر اخلاقی برائیوں سے محفوظ فرمائے اور ہم سب کے دلوں سے باہمی نفرتیں اور رنجشیں مٹا کر ایک دوسرے کا احترام اور ایک دوسرے سے محبت رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

واخر دعوانا ان الحمد اللّٰہ رب العالمین



دعاء مانگنے کا مسنون طریقہ

﴿عن ابی هریرة رضی اللّٰه عنه ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال یستجاب لا حدکم مالم یعجل، یقول قد دعوت ربی فلم یستجب لی﴾ (متفق علیه)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے ہر ایک کی دعا قبول ہو جاتی ہے جب تک کہ وہ جلد بازی نہ کرے (اور جلد بازی کا مطلب یہ ہے کہ) وہ کہتا ہے میں نے اپنے رب سے دعاء مانگی لیکن میری دعاء قبول نہیں ہوئی۔''

دعاء عربی زبان کا لفظ ہے اس کا معنی ہے پکارنا۔عموماً یہ لفظ کسی حاجت یا ضرورت کے وقت پکارنے میں استعمال ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو دعا مانگنے کا حکم دیا یہ اس امت کا خاص اعزاز ہے ورنہ حضرت کعب احبار کی روایت کے مطابق پہلے زمانہ میں یہ خصوصیت انبیاء کی تھی۔انبیاء لوگوں کے لیے دعاء کرتے اللہ تعالیٰ قبول فرماتا اور امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ حکم تمام امت کے لیے عام کر دیا گیا ہے اب ہر شخص دعاء مانگے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ارشاد نبوی منقول ہے:

﴿ان الدعاء سلاح المومن﴾

''یعنی دعاء مومن کا ہتھیار ہے۔''

ہتھیار صحیح کام تب ہی دکھاتا ہے جب ہتھیار بھی تیز ہو اور چلانے والا بھی طاقتور ہو۔

دعاء طاقتور کیسے بنے اس کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ آداب

سکھائے اور دعاؤں کے الفاظ سکھائے' جو مسنون دعائیں کہلاتی ہیں اور دعا مانگنے والا کیسے طاقتور بنے اس کے لیے دعاء مانگنے کے مسنون طریقے سکھائے۔

دعاء مانگنے کا اصل اصول اللہ تعالیٰ نے سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۵۵ میں بیان فرمایا:

﴿ادعوا ربکم تضرعا وخفیة انه لا یحب المعتدین﴾

''یعنی تم اپنے رب سے دعاء کیا کرو عاجزی کے ساتھ اور پوشیدہ طریقہ سے۔ بے شک اللہ تعالیٰ حد سے آگے بڑھنے والے کو پسند نہیں فرماتا۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ دعاء کرنے والا خشوع اور خضوع یعنی عاجزی اور اللہ کے دھیان کے ساتھ دعا مانگے اور دوسرا ادب یہ معلوم ہوا کہ آہستہ آواز سے دعاء کرے لیکن اگر عام مقتدی دعاؤں سے ناواقف ہوں تو پھر امام کے لیے اونچی آواز سے دعاء مانگنے میں کوئی حرج نہیں دعا کے طاقتور بنانے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ دعائیں مانگی جائیں جو قرآن مجید میں انبیاء کرام نے دعائیں مانگیں اللہ تعالیٰ نے ان کی وہ دعائیں قبول فرمائیں۔ یا احادیث میں جو دعائیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھائی ہیں وہ مانگی جائیں۔

لیکن قرآن وحدیث کے عربی جملے جن میں دعائیں ہیں اگر ان کا ترجمہ اور مطلب آتا ہو تو پھر وہی دعائیں مانگنا افضل اور بہتر ہے۔ لیکن عام حالات میں اگر ان دعاؤں کا مطلب معلوم نہ ہو تو پھر مانگنے والے کو تو معلوم نہیں کہ ان جملوں سے ہم اللہ سے کیا مانگ رہے ہیں اب ان دعاؤں کے پڑھنے کا ثواب تو ضرور ملے گا لیکن اسے دعاء مانگنا نہیں کہیں گے بلکہ دعاء پڑھنا کہیں گے۔

دراصل دعاء مانگنے کا مقصد اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجات اور ضروریات کا سوال کرنا ہے صرف مخصوص کلمات پڑھنا اصل مقصد نہیں اور یہ جب ہوگا کہ ان دعاؤں کا ترجمہ آتا ہو اور اگر برکت کے لیے ان کلمات کو پڑھ لے اور اپنی ضروریات کو اپنی زبان میں مانگ لے تو یہ زیادہ بہتر ہے تنہائی میں کوئی شخص جتنی چاہے لمبی دعائیں مانگے، خوب دیر تک دعائیں مانگے یہی پسندیدہ بات ہے لیکن جب امام جماعت کے ساتھ دعاء مانگے تو مختصر دعا ہونی چاہیے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو فرض نمازوں کے بارے میں یہ حکم دیا کہ جب تم امام بن کر نماز پڑھو تو ہلکی نماز پڑھو کیونکہ مقتدیوں میں بیمار ضعیف اور ضرورت مند بھی ہوتے ہیں۔

امام کے لمبی دعاء مانگنے کی صورت میں ضرورت مند شخص اٹھ کر واپس جانا چاہے تو صفیں چیر کر لوگوں کے کاندھے پھلانگ کر نکلے گا اور یہ دوسرے نمازیوں کے لیے تکلیف کا باعث ہوگا۔

صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب فرض نماز کے بعد سلام پھیر لیتے تو صرف اتنی دیر بیٹھتے کہ یہ دعاء پڑھ لیں:

﴿اللھم انت السلام و منك السلام تبارکت و تعالیت یا ذاالجلال والاکرام﴾

دعا مانگتے وقت ہاتھ اٹھانے کے بارے میں مسنون طریقہ یہ ہے کہ دعا کے وقت ہر حال اور ہر وقت میں چاہے نماز کے بعد ہو یا کوئی اور وقت ہاتھ اٹھانا مستحب ہے، جب کہ دعا کے الفاظ کوئی حاجت اور ضرورت مانگنے کی نیت سے پڑھے لیکن جب دعائیں پڑھنے سے ذکر مسنون ہو جیسے صبح و شام کی دعائیں جاگنے اور سونے کی دعائیں مسجد میں آنے اور واپس جانے کی دعائیں، کھانا کھانے کی، لباس پہننے کی دعائیں تو ان دعاؤں میں ہاتھ اٹھانا مسنون نہیں ہے۔

احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر امام نماز سے فارغ ہو جائے اور اس نماز کے بعد سنت یا نفل نہ ہوں جیسے فجر اور عصر کی نماز تو امام دائیں طرف ذرا گھوم کر مقتدیوں کی طرف منہ کر کے دعاء مانگے اسے بھی مستحب یا ضروری نہ سمجھا جائے۔

مسند احمد اور سنن ابوداؤد میں حضرت مالک بن یسار رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو اس طرح مانگو کہ ہتھیلیاں چہرہ کی طرف ہوں اور ہاتھ کی پشت نیچے کی طرف، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم سے یہ بھی منقول ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعاء سے فارغ

ہوتے تو ہاتھوں کو اپنے چہرے پر پھیر لیتے۔

دعاء مانگنے سے متعلق جو آداب احادیث نبویہ میں بیان ہوئے ہیں انہیں ترتیب سے ذہن میں رکھ لیا جائے تو انشاءاللہ وہ دعاء مکمل مسنون طریقے کے مطابق ہوگی۔

سب سے پہلا ادب تو یہ ہے کہ حرام مال سے بچے کیونکہ یہ دعاء کے قبول ہونے میں رکاوٹ ہے' اخلاص سے دعا کرنا یعنی یہ یقین رکھنا کہ اللہ تعالیٰ ہی ہماری دعاء قبول کرنے والا ہے' پاک صاف ہوکر قبلہ کی طرف متوجہ ہوکر دعاء کرنا' دعا کے شروع اور آخر میں اللہ تعالیٰ کی تعریف کرنا۔اسی طرح دعا کے شروع اور آخر میں درود شریف پڑھنا' دعاء کے لیے دونوں ہاتھوں کو کندھوں کے برابر اٹھانا' ادب اور عاجزی سے مانگنا، دعا کے وقت الفاظ کی ادائیگی میں قافیہ بندی کے تکلف سے بچنا' آہستہ آواز سے دعا مانگنا،مسنون دعائیں مانگنا، دعاء میں اپنے لیے، اپنے والدین کے لیے اور دوسرے مسلمان بھائیوں کے لیے دعا کرنا' پوری انسانیت کی ہدایت کے لیے دعا مانگنا پختہ عزم سے دعا مانگنا' بار بار دعا کرنا۔ دعا کے آخر میں آمین کہنا، جس کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ میری دعا قبول فرما۔ دعا کرتے ہوئے اپنے گناہوں کی معافی مانگنا، دنیا و آخرت کی بھلائی مانگنا، اور دعا مکمل کرنے کے بعد آخر میں دونوں ہاتھ اپنے چہرہ پر پھیر لینا یہ دعا کا مکمل مسنون طریقہ ہے جو ارشادات نبویہ سے معلوم ہوتا ہے۔

دعاء مانگنے کے بعد یہ نہیں کہنا چاہیے کہ میں نے دعاء کی تھی ابھی تک قبول نہیں ہوئی بخاری اور مسلم میں ارشاد نبوی ہے کہ دعا کرنے کے بعد یہ کہنا کہ میری دعاء قبول نہیں ہوئی یہ دعاء کو ضائع کرنا ہے اس لیے کہ انسان جو مانگتا ہے اللہ تعالیٰ یا تو وہی چیز دے دیتا ہے یا نعم البدل عطا فرما دیتا ہے یا دنیا میں اس دعاء کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ اس کے بدلے بندہ کے گناہ معاف فرما دیتا ہے۔

اللہ رب العزت ہمیں مسنون طریقہ سے دعاء مانگنے کی توفیق عطاء فرمائے۔اور ہم سب کی دعاؤں کو قبول فرمائے۔آمین ثم آمین۔



خشیت الٰہی کے تقاضے

﴿عن عبداللّٰہ بن مسعود رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم مامن عبد مومن یخرج من عینیه دموع وان کان مثل راس الذباب من خشیة الله ثم یصیب شیئا من حروجهه الاحرمه الله علی النار﴾ (رواه ابن ماجه)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''خشیت الٰہی سے جس بندۂ مومن کی آنکھوں سے کچھ آنسو نکلیں اگرچہ وہ (مقدار میں اتنے کم ہوں کہ) مکھی کے سر کے برابر ہوں پھر وہ آنسو بہہ کر اس کے چہرے پر پہنچ جائیں تو اللہ تعالیٰ اس چہرے کو جہنم کی آگ کے لیے حرام کردے گا۔''

عربی زبان میں ڈرنے کے لیے عموماً دو لفظ استعمال ہوتے ہیں۔ ایک خوف اور دوسرا خشیت۔ اردو میں دونوں کا ترجمہ ڈر اور خوف ہی کیا جاتا ہے لیکن درحقیقت ان دونوں

میں بہت زیادہ فرق ہے۔

امام راغب رحمہ اللہ نے مفردات القرآن میں لکھا ہے کہ خوف کہتے ہیں کسی چیز کے آثار اور نتائج سے آنے والے خطرہ کا اندیشہ کرنا۔ جیسے کسی دشمن، درندے یا کسی تکلیف دہ چیز سے ڈرنا، خوف کہلاتا ہے۔ اس کی ضد امن ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا **وامنھم من خوف** اور خشیت اس ڈر کو کہتے ہیں جو کسی ذات کی انتہائی عظمت اور محبت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس ڈر کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس ذات کی رضا اور خوشی کی ہر وقت فکر لاحق رہتی ہے اور اس کی ناراضگی کے اندیشہ سے بھی انسان بچتا ہے۔ یہی خشیت بندہ کو بارگاہ خداوندی میں کامل اور مقبول بنا دیتی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

﴿اللھم انی اسئلک من خشیتک ماتحول به بیننا و بین معاصیک﴾

''اے اللہ میں تجھ سے تیری خشیت مانگتا ہوں جس کی وجہ سے تو ہمارے درمیان اور گناہوں کے درمیان حائل ہو جائے۔''

خوف اور خشیت میں فرق قرآن مجید کی دو آیات سے مزید واضح ہوتا ہے۔

سورۂ فاطر کی ۲۸ ویں آیت میں ارشاد باری ہے:

﴿انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء﴾

یعنی ''اللہ تعالیٰ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔''

اور دوسری طرف سورۂ یونس کی آیت نمبر ۶۲ میں فرمایا:

﴿الا ان اولیاء اللّٰہ لا خوف علیھم﴾

''یاد رکھو جو لوگ اللہ کے دوست ہیں ان پر کوئی خوف نہیں۔''

معلوم ہوا کہ اللہ کے نیک بندوں میں خشیت الٰہی تو ہوتی ہے لیکن خوف سے وہ محفوظ ہوتے ہیں اللہ کے نیک بندوں میں نہ تکالیف کا خوف ہوتا ہے نہ مصیبتوں سے ڈرتے

ہیں' یہاں تک کہ وہ موت سے بھی نہیں ڈرتے۔ ہاں اللہ کے نیک بندے اللہ سے ڈرتے ہیں۔ عام انسان دنیا کی چیزوں سے خوف کھاتے ہیں' دنیوی مقاصد اور آرام و راحت، عزت، و دولت میں ذرا سی کمی آنے لگے تو راتوں کی نیندیں اڑ جاتی ہیں' ذرا ذرا سی تکلیف اور پریشانی کے خوف سے ان سے بچنے کی تدبیریں کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک مسلمان کے اندر خوف خدا اور خشیت الٰہی جس قدر آ جاتی ہے اسی قدر وہ اللہ کی اطاعت کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے اور اسے اپنے حقوق حاصل کرنے کے بجائے دوسروں کے حقوق اداء کرنے کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔

خوف خدا انسان کے اندر کیسے پیدا ہوتا ہے اس کا جواب آسان الفاظ میں یہ دیا جا سکتا ہے کہ جس قدر اللہ کی معرفت اور اس کی پہچان حاصل ہوتی جائے گی اس کا ڈر اور خوف نصیب ہوتا جائے گا۔

عربی میں ایک محاورہ ہے **الانسان عبدالاحسان** انسان احسان کا غلام ہوتا ہے۔ یہ جملہ انسان کی نفسیات کی عکاسی کرتا ہے' کسی انسان کے ساتھ دوسرا انسان اچھا سلوک کرے تو یہ انسان کسی موقع پر اپنے محسن کی نافرمانی نہیں کرتا۔ معمولی معمولی احسانات کی بناء پر ایک انسان دوسرے انسان کی نافرمانی سے ڈرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ میں اس کے کہنے پر عمل کروں۔

تو پھر انسان پر اللہ کے کس قدر احسانات ہیں، انسان شمار کرنا چاہے تو ان احسانات کو شمار کرنا اس کے بس میں نہیں۔ لیکن انسان محبت کی قدر اور اس سے والہانہ محبت تب کرتا ہے جب اسے ان انعامات کی قدر ہو۔

چنانچہ اللہ رب العزت نے قرآن حکیم کے تقریباً تھائی حصہ میں ان ہی امور کا تذکرہ فرمایا اپنی قدرت کے مظاہر انسان کے سامنے رکھے ان میں غور وفکر کی تعلیم دی اپنے اردگرد کی اشیاء میں غور کرنے کو کہا، اپنی ذات میں غور و فکر کرنے کی تلقین کی اور ان بے شمار انعامات کی طرف توجہ دلائی جو اللہ تعالیٰ نے انسان پر فرمائے۔ جب انسان ان احسانات اور انعامات خداوندی کے بارے میں غور وفکر کرتا ہے تو پھر انسان کے ذہن میں اللہ تعالیٰ کا یقین کامل پیدا

ہوتا ہے اس کے نتیجہ میں خوف خدا نصیب ہوتا ہے' یہ ڈر اور خوف خالصتاً اللہ سے محبت اور اس کی عظمت کی بنا پر ہوگا' یہ وہ ڈر نہیں جسے عام طور پر خوف کہتے ہیں۔

ان تمام باتوں کی وضاحت کے بعد ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ آخر یہ انسان جتنا اپنے افسر سے ڈرتا ہے اتنا خدا سے کیوں نہیں ڈرتا۔ یا یہ جملہ کہیں لکھا ہوا دیکھنے کو ملتا ہے کہ افسر کے خوف سے نہیں خدا کے خوف سے اپنے فرائض انجام دیں۔لیکن اس جملہ پر بسا اوقات عمل ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔

اس کی بنیادی وجہ دوسرے انسان کی طاقت اور اس کے اختیارات کا تجربہ ہے۔اگر اس انسان کی بات نہ مانی تو اس کا انجام یہ ہوگا۔بس یہی چیز مخلوق کا ڈر دل میں بٹھا دیتی ہے' اللہ تعالیٰ نے اس بات کی مثال موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے واقعہ میں دی۔اللہ کو فرعون نے نہیں مانا' اللہ کے نبی کی باتوں کو نہیں مانا' لیکن جب اللہ نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا اور فرعون غرق ہونے لگا تو پھر اللہ پر ایمان لانے لگا۔لیکن اس وقت کے ایمان کا اعتبار نہیں کیا گیا اس لیے کہ اس ایمان کی بنیاد غرق ہونے کا خوف تھا۔

اور اللہ تعالیٰ کو وہ خوف پسند ہے جو اس کی عظمت اور محبت کی بنا پر ہو۔ایسا خوف خدا رکھنے والے انسان کی خوبیاں یہ ہوتی ہیں کہ وہ اللہ پر پختہ ایمان رکھتا ہے۔نماز قائم کرتا ہے۔اللہ کی دی ہوئی نعمتوں میں سے قربانی اور ایثار کے ساتھ خرچ کرتا ہے۔اپنے وعدہ کو پورا کرتا ہے خوف خدا رکھنے والا انسان، تنگدستی میں، بیماری میں اور دنیا میں پیش آنے والی طرح طرح کی تکلیفوں میں صبر کرتا ہے۔معمولی معمولی باتوں میں بھی مخلوق کے بجائے خالق سے ڈرتا ہے۔ یہ انسان محض یہ سوچ کر کہ لوگ کیا کہیں گے،فضول خرچی نہیں کرتا۔ کیونکہ اسے مخلوق کا نہیں خالق کا خوف ہے پھر یہ انسان حرام مال کمانے کی دوڑ میں شامل ہونے کے بجائے حلال مال پر قناعت کرتا ہے خوف خدا رکھنے والے انسان میں ایک اہم خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے حقوق حاصل کرنے کی فکر کے بجائے دوسروں کے حقوق اداء کرنے کے لیے بے چین رہتا ہے۔دوسرے انسان سے اس پر زیادتی ہو جائے تو انتقام کے بجائے عفو و درگزر سے کام لیتا ہے۔دوسروں کے پاس نعمتیں دیکھ کر دل میں جلن اور کڑھن کے بجائے دوسرے

کو مبارک باد دیتا ہے اس پر خوش ہوتا ہے۔ دوسرے کا دل توڑنا اس کے نزدیک بڑا گناہ ہوتا ہے اس لیے کہ خوف خدا رکھنے والے شخص کی ایک بنیادی صفت یہ ہوتی ہے کہ اسے اپنے خالق و مالک کی معمولی سی نافرمانی بھی پہاڑ نظر آتی ہے۔

اللہ رب العزت ہم سب کے دلوں میں اپنی محبت اور عظمت پیدا فرما دے تا کہ خوف خدا جیسی عظیم نعمت نصیب ہو جائے۔ آمین۔

دولت سے بھی بڑی دولت

﴿عن عبداللہ بن عمرؓ وقال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قد افلح من اسلم ورزق کفافا وقنعہ اللہ بما اتاہ﴾

(رواہ مسلم)

''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کامیاب ہوا وہ شخص جسے اسلام نصیب ہوا اور گزارہ کے لیے روزی بھی ملی اور اللہ تعالیٰ نے جتنا اسے دیا اس پر قناعت بھی دی۔''

واقعی جس بندہ کو ایمان کی دولت نصیب ہو اور ساتھ ہی اس دنیا میں گزارے کا سامان بھی اور پھر اللہ تعالیٰ اس کے دل کو قناعت اور اطمینان کی دولت نصیب فرما دے تو اس کی زندگی بڑی مبارک اور بڑی خوشگوار ہے۔ یہ قناعت اور دل کا اطمینان وہ دولت ہے جس سے ایک فقیر کی زندگی بادشاہ کی زندگی سے زیادہ لذیذ اور پر مسرت بن جاتی ہے۔

کسی شخص کے پاس اگر دولت کے ڈھیر ہوں لیکن اس میں اور زیادہ کے لیے طمع اور حرص ہو اور وہ اس میں اضافہ ہی کی فکر اور کوشش میں لگا رہے تو اسے کبھی قلبی سکون نصیب نہیں ہوتا وہ دل کا فقیر ہی رہتا ہے لیکن اگر قناعت کی دولت حاصل ہو تو فقر و افلاس کے باوجود وہ دل کا غنی رہے گا۔ بخاری شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿ليس الغنى عن كثرة العروض ولكن الغنى غنى النفس﴾

''یعنی دولت مندی مال و اسباب سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اصلی دولت مندی دل کی بے نیازی ہے۔''

معجم کبیر للطبرانی میں حضرت ابو ذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن مجھ سے ارشاد فرمایا: ''ابو ذر کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ مال زیادہ ہونے کو غنی ہونا کہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا جی ہاں۔ پھر آپ نے فرمایا کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ مال کم ہونے کا نام فقیری ہے میں نے عرض کیا جی ہاں آپ نے تین مرتبہ بات کو دہرایا پھر فرمایا دولت مندی دل کے اندر ہوتی ہے اور فقیری بھی دل میں ہوتی ہے۔''

اسی حرص نے ان کو بخل کرنے کو کہا تو انہوں نے بخل اختیار کیا اسی بخل نے ان کو قطع رحمی کو کہا تو انہوں نے رشتہ داروں کے حقوق کو پامال کیا اسی حرص نے ان کو بدکاری کے لیے کہا تو انہوں نے بدکاریاں کیں۔ (ابوداؤد)

سنن ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ''انسان میں سب سے بری بات کڑھانے والی لالچ اور گھبرا دینے والی بزدلی ہے۔''

درحقیقت جب قناعت نصیب نہ ہو تو انسان ہر وقت اس غم میں گھلتا اور کڑھتا رہتا ہے کہ یہ نہیں ملا، وہ نہیں ملا، فلاں کے پاس یہ ہے اور میرے پاس یہ نہیں، بس یہی فکر بے شمار دولت کے ہوتے ہوئے بھی انسان کو بے سکون بنا دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو مال و دولت سے بھی بڑی دولت قناعت نصیب فرمائے۔



اگر آپ چاہتے ہیں کہ

اللہ آپ کی مدد کرے تو پھر؟

﴿عن ابن عمر رضی الله عنه ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال المسلم لا یظلمه ولا یسلمه ومن کان فی حاجة اخیه کان الله فی حاجته ومن فرج عن مسلم کربة فرج الله عنه کربة من کربات یوم القیمة ومن ستر مسلما ستره الله یوم القیمة﴾ (متفق علیه)

''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ دوسرے پر ظلم کرتا ہے نہ اسے (دشمن کے) سپرد کرتا ہے جو مسلمان بھائی کی ضرورت میں کام آئے گا اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت میں کام آئے گا اور جو کسی مسلمان کے رنج اور غم کو دور کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی مصیبت کو دور کر دے گا اور جو کسی مسلمان کے عیب چھپائے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے عیب کو چھپائے گا۔

خدمت خلق سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی رضا کے لیے اس کی مخلوق کی کے حقوق کی ادائیگی کرنا، اس میں صرف انسان ہی نہیں بلکہ جانور بھی شامل ہیں۔ خدمت خلق میں بنیادی بات یہ ہے کہ خدمت محض خدمت کے جذبہ سے ہو کوئی ذاتی غرض نہ ہو۔ شہرت، دکھلاوا اور نام و نمود شامل نہ ہو داد تحسین، لوگوں کی واہ واہ مقصود نہ ہو۔ اگر کوئی شخص خدمت خلق سے متعلق کام کا ملازم ہو اسے اس کام کی تنخواہ ملتی ہو تب بھی وہ اپنا کام دیانتداری

سے کرے اور عام شہریوں کو زیادہ سے اچھے سلوک سے پیش آئے اور شہریوں سے زیادہ فائدہ پہنچانے کی فکر میں رہے تو یہ بھی خدمت خلق کی ایک اعلیٰ صورت ہے۔

خدمت خلق بنیادی طور پر تین انداز سے کی جاسکتی ہے ایک تو مالی خدمت، یعنی اپنا مال دوسرے ضرورت مند انسانوں پر خرچ کرنا اور دوسرا انداز بدنی خدمت کا ہے یعنی اپنے جسم سے ایسے کام انجام دینا جس سے مخلوق خدا کو فائدہ پہنچتا ہو جیسے کمزور اور بیمار لوگوں کے ایسے کام کرنا جو وہ خود نہیں کر سکتے۔ خدمت خلق کا تیسرا انداز اخلاقی اور روحانی خدمت یعنی دوسروں کو برائی سے بچانا اور نیک راستے پر چلانا جہالت کی تاریکی دور کر کے علم کی روشنی سے منور کرنا۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ﴾

''یعنی تمارے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بہترین نمونہ زندگی موجود ہے۔''

چنانچہ خدمت خلق کی تعلیم اور اس پر عمل کا نمونہ بھی حیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں مکمل موجود ہے۔ مالی انداز سے بھی بدنی انداز سے بھی اور روحانی انداز سے بھی۔ گویا کہ خدمت کے ہر انداز سے خلق خدا کی خدمت کی۔

مالی انداز سے خدمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حد تک فرمائی کہ اگر ایک درہم بھی گھر میں رات کو رہ جاتا تو نیند نہ آتی کہ یہ محتاج کو پہنچ جائے۔ یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں ایک دفعہ ایک مہمان آیا، رات کے وقت گھر میں صرف بکری کا دودھ تھا۔ وہ مہمان کو دے دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے گھر والوں نے وہ رات فاقہ میں گزاری روایت میں لکھا ہے کہ اس سے پہلی رات بھی فاقہ سے گزری تھی۔ آپ فرماتے تھے ساری مخلوق اللہ کی عیال ہے، مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جو اللہ کی عیال کے ساتھ بھلائی کے ساتھ پیش آئے۔ آپ نے فرمایا جس کو

دوسرے کے دکھ درد کا احساس نہیں اور جس کا دل دوسرے کی تکلیف دیکھ کر نہیں پسیجتا وہ اللہ کی رحمت کا ہرگز مستحق نہیں تم اس خدا کی مخلوق پر مہربانی کروتا کہ تم پر خدا مہربان ہو جائے۔

اس لیے ضرورت مند انسانوں کی ہر قسم کی ضروریات پوری کرنا خدمت خلق کی اہم ترین صورت ہے خدمت خلق کا ایک شعبہ یتیموں کی خدمت ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یتیموں کی خاص طور پر خبر گیری فرماتے اور یہاں تک فرمایا کہ جو یتیم کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتا ہے تو جتنے بالوں پر اس کا ہاتھ گزرتا ہے اتنی نیکیوں میں اضافہ اور اتنے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیوہ کی خبر گیری کو جہاد کے برابر قرار دیا کہ یہ بھی خدمت کی مستحق ہیں۔

حضرت خباب رضی اللہ عنہ کے گھر بکریوں کا دودھ دوہنے کے لیے کوئی نہ تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم روزانہ ان کے گھر بکریوں کا دودھ دوہنے کے لیے تشریف لے جاتے رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے، جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں مصروف رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ بندہ کی مدد کرتا رہتا ہے۔ ایک مرتبہ تو یہاں تک فرمایا کہ مجھے رمضان بھر کے روزے رکھنے اور اس مبارک مہینہ میں مسجد حرام میں بیٹھ کر اعتکاف کرنے سے زیادہ عزیز یہ ہے کہ میں کسی مسلمان کی بوقت ضرورت مدد کروں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ فرض روزے اور فرض حج ادا نہ کرے اور بس اس کے بجائے دوسروں کی مدد کر دی جائے بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ فرض عبادات اپنی جگہ ادا کرے اور خلق خدا کی خدمت بھی کرتا رہے۔

خدمت خلق کی فضیلت تو واضح ہوئی لیکن یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ پھر انسان خلق خدا کی خدمت میں اتنے شوق کا اظہار کیوں نہیں کرتا جتنا کرنا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدمت خلق انسان کے لیے جب آسان ہوتی ہے جب انسان کے اندر قناعت ہو حرص ولالچ نہ ہو، دوسرے انسانوں سے ہمدردی ہو نفسا نفسی اور بے حسی نہ ہو، دوسرے انسانوں سے محبت ہو نفرت نہ ہو۔

اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ اور اسوۂ حسنہ میں قناعت،

ہمدردی اور خلق خدا سے محبت کرنے کی خوب تاکید فرمائی۔ جب انسان کے اندر یہ خوبیاں پید اہو جائیں تو پھر وہ خدمت خلق کی مختلف صورتیں خود بخود انجام دینے لگتا ہے۔ جیسے رفاہ عامہ کے کام مثلاً مسجد کی تعمیر، سکول اور مدرسے قائم کرنا' ڈسپنسریاں قائم کرنا، ادویات مہیا کرنا، صاف پانی کا بندوبست کرنا، یتیموں کی کفالت اور بیواؤں کی خبر گیری کرنا، بیمار کی عیادت کرنا اس کی ضروریات کا خیال کرنا، سماجی بہبود کے کام انجام دینا' ہمسایوں کے ساتھ اچھا سلوک اوران کے کام آنا، مسافروں اور رشتہ داروں کے ساتھ تعاون کے طریقے اپنانا۔ یہ خدمت خلق کی مختلف صورتیں ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ راستہ سے تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔ دور جدید میں یہ بھی خدمت خلق کی اہم ترین صورت ہے دوسری طرف وہ انسان جو کوڑا کرکٹ اور پلاسٹک کے لفافے ادھر ادھر پھینک دے اور سیوریج کے نظام کو درہم برہم کر دے گلیوں میں پانی کھڑا ہو گیا بدبو اور تعفن سے سب کو تکلیف ہوئی کارخانہ لگایا اس کا فاضل مادہ پانی میں بہا دیا۔ بیماریوں کے پھیلنے کا سبب بنا یہ دوسرے انسانوں کو تکلیف پہنچانے کی صورتیں ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ تعلیم دی کہ مسلمان وہ شخص ہوتا ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

خدمت خلق میں رکاوٹ ایک یہ بات بھی ہوتی ہے کہ ''دوسرے لوگ تو یہ نہیں کرتے ہم کیوں کریں۔'' یا یہ خیال آتا ہے کہ دوسرا ہم سے اچھا سلوک نہیں کرتا ہم کیسے کریں۔ یہی سوال ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کر دیا' عرض کیا یا رسول اللہ بعض لوگ ہمارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے ہم ان سے اچھا سلوک کیسے کریں؟ آپ نے فرمایا اگر تمہارے ساتھ وہ اچھا سلوک کریں اور تم بھی مقابلے میں ان سے اچھا سلوک کرو یہ تم نے نے ان کا بدلہ اتارا' احسان تو یہ ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہ کرے تب بھی تم اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ چنانچہ اسی جذبہ سے اسوہ حسنہ کی روشنی میں خدمت خلق کو بطور عبادت ادا کیا جائے تو جہاں خدمت خلق سے اللہ کی رضا اور

خوشنودی حاصل ہوگی وہاں معاشرہ میں ایک دوسرے انسان کے دل میں باہمی احترام اور محبت پیدا ہوگی انسان کوخود اپنی ضرورت پورا کرنے میں جتنا سکون ملتا ہے اس سے کہیں زیادہ خدمت خلق کرنے والے انسان کو روحانی تسکین نصیب ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو خلوص کے ساتھ خلق خدا کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔



تقویٰ کے بعد سب سے بڑی نعمت

﴿عن ابی امامة رضی الله عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم انه کان یقول ما استفاد المومن بعد تقوی الله خیرا له من زوجة صالحة ان امرها اطاعته وان نظر الیها سرته وان اقسم علیها ابرته وان غاب عنها نصحته فی نفسها وماله﴾

(رواه ابن ماجه)

''حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مومن بندہ نے تقویٰ کی نعمت کے بعد کوئی ایسی بھلائی حاصل نہیں کی جو اس کے حق میں نیک بیوی سے بڑھ کر ہو (پھر نیک بیوی کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ) اگر شوہر اسے حکم کرے (جو خلاف شرع نہ ہو) تو اس کا کہا مانے اور شوہر اس کی طرف دیکھے تو شوہر کو خوش کرے اور اگر شوہر کسی کام کے بارے میں قسم کھا بیٹھے کہ ضرور تم ایسا کرو گی (اور وہ کام شرعاً جائز ہو) تو اس کی قسم کو سچا کر دے اور اگر وہ کہیں چلا جائے اور وہ اس کے پیچھے گھر میں رہ جائے تو اپنی جان اور اس کے مال کے بارے میں اس کی خیر خواہی کرے۔''

تقویٰ کی نعمت بہت بڑی ہے اگر یہ نعمت کسی کو میسر ہو جائے تو وہ بہت مبارک ہے اس لیے کہ اصل دین داری تقویٰ ہی کا نام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تقویٰ فرائض وواجبات کے ادا کرنے اور حرام وممنوع کاموں سے پرہیز کرنے کا نام ہے اس تقویٰ کی وجہ سے بندہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے۔

تقویٰ کے علاوہ اور بھی بے شمار نعمتیں ہیں جن کا درجہ اگرچہ تقویٰ سے کم ہے لیکن انسان کی زندگی کے لیے وہ بھی بہت ضروری ہیں۔ ان نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت کے

بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تقویٰ کے بعد سب سے بڑی نعمت نیک بیوی ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نیک بیوی کی صفات بیان فرمائی ہیں۔

نیک بیوی کی ایک خوبی تو یہ ہے کہ وہ شوہر کی فرمانبردار ہو' شوہر جو کہے اسے پورا کرے اور نافرمانی کر کے اس کا دل نہ دکھائے بشرطیکہ شوہر نے خلاف شرع کام کا حکم نہ دیا ہو۔ خلاف شرع کاموں میں کسی کی بھی فرمانبرداری جائز نہیں۔

نیک بیوی کی دوسری خوبی ارشاد نبوی میں یہ بتائی گئی کہ اگر شوہر اس کی طرف دیکھے تو اسے خوش کرے یعنی اپنا رنگ ڈھنگ شوہر کی مرضی کے مطابق رکھے۔ جب بیوی پر نظر پڑے تو اسے دیکھ کر اس کا دل خوش ہو۔ بات بات پر منہ پھلانا، بیمار ظاہر کرنے کی عادت بنا لینا یا میلی کچیلی اور پھوہڑ بنی رہنا ان باتوں سے شوہر کو قلبی اذیت ہوتی ہے پھر شوہر اس کی صورت بھی دیکھنے کا روادار نہیں ہوتا بلکہ گھر میں جانے کو بھی اپنے لیے مصیبت سمجھتا ہے ان میں بعض عورتیں وہ بھی ہوتی ہیں جو نماز روزے کا پابند ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو دیندار اور نیک سمجھتی ہیں حالانکہ نیک عورت کے اوصاف میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ شوہر کی فرمانبرداری کرے البتہ خلاف شرع خواہش پوری نہ کرے۔

تیسری خوبی نیک بیوی کی یہ بتائی کہ اگر شوہر کسی ایسی بات پر قسم کھا لے جس کا پورا کرنا بیوی سے متعلق ہو مثلاً تم تہجد پڑھو گی، یا فلاں بچے کو نہلاؤ گی یا آج تم ضرور میری والدہ کے پاس چلو گی تو بیوی اس قسم کو سچا کر دے یعنی عمل کرے بشرطیکہ وہ عمل شرعاً درست ہو۔

چوتھی خوبی نیک عورت کی حدیث میں یہ بیان ہوئی کہ اگر شوہر کہیں چلا جائے اور بیوی کو گھر چھوڑ جائے تو بیوی کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی جان اور شوہر کے مال کے بارے میں وہی رویہ اختیار کرے جو اس کے سامنے رکھتی تھی لہٰذا بیوی عفت و عصمت کی حفاظت کرے اور شوہر کی غیر موجودگی میں بھی اس کے مال کی حفاظت کرے۔

ترمذی اور ابن ماجہ کی ایک روایت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہترین چیزوں کا ذکر یوں فرمایا:

﴿افضله لسان ذاکر وقلب شاکر و زوجة مؤمنة تعینه علی الایمان﴾ (مشکوٰۃ ص)

''یعنی سب سے بہتر چیز ذکر کرنے والی زبان اور شکر کرنے والا دل ہے اور وہ مومن بیوی ہے جو شوہر کی مدد کرے اس کے ایمان پر۔''

ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے مرقات شرح مشکوٰۃ میں ایمان پر مدد کرنے کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

﴿ای علی دینه بان تذکره الصلوٰة والصوم وغیرهما من العبادات وتمنعه من الزنا وسائر المحرمات﴾

یعنی ''بیوی کا شوہر کی مدد کرنا اس کے ایمان پر۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ بیوی اپنے شوہر کی دینداری کی فکر کرے اور اوقات مقررہ میں سے نماز، روزہ یاد دلائے اور دیگر عبادات پر آمادہ کرتی ہو، بدکاری اور دوسرے گناہوں سے باز رکھتی ہو''۔

واقعی ہمارے بدلتے ہوئے ماحول اور بگڑے ہوئے معاشرہ کو ایسی نیک خواتین کی ضرورت ہے جو خود بھی دین پر کاربند ہوں اور شوہر اور اولاد کو بھی دیندار بنانے کی فکر رکھتی ہوں۔

آج کی دنیا میں ہر شخص دنیا کی بہترین سے بہترین چیزوں کو حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگا ہوا ہے لیکن ایک بہترین چیز نظروں سے اوجھل ہے جس کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿الدنیا کلها متاع وخیر متاع الدنیا المراة الصالحة﴾

(رواه مسلم. مشکوٰۃ ص)

یعنی ''پوری دنیا نفع حاصل کرنے کی چیز ہے اور دنیا کی بہترین چیز جس سے نفع حاصل کیا جائے وہ نیک عورت ہے۔''

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''عورت سے چار چیزیں دیکھ کر نکاح کیا جاتا ہے:

(۱) اس کے مال کی وجہ سے،

(۲) اس کی حیثیت کی وجہ سے،

(۳) اس کی خوبصورتی کی وجہ سے،

(۴) اس کی دینداری کی وجہ سے،

پس تم دیندار عورت کو اپنے نکاح میں لاکر کامیاب ہو جاؤ۔

(رواہ البخاری ومسلم ص ۲۶۷)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی شخص تمہارے پاس نکاح کا پیغام بھیجے جس کی دینداری اور اخلاق تمہیں پسند ہوں تو اس شخص سے نکاح کر دو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو زمین پر بڑا فتنہ اور بڑا فساد پیدا ہو گا۔

(رواہ الترمذی، مشکوٰۃ ص ۲۶۷)

معلوم ہوا کہ جس طرح دیندار بیوی بڑی نعمت ہے اسی طرح شوہر بھی دیندار تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر لڑکے میں دینداری نہیں ہو گی تو وہ لڑکی کو بھی دین پر نہیں چلنے دے گا' بے نمازی نہ خود نماز پڑھے گا نہ پڑھنے دے گا' حرام کمائے گا حرام کھلائے گا لیکن اگر شوہر اور بیوی دونوں دیندار ہوں ان میں سے ہر ایک اخلاق حسنہ سے متصف ہو، انسانیت کے شرف سے مالا مال ہو، انس والفت کا مجسمہ اور محبت واخوت کا عادی ہو' دوسروں کی خاطر تکلیف برداشت کر سکتا ہو، احباب واصحاب سے نباہ کرنے کا خوگر ہو تو پھر ایسے میاں بیوی اخلاق حسنہ اور اعمال صالحہ کی وجہ سے زندگی بھر خوش رہیں گے۔

اللہ رب العزت کے حضور یہ دعا کرتے رہنا چاہیے جو سورۂ فرقان میں عباد الرحمٰن کی خصوصیات میں شمار کی گئی ہے۔

﴿ربنا هب لنا من ازواجنا وذريتنا قرة اعين﴾

''اے ہمارے رب ہمارے لیے ہماری بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما'' آمین۔



مردوں کو زنانہ اور عورتوں کو مردانہ لباس اور وضع قطع اختیار کرنے کی ممانعت ہے

﴿عن ابن عباس رضی الله عنه قال لعن رسول الله صلی الله علیه وسلم المتشبهین من الرجال بالنساء والمتشبهات من النساء بالرجال﴾ (رواه البخاری)

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ان مردوں پر جو عورتوں کی مشابہت اختیار کریں۔ (یعنی ان کی شکل، ہیئت، ان کا سا لباس اور ان کا انداز اپنائیں'' اوران عورتوں پر بھی جو مردوں کی مشابہت اختیار کریں۔''

وضع قطع اور لباس کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ہدایات دیں کہ مرد خاص عورتوں والا لباس پہن کر نسوانی صورت نہ بنائیں اور عورتیں مردوں والے مخصوص کپڑے پہن کر اپنی نسوانی فطرت پر ظلم نہ کریں۔

دور جدید میں فیشن پرستی کی وبا یہاں تک پہنچ چکی کہ مردوں نے بال لمبے کر کے لڑکیوں کی طرح ''پونی'' باندھنی شروع کر دی ہے اور کانوں میں بالیاں اور زیور پہننا شروع کر دیا ہے یہاں تک کہ گذشتہ دنوں ایک معتبر اخبار میں پڑھا کہ اسلام آباد میں ایک ''بوتیک'' نے مردوں کے لیے دوپٹہ کرتا اور شلوار متعارف کروا دیا ہے۔ (**نعوذ بالله من هذه الفتنة**)

حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ان مردوں پر جو عورتوں کی مشابہت اختیار کریں (یعنی ان کی طرح شکل وہیئت ان کی طرح لباس اور ان کا انداز اپنائیں) اوران عورتوں پر بھی لعنت فرمائی جو مردوں کی مشابہت اختیار کریں۔

(رواہ البخاری)

ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مردوں پر لعنت فرمائی جوزنانہ لباس پہنیں اوران عورتوں پر جو مردانہ لباس پہنیں۔

(معارف الحدیث جلد ۶ ص نمبر ۲۹۴)

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی دیکھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ہاتھ سے نکال کر پھینک دی اور ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کسی کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی خواہش سے دوزخ کا انگارہ لے کر اپنے ہاتھ میں پہن لیتا ہے۔(یعنی مرد کے لیے سونے کی انگوٹھی گویا دوزخ کی آگ ہے جو اس نے شوق سے ہاتھ میں پہن رکھی ہے) پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے تشریف لے گئے تو کسی نے ان صاحب سے کہا (جن کے ہاتھ سے سونے کی انگوٹھی نکال کر پھینکی تھی) کہ اپنی انگوٹھی اٹھا لو اور کسی طرح اپنے کام میں لے آؤ (مثلاً فروخت کر دو یا گھر کی خواتین میں سے کسی ایک کو دے دو) ان صاحب نے کہا خدا کی قسم جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پھینک دیا ہے تو اب میں اس کو کبھی نہیں اٹھاؤں گا۔(معارف الحدیث جلد ۶ ص ۳۱۴)

اس حدیث سے یہ سبق ملتا ہے کہ اگر مناسب اور مفید سمجھا جائے تو اپنے سے متعلق لوگوں کے ساتھ اصلاح کا یہ طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے کہ ان کے پاس جو چیز شریعت کے خلاف ہو اسے ان سے جدا کر دیا جائے۔

حضرت ابن ابی ملیکۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا گیا کہ ایک عورت مردوں جیسا جوتا پہنتی ہے اس نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت پر لعنت کی ہے جو مردوں سے مشابہت اختیار کرے۔(رواہ ابوداؤد)

حضرت ابن الحطلیہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خزیم اسدی اچھا آدمی ہے اگر اس کے بال لمبے نہ ہوں اور اس کی چادر نیچے لٹکی ہوئی نہ ہو۔ یہ بات خریم اسدی تک پہنچ گئی اس نے تیز دھار آلے کے ساتھ کانوں تک بال کاٹ لیے اور چادر

آدھی پنڈلی تک اٹھالی۔ (رواہ ابوداؤد)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سونے کی انگوٹھی اور ''قسی'' (ریشمی کپڑوں کی طرح کپڑا) پہننے سے اور میاثر (سرخ رنگ کی ریشمی زین) کے استعمال سے منع فرمایا۔ (رواہ الترمذی)

مردوں کو سونے کی انگوٹھی پہننا چاروں اماموں کے نزدیک حرام ہے جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ بعض صحابہؓ جیسے حضرت طلحہؓ، حضرت سعدؓ، حضرت صہیبؓ کے بارے میں یہ منقول ہے کہ انہوں نے سونے کی انگوٹھی پہنی تھی تو اس کا تعلق اس زمانہ سے ہے جب کہ یہ حرمت نافذ نہیں ہوئی تھی۔

فتاویٰ قاضی خان میں لکھا ہے کہ لوہے اور پیتل کی انگوٹھی وغیرہ پہننا مکروہ ہے اور مردوں کے لیے سونے کی انگوٹھی پہننا حرام ہے۔ (مظاہر حق جلد ۴ ص ۲۰۰)

ان تمام ارشادات نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آداب اسلامی کے پیش نظر یہ ہمارے معاشرے کے افراد کے لیے لمحہ فکریہ ہے جہاں پہلے مرد گلے میں زنجیریں اور ہار پہنتے تھے پھر ہاتھ میں کڑے اور انگلیوں میں انگوٹھیاں آئیں اور کچھ عرصہ سے بال لمبے کر کے لڑکیوں کی طرح ''پونیاں'' باندھنی شروع کر دی تھیں۔ اور اب ایک ''بوتیک'' سے مردوں کے لیے دوپٹہ، کرتا اور شلوار متعارف کروایا گیا ہے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ جس طرح مردوں کا طبقہ اپنی غرض وغایت کے لحاظ سے ایک مخصوص طبقہ ہے اسی طرح عورتوں کا طبقہ بھی اپنی خلقت کی مخصوص غرض وغایت رکھتا ہے اس لیے قدرتی طور پر مرد وزن میں باہمی ظاہری تمیز ہونی چاہیے۔ شریعت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ عورتیں مردوں کے ساتھ یا مرد عورتوں کے ساتھ لباس میں تشبیہ کریں (التشبیہ فی الاسلام، قاری محمد طیب صاحبؒ صفحہ نمبر ۲۳۰)

اللہ رب العزت امت مسلمہ کو مرد وزن کی وضع قطع میں مشابہت کے فتنہ سے محفوظ فرمائیں۔



پاکیزہ خیالات

﴿عن ابی هریرة رضی الله عنه ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث﴾

(رواه الترمذی)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بدگمانی سے بچو کیونکہ یہ سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے''۔

اللہ رب العزت نے سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۲۸۴ میں فرمایا

''جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے اور اگر تم ان باتوں کو ظاہر کرو گے جو تمہارے نفسوں میں ہیں یا ان باتوں کو چھپاؤ گے تو اللہ تعالیٰ تم سے ان کا حساب لے گا۔ پھر جسے چاہے گا بخش دے گا اور جسے چاہے گا عذاب دے گا اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔''

اس آیت کے سیاق وسباق کو مدنظر رکھا جائے تو یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے گواہی کو ظاہر کرنے کا حکم دیا اور گواہی کے چھپانے سے منع فرمایا۔ لہٰذا اگر کوئی شخص معاملے کو جانتے ہوئے اصل بات چھپائے تو اللہ تعالیٰ دلوں کا حال بخوبی جانتا ہے وہ ضرور حساب لے گا۔

جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے تمام اعمال کا محاسبہ فرمائیں گے ان اعمال کا جو انسان کر چکا اور اس بات کا بھی کہ جس چیز کے چھپانے اور جس چیز کے ظاہر کرنے کا حکم فرمایا کیا انسان نے اس پر عمل کیا؟

صحیح بخاری اور مسلم میں حضرت عبداللہ عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مومن کو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے قریب کیا جائے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کے ایک ایک گناہ کو یاد دلائیں گے اور سوال کریں گے کہ تو جانتا ہے کہ تو نے یہ گناہ کیا تھا؟ مومن بندہ اقرار کرے گا۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں نے دنیا میں بھی تیری پردہ پوشی کی اور تیرا گناہ لوگوں میں ظاہر نہیں ہونے دیا، آج میں اسے معاف کرتا ہوں اور نیکیوں کا اعمال نامہ اسے دے دیا جائے گا۔

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ یہ وہ دن ہے جس میں پوشیدہ چیزوں کا جائزہ لیا جائے گا اور دلوں کے پوشیدہ راز کھولے جائیں گے اور اعمال لکھنے والے فرشتوں نے تو صرف تمہارے وہ اعمال لکھے ہیں جو ظاہر تھے اور میں ان چیزوں کو بھی جانتا ہوں جن کے بارے میں فرشتے بھی نہیں جانتے اور نہ انہوں نے وہ چیزیں تمہارے نامہ اعمال میں لکھی ہیں میں وہ سب بتاتا ہوں اور اب ان کا حساب لوں گا۔

جب سورۂ بقرہ کی یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بڑا فکر ہوا کہ دل میں پتہ نہیں کیا کیا خیالات آتے ہیں اگر ان کا حساب ہونے لگا تو پھر نجات کیسے ہو گی؟ صحابہ کرام نے اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا آپ نے فرمایا جو کچھ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اسے سن لو اور اس کی اطاعت کرو اور مان لو۔ پھر قرآن مجید کا یہ جملہ

نازل ہوا:

﴿لا يكلف الله نفسا الا وسعها﴾

”یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی قدرت سے زائد تکلیف نہیں دیتا۔“

لہٰذا اس بارے میں بڑی واضح بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ انسان کی فطرت ہی ایسی ہے کہ اگر اس کے ذہن میں کوئی خیال آئے تو اس کو روکا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا جب انسان خیالات کے خود بخود آنے پر قدرت نہیں رکھتا تو اللہ تعالیٰ اس پر مؤاخذہ بھی نہیں فرمائیں گے۔ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ ایک ہے خیالات کا آنا ایک ہے خیالات کا لانا۔ دونوں میں فرق واضح ہے خیالات آ جائیں ان کے روکنے پر تو قدرت نہیں لیکن خیالات لانے پر یا نہ لانے پر تو انسان قادر ہے لہٰذا اگر کوئی جان بوجھ کر برے خیالات کو ذہن میں لائے تو اس پر پکڑ ہوگی۔ جیسے تکبر کا خیال، حسد، بغض، کینہ، دشمنی، لالچ اور دوسرے گناہوں کا خیال لانا اور ذہن میں اسے جگہ دینا یہ برا ہے لیکن اگر یہ خیالات خود بخود آ جائیں تو پکڑ نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿ان الله تجاوز عن امتی عما حدثت انفسها مالم يتكلموا اويعملوا به﴾

”فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے دلوں میں آنے والے خیالات کو معاف کر دیا ہے جب تک کہ ان خیالات کو زبان سے نہ کہا اور نہ ان پر عمل کیا۔“

برے خیالات انسان کے ذہن میں جب آئیں تو ان کا علاج بہت آسان ہے، ماہرین نفسیات کی تحقیق کے مطابق ایک صحت مند انسان کے ذہن میں ایک وقت میں ایک طرح کا خیال رہ سکتا ہے لہٰذا جب بھی کوئی برا خیال ذہن میں آئے تو اپنے ذہن کو کسی اچھے کام اور اچھے خیال کی طرف مائل کر دیا جائے۔ جب اچھا خیال ذہن میں آئے گا تو برا خیال خود بخود نکل جائے گا۔

لیکن معاشرے کے بعض انسان وہ بھی ہیں جن کا ذہن ہر وقت برے خیالات اور گناہوں بھرے وساوس سے بھرا رہتا ہے اس کی ایک بڑی وجہ ہے اور وہ یہ کہ انسان کا ذہن ایک کیسٹ کی طرح ہے انسان جو کچھ کانوں سے سنتا ہے وہ آوازیں ذہن میں ریکارڈ ہو جاتی ہیں اور جو کچھ آنکھوں سے دیکھتا ہے وہ تصویر بھی ذہن میں محفوظ ہو جاتی ہے اب اگر انسان کیسٹ میں گناہوں بھری آوازیں محفوظ کرتا رہے اور ممنوعہ مناظر کو ذہن میں نقش کرتا چلا جائے اور جب ذہن میں وہ کیسٹ چلے تو اب یہ انسان پریشان ہو کر چاہتا ہے کہ اس میں سے نیک باتیں سنائی دیں اور اچھے مناظر دکھائی دیں تو یہ ناممکن ہے خلاف فطرت ہے۔

اس لیے اگر انسان اپنے سننے کی چیزوں کو پاکیزہ بنا لے۔ دیکھنے اور پڑھنے کی چیزوں کو پاکیزہ بنالے تو انشاءاللہ دل میں آنے والے برے خیالات سے چھٹکارا ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ چونکہ ہمارے ذہن میں چھپائی جانے والی اور ظاہر کی جانے والی باتوں کا بہرحال حساب لے گا اس لیے ہمیں زندگی اس طرح گزارنی ہوگی کہ اگر کچھ باتیں ہمارے ذہن میں دوسروں کے فائدہ کی ہوں وہ ضرور بتائیں انہیں نہ چھپائیں۔ جیسے گواہی چھپانے سے منع فرمایا اور ایسی باتیں جن سے دوسروں کی اصلاح ہوسکتی ہو اور بہت سی ایسی باتیں جن سے کسی کو دینی یا دنیوی فائدہ پہنچ سکتا ہو اور اگر کسی کے بارے میں بری باتیں معلوم ہو جائیں تو اسے چھپایا جائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی ہدایت دی ہے کہ جو کوئی دوسرے مسلمان کا عیب چھپائے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے عیوب کو چھپائے گا۔

اور انسان بھرپور کوشش کرے کہ اس کے ذہن میں اچھے خیالات آئیں برے خیالات پر پریشان ہونے کی بجائے ان کا علاج کرے اپنے دیکھنے سننے اور پڑھنے کی چیزوں کو پاکیزہ بنائے اس لیے کہ اللہ رب العزت دل میں چھپے اور ظاہر کی جانے والی چیزوں کا حساب لے گا اس بات کا پختہ یقین رکھنے والا شخص یقیناً دنیا و آخرت میں کامیاب انسان شمار ہوگا اور معاشرے میں ایک تندرست ذہن رکھنے والا انسان شمار ہوگا۔



صحابہؓ کرام (مہاجرین ،انصاراوراہل بیت) کی محبت اور

اسوۂ صحابہؓ کی اہمیت

﴿عن عبدالله ابن مغفل رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم الله الله فی اصحابی. الله الله فی اصحابی لا تتخذوهم غرضا من بعدی فمن احبهم فبحبی احبهم ومن ابغضهم فببغضی ابغضهم ومن اذاهم فقد اذانی ومن اذانی فقد اذی الله فیوشك ان یاخذه﴾ (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ ص۵۵۴)

''حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ سے ڈرو میرے صحابہ کے بارے میں (پھر تاکیداً فرمایا) اللہ سے ڈرو میرے صحابہ کے بارے میں۔ میرے بعد ان کو نشانہ (اور ہدف ملامت) نہ بنانا۔ جو ان سے محبت رکھے گا وہ میری وجہ سے محبت رکھے گا اور جو ان سے بغض رکھے گا وہ میری وجہ سے بغض رکھے گا۔ جو انہیں تکلیف دے گا اس نے گویا مجھے تکلیف دی اور جس نے مجھے تکلیف دی تو اس نے اللہ کو تکلیف دی اور جس نے اللہ کو تکلیف دی تو قریب ہے کہ اللہ اس پر گرفت کر لے۔

میرے استاذ مکرم علامۃ الزمان حضرت مولانا شمس الحق افغانی نور اللہ مرقدہ نے کتاب ''صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین اور ان پر تنقید'' کی تقریظ تحریر فرماتے ہوئے آغاز میں یہ لکھا کہ دین خداوندی اور اہل دین کے درمیان بسلسلہ ابلاغ دین بنیادی واسطے دو ہیں۔ ایک ذات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دوم آپ کے شاگردان مقبول عنداللہ جن پر رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کا حکم الٰہی قرآنی شاہد ہے۔ ان دو واسطوں میں سے ایک واسطے سے بھی عقیدت اور

اعتماد میں فرق آ گیا تو استحکام دین کا خاتمہ ہو جائے گا۔

(تحریر علامہ افغانیؒ ۱۱ شوال ۱۳۷۸ھ)

اسلام میں مرکز محبت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ اہل عرب سے محبت اسی لیے ہے کہ وہ خدا کے برگزیدہ پیغمبر کا محبوب وطن اور قوم ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تم عرب سے تین باتوں کی وجہ سے محبت رکھو اس لیے کہ میں عربی ہوں، قرآن عربی ہے، اور اہل جنت کا کلام عربی ہے۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

مہاجرین صحابہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قبیلہ اور خاندان سے ملے۔ انصار صحابہ نے غیر ہونے کے باوجود آپ کی مدد کی۔ اس میں خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے سوا اور کیا جذبہ ہوسکتا تھا۔ اس لیے بہت سے مواقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم انصار صحابہ سے محبت آمیز کلمات فرماتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند بچوں اور عورتوں کو ایک شادی سے واپس آتے ہوئے دیکھا تو کھڑے ہو گئے اور فرمایا۔ سب لوگوں میں سے تم مجھے بہت ہی محبوب ہو (دو مرتبہ فرمایا) راوی کہتے ہیں کہ آپ کا یہ خطاب انصار کے بچوں اور عورتوں سے تھا (متفق علیہ) اہل بیت سے محبت کی اہمیت کا اندازہ اس روایت سے ہوتا ہے جو حضرت براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ آپ کے کندھے پر ہیں اور آپ یہ دعا فرما رہے ہیں۔ اے اللہ میں ان سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان سے محبت فرما (متفق علیہ) اور شیخین نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ بھی نقل فرمایا کہ اے اللہ میں ان سے محبت رکھتا ہوں تو بھی ان سے محبت فرما اور جو ان سے محبت کرے ان سے بھی محبت فرما۔ اور پھر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اتنا اعلیٰ معیار قائم فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے ساتھ آپ کی ہر چیز سے محبت، ہر ادا سے محبت۔

عبید بن جریج نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا میں دیکھتا ہوں

کہ آپ ہمیشہ **النعال السبتیہ** (بے بال چمڑے کے جوتے) پہنتے ہیں' انہوں نے جواب دیا کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے ہی جوتے پہنے دیکھا تھا اس لیے مجھے بھی ایسے جوتے پہننا پسند ہیں۔ (رواہ الترمذی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک درزی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کچھ کھانا تیار کیا اور دعوت کی، میں بھی ساتھ تھا آپ کے سامنے جو کی روٹی اور شوربا پیش کیا۔ جس میں گوشت اور کدو کے ٹکڑے تھے۔ میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کدو کے ٹکڑے پیالے میں تلاش فرما رہے تھے (آپ کو پسند ہونے کی وجہ سے) بس اس دن سے مجھے کدو بھی محبوب ہو گئے۔ (رواہ الشیخان)

علامہ بدرالدین عینی لکھتے ہیں:

﴿ان من قال كان النبی صلی الله عليه وسلم يحب القرع فقال الاخر لا احب القرع يخشى عليه من الكفر.﴾

(جلد لا ص ص)

"یعنی اگر کوئی شخص کہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کدو پسند فرماتے تھے اس کے مقابلہ میں دوسرا شخص بول اٹھے کہ مجھے کدو پسند نہیں ہے تو اس بے محل انکار پر اس کے کفر کا اندیشہ ہے۔"

اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کسی سبزی سے ثابت ہو جائے اس سے محبت کا کتنا خیال ہے تو پھر ان صحابہ کرام سے محبت کرنا جن سے محبت کرنے کا حکم ہے کس قدر اہمیت اختیار کر جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نجات پانے والوں کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: **ماانا علیہ و اصحابی** وہی راستہ حق ہے جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب وسنت کی عملی تصویر اپنے صحابہ کے سامنے بطریق اسوہ پیش فرمائی۔ صحابہ کرام نے اس کے ایک ایک خدوخال کو دیکھا اور بالکل اسی

طرح نقل کر دی اگر اسوہ صحابہ کرام پر اعتماد نہ رہے تو پھر نقوش سیرت کہاں سے معلوم ہوں گے حضرت مولانا بدر عالم صاحبؒ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ اپنے اور رسول کے درمیان تفریق کی اجازت نہیں دیتا اس طرح رسول اپنے اور اپنے صحابہ کے درمیان تفریق کی اجازت نہیں دیتا۔ درحقیقت یہ انتہائی نادانی اور کجروی ہے کہ جو جماعت، امت اور اس کے رسل کے درمیان واسطہ ہے، اس کے اقوال و افعال کو ہم تک پہنچانے والی جو چیز ہے اس پر اعتماد نہ کیا جائے۔ اگر خدا کا رسول اپنی حیات میں ان پر اعتماد کر چکا ہے بادشاہوں سے قبائل کفار سے گفت وشنید ان ہی کی معرفت کی ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ امت ان پر اعتماد نہ کرے۔ (ترجمان السنۃ جلد اول ص ۸۵)

حضرت مولانا بدر عالم صاحب اسوہ صحابہ کی اہمیت کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔

اسی اہمیت کے پیش نظر صحابہ کی سنت کو ایک مستقل حیثیت دے دی گئی ورنہ جس طرح رسول کا طریقہ خدائے تعالیٰ کے طریقہ سے علیحدہ نہیں۔ ٹھیک اسی طرح صحابہ کی سنت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے علیحدہ نہیں۔ اس لیے فرقہ ناجیہ کی ایک بڑی علامت یہ ہے کہ وہ ان دونوں طریق کی جو درحقیقت ایک ہی ہیں اپنے اپنے مرتبہ میں بزرگی و احترام کی قائل ہو بلکہ اس پر گامزن بھی ہو۔ خوارج نے صرف سنت رسول کو لیا اور صحابہ کی ایک جماعت کو کافر ٹھہرایا جو ان کے ناحق ہونے کی پہلی علامت تھی۔

(ترجمان السنۃ جلد اول ص ۸۵)



صداقت اپنایئے

صدیقؓ کا مقام نصیب ہوگا

﴿عن عبدالله بن مسعود رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم مایزال الرجل یصدق ویتحری الصدق حتی یکتب عندالله صدیقا﴾

(رواہ البخاری ومسلم)

''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب کوئی شخص ہمیشہ سچ ہی بولتا ہے اور سچائی کو اختیار کر لیتا ہے تو وہ اللہ کے ہاں صدیقین میں لکھ لیا جاتا ہے۔''

اسلامی تعلیمات میں جن اخلاق کی بہت زیادہ فضیلت اور اہمیت معلوم ہوتی ہے ان میں سے ایک صداقت اور سچائی ہے۔ واقعہ کے مطابق بات کو صدق اور سچ کہتے ہیں اور واقعہ کے خلاف بات کو جھوٹ کہتے ہیں۔

سچ ایک اچھی بات اور ایک اچھی عادت ہے اور جن باتوں کو کائناتی سمجھا جاتا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سچ اور صدق ایک اچھی بات ہے۔ لیکن اسلام چونکہ ایک دین کامل ہے اس لیے اس میں صداقت وسچائی کا دائرہ کار بہت وسیع معلوم ہوتا ہے اسلام میں زبان کی سچائی کے ساتھ ساتھ دل اور عمل کی سچائی کی بھی تعلیم دی گئی ہے۔

دل کی سچائی سے مراد یہ ہے کہ دل میں کسی قسم کی منافقت اور دھوکہ فریب نہ ہو اور عمل کی سچائی یہ ہے کہ جو عقیدہ اور قول ہو اسی کے مطابق عمل بھی ہو۔ انسان کا اندر اور باہر ایک ہو تو پھر قرآن حکیم ایسے لوگوں کو صادق کہتا ہے اور صداقت کی صفت میں بہت زیادہ کمال حاصل ہو جائے تو وہ صدیق کہلاتا ہے۔

اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں صداقت کا یہ اعلیٰ مقام کیسے حاصل کروں تو اس کے لیے دین اسلام کی روشنی میں امام غزالیؒ نے صداقت کے چھ درجے بتائے ہیں اور زندگی میں جب انسان کے اندر صداقت کا ہر رخ روشن ہو جائے تو یہ انسان صدیق بن کر اللہ کا مقرب بندہ بن جاتا ہے۔

ان میں سے پہلا کام یہ ہے کہ انسان قول کا سچا بن جائے کہ انسان زبان سے جو بات نکالے وہ صرف سچی بات ہو۔ دوسرا کام یہ کہ اس شخص کے افعال میں صداقت ہو یعنی یہ شخص جو زبان سے کہتا ہے اس کا فعل بھی اس کے مطابق ہو۔ تیسرا یہ کہ اس شخص کے عزم و ارادہ میں بھی صداقت ہو۔ جیسے جب یہ انسان طالب علم تھا تو یہ ارادہ تھا کہ میں پڑھ لکھ کر قوم کی خدمت کروں گا پھر جب پڑھ لکھ کر ڈاکٹر، انجینئر یا استاد بن گیا اور اپنے عزم و ارادہ کے مطابق قوم کی خدمت کرنے لگا یہ اپنے عزم و ارادوں میں سچا شمار ہو گا۔ سچے شخص کی چوتھی خوبی یہ ہوتی ہے کہ یہ انسان اپنے وعدے اور معاہدے میں سچا ہو۔ جو وعدہ کیا اسے پورا کرنے کی کوشش کرے۔ پانچویں خوبی سچے شخص میں یہ ہوتی ہے کہ اس کی ہر حالت سچی ہوتی ہے۔ یعنی اس کا ظاہر و باطن سچا ہوتا ہے۔ جیسے کسی شخص کے اندر کسی خاص کام کی صلاحیت نہ ہو اور وہ یہ کہے کہ میں یہ کام بھی کر سکتا ہوں یا جیسے کوئی شخص بظاہر بڑا نیک اور تواضع اور عاجزی کرنے والا اپنے آپ کو ظاہر کرے جب کہ اندر سے ایسا نہ ہو۔ یا جیسے کسی کے پاس اتنی مالی گنجائش نہ ہو لیکن وہ اپنے آپ کو بڑا امیر و کبیر ظاہر کرے تو اس شخص نے اپنے حال کو صداقت کی خوبی سے نہیں سجایا اور چھٹی خوبی سچے شخص کی یہ ہوتی ہے کہ ہر کام میں اس کی نیت صحیح ہوتی ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت سے پہلے کی زندگی میں صداقت کا اتنا اعلیٰ معیار پیش فرمایا کہ اہل مکہ نے آپ کو ''صادق'' کا لقب دیا اور جب آپ نے نبوت کا اعلان فرمایا تو بہت سے لوگ صرف اسی وجہ سے ایمان لے آئے کہ جس ذات نے زندگی کے کسی مرحلے میں جھوٹ نہیں بولا اور چالیس سال کی زندگی میں ہمیشہ سچ بولا، صداقت کا دامن ہمیشہ تھامے رکھا جب وہ ذات یہ کہہ رہی ہے کہ انی رسول اللہ میں اللہ کا رسول ہوں تو یقیناً یہ بھی سچ ہے لہٰذا ان لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔

اس لیے کہ صداقت وسچائی کی خوشبو سے معاشرہ کا ہر شخص متاثر ہوتا ہے، سچے آدمی

پر ہر کوئی اعتماد کرتا ہے، سچائی باہمی اعتبار کی فضا بناتی ہے، سچا انسان ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ایسا انسان معاشرے میں باوقار سمجھا جاتا ہے، سچائی انسان کو نیکی کی طرف لے جاتی ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے اور اس طرح سچا انسان دنیا و آخرت میں ایک کامیاب انسان ہوتا ہے۔

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿علیکم بالصدق فان الصدق یھدی الی البروان البر یھدی الی الجنة﴾

عبدالرحمٰن بن ابی قرادؓ سے بیہقی میں روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿من سرہ ان یحب اللہ و رسولہ فلیصدق حدیثہ اذا حدث﴾

فرمایا کہ جس شخص کو یہ بات خوش کرے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھے یا اللہ اور اس کے رسول اس سے محبت کریں تو اسے چاہیے کہ جب وہ بات کرے تو سچ بولے۔

اسلام نے جہاں زندگی کے دوسرے تمام شعبوں میں صداقت کی خوبی اپنانے کا حکم فرمایا وہاں خاص طور پر تجارت میں سچائی کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

﴿التاجر الصدوق الامین مع النبیین و الصدیقین و الشھداء﴾

معلوم ہوا کہ ایک تاجر بازار میں بیٹھ کر اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی فرمانبرداری کرتے ہوئے سچائی اور امانت داری جیسے اسلامی قوانین کی پابندی کر کے آخرت میں انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوسکتا ہے۔

اسلام چونکہ دین کامل ہے اس لیے اس نے معاشرتی زندگی میں انتہائی حساس رہنے کا سلیقہ سکھایا۔ سنن ابی داؤد میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿کبرت خیانة ان تحدث اخاك حدیثا هو لك به مصدق وانت به کاذب﴾

یعنی یہ بہت بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے کوئی بات بیان کرو وہ تمہیں سچا سمجھتا ہو حالانکہ تم اس سے جھوٹ بول رہے ہو' معلوم ہوا کہ جب دوسرا شخص آپکو صداقت والا یعنی سچا سمجھتا ہو تو اس کے اس اعتبار کو قائم رکھتے ہوئے اس سے سچ ہی بولنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اسی طرح معاشرے میں رہتے ہوئے ہر سنی سنائی بات کو بغیر تحقیق کے آگے بیان کر دینا بھی صداقت اور سچائی کی خوبی کو ختم کر دیتا ہے۔ اس سے افواہیں پیدا ہوتی ہیں اور اہل معاشرہ میں بے سکونی اور بے چینی پیدا ہوتی ہے اور ایسا شخص جو ہر سنی سنائی بات کو بیان کرتا ہے ایسے شخص پر لوگوں کو اعتماد ختم ہو جاتا ہے۔ حدیث کی کتاب صحیح مسلم میں ارشاد نبوی ہے:

﴿کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ماسمع﴾

"یعنی آدمی کے جھوٹ کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بیان کرتا پھرے۔"

معاشرے میں ہر سمجھدار شخص یہ جانتا ہے کہ سچ اور صداقت اچھی بات ہے اور جھوٹ بری بات ہے لیکن چند پہلو ایسے بھی ہیں جن کو انسان شاید جھوٹ سمجھتا ہی نہیں جیسے پاکستانی مصنوعات پر غیر ملکی مہر لگا دینا یا غیر ملکی کہہ کر بیچنا۔ یا بچوں کو بہلانے کے لیے جھوٹ بول دینا یہ بھی سچائی نہیں حضرت عبداللہ عامرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر میں تشریف فرما تھے کہ میری والدہ نے مجھے بلایا "**ھاتعال اعطیك**" ادھر آ...... میں تجھے کوئی چیز دوں گی۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ کیا تم نے اس کو کچھ دینے کے لیے رکھا ہوا ہے؟ انہوں نے کہا جی! ایک کھجور دوں گی۔ فرمایا کہ اگر تمہارے پاس کچھ نہ ہوتا اور تم نے اس کو صرف بہلانا ہوتا تو یہ بھی جھوٹ شمار ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم کو صداقت اور صدیقیت کا مرتبہ عطا فرمائے۔



لوگوں کی نگاہوں میں عزت والا کیسے بنا جائے

﴿عن عمر رضی الله عنه قال انی سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول من تواضع لله رفعه الله فهو فی نفسه صغیر وفی اعین الناس عظیم ومن تکبر وضعه الله فهو فی اعین الناس صغیر وفی نفسه کبیر حتی لهو اهون علیهم من کلب او خنزیر﴾ (رواه البیهقی)

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے ہیں جس نے اللہ کے لیے عجز وانکساری کا رویہ اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ اسے بلند کرے گا وہ اپنے خیال اور اپنی نگاہ میں تو چھوٹا ہوگا لیکن خدا اور بندوں کی نگاہوں میں عظمت والا ہوگا۔ اور جو کوئی تکبر اور بڑائی کا رویہ اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے نیچے گرا دیں گے وہ عام لوگوں کی نظروں میں ذلیل اور حقیر ہوگا اگرچہ خود اپنے خیال میں بڑا ہوگا اور دوسروں کی نگاہوں میں کتے اور خنزیر سے زیادہ

بے وقعت اور ذلیل ہو گا۔‘‘

جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو نعمتیں عطا فرمائیں تو اس سے متعلق انسانی کردار کی خوب تربیت فرمائی کہ دیکھو یہ نعمتیں میرے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق استعمال کرو اور میرا شکر ادا کرو۔ اگر میں یہ نعمتیں واپس لے لوں تو صبر کرو۔ اور جب میں یہ نعمتیں دوں تو اسے اپنے زور بازو اور اپنی محنت کا کمال نہ سمجھنا بلکہ یہ میرا فضل وکرم ہے اور دیکھو تمہیں تو نعمتیں مل گئی ہیں لیکن کچھ لوگ ایسے ہوں گے جن کے پاس یہ نعمتیں نہیں ان کو حقیر مت سمجھنا اور خود تکبر میں مبتلا نہ ہونا۔ نعمتیں ملنے پر اتنا اترانا نہیں، شیخی میں نہ آنا۔

شیخی کا مطلب ہوتا ہے بڑائی، گھمنڈ۔ اردو میں اس کے بعض محاورے بولے جاتے ہیں۔ جیسے شیخی بگھارنا، شیخی مارنا اور شیخی میں آنا یعنی اپنی بڑائی ظاہر کرنا، اپنی تعریف کرنا، ڈینگیں مارنا، اترانا اور اپنے آپ پر گھمنڈ کرتے ہوئے اپنے کو برتر اور دوسرے کو حقیر سمجھنا دراصل غرور اور تکبر کے نتیجہ میں انسان شیخی کے انداز اپناتا ہے۔ کبھی انسان اپنے آپ کو مال و دولت میں دوسروں سے زیادہ سمجھتا ہے کبھی علم یا عبادت میں اپنے آپ کو زیادہ درجہ والا سمجھنا شروع کر دیتا ہے کبھی خاندان اور برادری میں بڑائی میں مبتلا ہو جاتا ہے کبھی دنیا کے مرتبے اور عہدوں کی بڑائی میں دوسروں کو حقیر اور اپنے آپ کو بڑا ظاہر کرنے لگتا ہے۔

جس کے نتیجہ میں انسان اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ افراد کی فہرست میں سے نکل جاتا ہے۔ **ان اللہ لا یحب کل مختال فخور۔**

اب ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ آخر جب انسان کو کوئی عہدہ ملتا ہے، کوئی نعمت نصیب ہوتی ہے یا کوئی اچھے کپڑے پہنے تو دل میں اچھا ہونے کے خیالات کا پیدا ہونا فطری بات ہے تو کیا یہ کوئی بری بات ہے؟ اس کا جواب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم میں روایت منقول ہے کہ ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہو گا وہ جنت میں نہیں جائے گا تو ایک شخص نے عرض کیا **ان الرجل یحب ان یکون ثوبہ حسنا و نعلہ**

حسنا یعنی ایک شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا لباس اچھا ہو اور اس کا جوتا اچھا ہو تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

﴿ان اللہ جمیل یحب الجمال﴾

بے شک اللہ جمیل ہے اور حسن و جمال کو پسند کرتا ہے لیکن تکبر یہ ہے کہ حق بات کو جھٹلانا اور دوسرے لوگوں کو حقیر سمجھنا۔

معلوم ہوا کہ نعمت ملنے پر خوش ہو جانا اچھی بات ہے لیکن پھر دوسروں کو حقیر سمجھنا اور اس نعمت پر اترانا گناہ ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں عطا فرمائی ہوں ان کے بارے میں لوگوں کو بتانا بھی شیخی مارنا نہیں کہلاتا بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو قرآن مجید میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی تعلیم دی اما بنعمة ربك فحدث۔ یعنی اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو بیان کرو۔ لیکن بیان کرنے کا سلیقہ یہ سکھایا کہ اس میں مجھے یہ نعمت ملی ہے اور پھر ملنے والی نعمت کے ذریعہ دوسرے انسانوں کے کام آئے، والدین، رشتہ دار، ہمسائے کے حقوق ادا کرے تو پھر انسان شیخی کے ہر انداز سے بچ جاتا ہے۔

ماہرین نفسیات نے اس پر خوب تحقیق کی ہے جو انسان معاشرے میں شیخی مارتا ہے وہ دراصل احساس کمتری میں مبتلا ہوتا ہے اور شیخی کے انداز اپنانے والے شخص کی معاشرے میں کچھ بھی عزت نہیں ہوتی۔ بظاہر لوگ اس کے معاشرتی مرتبہ کی وجہ سے اس کے سامنے خاموش رہتے ہیں یا اس کی بڑی آؤ بھگت کرتے ہیں لیکن کسی کے دل میں ایسے انسان کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔

امام غزالیؒ نے شیخی مارنے کے مختلف انداز و اطوار کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اہل علم اور عبادت گزار لوگوں کے شیخی مارنے کا انداز مختلف ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں کہ جب کسی کو علم نصیب ہوتا ہے تو منہ سے یہ جملے نکلنے لگتے ہیں کہ دیکھیں فلاں شخص کو یہ بات بھی معلوم نہیں اور اسے تو یہ بھی پتہ نہیں۔ گویا وہ اپنے ہم مجلسوں کو یہ بتانا چاہتا ہے کہ مجھے یہ سب کچھ معلوم ہے۔ اسی طرح شیخی کا یہ انداز بھی انسان کو دوسرے انسان کی نگاہوں سے گرا دیتا ہے

کہ جب پابندی سے نماز پڑھنی شروع کی تو اب لوگوں کے سامنے تو بڑا برا لگتا ہے کہ میں نمازیں پڑھتا ہوں لیکن اس میں شیخی کا انداز یہ آجاتا ہے کہ دیکھیں فلاں نمازیں نہیں پڑھتا۔ یعنی میں پڑھتا ہوں۔ یا حج اور عمرہ کر کے انسان آئے تو زبان سے یہ کلمات نکلنے لگیں کہ دیکھیں فلاں کے پاس اتنا پیسہ ہے لیکن حج نہیں کرتا۔ اب ایسا انسان معاشرہ میں اپنی قدر کھو دیتا ہے۔

ارشاد نبوی ہے:

﴿بئس العبد عبدتخیل و اختال﴾

''فرمایا کہ برا ہے وہ بندہ جو شیخی کے انداز اپنائے اور تکبر کرے۔''

یہ تو جب تھا کہ انسان کے اندر وہ خوبیاں ہوں لیکن جب شیخی کے انداز اپنانے کی عادت پڑ جاتی ہے تو پھر انسان جھوٹ کی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے اس لیے کہ ڈینگیں مارنے والے شخص کو جب اس کام میں مزہ آنے لگتا ہے تو پھر وہ اپنی طرف ایسی خوبیاں اور بڑائیاں منسوب کر لیتا ہے جو اس میں نہیں ہوتیں اور اس طرح وہ جھوٹ بولنے کا بھی مرتکب ہو جاتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کیفیت کی بھی اصلاح فرمائی اور فرمایا کہ جب انسان اپنے بارے میں ایسی خوبیاں بیان کرنے لگتا ہے جو اس میں نہیں ہوتیں تو پھر ''**فضح الامتحان مایدعیہ**'' یعنی اللہ تعالیٰ اس پر ایسی آزمائش ڈال دیتے ہیں کہ وہ لوگوں کے سامنے رسوا ہو جاتا ہے اور سارا پول کھل جاتا ہے اور لوگوں کے دلوں میں ایسے شخص کی کچھ بھی عزت نہیں رہتی۔ درحقیقت شیخی کے انداز اپنانے کے بارے میں ہمارے خالق و مالک نے جب فرمایا کہ **ان اللہ لا یحب کل مختال فخور**۔ جب بندہ اللہ کے پسندیدہ افراد میں سے نکل گیا تو اللہ کے بندوں کے دلوں میں اس کی عزت کیسے ہوگی۔

اللہ رب العزت ہم سب کو نعمتیں عطا فرمائے لیکن اللہ تعالیٰ ہمیں ہر ایسے عمل سے محفوظ رہنے کی توفیق عطا فرمائے جو دنیا و آخرت میں رسوائی کا سبب بنے۔

☆☆☆

نگاہ کی حفاظت کیجیے!

﴿عن عبدالله بن مسعود رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ان الله عزوجل یقول النظر سهم من سهام ابلیس مسموم من ترکها مخافتی ابدلته ایمانا یجد حلاوته فی قلبه﴾ (رواه ابن کثیر)

''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ حدیث قدسی بیان فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں آنکھ کی نظر شیطان کے تیروں میں سے ایک زہریلا تیر ہے۔ پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو شخص میرے خوف سے (دل کے تقاضے کے باوجود) اپنی نگاہ کی حفاظت کر لے میں اس کے بدلہ میں اسے ایسا پختہ ایمان دوں گا کہ جس کی لذت اور مٹھاس کو وہ اپنے دل میں محسوس کرے گا۔''

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مردوں اور عورتوں دونوں کو نگاہوں کی حفاظت کا حکم فرمایا ہے۔ ارشاد باری ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایمان والے مردوں سے کہہ دیجیے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی عفت کی حفاظت کریں یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے اس کے بعد ارشاد باری ہے کہ آپ عورتوں سے بھی کہہ دیجیے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی عفت و عصمت کی حفاظت کریں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو جسمانی نعمتیں عطا فرمائی ہیں ان میں آنکھیں اللہ کی بہت بڑی نعمت ہیں اور یہ ایسی نعمت ہے جو بغیر مانگے مل گئی، نہ کوئی محنت کرنا پڑی نہ پیسہ خرچ کرنا پڑا۔ جو لوگ اس نعمت سے محروم ہیں ان ہی سے اس نعمت کی قدر و منزلت معلوم ہوسکتی ہے۔

جس قدر سائنسی تحقیقات آگے بڑھ رہی ہیں ماہرین نے آنکھ اور اس کے اندر کے حالات کو ایک الگ کائنات قرار دے دیا ہے اس دیکھنے کے عمل کو انسان کی زندگی میں بڑی

اہمیت ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جو انسان کا خالق ہے اس نے اس آنکھ کی مشین کو استعمال کرنے کا سلیقہ سکھایا ظاہر ہے کہ مشین بنانے والے کی ہدایات کے مطابق مشین کو نہ چلایا جائے تو وہ مشین کیسے درست رہ سکتی ہے۔

اللہ رب العزت نے آنکھ کے استعمال کی جگہیں بتائی ہیں کہ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی چیزوں کو دیکھئے اور اللہ کی قدرت کا دل سے یقین کیجیے پھر اس کے احکام کے مطابق زندگی گزاریئے۔ قرآن حکیم میں کئی انداز سے اس کی تعلیم دی گئی یہاں تک فرمایا جیسا کہ ترمذی میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ اس آنکھ کے ذریعہ محبت سے ماں باپ کی طرف دیکھو گے تو ایک حج اور عمرہ کا ثواب ملے گا۔

جب اس آنکھ کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق استعمال کیا جائے تو یہی عبادت اور ثواب کا ذریعہ بنتی ہے اور اگر اس آنکھ کا استعمال احکام الٰہیہ کے خلاف کیا جائے، نگاہ کا استعمال غلط ہونے لگے تو پھر اس انسان کا ذہن بھی برے خیالات کا مرکز بن جاتا ہے۔ دماغ کی کمزوری اور حافظہ کی کمزوری سامنے آتی ہے، کاموں میں دل نہیں لگتا، نیند کم ہو جاتی ہے، قوت ارادی ختم ہو جاتی ہے، یہ ساری مشکلات صرف آنکھ کی حفاظت نہ کرنے کی بنا پر پیش آتی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ حدیث قدسی بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نقل فرمایا:

﴿النظر سهم من سهام ابليس مسموم من تركها مخافتي ابدلته ايمانا يجد حلاوته في قلبه﴾

”فرمایا کہ آنکھ کی نظر شیطان کے تیروں میں سے ایک زہریلا تیر ہے پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو شخص میرے خوف سے باوجود دل کے تقاضے کے اپنی نگاہ کی حفاظت کر لے میں اس کے بدلہ میں اسے ایسا پختہ ایمان دوں گا کہ جس کی لذت اور مٹھاس کو وہ اپنے دل میں محسوس

کرے گا۔‘‘

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نگاہ کی حفاظت کے بارے میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی باقاعدہ تربیت فرماتے ایک مرتبہ فرمایا کہ تم راستوں میں بیٹھنے سے بچا کرو اگر ضرورت کی وجہ سے راستہ میں بیٹھنا پڑ جائے تو راستہ کا حق ادا کیا کرو۔ عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راستہ کا حق کیا ہے؟ فرمایا کہ نظریں نیچی رکھنا، کسی کو تکلیف نہ دینا، سلام کا جواب دینا، نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا۔

حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے ایک بار پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اچانک نظر پڑ جائے تو اس کا کیا حکم ہے ارشاد فرمایا:

﴿اصرف بصرك﴾

’’اپنی نگاہ پھیرلو۔‘‘ (رواہ مسلم)

سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد باری ہے:

﴿ان السمع والبصر والفؤاد كل اولئك كان عنه مسؤلا﴾

’’بے شک ہر شخص سے کان، آنکھ اور دل کے اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

انسان سوچتا ہے کہ یہ تو بڑا مشکل کام ہے لیکن ہمت کر کے انسان نگاہ کی حفاظت کرنا شروع کر دے تو بہر حال اس پر قابو پا سکتا ہے۔ اور اس میں بڑی خوبصورت بات ہے۔

﴿النفس كالطفل ان تهمله شب على حب الرضاع وان تفطمه ينفطم﴾

’’یعنی انسان کا نفس تو ایک بچے کی طرح ہے اگر دودھ پینے کی عادت اس سے نہ چھڑاؤ تو یہ جوانی میں بھی شیر خوارگی کی کیفیت میں رہے گا اور اگر دودھ چھڑاؤ گے تو چھوڑ دے گا۔

چنانچہ انسان اگر یہ چاہے کہ اس کی زندگی پرسکون ہو، اس کے خیالات پاکیزہ ہوں، اس کی جسمانی اور روحانی صحت اچھی رہے تو اسے اپنی نگاہوں کی حفاظت کرنا چاہیے۔ نگاہوں کی حفاظت کے فائدے اور نقصانات ذہن میں رکھے۔ قرآن حکیم اور سیرت طیبہ کا مطالعہ کرتا رہے اپنے گھر ماحول اور درودیوار کو پاکیزہ رکھے اپنی نشست و برخاست کو پاکیزہ بنائے تو یقینی طور پر نگاہوں کی حفاظت ایک آسان عمل ثابت ہوگا۔

اللہ رب العزت ہم سب کو آنکھوں کی قدر کرنے اور اس کے صحیح استعمال کی توفیق عطاء فرمائے۔



غیرت کے تقاضے

﴿عن عائشة رضی الله عنها...... قال رسول الله صلی الله علیه وسلم یا امة محمد والله مامن احدا غیر من الله﴾

(متفق علیه)

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کسوف (سورج گہن) کے خطبہ میں فرمایا، اے امت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کی قسم اللہ سے زیادہ کوئی غیرت مند نہیں۔''

غیرت عربی زبان کا لفظ ہے جس کا ترجمہ اردو میں حمیت، لحاظ، شرم، حیا کرتے ہیں۔ چنانچہ غیرت منداس شخص کو کہتے ہیں جو خوددار، حیادار اور حمیت والا ہو۔ چنانچہ ایسا شخص جو گناہ اور برائی کی نفرت دل میں رکھتا ہو اور گناہ ہوتا دیکھ کر اس کے اندر ایک جوش اور ولولہ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہو کہ وہ اس غلط کام سے بچنے کی کوشش کرتا ہو اور لوگوں کو اس برائی سے روکتا رہے یہی غیرت مند شخص کی کیفیات ہیں۔

ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے پوچھا کہ اگر کوئی اپنی بیوی کے ساتھ کسی غیر مرد کو دیکھ لے تو کیا کرے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چارعینی گواہ پیش کرے۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ جو فطرتاً غیر معمولی غیور تھے وہاں بیٹھے تھے وہ بولے، اگر میں ایسا دیکھ لوں تو میری غیرت برداشت نہ کر سکے میں اسی وقت تلوار اٹھاؤں گا اور اس کے دو ٹکڑے کر دوں گا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا، سعد کی غیرت پر کیوں تعجب کرتے ہو۔ خدا گواہ ہے میں خود اس سے زیادہ غیرت مند ہوں اور میری غیرت سے بڑھ کر خود اللہ رب العزت کی غیرت ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ظاہر و باطن کی تمام فواحش کو حرام قرار دیا ہے وہ کھلا ہو یا پردہ پوشی کے ساتھ۔

اس ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہوا کہ غیور اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور یہ صفت اللہ نے بندوں کو بھی اختیار کرنے کا حکم دیا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کی ذات اقدس میں تمام انسانوں سے زیادہ غیرت کی صفت موجود تھی۔

یہی وہ غیرت کی صفت ہے جس کی بنیاد پر انسان خود برائی سے بچتا ہے اور دوسروں کو برائی سے روکتا ہے۔

ارشاد نبوی ہے:

﴿من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ وذلك اضعف الایمان﴾

''فرمایا کہ جو شخص تم میں سے برائی دیکھے وہ زور بازو سے اسے روکے اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے روکے اور اگر اس کی طاقت نہ ہو تو کم ازکم غیرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس برائی کو دل سے برا سمجھے اور فرمایا کہ یہ کمزورترین ایمان کی حالت ہے۔''

معلوم ہوا کہ غیرت مندی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان خود بھی برائیوں اور گناہوں سے بچے اور دوسروں کو بھی برائیوں سے روکتا رہے۔ بخاری شریف میں روایت موجود ہے کہ ایک مرتبہ جب سورج گہن ہوا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ کسوف میں لوگوں کو گناہوں سے روکتے ہوئے یہ بھی فرمایا:

﴿یاامۃ محمد واللہ انہ لا احد اغیر من اللہ﴾

''اے امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی قسم اللہ سے بڑھ کر کوئی غیرت والا نہیں۔''

چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی اللہ کے احکام کے خلاف کوئی بات دیکھتے تو آپ کی غیرت انتہائی جوش میں آجاتی۔ جب ایک عورت فاطمہ بنت الاسود نے چوری کی، سزا دینے کا حکم صادر فرمایا، معافی کی سفارش آئی تو سفارش کرنے والے سے فرمایا کیا تم اللہ کی مقرر کردہ حدود میں سفارش کرتے ہو؟ پھر فرمایا خدا کی قسم اگر فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ ضرور کاٹا جاتا۔

لیکن اپنے ذاتی معاملات اور ذاتی مفادات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا

معاملہ مختلف ہوتا وہاں غیرت کا اظہار کرنے کے بجائے عفو و درگزر سے کام لیتے۔ ذاتی موقع آئے تو وہاں اپنے چچا حمزہؓ کا کلیجہ چبانے والی ہندہ کو بھی معاف کر دیا۔

جب کہ اہلِ عرب نے اس وقت اپنے طور پر غیرت کے تقاضے بنا رکھے تھے اور ان کے نزدیک غیرت کے معیار کچھ اور ہی تھے۔ فلاں کے اونٹ نے میرے اونٹ سے پہلے پانی کیوں پیا، فلاں کا اونٹ میرے اونٹ سے آگے کیوں نکل گیا۔ فلاں نے میرے خاندان یا میرے باپ دادا کے بارے میں یہ کیوں کہا، سالہا سال انہی باتوں پر خون بہائے جاتے تھے۔ یا پھر بیٹی کی پیدائش کو غیرت کے خلاف سمجھتے۔ سورہ نحل میں ارشاد باری ہے:

﴿واذا بشر احدهم بالانثى ظل وجهه مسودا وهو كظيم يتوارى من القوم من سوء مابشر به ايمسكه على هون ام يدسه فى التراب﴾

"ان میں سے جب کسی کو بیٹی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی تو اس کا چہرہ بے رونق ہو جاتا اور دل ہی دل میں گھٹتا رہتا اور بری خبر کی شرم سے لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا کہ اس ذلت کو برداشت کرے یا اسے مٹی میں گاڑ دے۔"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے وقت اس معاشرے میں غیرت مندی کے ایسے معیار تھے لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیرت کے ان تمام معیاروں کو بدل کر رکھ دیا۔

اللہ رب العزت ہمیں بھی زمانہ جاہلیت کے ان غیرت کے معیاروں سے محفوظ فرمائے۔ اور خیر مجسم ﷺ جیسی غیرت مندی نصیب فرمائے۔

گھریلو زندگی میں مغربی تہذیب کی نقالی کے برے اثرات

﴿عن ابن عباس رضی الله تعالیٰ عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لیس منا من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیر نا ویامر بالمعروف وینه عن المنکر﴾

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے ہمارے بڑوں کی عزت وتو قیر نہ کرے، نیکی اور بھلائی کا حکم نہ دے اور برائی سے نہ روکے۔''

عائلۃ عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے خاندان، کنبہ، گھرانہ، اس لیے گھریلو زندگی کو عائلی زندگی کہا جاتا ہے اور اسلام نے گھریلو زندگی کے جو اصول وآداب سکھائے ہیں وہ اسلام کا عائلی نظام ہے۔

عائلی زندگی یا گھریلو زندگی سے مراد شوہر اور بیوی کی زندگی ہے اور جب ان کے ہاں اولاد ہو تو یہی شوہر باپ اور بیوی ماں کہلاتی ہے تو اب اس گھریلو زندگی کے افراد ماں باپ اور اولاد ہیں۔

گھریلو زندگی اختیار کر کے مل جل کر زندگی بسر کرنا اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں شامل فرمایا ہے۔ چنانچہ اللہ رب العزت نے انسان کو گھریلو زندگی کے آداب سکھائے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ سے گھریلو زندگی کا ایک مکمل نظام عطا فرمایا ہے اور گھریلو زندگی سے بچ کر تنہائی اختیار کرنے کو پسند نہیں فرمایا۔

اسلام نے گھریلو زندگی کا جو نظام دیا ہے اس کا خاکہ یہ ہے کہ ایک طرف تو شوہر

کے فرائض مقرر کیے جو بیوی کے حقوق ہیں اور دوسری طرف بیوی کے فرائض مقرر کیے جو شوہر کے حقوق ہیں۔ان دونوں کو ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کا پابند بھی کیا۔ پھر جب زندگی کا یہ نظام اور آگے بڑھا تو اب یہ میاں بیوی، ماں باپ کہلائے۔ اور ان کے سامنے اولاد ہے۔ اب اسلام نے ماں باپ کے کچھ فرائض مقرر کیے جو اولاد کے حقوق ہیں اور اولاد کے ذمہ کچھ فرائض مقرر کیے جو ماں باپ کے حقوق ہیں۔ ان تمام فرائض وحقوق کی ادائیگی کے ساتھ جو گھریلو زندگی کا ایک نظام سامنے آتا ہے وہ اسلام کا گھریلو نظام زندگی ہے۔

اسلام نے گھریلو زندگی کے مقاصد بھی واضح کیے کہ آخر زندگی کا یہ طرز کیوں اختیار کیا جائے چنانچہ گھریلو زندگی کے بنیادی مقاصد میں سے ایک مقصد نسل انسانی کی بقاء اور تحفظ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ میں مرد وعورت کے باہمی پاکیزہ تعلق کو "**نساء کم حرث لکم**" سے تعبیر فرمایا کر یہ گھریلو زندگی نسل انسانی کی بقاء کا ذریعہ ہے۔

گھریلو زندگی کا دوسرا اور اہم مقصد تربیت اولاد ہے یہی تربیت اولاد کے دین اور دنیا سنوارنے کا سبب ہے اور ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفرقان میں اپنے نیک بندوں کی یہ خوبی بتائی کہ وہ یہ دعا مانگتے ہیں۔ **ربنا هب لنا من ازواجنا و ذريتنا قرة اعين** ۔اے اللہ! ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما۔

گھریلو زندگی کا تیسرا مقصد تحفظ عصمت ہے یعنی گھریلو زندگی کے ذریعہ مرد وعورت فطری تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے پاکیزہ زندگی گزارتے ہیں۔

گھریلو زندگی کا چوتھا مقصد راحت وسکون حاصل کرنا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿**ومن آياته ان خلق لكم من انفسكم ازواجا لتسكنوا اليها**﴾ (سورۂ روم آیت ؅)

"اور اللہ کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہی میں سے تمہارے

لیے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے سکون پاسکو۔‘‘

گھریلو زندگی کا پانچواں مقصد احساس ذمہ داری ہے کہ اسلام نے مرد وعورت کے لیے کچھ فرائض مقرر کیے، ارشاد نبوی ہے:

﴿الا کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته﴾

’’آگاہ رہو تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور جو لوگ اس کے زیر نگرانی ہیں ان کے بارے میں اس سے پوچھا جائے گا۔‘‘

اب انسان سوچ رہا ہے اور فکر مند ہے کہ آخر اسے گھریلو زندگی کے یہ اہم مقاصد کیوں حاصل نہیں ہو رہے۔ یہ انسان اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک کا طلب گار ہے گھر میں سکون کا متلاشی ہے محبت وخلوص کیلئے ترس رہا ہے باہمی احترام و اعتماد کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ اگر ان تمام باتوں کی مجموعی وجہ تلاش کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس انسان کی زندگی اسلام کے عطا کردہ گھریلو نظام زندگی سے دور ہو رہی ہے اور یہ انسان گھریلو زندگی میں مغربی تہذیب کی نقالی میں مصروف ہو رہا ہے۔

دراصل ہر نظام کچھ نظریات پر مبنی ہوتا ہے موجودہ مغربی تہذیب درحقیقت رہبانیت یعنی دنیا کو چھوڑ چھاڑ کر معاشرہ سے کٹ کر زندگی گزارنے کے ردعمل میں وجود میں آئی ہے۔ اب اس کی بنیاد ہی انکار خدا ہے۔ اس مغربی تہذیب کی بنیاد پر انسان کو ہر معاملے میں آزادی دی جائے۔ اپنی سوچ، اپنے عمل و کردار اور اپنی پسند و ناپسند میں مذہب کی طرف سے کوئی پابندی نہ ہو۔ ہر شخص اپنی خواہشات کو پورا کر کے خود کو مطمئن کرنے میں مکمل آزاد ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شوہر اور بیوی کے درمیان اسلام نے جو باہمی محبت وسکون، اعتماد اور تحفظ عصمت کا جو رشتہ قائم کیا تھا وہ اختیارات اور آزادی کی نذر ہو گیا۔ گھریلو زندگی کے یہ دو اہم ستون یعنی شوہر اور بیوی ایک دوسرے کے حقوق اداء کرنے کی بجائے اپنی ضروریات، اپنی خواہشات اور اپنے وقتی مسائل کے پیچھے دوڑنے لگے جس کے نتیجہ میں فیملی لائف کا مغربی تہذیب میں تصور ختم ہو گیا۔

پھر جب اولاد ہوتی ہے تو اگر ماں باپ دیندار، بااخلاق، زبان وعمل کے پاکیزہ ہوں تو یہی صفات اولاد میں منتقل ہو جاتی ہیں پھر اولاد بھی فرمانبردار، باکردار، بااخلاق اور محبت واحترام کرنے والی ہوتی ہے اس لیے کہ اسلام نے یہ سکھایا ہے جیسا کہ سنن ترمذی میں ارشادنبوی منقول ہے کہ ماں باپ کے چہرہ کی طرف ایک محبت بھری نظر دیکھنے سے ایک حج اور عمرہ کا ثواب ملتا ہے اور پھر اسلام نے بزگوں کو یہ سکھایا کہ چھوٹوں پر شفقت کرو، اور چھوٹوں کو یہ سکھایا کہ بزرگوں کا احترام کرو۔

نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کے گھریلو نظام زندگی میں جنریشن گیپ یعنی دونسلوں کے درمیان فاصلہ پیدانہیں ہوتا۔لیکن مغربی تہذیب کے گھریلو نظام زندگی میں جنریشن گیپ اس قدر پیدا ہوگیا ہے کہ وہاں ان ممالک میں اولاد نے اپنے بزرگوں کو''اولڈ ہومز'' میں پہنچا دیا۔ ذرا ماں باپ نے تربیت کی خاطر سختی کی بچے نے پولیس کوفون کیا باپ کو''اولڈ ہاؤس'' پہنچا دیا، اس لیے مغربی تہذیب میں وہاں کے معاشرے کے بزرگوں کے لیے الگ جگہ بنا دی ہے۔

ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ آخر اسلام کے ایک مکمل گھریلو نظام زندگی سے رخ موڑ کر مغربی تہذیب کی نقالی کیوں کر آتی ہے۔تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جب مسلمانوں کے ذہن میں مغربی تہذیب کی طرف سے یہ بات بٹھا دی جائے کہ یہ دین اسلام قدیم زمانہ کا مذہب ہے اب یہ قابل عمل نہیں اور خود مسلمانوں کے اندر اسلامی نظام زندگی کے بارے میں تعارف نہ ہو۔تو پھر ایک انسان کے اندر اپنے نظام کے بارے میں احساس کمتری پیدا ہوتی ہے اس کے نتیجہ میں وہ دوسرے نظام کی نقالی کرتا ہے اوراسی نظام زندگی کے مطابق اپنی زندگی کا معیار بنالیتا ہے۔

چنانچہ آج ہم جب گھریلو زندگی میں معاشی پریشانیوں کا جائزہ لیتے ہیں تو وہاں اور دوسرے اسباب کے ساتھ ساتھ جوشخص مغربی تہذیب کی نقالی میں اپنے ذہن میں ایک معیار زندگی بنا لیتا ہے پھر اسی معیار پر بیوی بچوں کو چلانا چاہتا ہے لیکن اتنے وسائل نہیں ہوتے تو

پھر وہ گھریلو طور پر انتہائی پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایسی گھریلو زندگی میں گھر کے ہر فرد کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی خواہش کو پورا کرنا، ناشکری، بے صبری، حرص و لالچ، بے حسی اور خود غرضی آ جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس گھریلو نظام میں نہ آپس کا احترام ہو گا، نہ محبت ہو گی، نہ گھریلو زندگی میں سکون ہو گا نہ اولاد سے آنکھوں کو ٹھنڈک ملے گی۔

لیکن جب شوہر اور بیوی میں اور ان کی اولاد میں اسلام کے نظام زندگی کے مطابق صبر و شکر، قناعت و ایثار، احسان اور خدمت اور باہمی احترام و محبت کی فضا موجود ہو تو پھر انسان اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھے گا کہ اسلامی نظام زندگی سے جو قرار و سکون حاصل ہوتا ہے وہ دولت کے انبار سے میسر نہیں ہوتا۔

اللہ رب العزت ہمیں اپنے گھروں میں اسلام کے گھریلو نظام زندگی کو رائج کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔



کامیاب زندگی گزارنے کے لیے نفسانی خواہشات کا جائزہ

﴿عن عبداللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یؤمن احدکم حتی یکون ھواہ تبعالما جئت بہ﴾

(رواہ فی شرح السنۃ)

''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے کوئی کامل مومن نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ اس کی خواہش دین کے تابع نہ ہو جائے۔''

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ونفس وما سوھا فالھمھا فجورھاوتقوھاقدافلح من زکاھا وقد خاب من دساھا﴾ (سورۃ الشمس)

''قسم ہے نفس کی اور اس کی جس نے اسے درست کیا پھر اسے اس کی نافرمانی اور پرہیزگاری بتائی تحقیق وہ شخص کامیاب ہوا جس نے اس نفس کو پاکیزہ بنایا اور ناکام ورسوا ہوا وہ شخص جس نے اسے خاک آلود کیا۔''

اللہ رب العزت نے دین اسلام کے ذریعہ جہاں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تعلیم دی وہاں نفس کے حقوق سے بھی آگاہ کیا۔

نفس انسان کے اندر ایک ایسی قوت کا نام ہے جس سے انسان اپنے لیے خیر یا شر چاہتا ہے۔ کبھی انسان اس کو ذات سے تعبیر کرلیتا ہے کبھی اپنے دل سے تعبیر کرلیتا ہے۔ جیسے یہ جملہ سننے کو ملتا ہے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں کام کروں اور میرا دل یہ نہیں چاہتا، دراصل یہ انسان کا نفس ہے جس سے انسان کسی چیز کی خواہش کرتا ہے چاہے وہ خواہش اچھی ہو یا بری۔

جس طرح بندوں میں سے مختلف افراد کے حقوق مختلف ہوتے ہیں اسی طرح نفس کی حالت کے اعتبار سے اس کے حقوق مختلف ہوتے ہیں۔

چنانچہ اللہ رب العزت نے قرآن حکیم میں نفس کی تین حالتیں بتائی ہیں اگر وہ ذہن میں ہوں تو نفس کی حقیقت اور پھر اس کے حقوق بخوبی ذہن میں آ جاتے ہیں۔

قرآن مجید میں نفس کی ایک حالت نفس مطمئنہ، دوسری حالت نفس امارہ اور تیسری حالت نفس لوامہ بیان کی گئی ہے۔ اگر نفس خیر کی طرف مائل ہو، اللہ تعالیٰ کی عبادت اور فرمانبرداری میں انسان کو خوشی حاصل ہو دین اسلام کے احکام پر عمل کر کے سکون و اطمینان محسوس ہو تو یہ نفس مطمئنہ ہے۔ اس حالت کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفجر کی ستائیسویں آیت میں فرمایا ہے:

﴿یایتھا النفس المطمئنة ارجعی الی ربك راضية مرضية فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی﴾

”اے مطمئن نفس! اپنے رب کی طرف چل اس حال میں کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ پس میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔“

یہ نفس مطمئنہ کی حالت تھی دوسری حالت نفس امارہ کی ہے اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۂ یوسف کی آیت نمبر ترپن (۵۳) میں فرمایا:

”اور میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتا کیونکہ نفس برائی پر ابھارتا ہے مگر جس پر میرا پروردگار رحم کرے۔“

یہاں سے نفس کی دوسری حالت معلوم ہوئی۔ یعنی نفس اگر برائی ہی کی طرف لگا رہے دنیا کی خواہشات اور اس کی چیزوں میں نفس کو مزا آئے اور دین اسلام کے احکام سے نفس بچنا چاہتا ہو تو یہ نفس امارہ ہے۔ اسے نفس امارہ اسی لیے کہتے ہیں کہ یہ برائی کا حکم دیتا ہے۔

اب نفس کی ایک تیسری حالت بھی ہے کہ وہ نفس کبھی برائی کی طرف جھکتا ہے من مانی کرتا ہے' اللہ کی نافرمانی کرتا ہے لیکن پھر گناہ ہونے پر شرمندہ ہوتا ہے' اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا ہے یہ نفس لوامہ ہے۔ یعنی ملامت کرنے والا نفس۔ نفس کی اس حالت کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ القیامۃ کی دوسری آیت میں فرمایا:

﴿ولا اقسم بالنفس اللوامة﴾

''اور قسم ہے اس نفس کی جو ملامت کرے۔''

نفس کی ان تینوں حالتوں کو سامنے رکھ کر معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کس طرح کے نفس کے کیسے حقوق ہیں۔ ظاہر ہے کہ صرف نفس کی خواہشات کو پورا کرتے رہنا اسے خوش رکھنا یہ اس کے حقوق ادا کرنا شمار نہیں ہوگا۔ جیسے ایک بچہ شریف النفس ہو، محنتی ہو اسے شاباش دی جائے تو اس کے حق کو ادا کرنا ہے ایک بچہ انتہائی شرارتی ہو، نافرمان ہو تو اس کی اصلاح کرنا اور اسے ہر طرح سمجھانا یہ اس کا حق ہے۔ چنانچہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان تین افراد کے بارے میں معلوم ہوا جن میں سے ایک نے اپنے لیے یہ طے کیا کہ میں کبھی شادی نہیں کروں گا بس عبادت کرتا رہوں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ روزے رکھوں گا تیسرے نے کہا کہ میں کبھی رات کو نہیں سویا کروں گا اور خوب عبادت کروں گا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح فرما دیا کہ تم مجھ سے نیکی اور تقویٰ میں ہرگز آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اور اپنے نفس کے حقوق سے آگاہ کرتے ہوئے یہ تعلیم دی:

﴿ان لنفسك عليك حقا﴾

''بے شک تم پر اپنے نفس کا بھی حق ہے۔''

نفس کو پاکیزہ بنانا اور برائیوں کی آلودگیوں سے بچانا یہ نفس کا حق ہے۔ لہٰذا صرف کھانا پینا، آرام و آسائش مہیا کرنے سے نفس کے حقوق ادا نہیں ہوتے بلکہ نفس کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی خوبیوں سے سجانا نفس کا حق ہے۔ نفس کو سچائی اور صبر کا خوگر بنانا، وعدہ پورا کرنا، امانت، عدل و انصاف، سخاوت، قناعت، دیانت داری، توکل و

تواضع، حلم و بردباری، حیاء، خودداری جیسی اعلیٰ صفات سے اپنے نفس کو آراستہ کرنا یہ نفس کا حق ہے اس لیے کہ اللہ رب العزت نے ہم پر یہ واضح فرمایا۔ **"قد افلح من زکھا"** یقیناً وہ شخص کامیاب ہوا جس نے اپنے نفس کو پاکیزہ بنایا۔ اسی طرح نفس پر اس کی طاقت اور گنجائش کے مطابق بوجھ ڈالنا یہ بھی اس کا حق ہے جس ذات نے ہمارے نفس کو پیدا فرمایا اسی نے ارشاد فرمایا **"لایکلف الله نفسا الا وسعها"** یعنی اللہ تعالیٰ انسان کو اس کی طاقت اور گنجائش کے مطابق ہی اپنے احکام کا مکلّف اور پابند فرماتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے نفس کو ان تمام برائیوں سے بچنے کی تعلیم دی جو اس نفس کو نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ مال کی حرص، جھوٹ، غیبت، چغل خوری، بہتان تراشی، غصہ، حسد، بغض، بخل، فضول خرچی، تکبر، نفرت اور دشمنی جیسی باتوں سے نفس بچانا اس کا حق ہے۔

اللہ رب العزت ہمارے نفس کو نفس مطمئنہ بنا دے۔ گناہوں سے برائیوں سے نفرت ہو۔ آپس میں محبت و الفت ہو، عبادات اور نیکی کا شوق ہو۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہی میں مزا آئے، اسی میں سکون نصیب ہو۔ آمین



علماء کا اُٹھ جانا لمحۂ فکریہ

﴿عن عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان اللہ لا یقبض العلم انتزاعا ینتزعہ من العباد ولکن یقبض العلم بقبض العلماء حتی اذا لم یبق عالم اتخذ الناس رؤسا جھالا فسئلوا فافتوا بغیر علم فضلوا واضلوا﴾ (رواہ البخاری ص ۵)

''حضرت عبداللہ بن عمرو ابن عاصؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، علم آدمیوں سے چھینا نہیں جاتا، لیکن علماء کے مٹنے سے مٹ جاتا ہے یہاں تک کہ جب عالم باقی نہیں رہتے تو لوگ جاہلوں کو سردار اور پیشوا بنا لیتے ہیں، جو علم کے بغیر فتویٰ دیتے ہیں، اس طرح خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور مخلوق کو بھی گمراہ کر ڈالتے ہیں۔''

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قیامت سے پہلے میری امت میں سے تیس دجال اٹھیں گے اور ہر دجال کا دعویٰ یہی ہوگا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں، علم قبض کرلیا جائے گا' فتنے پھیلیں گے اور ہرج بڑھ جائے گا۔ سوال کیا گیا، ہرج کیا ہے؟ فرمایا، قتل! قتل!

بخاری نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت انس بن مالکؓ نے ہم سے فرمایا، میں تمہیں ایک ایسی حدیث سناتا ہوں، جو میرے بعد کسی سے نہ سنو گے۔ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا۔ قیامت کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ علم کم ہو جائے گا' جہل پھیل جائے گا' زنا کو رواج ہوگا' عورتیں زیادہ ہو جائیں گی' مرد کم ہو جائیں گے' حتیٰ کہ پچاس پچاس عورتوں کا ایک ایک مرد رکھوالا بن جائے گا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا علم کو اس کے قبض ہو جانے سے پہلے سیکھ لو، علم کا

قبض ہونا، اہل علم کا اٹھ جانا ہے۔

ابن شہاب زہری کہا کرتے تھے ہم نے علماء سے سنا ہے کہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر استواری میں ہی نجات ہے، علم بڑی تیزی سے سلب ہو جاتا ہے، علمائے حق کے وجود سے دین اور دنیا کا استحکام ہے اور علم کی تباہی، دین و دنیا کی تباہی ہے۔

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر تھے کہ آپ نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی اور فرمایا۔ یہ علم کے اٹھ جانے کا وقت ہے۔ اس پر ایک انصاری بول پڑے علم کیسے اٹھ سکتا ہے جب کہ کتاب اللہ ہمارے ہاتھ میں موجود ہے اور ہم اپنے بچوں اور عورتوں تک کو اس کی تعلیم دے چکے ہیں؟ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں تو تجھے مدینے کے داناؤں میں خیال کرتا تھا۔ پھر اہل کتاب کا ذکر فرمایا، جو کتاب اللہ کی موجودگی میں گمراہ ہو گئے۔

حضرت شداد بن اوس نے اس روایت کی تصدیق کی اور فرمایا۔ تم جانتے ہو، علم کے اٹھ جانے کا مطلب کیا ہے؟ علم کا اٹھ جانا، اہل علم کا مرکھپ جانا ہے۔ تمہیں معلوم ہے، کون سا علم سب سے پہلے اٹھے گا؟ وہ علم، خشوع ہے حتیٰ کہ کسی آدمی میں خشوع نہ پاؤ گے۔

حسن بصری کہا کرتے تھے عالم کی موت سے اسلام میں ایسا شگاف پڑ جاتا ہے کہ گردش لیل ونہار بھی اسے پر نہیں کر سکتی۔

محمد بن سیرین افسوس کیا کرتے تھے کہ علم تو جا چکا اب کچھ یوں ہی تھوڑی سی کھرچن میلے برتنوں میں لگی رہ گئی ہے۔

سعید بن جبیر سے پوچھا گیا قیامت کے آنے اور مخلوق کے برباد ہو جانے کا نشان کیا ہے؟ جواب دیا۔ علماء کا اٹھ جانا۔

حضرت ابو امامہؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خدا نے مجھے تمام مخلوق کے لیے رحمت و ہدایت بنا کر بھیجا ہے۔ پروردگار کا حکم ہے کہ بانسریاں، باجے، شراب اور بتوں کو مٹا ڈالوں۔ میرے پروردگار نے اپنی عزت و جلال کی قسم کھائی ہے کہ میرا جو بندہ دنیا میں شراب پیئے گا اسے بخشوں یا نہ بخشوں، مگر جہنم کا کھولتا ہوا پانی اسے ضرور پلاؤں گا اور

میرا جو بندہ، حرام سمجھ کر شراب سے باز رہے گا، اسے خطیرۃ القدس میں شراب طہور سے ضرور شاد کام کروں گا۔ ہر چیز کی طرح اس دین کے لیے بھی اقبال و ادبار کی منزلیں ہیں دین کا اقبال یہ ہے کہ قوم کی قوم، علم و معرفت کے زیور سے آراستہ ہو اور اس میں اکا دکا ہی فاسق باقی رہ جائیں، وہ ذلیل و خوار ہوں، زبان کھولیں تو دھتکارے جائیں، ستائے جائیں اور مروڑ ڈالے جائیں۔ دین کا ادبار یہ ہے کہ قوم کی قوم علم کو چھوڑ بیٹھے اور اس میں اکا دکا ہی عالم رہ جائیں، جو بالکل مغلوب و ذلیل ہوں۔ بولنے کی ہمت کریں، تو مارے ستائے چور کر ڈالے جائیں اور کہا جائے، ہم سے سرکشی کرتے ہو اور پھر یہ ہو کہ مجلسوں اور بازاروں میں برملا شراب کے دور چلیں۔ اس کے نئے نئے نام رکھ دیئے جائیں، اور یہ ہو کہ اس اُمت کی پچھلی نسلیں، اگلی نسلوں پر لعنت کرنے لگیں، حالانکہ خود انہی پر خدا کی لعنت ہے۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا، تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا جس نے علم کا اٹھنا نہ دیکھا ہو، آج دیکھ لے۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ ہی فرمایا کرتے تھے عالم مرتے چلے جائیں گے اور ان کے ساتھ حق کے نشان بھی مٹتے چلے جائیں گے، یہاں تک کہ جب جاہل زیادہ ہو جائیں گے اور اہل علم فنا ہو چکیں گے تو لوگ جہل پر عمل اور باطل پر یقین کرنے لگیں گے اس طرح گمراہی مکمل ہو جائے گی۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میری امت پر ایک ایسا زمانہ بھی آئے گا، جب پڑھنے والے بہت ہوں گے اور سمجھنے والے کم رہ جائیں گے، علم سلب کر لیا جائے ہرج زیادہ ہو گا۔ عرض کیا گیا، ہرج کیا ہے فرمایا، تمہاری آپس کی خونریزی، پھر ایک زمانہ آئے گا جب میری امت کے بعض لوگ قرآن تو پڑھیں گے مگر وہ ان کے حلق کے نیچے نہ اترے گا۔ پھر ایک زمانہ آئے گا جب منافق، کافروں اور مشرکوں سے کفر میں بحث کرنے لگیں گے۔

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ حسرت سے فرمایا کرتے تھے یہ میں کیا دیکھتا ہوں کہ

تمہارے علماء اٹھ جاتے ہیں اور تمہارے جہلاء علم حاصل نہیں کرتے، لوگو! علم حاصل کر لو اس سے پہلے کہ وہ اٹھا لیا جائے، علم کا اٹھ جانا، اہل علم کا مٹ جانا ہے، یہ میں کیا دیکھتا ہوں کہ تم اس چیز کے پیچھے پڑے ہو، جو تمہیں ضرور ملے گی (یعنی رزق) اور اس چیز سے بے فکر ہو، جس کی تحصیل تم پر واجب ہے (یعنی علم) میں تمہارے شریروں کو اس سے کہیں زیادہ پہچانتا ہوں، جتنا سلوتری گھوڑوں کو پہچانتا ہوں، یہ وہ لوگ ہیں جو نماز کا استقبال پیٹھ موڑ کر کرتے ہیں اور قرآن کان بند کر کے سنتے ہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگلے چلے جائیں اور پچھلے علم نہ سیکھیں۔ اگر عالم مزید علم حاصل کریں، تو ان کا علم بڑھ جائے گا اور خود علم میں ذرا کمی نہ پڑے گی اور اگر جاہل، علم طلب کریں، تو علم کو اپنے لیے ہموار پائیں گے۔ یہ کیا ہے کہ میں تمہیں کھانوں سے لبریز اور علم سے خالی دیکھتا ہوں؟

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس امت کی پہلی نسل ایسے راستے پر استوار ہے جس میں ذرا غبار نہیں، لیکن دوسری نسل میں ظلم و خودغرضی کا ظہور ہوگا۔ تیسری نسل میں فساد خونریزی کا دور دورہ ہوگا۔ چوتھی نسل میں لوگ دین سے دور جا پڑیں گے اور ہر قبیلے کا سردار وہ ہوگا، جو اس میں سب سے زیادہ فاسق، سب سے زیادہ منافق، سب سے زیادہ ذلیل ہوگا۔

داؤد بن الجراح کا بیان ہے کہ سفیان ثوری عسقلان تشریف لائے اور تین دن مقیم رہے، مگر کسی نے ایک مسئلہ بھی ان سے دریافت نہ کیا۔ یہ دیکھ کر فرمانے لگے، سواری کا فوراً انتظام کرؤ میں یہاں سے نکل جاؤں گا یہ ایسا مقام ہے جہاں علم کی موت ہے۔

لوگوں کا رویہ کیسا کیسا تو پھر جیسے کو تیسا ایسے لوگوں سے احسان کیسا

﴿عن حذیفة رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لا تکونوا امعة تقولون ان احسن الناس احسنا وان اظلموا ظلمنا ولکن وطنوا انفسکم ان احسن الناس ان تحسنوا وان اساء وافلاتظلموا﴾

(رواه الترمذی)

''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم دوسروں کی دیکھا دیکھی کام کرنے والے نہ بنو کہ کہنے لگو اگر لوگ احسان کریں گے تو ہم بھی احسان کریں گے اور اگر دوسرے ظلم کا رویہ اختیار کریں گے تو ہم بھی ویسا ہی کریں گے بلکہ اپنے دلوں کو اس پر پکا کرو کہ اگر اور لوگ احسان کریں تب بھی تم احسان کرو اور اگر لوگ برا سلوک کریں تب بھی تم ظلم اور برائی کا رویہ اختیار نہ کرو۔ (بلکہ احسان ہی کرو)''

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ:- ''جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ اذیت پہنچاتے ہیں ان لوگوں کو ان کے اعمال کا ثواب ان کے پروردگار کے پاس ملے گا اور قیامت کے دن ان کو نہ کوئی خطرہ ہوگا اور نہ غمگین ہوں گے۔ بھلائی کی اور مناسب بات کہہ دینا اور درگزر کر دینا بہتر ہے اس صدقہ و خیرات

سے جس کے بعد اذیت پہنچائی جائے۔ اور اللہ بے نیاز اور نہایت تحمل والا ہے۔''

ان آیات میں اللہ رب العزت نے انفاق فی سبیل اللہ کے آداب سکھائے ہیں۔انفاق فی سبیل اللہ کا مطلب ہے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اسے ذاتی طور پر ہمارے صدقہ وخیرات کی ضرورت نہیں ہم جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ وہ بھی تم اپنے لیے ہی خرچ کرتے ہو۔

﴿وما تنفقوا من خیر فلانفسکم﴾ (البقرہ آیت؃)

اس لیے انفاق فی سبیل اللہ کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنا مال اللہ پاک کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق خرچ کرے۔ وہ طریقے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بتائے ہیں۔ اپنی ذات پر خرچ کرنا' بیوی بچوں کے لیئے' والدین کے لیئے' عزیز و اقربا کے لیئے' ہمسایوں کے لیئے' دوسرے محتاج لوگوں کے لیے بیوہ، یتیم، قرض دار، مسافر اور مجاہدین کے لیے اور دین کا کام کرنے والوں کے لیے اور انسانی فلاح و بہبود کا کام کرنے کے لیے۔ غرض یہ کہ زندگی کے بہت سے پہلو ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو خرچ کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں خرچ کرنے کے آداب بھی سکھائے اور خرچ کرنے کے بعد کے آداب بھی سکھائے۔

خرچ کرنے کے لیے پہلا ادب تو یہ سکھایا کہ اخلاص کے ساتھ خرچ کیا جائے یعنی صرف اور صرف اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے خرچ کیا جائے۔ اس خرچ کرنے میں دکھاوا اور ریا کاری، نمود و نمائش نہ ہو ورنہ اخلاص نہیں رہے گا۔

اور ان آیات میں یہ ادب سکھایا کہ جس شخص کو اللہ کے لیے کچھ صدقہ وخیرات دی جائے اس پر نہ تو احسان جتایا جائے اور نہ اس کی کسی طرح دل آزاری کی جائے۔

بسا اوقات انسان کسی کی مالی مدد کرتا ہے تو پھر اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ شخص زندگی بھر اس کا احسان مند رہے۔ اور جب کبھی اس احسان مندی کے خلاف اس شخص کا کوئی

عمل دیکھتے ہیں تو فوراً کہہ دیتے ہیں دیکھو میں نے فلاں وقت میں اس کی مدد کی تھی، اس کی یہ حالت تھی میں مدد کر کے اس کو آج اس حالت میں لایا ہوں لیکن یہ میرا کوئی کام نہیں کرتا یا میرا کہنا نہیں مانتا۔ پھر ایسا انسان دل آزاری اور طعنوں پر اتر آتا ہے۔ اور خاندان میں عزیز و اقارب میں یا دوست احباب میں اسے ذلت و رسوائی کے الفاظ سے یاد کرنے لگتا ہے۔ یہ کیفیات خرچ کرنے والے انسان میں جب آنے لگیں تو پھر اللہ تعالیٰ کا یہ حکم سامنے آتا ہے:

"اے ایمان والو! تم اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور اذیت پہنچا کر ضائع نہ کرو۔"

اس لیے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے پر ثواب اس شرط پر ملتا ہے کہ انسان اللہ کی راہ میں خرچ کر دے اور پھر اس کے بعد نہ احسان جتلائے اور نہ تکلیف پہنچائے۔ معاشرہ میں بسا اوقات اس معاملے میں الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے کہ جی ہم نے اپنے فلاں عزیز اور دوست کے ساتھ فلاں وقت میں اتنا اچھا سلوک کیا اور اس کی مالی مدد کی لیکن آج تک اس سے ہمیں کبھی کوئی فیض نہیں پہنچا لہٰذا معاشرے میں بسا اوقات یہ رواج بن جاتا ہے کہ انسان یہ دیکھتا ہے کہ کون سا رشتہ دار ہم سے میل جول رکھتا ہے اور کون سا شخص ہمارے کس کام آ سکتا ہے بس اس کی مدد کرتے ہیں۔ یہ رویہ بھی اخلاص کے خلاف ہے۔ ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کو یہی باتیں سکھا رہے تھے تو ایک صحابیؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کچھ دوست و احباب اور عزیز و اقارب ہمارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے کیا ہم پھر بھی ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم لوگ خودغرض نہ بنو کہ اگر تمہارے ساتھ کوئی اچھا سلوک کرے تو تم بھی اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو گے ورنہ نہیں پھر فرمایا احسان یہ نہیں کہ لوگ تمہارے ساتھ اچھا سلوک کریں تو تم بھی ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ یہ تو مکافات ہے بدلہ چکانا ہے، احسان تو یہ ہے کہ کوئی تمہارے ساتھ برا سلوک کرے لیکن تم اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔

اس لیے دوسرے کے ردعمل کو دیکھ کر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے ہاتھ نہیں روکنا

چاہیے۔ اس طرح عموماً مالدار لوگوں کے اندر احسان برتری بڑھتا ہے دوسری طرف سائل کا لہجہ اپنی ضرورت کی وجہ سے نارمل نہیں ہوتا تو دینے والا غصہ میں بھڑک اٹھتا ہے اور نامناسب بات کہہ دیتا ہے۔

فرمایا ایک بھلی بات ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی اس میراث سے بہتر ہے جس کے بعد دکھ پہنچایا جائے۔

اللہ رب العزت ہم سب کو محتاجی سے محفوظ رکھے اور اگر اللہ تعالیٰ مال و دولت عطا فرمائے تو اس کو راہ خدا میں مکمل آداب کے ساتھ خرچ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔



اولاد کے لیے عظیم تحفہ

﴿عن سعید بن العاص رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم مانحل و الدولدا من نحل افضل من ادب حسن﴾ (رواہ الترمذی)

''حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کسی باپ نے اپنی اولاد کو کوئی عطیہ اور تحفہ حسن ادب اور اچھی تربیت سے بہتر نہیں دیا۔''

یہ حقیقت ہے کہ نیک اولاد دُنیا میں بہت بڑی نعمت، آنکھوں کی ٹھنڈک اور آخرت کے لیے صدقہ جاریہ ہے لیکن یہی اولاد اگر دینی اور اخلاقی قدروں سے بیگانہ ہو تو ماں باپ کو اس کے لیے ابتداء ہی سے تدابیر اختیار کرنی پڑتی ہیں یہ بات علم نفسیات اور اخلاقیات کے ماہر تسلیم کر چکے ہیں۔ اسلام نے اس طریقے کی مکمل تعلیم دی کہ بچے کو ابتداء ہی سے دینی قدروں سے کیسے روشناس کرایا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر صاحب اولاد پر اس کی اولاد کا یہ حق واضح فرمایا ہے کہ وہ بالکل ابتداء ہی سے اولاد کی دینی تعلیم اور تربیت کی فکر کرے۔ ابتداء سے مراد یہ نہیں کہ جب وہ چلنا شروع کرے اور باتیں کرنا اور سمجھنا شروع کرے تب دینی تعلیم کی فکر کی جائے۔ بلکہ پیدا ہونے کے فوراً بعد دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہنے کی تعلیم دی۔ جدید سائنسی تجربات اور تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ پیدائش کے وقت ہی سے بچہ کے ذہن میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ جو آوازیں وہ کان سے سنے اور جو آنکھوں سے دیکھے اس کا اثر قبول کرتا ہے۔ پھر اس کے بعد نام رکھنے کا مرحلہ آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

﴿اول ماینحل الرجل ولده اسمه فلیحسن اسمهٔ﴾

یعنی آدمی اپنے بچے کو سب سے پہلا تحفہ اس کا نام دیتا ہے اس لیے اسے چاہیے کہ وہ اس کا اچھا نام رکھے۔

اچھا نام وہ ہے جس کا مطلب اچھا ہو غیر اسلامی اور غیر شرعی مفہوم نہ ہو۔ پھر جب بچہ بولنا شروع کرے تو فرمایا

﴿افتحوا علی صیبانکم اول کلمۃ بلا الہ الا اللہ﴾

یعنی جب بچہ بولنے لگے تو اس کی زبان کا افتتاح کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ سے کراؤ۔

معاشرہ میں اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ بچہ کو اچھی خاصی نظمیں، کہانیاں، اپنی زبان اور دوسری زبانوں میں یاد ہوتی ہیں لیکن کلمہ نہیں سنا سکتے۔ اس میں ماں باپ کی بڑی ذمہ داری ہے جب بچہ اور ذرا بڑا ہو تو ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿مانحل والد ولدا من نحل افضل من ادب حسن﴾

''فرمایا کہ کسی باپ نے اچھی تربیت سے زیادہ اچھا تحفہ اپنی اولاد کو نہیں دیا۔''

بچوں کو مہنگے سے مہنگے، خوبصورت ترین کپڑے اور جوتے پہنائے جائیں اچھے سے اچھے کھلونے لا کر دیں لیکن اگر ان میں ادب و احترام نہیں سلیقہ، تمیز نہیں' اس کے اخلاق بہتر نہیں تو یقین جانیں محض پیسہ خرچ کر دینے سے اولاد آنکھوں کی ٹھنڈک نہیں بنتی۔ سادہ سا بچہ ہو سادے سے کپڑے پہنے ہوں، اچھے اخلاق اور اسلامی قدروں سے آراستہ ہو تو وہ اپنے ماں باپ کی تربیت کا چلتا پھرتا اشتہار ہوتا ہے۔

ایک صاحب اپنے بچے کے بارے میں شکایت لے کر آئے کہ اس کی زبان پاکیزہ نہیں اور بات کرنے کی تمیز تو بالکل نہیں۔ میں نے گذارش کی کہ میں انشاء اللہ سمجھا دوں گا آئندہ نہیں کرے گا تو بچہ کے والد نے خوب بڑی سی گالی نکال کر بڑے عجیب انداز میں کہا، جناب میں نے اسے خوب سمجھایا ہے یہ اس طرح ٹھیک نہیں ہو گا اس کی ہڈیاں توڑ دیں، میں

نے اسی وقت بچے کو باہر بھیج دیا اور اس کے والد سے کہا، جناب بیماری کی تشخیص تو ہو چکی ہے پہلے آپ اپنی زبان پاکیزہ بنائیں، اپنے اخلاق بہتر بنائیں پھر بچہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔

ہر بچہ وہی کرتا ہے جو اس کے ذہن میں نقش ہوتا ہے اور نقش وہی کچھ ہوتا ہے جو وہ کانوں سے سنتا ہے، آنکھوں سے دیکھتا ہے، گھر میں آئے دن میاں بیوی کے جھگڑے آپس کی بدزبانی، ماں باپ کا بچوں سے منفی انداز میں گفتگو کرنا، یہ سب کچھ اس کے ذہن میں ریکارڈ ہو جاتا ہے۔ پھر ذہن میں جب وہ کیسٹ چلتی ہے تو منہ سے وہی کچھ سننے کو ملتا ہے۔ کیسٹ میں ریکارڈ کچھ اور کیا جائے، سنا کچھ اور جائے یہ کیسے ممکن ہے۔

اس لیے اولاد کو دینی قدروں سے آگاہی کی پہل تدبیر، تدبیر منزل ہے۔ اپنے گھروں کو انہی قدروں سے بچانے کے بعد اولاد پر اس کے نقش یقیناً آئیں گے۔ ایک ماں اپنے بچے کو استاد کے پاس لے گئی استاد صاحب نے قاعدہ شروع کرایا۔ بچے کو الف ب بھی نہیں آتی تھی لیکن بچے نے بتایا کہ اسے قرآن حکیم کے پندرہ پارے زبانی یاد ہیں اور پھر سنائے بھی۔ استاد بہت حیران ہوئے۔ ماں کو بلایا تو اس نے بتایا کہ دراصل بات یہ ہے کہ میں جب اسے سلاتی تھی تو لوری سناتے وقت قرآن مجید پڑھتی تھی۔ اس نے بار بار سنا اور سن کر یاد کر لیا۔ لیکن مجھے صرف پندرہ پارے یاد تھے اس لیے باقی قرآن حکیم اسے یاد نہ ہوا یہ بچے کا بچپن تھا بڑے ہو کر ان کا نام خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمہ اللہ علیہ ہوا۔ یہی تشریح ہے اس جملہ کی کہ اولاد کی پہلی تربیت گاہ ماں کی گود ہوتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں باپ کو اولاد کی تربیت کے بارے میں کسی قدر حساس رہنے کی تعلیم دی۔ اس کا اندازہ حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہوتا ہے فرمایا کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر تشریف فرما تھے تو میری والدہ نے مجھے پکارا اور کہا، ادھر آؤ میں کوئی چیز دوں گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نے اس بچے کو کیا چیز دینے کا ارادہ کیا تھا؟ والدہ نے کہا ایک کھجور دینے کا ارادہ کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کہنے کے بعد اگر تم کوئی چیز بچہ کو نہ دیتیں تو تمہارے نامہ اعمال میں ایک

جھوٹ لکھا جاتا۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہوا کہ بچوں کو بہلانے کے لیے بھی جھوٹ استعمال کرنے کی اجازت نہیں۔

جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق اسے نماز پڑھنے کی پابندی کرانی چاہیے آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جب بچہ دس سال کا ہو جائے تو نماز کے بارے میں سختی بھی کریں۔ اس طرح جب بچہ باشعور ہو گا تو اس کو عبادت کی عادت ہو گی۔ جب سکول، مدرسہ میں تعلیم کا وقت آئے تو اس کی عادات پر والدین کی گہری نظر ہونی چاہیے۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے پر بھی نگاہ رکھنی چاہیے تاکہ خراب ماحول سے آلودہ نہ ہو جائے۔ قرآن حکیم کی تلاوت اور مختلف گناہوں سے پرہیز کی تلقین کے ساتھ ساتھ گھر کے ماحول کو مکمل طور پر دینی اور اخلاقی قدروں سے آراستہ رکھنا چاہیے۔ جس میں صبر و شکر، قناعت، ہمدردی جیسی صفات ہوں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کی اولاد کو نیک، فرمانبردار اور دیندار بنائے۔



والدین کی طرف سے اولاد کے لیے بہترین تحفہ

﴿عن ایوب بن موسیٰ عن ابیه عن جده ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال مانحل والد ولداً من نحلٍ افضل من ادبٍ حسنٍ﴾ (رواه الترمذی)

''حضرت ایوب بن موسیٰ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کسی باپ نے اپنی اولاد کو حسن ادب سے بہتر تحفہ انعام میں نہیں دیا''۔

اولاد کی تربیت کس قدر اہم ہے اس کا اندازہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ہوتا ہے:

''اے ایمان والو تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔''

آگ سے بچانے کی صورت تو صرف یہی ہے کہ انہیں اچھے اخلاق و آداب سکھا کر سچا مسلمان بنایا جائے تاکہ وہ جہنم کا ایندھن نہ بنیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کوئی باپ اپنے بچے کو حسن آداب سے بہتر عطیہ نہیں دے سکتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا: ''اولاد کا باپ پر یہ بھی حق ہے کہ وہ اس کی صحیح تربیت کرے اور اچھا سا نام رکھے۔ ماں کی گود بچے کے لیے پہلی تربیت گاہ ہے' اخلاق کی جو تربیت ماں کی گود میں ہو جاتی ہے اسی پر بچے کی شخصیت پروان چڑھتی ہے، اسی تربیت پر کسی بچہ کی سیرت کے بننے یا بگڑنے کا انحصار ہوتا ہے۔ اسی لیے ماں کا یہ اہم فریضہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اسلامی اخلاق کی تربیت دے۔ ماں اور باپ دونوں بچے کے سامنے حسن اخلاق کا نمونہ پیش کریں تاکہ ان کی اولاد عمدہ اخلاق کی حامل ہو۔ ان کا یہ فرض ہے کہ بچوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرائیں۔ انہیں اسلام کے عقائد سکھائیں اور پھر ان پر عمل بھی کرائیں۔ اس لیے حدیث

شریف میں آتا ہے کہ جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو اس کو نماز کی تلقین کرنی چاہیے اور جب وہ دس سال کا ہو جائے تو نماز نہ پڑھنے پر اسے سزا دی جائے۔

اسلام میں اولاد کی صحیح تربیت کی بڑی تاکید ہے چونکہ اس تربیت نے ہی اسلام کا شیدائی بنانا ہے اس لیے تربیت اولاد ایک انتہائی اور بنیادی ذمہ داری ہے جو والدین پر نہ صرف اسلام عائد کرتا ہے بلکہ اولاد کی صحیح تربیت کا فریضہ ملک وملت کی طرف سے بھی عائد ہوتا ہے۔ چونکہ بری صحبت سے برے شہری پیدا ہوتے ہیں جو ملک پر بار ہوتے ہیں اگر تربیت صحیح اصولوں پر ہو جائے تو یہی بچے اپنے ملک اور ملت کا نام روشن کرنے والے ہوں گے اور قوم کو ان پر فخر ہوگا۔

اولاد کی تربیت ایک دینی فریضہ بھی ہے۔ حدیث کی رو سے بچہ اپنے والدین پر کچھ خرچ کرے تو صرف بچے کو ہی نہیں بلکہ والدین کو بھی ثواب ملتا ہے۔ والدین کو اس بات کا ثواب ملے گا کہ بچے کو نیک تربیت دی کہ والدین کی خدمت بجا لا رہا ہے اور یہ کہ والدین نے اسے دولت کمانے کا طریقہ سکھایا اور اسے اس قابل بنایا۔ نیک اولاد صدقہ جاریہ ہے یعنی جاری رہنے والی خیرات ہے۔ حدیث شریف میں ہے ''جب چند لوگوں کا درجہ چند دوسرے لوگ بلند دیکھیں گے تو پوچھیں گے کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ تو جواب ملے گا تمہاری اولاد نے تمہارے لیے جو استغفار کیا ہے یہ اس کی وجہ سے ہے۔'' (ترمذی)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی جس انداز سے تربیت و پرورش فرمائی وہ سارے انسانوں کے لیے ایک بہترین نمونہ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جناب فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا سب عورتوں سے عقلمند ہیں۔ وہ اپنے طرزِ کلام، حسن خلق، اسلوب گفتگو، خشوع وخضوع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پاکیزہ زندگیاں مسلمانانِ عالم کے لیے بہترین نمونہ ہیں۔ ان سب نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت سے فیض حاصل کیا۔

اولاد کا والدین پر یہ بھی حق ہے کہ وہ حیثیت کے مطابق اولاد کو مروجہ تعلیم بھی دلائیں اور دینی تعلیم کا بھی بندوبست کریں۔علم وہ دولت ہے جس سے انسان کی صلاحیتیں اجاگر ہوتی ہیں اور وہ انسانیت کے زیور سے آراستہ ہوتا ہے۔ جہاں اس تعلیم سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ انسان انسان بن جاتا ہے وہاں اس کا یہ بھی فائدہ ہے کہ حصول معاش میں آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور یہ اولاد بڑھاپے میں والدین کا سہارا بن جاتی ہے۔سب سے بڑھ کر آج سائنس اور ٹیکنالوجی کے زمانے میں بغیر علم کے ملک کے کسی بھی شعبہ میں انسان خدمت نہیں کرسکتا۔کسی ملک کی ترقی کے لیے اس بات کی ضرورت بنیادی طور پر ہے کہ اس کے افراد تعلیم یافتہ ہوں اور ان میں ماہرین فن بھی ہوں اور ماہرین تعلیم بھی تاکہ ملک کے منصوبے پورے ہوسکیں۔

بچوں کو تعلیم دلانا گویا کہ ایک ملی فریضہ بھی ہے جسے ہر ماں باپ کو ادا کرنا چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کو بڑی اہمیت دی۔ بدر کے قیدیوں کا فدیہ یہ فرمایا کہ وہ مسلمانوں کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں حصول تعلیم میں تکلیفیں اٹھانے والوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے کا درجہ دیا۔شرط صرف اتنی ہے کہ اس طلب علم کا مقصد نیک ہو۔

اولاد کا یہ بھی حق ہے کہ والدین ان سے محبت وشفقت کا اظہار کریں اور ان پر رحم کرنا مسلمان ہونے کی نشانی ہے۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کا احترام نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوہ بھی یہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بچوں سے محبت کیا کرتے تھے۔

ایک دن ایک دیہاتی حاضر خدمت ہوا بچوں کو پیار کرتے دیکھ کر پوچھا کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم بچوں کو چومتے اور پیار کرتے ہیں؟ ہم تو ایسا نہیں کرتے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اس پر قادر نہیں ہوں کہ تیرے دل سے اللہ تعالیٰ نے جو رحم نکال لیا ہے پھر تیرے دل میں رکھ دوں۔

ایک صحابیؓ کا بیان ہے کہ میں نے ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کی حالت میں دیکھا آپ کی نواسی امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھے پر تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت رکوع اور سجدہ میں جاتے تو انہیں زمین پر بٹھا دیتے اور جب کھڑے ہوتے تو پھر کندھے پر اٹھا لیتے۔ ذرا اندازہ لگائیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کا۔

اولاد سے محبت ایک فطری بات ہے مگر اس میں اعتدال سے گزر جانا تباہ کن چیز ہے۔ انسان کو یہ محبت راہ ہدایت سے بھی گمراہ کر دیتی ہے۔ اولاد میں انسان کے لیے بڑی آزمائش ہے۔ جو اس میں پورا اترا وہ کامیاب ہوا۔ یہ اولاد ہی تو ہے جو انسان کو حرام روزی کمانے پر مجبور کرتی ہے۔ پھر انہی کی محبت میں گرفتار ہو کر آدمی فرائض کی بجا آوری میں کوتاہی کرتا ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿انمآ اموالکم واولادکم فتنة﴾ (تغابن: ۱۵)

''تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تمہارے لیے آزمائش ہیں۔''

اسلام اموال اور اولاد کی محبت میں اعتدال اور میانہ روی کا راستہ تجویز کرتا ہے۔ اس کے برعکس عمل سے انسان کو سراسر گھاٹا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے روز حرام روزی مہیا کرنے والے آدمی کے ساتھ سب سے پہلے اس کے اہل وعیال جھگڑا کریں گے اور گناہوں کی تمام تر ذمہ داری اس پر ڈال دیں گے۔

والدین کا یہ فرض ہے کہ اپنے تمام بچوں سے یکساں اور عدل و انصاف والا سلوک کریں۔ اسلام میں لڑکے اور لڑکی یا چھوٹے اور بڑے کی کوئی تمیز نہیں، سب کے حقوق یکساں ہیں، اسلام نے لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کے مقابلے میں ترجیحی سلوک کو روا نہیں رکھا۔ اسلام پہلا مذہب ہے جس نے لڑکیوں کو وراثت میں حق دلایا۔ اپنی اولاد میں کسی ایک کو کوئی چیز دے دینا اور دوسروں کو اس سے محروم رکھنا جائز نہیں، اسے ظلم قرار دیا گیا کیونکہ یہ انصاف کے خلاف ہے۔

ایک مرتبہ ایک صحابیؓ نے اپنے ایک بیٹے کو ایک غلام دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آ کر عرض کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے گواہ رہیئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کیا دوسرے بچوں کو بھی ایک غلام دیا ہے؟ اس نے عرض کیا ''نہیں'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں اس ظلم کا گواہ نہیں بننا چاہتا۔''

اولاد کے درمیان ناانصافی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ بہن بھائیوں میں عداوت اور دشمنی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں جس سے گھر کا سکون ختم ہو جاتا ہے اور وہ بچہ جس سے ناروا سلوک کیا گیا ہے والدین سے نفرت کرنے لگے گا۔ یہ بات اس کی اور والدین کی زندگی پر بری طرح اثر انداز ہو گی۔

لہٰذا ایک اچھے معاشرے کی تشکیل کے لیے اولاد کی تربیت عمدہ خطوط میں کرنا والدین کا ایک اہم فریضہ ہے۔

اللہ رب العزت ہمیں دین اسلام کے مطابق بہترین طرزِ عمل اختیار کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔



ہمسایہ کے حقوق کی ادائیگی خوشحال معاشرہ کی ضمانت ہے

﴿عن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیر الا صحاب عنداللہ خیرھم لجارہ﴾ (رواہ الترمذی)

''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہترین ساتھی وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لیے بہتر ہو اور بہتر پڑوسی وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لیے بہتر ہو۔''

ہمسایہ اور پڑوسی کو عربی میں جار کہتے ہیں جس کی جمع جیران ہے۔ اس سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جو ایک شخص کے قرب و جوار میں رہتے ہوں۔ لغوی اعتبار سے شریک کار اور شریک سفر کو بھی ہمسایہ کہا جاتا ہے۔ مگر عام اصطلاح میں ہمسایہ یا پڑوسی صرف ان ہی لوگوں کو کہا جاتا ہے جن کے مکان ایک دوسرے سے ملحق اور آمنے سامنے ہوں۔ مگر اسلامی لحاظ سے ہمسائیگی کی حدود اپنے مکان سے چاروں طرف چالیس گھر تک ہے۔

ان تمام پڑوسیوں میں زیادہ حق اسی پڑوسی کا ہے جو زیادہ قریب ہو اور رشتہ دار بھی ہو۔ ایک دفعہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! میرے دو پڑوسی ہیں، اگر میں تحفہ یا ہدیہ بھیجنا چاہوں تو کس کو بھیجوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کا گھر تمہارے گھر کے قریب تر ہو۔ (بخاری)

قرآن مجید میں بھی ''جار ذی القربی'' اور ''جار الجنب'' کا ذکر آیا ہے یعنی

رشتہ دار ہمسایہ اور غیر رشتہ دار ہمسایہ۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اللہ تعالیٰ اور روزِ جزاء پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے۔ (بخاری)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر یقین رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہ دے۔ (بخاری)

ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ جبرئیل علیہ السلام مجھے ہمسایہ کے بارے میں یہاں تک تاکید کرتے رہے کہ مجھے گمان ہوا کہ ہمسایہ کو وارث قرار دے دیا جائے گا۔

ارشاد فرمایا کہ جسے یہ پسند ہو کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اس سے محبت کرے یا جسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبت کا دعویٰ ہو اسے چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کا حق ادا کرے۔ (مشکوٰۃ)

ایک اور حدیث میں فرمایا قیامت کے دن جن دو آدمیوں کا مقدمہ سب سے پہلے پیش ہوگا وہ دو پڑوسی ہوں گے۔ (مشکوٰۃ)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ساتھیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لیے بہتر ہو اور پڑوسیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لیے بہتر ہو۔ (ترمذی)

ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک دن صحابہ کرامؓ نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں کیسے معلوم ہو کہ ہم اچھے کام کر رہے ہیں یا برے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اپنے پڑوسی کو اپنی نسبت اچھا کہتے سنو تو سمجھو کہ اچھا کر رہے ہو اور جب برا کہتے سنو تو سمجھو کہ برا کر رہے ہو۔ (ابن ماجہ)

ایک حدیث میں یہ ہے کہ بخدا وہ ایماندار کہلانے کا مستحق نہیں جس کا پڑوسی اس کے غضب اور شر سے محفوظ نہیں۔ (بخاری)

ایک حدیث میں یہ ہے کہ تم میں سے کوئی اس وقت تک مؤمن نہیں ہوگا جب تک اپنے پڑوسی کے لیے عزیز نہ جانے جو اسے عزیز تر ہے۔ (مسلم)

ان احادیث سے حقوق ہمسایہ کی اہمیت پوری طرح واضح ہو رہی ہے۔ پڑوسیوں کا ایک حق یہ ہے کہ ان کے ساتھ اچھا اور نیک سلوک کیا جائے۔ حسن سلوک کی بہت سی صورتیں ہوتی ہیں پڑوسی ان سب کے مستحق ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو شخص اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر یقین رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے پڑوسی سے حسن سلوک کرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ ہمسایہ کا حق صرف یہی نہیں کہ اسے ستایا نہ جائے بلکہ اس کے ساتھ احسان بھی کیا جائے۔

پڑوسیوں کا اہم ترین حق یہ ہے کہ ان کی ہر قسم کی مدد کی جائے۔ اس میں جسمانی خدمت اور مالی اعانت وغیرہ سب شامل ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تمہارا پڑوسی تمہاری مدد کا محتاج ہو اس کی مدد کرو اور قرض مانگے تو قرض دو۔ وہ شخص کامل مؤمن نہیں جو خود سیر ہو کر کھائے اور اس کا ہمسایہ بھوکا رہے۔ جب تم سالن پکاؤ تو اس میں پانی ذرا زیادہ ڈال دو اور اس میں سے کچھ پڑوسی کے گھر بھیج دو۔

پڑوسی کا ایک حق یہ ہے کہ جب وہ بیمار ہو تو اس کی بیمار پرسی کی جائے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب ہمسایہ بیمار ہو تو اس کی تیمارداری اور عیادت کی جائے۔

خوشگوار ہمسائیگی کے لیے تحفوں کا بھیجنا بھی مفید ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ ایک دوسرے کو تحفے بھیجا کرو اس سے آپس میں محبت پیدا ہو گی۔ ان ہدیوں کا قیمتی ہونا ضروری نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''تم میں کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے لیے ہدیئے کو حقیر نہ سمجھے خواہ وہ بکری کا کھر ہی کیوں نہ ہو۔''

یہ تحفے اس صورت میں بھی دیئے جا سکتے ہیں کہ گھر میں جو پھل وغیرہ اپنے بچوں کے لیے لائے جاتے ہیں ان میں سے تھوڑا سا اپنے قریبی ہمسایوں کو بھی بھیج دیا جائے اس عمل سے ہمسایوں کے دلوں میں محبت اور الفت پیدا ہو جائے گی۔

ایک ہمسائے کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں کی عزت و آبرو کی حفاظت کرے۔ نہ تو خود کسی کی عزت پر دست درازی کرے اور نہ کسی اور کو کرنے دے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑوسیوں کے ساتھ برائی کا گناہ زیادہ بتایا ہے۔ یہ وعید اس لیے ہے کہ ایک پڑوسی کو دوسرے پڑوسیوں کی عزت و ناموس کا خود محافظ ہونا چاہیے۔

ہمسایوں کا ایک اہم ترین حق یہ ہے کہ انہیں تکلیف نہ پہنچائی جائے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہ دے۔

ہمسائے کو ستانے اور تکلیف دینے والا دوزخ میں جائے گا۔ نماز، روزہ، صدقہ اور خیرات کی کثرت کے باوجود ہمسایہ کو تکلیف دینے والے کاموں سے منع کیا گیا ہے۔ وہ کام درج ذیل ہیں۔ مکان کی دیوار اتنی بلند نہ کرنا کہ ہمسایہ کو رکاوٹ کی وجہ سے تکلیف ہو باورچی خانہ ایسی جگہ نہ بنایا جائے کہ ہمسائے کے گھر میں دھواں جائے اور اسے تکلیف ہو اگر ہمسایہ کے گھر میوہ وغیرہ نہ بھیجا جا سکے تو اسے پوشیدہ رکھنا اور بچوں کو میوہ لے کر باہر نہ نکلنے دینا تاکہ ہمسایہ کے بچے رنجیدہ نہ ہوں۔ غرضیکہ ہمسائے کو زبان، ہاتھ یا کسی فعل سے تکلیف نہ پہنچائی جائے۔

اسلام کی تعلیم میں ہمسایوں کا حق صرف یہی نہیں کہ انہیں تکلیف نہ پہنچائی جائے بلکہ یہ بھی ہے کہ اگر ان کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچے اور وہ کوئی زیادتی کریں تب بھی صبر و تحمل سے کام لیا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بات کی تلقین فرمائی ہے۔ ایک صحابیؓ نے تین مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے پڑوسی کی شکایت کی کہ وہ مجھے ستاتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تینوں مرتبہ یہی فرمایا کہ صبر کرو، چوتھی مرتبہ شکایت کرنے پر فرمایا کہ اپنا سامان راستے میں ڈال دو۔ (یعنی گھر چھوڑنے کی صورت بناؤ)۔ انہوں نے ایسا ہی کیا آنے جانے والوں نے پوچھا کیا بات ہے؟ انہوں نے صورت حال بتائی' سب نے پڑوسی کو برا بھلا کہا یہ دیکھ کر وہ شرمندہ ہوا اور اس کو منا کر گھر واپس لے گیا اور آئندہ نہ ستانے

کا وعدہ کیا۔

ہمسایوں کا ایک حق یہ ہے کہ ان کے عیبوں اور خامیوں پر پردہ ڈالا جائے اور جہاں تک ہو سکے ان کے عیبوں کو مشتہر نہ کیا جائے۔ ہمسائے قریبی ہوتے ہیں اور قریب ہونے کی وجہ سے ان کی اچھائیاں اور برائیاں سبھی دوسرے ہمسایوں کو معلوم ہوتی ہیں۔ اگر پردہ پوشی نہ کی جائے تو ظاہر ہے کہ ان کا مقام محلے میں گر جائے گا اور یہ اچھی بات نہیں۔

ایک ہمسائے کا فرض یہ ہے کہ اپنے ہمسائے کو نیکی کی تلقین کرے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ نیک اور عبادت گزار لوگوں کے ہمسائے قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں فریاد کریں گے کہ ہمارے ان نیک ہمسایوں نے خود تو تیرے احکامات کی پیروی کی لیکن ہمیں ان کی تلقین نہ کی جس کی وجہ سے آج ہم جہنم کے مستحق ٹھہرائے جا رہے ہیں اور وہ مطالبہ کریں گے کہ ان کی بجائے ان کے نیک پڑوسیوں کو جہنم میں ڈال دیا جائے۔

ہمسایوں کے حقوق کے بارے میں حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر کوئی ہمسایہ وفات پا جائے تو دوسرے ہمسائے اس کی تجہیز و تکفین میں شرکت کریں اور جنازے کے ہمراہ جائیں۔

پڑوسیوں کے حقوق ادا کرنے سے اچھے تعلقات اور خوشگوار ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ رنج والم اور بیماری و افلاس یا دوسرے مصائب اگر کبھی کسی کو پیش آئیں تو ایک دوسرے کی امداد سے وہ بہت جلد ختم ہو جاتے ہیں۔ پڑوسی کے حقوق ادا کرنے سے معاشرہ میں سکون اور خوشحالی کی فضاء پیدا ہوتی ہے۔ جہاں انسان سکھ اور چین کی زندگی گزارتے ہیں اور خدا کی رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہوتا ہے۔

☆☆☆

توبہ واستغفار کے بارے میں اسوۂ حسنہ

﴿عن ابی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله عليه وسلم والله انی لا ستغفر الله و اتوب اليه فی اليوم اكثر من سبعين مرة﴾ (رواه البخاری)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا خدا کی قسم میں دن میں ستر دفعہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں توبہ اور استغفار کرتا ہوں۔''

اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی، جلال و جبروت کے بارے میں جس بندے کو جس طرح کا شعور و احساس ہوگا وہ اپنے آپ کو اس درجہ ادائے حقوق عبدیت میں قصوروار سمجھے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار اور مسلسل توبہ و استغفار کی طرف متوجہ رہتے تھے اور اس کا اظہار فرما کر دوسروں کو بھی اس طرف متوجہ کرتے اور تلقین فرماتے تھے جیسے کہ ایک دوسری روایت میں اغرالمزنیؓ سے منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اے لوگو! اللہ کے حضور میں توبہ کرو میں خود دن میں سو سو دفعہ اس کے حضور میں توبہ کرتا ہوں۔ یہ ستر اور سو کی تعداد دراصل کثرت کو بیان کرنے کے لیے ہے اور قدیم عربی زبان کا عام محاورہ ہے ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے توبہ و استغفار کی تعداد یقیناً اس سے بہت زیادہ ہوتی تھی۔ یہ تو اس ذات کا حال ہے جس کے کوئی گناہ ہیں ہی نہیں۔ دراصل اس طرح کی روایات سے امت کو تعلیم دینا مقصود ہے کہ ہمیں ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا اور توبہ و استغفار کرنا چاہیے کیونکہ توبہ و استغفار نہ کرنے کی صورت میں گناہوں کی سیاہی رفتہ رفتہ انسان کے دل پر چھا جاتی ہے اسی بناء پر ایک حدیث میں فرمایا گیا مومن بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے پھر اگر اس نے اس گناہ سے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں معافی و بخشش کی التجاء اور استدعاء کی تو وہ سیاہ نقطہ زائل ہو کر قلب صاف ہو جاتا ہے اور اگر اس

نے گناہ کے بعد توبہ واستغفار کے بجائے مزید گناہ کیے اور گناہوں کی وادی میں قدم بڑھائے تو دل کی وہ سیاہی اور بڑھ جاتی ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی وہ زنگ ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

﴿کلا بل ران علی قلوبھم ما کانوا یکسبون﴾

''کہ ان لوگوں کی بدکاریوں کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ اور سیاہی آ گئی ہے۔''

اور کسی مسلمان کے لیے بلاشبہ یہ انتہائی بدبختی کی بات ہے کہ گناہوں کی ظلمت اس کے دل پر چھا جائے اور اس کے قلب میں اندھیرا ہی اندھیرا ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس سے حفاظت فرمائے (آمین) دراصل خطاء اور لغزش آدمی کی فطرت میں داخل ہے کوئی ابن آدم اس سے مستثنیٰ نہیں ہے لیکن وہ بندے بڑے اچھے اور خوش نصیب ہیں جو خطاء وقصور اور گناہ کے بعد نادم ہو کر اپنے مالک کی طرف رجوع کرتے ہیں اور توبہ واستغفار کے ذریعہ اس کی رضاء ورحمت حاصل کرتے ہیں اسی کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں یوں فرمایا کہ ہر آدمی خطا کار ہے اور خطا کاروں میں وہ بہت اچھے ہیں جو مخلصانہ توبہ کریں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو جائیں۔ اس بناء پر ہم سب کو چاہیے کہ خود بھی توبہ واستغفار کریں اور دوسروں کو بھی توبہ واستغفار کی طرف متوجہ کریں تاکہ ہمارے گناہوں کی نحوست کی وجہ سے آج امت مسلمہ جن پریشانیوں اور تکلیفوں سے دوچار ہے وہ چاہے مہنگائی کی صورت میں ہوں، چاہے بے رحم حکمرانوں کی صورت میں ہوں یا بہت سے علاقوں میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے قحط سالی کے عذاب کی صورت میں ہوں یا یہود ونصاریٰ کے ہم پر تسلط کی صورت میں ہوں، اللہ تعالیٰ توبہ واستغفار کی برکت سے اس طرح کی سب پریشانیوں اور تکلیفوں سے ہماری خلاصی کروا دیں گے پھر استغفار کے لیے یہ مسنون الفاظ بہت مناسب ہیں جس کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس بندے نے ان الفاظ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ واستغفار کیا

﴿استغفر الله الذی لا اله الا هو الحی القیوم واتوب الیه﴾

تو اس بندہ کو ضرور بخش دیا جائے گا اگرچہ اس نے میدان جنگ سے بھاگنے کا گناہ کیا ہو۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توبہ واستغفار کرنے والا بنادے۔ آمین

☆☆☆

حق گوئی کا سلیقہ

﴿عن ابی سعید الخدری رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلمل افضل الجهاد من قال کلمة حق عند سلطان جائر﴾ (رواه الترمذی، و ابو داؤد)

''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہترین جہاد یہ ہے کہ ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہے۔''

لیکن دور حاضر میں لوگ بسا اوقات حق بات بیان کرنے سے اس لیے روک دیتے ہیں کہ اس سے فتنہ پیدا ہوگا اب ایسے مرحلہ میں کیا کرنا چاہیے۔اس بات کا جواب شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

''حق بات،حق طریقے سے،حقانیت سے کہی جائے تو کبھی فتنہ پیدا نہیں ہوگا۔''

اس بات سے معلوم ہوا کہ بات حق کہی جائے' نیت حق ہو اور پھر طریقۂ بیان بھی حق ہو تو اس کا اثر ضرور ہوگا اگر کسی جگہ حق کہنے کے نتیجہ میں فتنہ کھڑا ہو، جھگڑا پیدا ہو جائے تو جان لینا چاہیے کہ ان تین باتوں میں سے کوئی بات کم ہوگئی ہے۔

یا تو بات حق نہیں تھی یا بات حق تھی لیکن نیت حق نہیں تھی یعنی کسی کی تحقیر و تذلیل مقصود تھی یا نیت بھی حق تھی لیکن حق بیان کرنے کا طریقہ صحیح نہیں تھا۔

اگر یہ تینوں باتیں موجود ہوں تو حق بات میں بہرحال اثر ضرور ہوتا ہے۔اللہ رب العزت نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ امت کو دین حق عطا فرمایا اور اس پر ایمان لانے کا حکم فرمایا جب بندہ دین حق پر ایمان لے آتا ہے تو پھر اس مرد مومن کو زندگی بھر کے لیے حق گو اور حق پرست رہنے یعنی ہمیشہ حق بات کہنے اور حق بات ماننے کی تعلیم دی گئی۔

عام طور پر حق اور سچ کے الفاظ ایک ساتھ بولے جاتے ہیں لیکن قرآن حکیم کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سچ یعنی صدق کے مقابلہ میں کذب یعنی جھوٹ کا تذکرہ کیا اور حق کے مقابلہ میں باطل کا لفظ فرمایا جیسے سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا:

﴿قل جاء الحق وزهق الباطل﴾

''آپ فرما دیجئے کہ حق آ گیا اور باطل چلا گیا۔''

عربی لغت کے ماہر محققین کہتے ہیں کہ سچ کے لیے صدق اور حق دونوں لفظ استعمال ہو سکتے ہیں لیکن ان دونوں کے درمیان فرق بھی ہے اگر بات واقع کے مطابق ہو تو وہ صدق یعنی سچ کہلاتا ہے اور حق ہر وہ بات جو تجربہ، مشاہدہ اور دلیل کے ساتھ سچ اور درست ہو اور جو بات تجربہ مشاہدہ اور دلیل کے ساتھ سچ ثابت نہ ہو وہ باطل ہے یہی وجہ ہے کہ بندہ مومن کو سچ بولنے کا حکم دیا گیا اور ساتھ ہی حق بات کہنے اور حق بات پر ایمان لانے کا سبق بھی دیا گیا۔

اس لیے حق بات وہی ہوتی ہے جو ثابت و قائم اور اٹل ہو اور باطل کا معنی ہی مٹ جانا، قائم نہ رہنا، باقی نہ رہنا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ حق بات فرماتے تھے اور حق بات کہنے والے کو پسند فرماتے تھے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿اصدق کلمة قالها الشاعر کلمة لبید الا کل شی ما خلاالله باطل﴾

''یعنی سب سے سچی بات جو کسی شاعر نے کہی وہ لبید کا قول ہے کہ اس نے یہ شعر کہا آ گاہ رہو اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے بے ثبات ہے فانی ہے۔''

حق گوئی ایک ایسی خوبی ہے کہ یہی صفت اللہ تعالیٰ نے اپنی بھی بیان فرمائی۔ سورۂ احزاب کی آیت 6 میں فرمایا:

﴿و الله یقول الحق﴾

''اور اللہ حق بات کہتا ہے۔''

بلکہ اللہ کی صفت ہی حق ہے فذالکم الله ربکم الحق اس لیے کہ حق ہی ثابت اور قائم رہنے والا ہوتا ہے تو پھر اللہ ہی ہمیشہ قائم اور باقی رہنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام یعنی قرآن مجید کو حق کہا۔

﴿فقد جاء کم الحق من ربکم﴾

''تمہارے رب کی طرف سے حق آیا۔''

اور قرآن مجید میں مذکورہ واقعات کو بھی حق قرار دیا۔

سورہ آل عمران آیت 62 میں فرمایا:

﴿ان هذا لهو القصص الحق﴾

''بے شک یہ قصے بھی حق ہیں۔''

بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو مکمل دین حق قرار دیا ہے۔

اب بندہ مومن کی شان یہ ہے کہ وہ حق بات کہے یعنی دین اسلام کی بات کہے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام بتائے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے یعنی لوگوں کو جن باتوں کے کرنے کا حکم دین اسلام نے دیا وہ لوگوں کو بتائے اور جن باتوں سے اسلام نے منع کیا ان باتوں سے روکے۔

یہاں حق بات کہنے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہترین جہاد قرار دیا' ترمذی اور ابوداؤد میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿افضل الجهاد من قال کلمة حق عند سلطان جائر﴾

فرمایا کہ ''بہترین جہاد یہ ہے کہ بندہ ظالم بادشاہ کے سامنے بھی حق بات کہے۔''

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی حق بات کہنے کی پاداش میں بہت تکالیف برداشت فرمائیں مکہ میں کوہ صفا پر دعوت حق دینے کے بعد قریش مکہ نے کیا کیا مظالم کیے۔ شعب ابی طالب میں تین سال حق بات کہنے کی بنا پر کس قدر تکالیف اٹھائیں۔ پھر ہجرت کے بعد فتح مکہ تک تمام غزوات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جان نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہ اجمعین نے غزوہ بدر، احد، خندق، حنین، تبوک میں کس قدر جانوں کا نذرانہ پیش کیا اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کی ازواج مطہراتؓ نے حق گوئی اور حق پرستی میں کس قدر تکالیف اٹھائیں اور امت مسلمہ کے سامنے ثابت کر دیا کہ:

﴿افمن یھدی الی الحق احق ان یتبع﴾

”حق کا یہی تو حق ہے کہ حق بات کہنے والے کی پیروی کی جائے (اور حق و باطل کے درمیان خلط ملط نہ کیا جائے اور حق کو نہ چھپایا جائے)۔“

اور جب دین حق آ چکا تو اب ہر انسان ہر معاملہ میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے احکام کے مطابق زندگی گزارے۔

اللہ رب العزت ہم سب کو حق بات کہنے اور حق بات ماننے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین

بغیر اجازت دوسروں کی چیز لینے میں احتیاط کیجیے

عن ابی حرۃ عن عمہ قال قال رسولہ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا لاتظلموا لایحل مال امرء الابطیب نفس منہ.

(رواہ البیھقی فی شعب الایمان والدار قطنی فی المجتبیٰ)

”حضرت ابوحرہ رضی اللہ عنہ اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خبردار کسی پر ظلم وزیادتی نہ کرو! خبردار کسی آدمی کی ملکیت کی کوئی چیز اس کی دلی رضامندی کے بغیر لینا حلال اور جائز نہیں ہے۔ (شعب الایمان للبیہقی)

اگر کسی کی کوئی چیز قیمت دے کر لی جائے تو شریعت اور عرف میں اس کو بیع وشراء (خرید وفروخت) کہا جاتا ہے اور اگر اجرت اور کرایہ معاوضہ دے کر کسی کی چیز استعمال کی جائے تو شریعت اور عرف میں ''اجارہ'' ہے اور اگر بغیر کسی معاوضہ اور کرایہ کے کسی کی چیز وقتی طور پر استعمال کے لیے لی جائے اور استعمال کے بعد واپس کر دی جائے تو ''عاریت'' ہے۔ یہ سب صورتیں جائز اور صحیح ہیں اور ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات و ارشادات تفصیل سے موجود ہیں۔

لیکن کسی دوسرے کی چیز لے لینے کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ اس کی مرضی کے بغیر زبردستی اور ظالمانہ طور پر اس کی مملوکہ چیز لے لی جائے۔ شریعت کی زبان میں اس کو ''غصب'' کہا جاتا ہے اور یہ حرام اور سخت ترین گناہ ہے اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مندرجہ ذیل ہدایات ارشاد فرمائی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے کسی دوسرے کی کچھ بھی زمین ناحق لے لی تو قیامت کے دن وہ اس زمین کی وجہ سے (اور اس کی سزا میں) زمین کے ساتوں طبق تک دھنسایا جائے گا۔ (صحیح بخاری)

یہ مضمون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک دو لفظوں کے فرق کے ساتھ متعدد صحابہ کرامؓ سے مروی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کسی دوسرے کی زمین کا چھوٹے سے چھوٹا ٹکڑا بھی ناحق غصب کیا (اور ایک روایت میں ہے کہ اگر صرف بالشت بھر بھی غصب کیا) تو قیامت کے دن اس گناہ کی سزا میں وہ زمین میں دھنسایا

جائے گا اور آخری حد تک گویا تحت الثریٰ تک دھنسایا جائے گا۔ اللہ کی پناہ!

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ایک بڑا عبرت آموز واقعہ زمین کے غصب ہی کے بارے میں روایت کیا گیا ہے جس کا تعلق اس حدیث ہی سے ہے اور وہ یہ کہ ایک عورت نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کے خلاف (جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں) مدینہ کے اس وقت کے حاکم مروان کی عدالت میں دعویٰ کیا کہ انہوں نے میری فلاں زمین دبالی ہے۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ کو اس جھوٹے الزام سے بڑا صدمہ پہنچا، انہوں نے مروان سے کہا کہ کیا میں اس عورت کی زمین دباؤں گا اور غصب کروں گا؟ میں نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں سخت وعید سنی ہے (یہ بات حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے دل کے کچھ ایسے تاثر کے ساتھ اور ایسے انداز سے کہی کی کہ خود مروان بہت متاثر ہوا) اور اس نے کہا کہ اب میں آپ سے کوئی دلیل اور ثبوت نہیں مانگتا اس کے بعد حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے (دکھے دل سے) بددعا کی کہ اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ اس عورت نے مجھ پر یہ جھوٹا الزام لگایا ہے تو اس کو اس کی آنکھوں کی روشنی سے محروم کر دے اور اس کی زمین ہی کو اس کی قبر بنا دے۔ (واقعہ کے راوی حضرت عروہ کہتے ہیں کہ) پھر ایسا ہی ہوا، میں نے خود اس عورت کو دیکھا وہ آخری عمر میں نابینا ہوگئی اور خود کہا کرتی تھی کہ سعید بن زید کی بددعا سے میرا یہ حال ہوا ہے اور پھر ایسا ہی ہوا کہ وہ ایک دن اپنی زمین ہی میں چلی جا رہی تھی کہ ایک گڑھے میں گر پڑی اور بس وہ گڑھا ہی اس کی قبر بن گیا۔ (صحیح بخاری ومسلم)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس نے کسی کی کوئی چیز چھین لی اور لوٹ لی وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

(جامع ترمذی)

اگر دل میں ایمان کا ذرہ ہو تو یہ وعید انتہائی سخت وعید ہے کہ کسی چیز کا چھیننے والا اور غصب کرنے والا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں میں سے نہیں ہے، جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سے الگ اور دور کر دیا وہ بڑا محروم اور

بد بخت ہے۔ سائب بن یزید اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی اپنے دوسرے بھائی کی لکڑی، چھڑی بھی نہ لے نہ ہنسی مذاق میں اور نہ لینے کے ارادہ سے پس اگر لے لے تو اس کو واپس لوٹائے۔

مطلب یہ ہے کہ کسی بھائی کی لکڑی اور چھڑی کی طرح کی حقیر اور معمولی چیز بھی بغیر اس کی مرضی اور اجازت کے نہ لی جائے، ہنسی مذاق میں بھی نہ لی جائے اور اگر غفلت یا غلطی سے لی گئی ہو تو واپس ضرور لوٹائی جائے یہ نہ سمجھا جائے کہ ایسی معمولی چیز کا واپس کرنا کیا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ہدایات کی اہمیت محسوس کرنے کی توفیق دے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند اصحاب و رفقاء کا گذر ایک خاتون کی طرف سے ہوا اور اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کھانا تناول فرمانے کی درخواست کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرما لیا تو اس نے ایک بکری ذبح کی اور کھانا تیار کیا (اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء کے سامنے حاضر کر دیا) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں سے ایک لقمہ لیا مگر اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حلق سے نہیں اتار سکے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ (واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے) یہ بکری اصل مالک کی اجازت کے بغیر ذبح کر لی گئی ہے۔ اس خاتون نے عرض کیا کہ ہم لوگ (اپنے پڑوسی) معاذ کے گھر والوں سے کوئی تکلف نہیں کرتے ہم ان کی چیز لے لیتے ہیں اور اسی طرح وہ ہماری چیز لے لیتے ہیں۔ (مسند احمد)

جیسا کہ دعوت کرنے والی خاتون کے جواب سے معلوم ہوا واقعہ یہی تھا کہ وہ بکری جو ذبح کی گئی تھی پڑوس کے ایک گھرانے آل معاذ کی تھی اور باہمی اعتماد و تعلق اور رواج و چلن کی وجہ سے ان سے اجازت لینے کی ضرورت محسوس نہیں سمجھی گئی اور بکری ذبح کر کے اور کھانا تیار کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء کے سامنے پیش کر دیا گیا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب پہلا ہی لقمہ اس میں سے لیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی

طبیعت مبارک نے اس کو قبول نہیں کیا اور وہ حلق سے اتر ہی نہیں سکا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ منکشف کر دیا گیا کہ یہ بکری اصل مالک کی اجازت کے بغیر ذبح کر لی گئی ہے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے کھانے پینے کی چیزوں کے بارے میں عام انسانوں کو ایک ذوق اور احساس دیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کڑوی کسیلی چیزوں کا کھانا اور حلق سے اتارنا مشکل ہوتا ہے، اسی طرح وہ اپنے بعض خاص بندوں کو جن کی وہ ناجائز غذاؤں سے حفاظت فرمانا چاہتا ہے ایسا ذوق عطاء فرما دیتا ہے کہ ناجائز غذا نہ ان سے کھائی جا سکتی ہے اور نہ حلق سے اتاری جا سکتی ہے۔

مذکورہ بالا واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لقمہ منہ میں لے لینے کے باوجود نہ کھا سکنا اللہ تعالیٰ کی اسی خاص الخاص عنایت کا ظہور تھا۔ امت کے بعض اولیاء اللہ سے بھی اسی طرح کے واقعات منقول ہیں۔ **ذالك فضل الله یو تیه من یشاء......** اس واقعہ میں یہ بات خاص طور پر قابل غور ہے کہ بکری نہ چرائی گئی تھی نہ غصب کی گئی تھی .... بلکہ باہمی اعتماد و تعلق اور رواج و چلن کی وجہ سے اجازت لینے کی ضرورت محسوس نہیں کیگئی تھی اور اسی طرح اس کو ذبح کر لیا گیا۔ اس کے باوجود اس میں ایسی خباثت اور خرابی پیدا ہوگئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو نہیں کھا سکے اور حلق سے نہیں اتار سکے۔ اس میں یہ سبق ہے کہ دوسروں کی چیز بغیر اجازت لے لینے اور استعمال کرنے کے بارے میں کس قدر احتیاط کرنی چاہیے۔



برکت مدینہ طیبہ

﴿عن ابی هريرة رضی الله عنه قال كان الناس اذا راو اول الثمر ة جاؤابه الى النبى صلى الله عليه وسلم فاذا اخذه قال اللهم بارك لنا فى مدينتنا وبارك لنا فى صاعنا وبارك لنا فى مدنا اللهم ان ابراهيم عبدك وخليلك ونبيك وانه دعاك لمكة وانا ادعوك للمدينة بمثل ما دعاك لمكة مثله ومعه قال: ثم يدعو اصغر وليدله فيعطيه ذالك الثمر﴾

(رواه مسلم)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگوں کا دستور تھا کہ جب وہ درخت پر نیا پھل دیکھتے تو اس کو لاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو قبول فرما کر اس طرح دعا فرماتے: اے اللہ! ہمارے پھلوں میں اور پیداوار میں برکت دے، اور ہمارے شہر مدینہ میں برکت دے، اور ہمارے صاع میں اور مد میں برکت دے، الٰہی! ابراہیم علیہ السلام تیرے خاص بندے اور تیرے خلیل اور تیرے نبی تھے اور میں بھی تیرا بندہ اور تیرا نبی ہوں۔

انہوں نے مکہ کے لیے تجھ سے دعا کی تھی اور میں تجھ سے مدینہ کے لیے ویسی ہی دعا کرتا ہوں اور اس کے ساتھ اتنی ہی مزید، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی چھوٹے بچے کو بلاتے اور نیا پھل اس کو دے دیتے۔'' (صحیح مسلم)

پھلوں اور پیداوار میں برکت کا مطلب تو ظاہر ہے کہ زیادہ سے زیادہ پیداوار ہو اور فصل بھرپور ہو اور شہر مدینہ میں برکت کا مطلب یہ ہے کہ خوب آباد ہو اور اس کے رہنے والوں پر اللہ کا فضل ہو اور صاع اور مد پیمانے ہیں۔ اس زمانہ میں غلہ وغیرہ کی خرید وفروخت ان پیمانوں ہی سے ہوتی تھی، ان میں برکت کا مطلب یہ ہے کہ ایک صاع ایک مد جتنے آدمیوں یا جتنے دنوں کے لیے کافی ہوتی تھی اس سے زیادہ دنوں کے لیے کافی ہو۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کا ذکر ہے جو آپ علیہ السلام نے اپنی بیوی بچے کو مکہ کی غیر آباد اور بے آب وگیاہ وادی میں بسا کر اللہ سے ان کے لیے کی تھی۔ ''اے اللہ! تو اپنے بندوں کے دلوں میں ان کی محبت ڈال دے، اور ان کی ضرورت کا رزق اور پھل وغیرہ پہنچا، اور یہاں ان کے لیے امن اور سلامتی مقدر فرما۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطور نظیر اس ابراہیمی دعا کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ سے مدینے کے لیے وہی دعا، بلکہ مزید اضافے کے ساتھ کرتے تھے۔ اس دعا کا یہ ثمرہ بھی ظاہر ہے کہ دنیا بھر کے جن ایمان والوں کو مکہ سے محبت ہے ان سب کو مدینہ سے بھی محبت ہے اور اس محبوبیت میں تو اس کا حصہ مکہ سے یقیناً زیادہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دعا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ کا بندہ، اس کا نبی اور اس کا خلیل کہا ہے اور اپنے کو صرف بندہ اور نبی کہا، حبیب ہونے کا ذکر نہیں کیا، یہ تواضع اور کسر نفسی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مستقل مزاج تھا۔

بالکل نیا اور درخت کا پہلا پھل چھوٹے بچے کو بلا کر دینے میں یہ سبق ہے کہ ایسے مواقع پر چھوٹے معصوم بچوں کو مقدم رکھنا چاہیے، اس کے علاوہ نیا پھل اور کمسن بچے کی مناسبت بھی ظاہر ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک مدینہ اپنے فاسد اور خراب عناصر کو اس طرح باہر نہ پھینک دے گا جس طرح لوہار کی بھٹی لوہے کے میل کو دور کر دیتی ہے۔
(صحیح مسلم)

یعنی قیامت آنے سے پہلے مدینہ کی آبادی کو ایسے خراب عناصر سے پاک صاف کر دیا جائے گا جو عقائد وافکار اور اعمال واخلاق کے لحاظ سے گندے ہوں گے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مدینہ کے راستوں پر فرشتے مقرر ہیں اس میں طاعون اور دجال داخل نہیں ہوسکتا۔
(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

صحیحین ہی کی بعض دوسری حدیثوں میں مدینہ طیبہ کی برکات میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ کے خلیل سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور اس کے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں مقدس ومبارک شہروں کے لیے کی تھی۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”جو اس کی کوشش کر سکے کہ مدینہ میں اس کی موت ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ اس کی کوشش کرے اور مدینہ میں مرے۔ میں ان لوگوں کی ضرور شفاعت کروں گا جو مدینہ میں مریں گے۔(اور وہاں دفن ہوں گے)۔ (مسند احمد، جامع ترمذی)

ظاہر ہے کہ یہ بات کہ موت فلاں جگہ آئے، کسی کے اختیار میں نہیں ہے تاہم بندہ اس کی آرزو اور دعا کرسکتا ہے اور کسی درجہ میں اس کی کوشش بھی کرسکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ جس جگہ مرنا چاہے وہیں جا کر پڑ جائے، اگر قضاء وقدر کا فیصلہ خلاف نہیں ہے تو موت وہیں آئے گی، بہرحال حدیث کا مدعا یہی ہے کہ جو شخص یہ سعادت حاصل کرنا چاہے وہ اس کے لیے اپنے امکان کی حد تک کوشش کرے، اخلاص کے ساتھ کوشش کرنے والوں کی اللہ تعالیٰ بھی مدد کرتا ہے۔

یحییٰ بن سعیدؒ انصاری تابعی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے قبرستان میں تشریف فرما تھے اور کسی میت کی قبر کھودی جا رہی تھی، ایک صاحب نے قبر میں

جھانک کر دیکھا اور اس کی زبان سے نکلا کہ مسلمان کے لیے یہ اچھی آرامگاہ نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ تمہاری زبان سے نہایت ہی بری بات نکلی۔ (کہ ایک مسلمان کو مدینہ میں موت اور قبر نصیب ہوئی اور تم کہتے ہو کہ مسلمان کے لیے یہ آرام گاہ اچھی نہیں)۔ ان صاحب نے بطور معذرت عرض کیا: حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) میرا مطلب یہ نہیں تھا (کہ مدینہ میں موت اور قبر اچھی نہیں) بلکہ میرا مقصد راہِ خدا میں شہادت سے تھا (یعنی میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ یہ مرنے والے بھائی اگر بستر پر مرنے اور قبر میں دفن ہونے کی بجائے جہاد کے کسی میدان میں شہید ہوتے اور ان کی لاش وہاں خاک وخون میں تڑپتی تو اس قبر میں دفن ہونے سے زیادہ اچھا ہوتا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا راہِ خدا میں شہید ہونے والوں کے برابر تو نہیں (یعنی شہادت کا مقام تو بے شک بہت بلند ہے لیکن مدینہ میں مرنا اور اس کی خاک میں دفن ہونا بھی بڑی سعادت ہے) روئے زمین پر کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں اپنی قبر کا ہونا مجھے مدینہ سے زیادہ محبوب ہو۔ یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین (۳) دفعہ ارشاد فرمائی۔ (موطا امام مالک)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ شہادت فی سبیل اللہ کی فضیلت وعظمت بے شک مسلم ہے اور بستر پر مرنا اور میدان جہاد میں اللہ تعالیٰ کے لیے سر کٹنا برابر نہیں، لیکن مدینہ میں مرنا اور یہاں دفن ہونا بھی بڑی خوش قسمتی ہے، جس کی خود مجھے چاہت اور آرزو ہے۔

امام بخاریؒ نے اپنی جامع صحیح بخاری میں کتاب الحج کے بالکل آخر میں مدینہ طیبہ کے فضائل کے سلسلہ کی حدیثیں ذکر کرنے کے بعد اس بیان کا خاتمہ امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی اس مشہور دعا پر کیا ہے کہ:

﴿اللھم ارزقنی شھادۃ فی سبیلک واجعل موتی فی بلد رسولک﴾

”اے اللہ! مجھے اپنی راہ میں شہادت بھی دے اور اپنے محبوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک شہر میں مرنا اور دفن ہونا بھی نصیب فرما۔“

اس دعا کا واقعہ ابن سعد نے صحیح سند کے ساتھ یہ روایت کیا ہے کہ عوف بن مالک

اشجعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خواب میں دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے ہیں انہوں نے یہ خواب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بیان کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بڑی حسرت سے کہا:

﴿انی لی بالشھادة وانا بین ظھر انی جزیرة العرب لست اغزو والناس حولی......﴾

''مجھے شہادت فی سبیل اللہ کیسے نصیب ہو سکتی ہے جب کہ میں جزیرۃ العرب کے درمیان مقیم ہوں (اور وہ سب دارالاسلام بن چکا ہے) اور میں خود جہاد نہیں کرتا اور اللہ کے بندے ہر وقت میرے آس پاس رہتے ہیں۔''

پھر خود ہی کہا:

﴿بلی یاتی بھا اللہ ان شاء ......﴾(فتح الباری بحوالہ ابن سعد)

''مجھے شہادت کیوں نصیب نہیں ہو سکتی اگر اللہ چاہے تو انہی حالات میں مجھے شہادت سے نواز دے گا۔''

اس کے بعد وہ دعا کی جو اوپر درج کی گئی ہے۔

آپؓ کی زبان سے یہ دعا سن کر آپؓ کی صاحبزادی ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا: ''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ راہِ خدا میں شہید بھی ہوں اور موت مدینہ میں بھی ہو؟'' آپؓ نے فرمایا: ''اللہ چاہے گا تو یہ دونوں باتیں ہو جائیں گی۔''

اس سلسلہ کی روایات میں یہ بھی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس دعا کو سن کر سب کو تعجب ہوا تھا اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ دونوں باتیں کس طرح ہو سکتی ہیں؟ جب ابولؤلؤ نے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی محراب میں آپؓ کو زخمی کیا، تب سب نے سمجھا کہ دعا کی قبولیت اسی طرح مقدر تھی۔

بے شک جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تو اس چیز کو واقع کر کے دکھاتا ہے جس کے امکان میں بھی انسانی عقلیں شبہ کریں۔ ان اللہ علی کل شئی قدیر.

آیئے ہم اپنی پریشانیوں کے لیے رو رو کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کریں

﴿عن انس قال کان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول اللّٰھم اِنی اعوذبك من الھم والحزن والعجز والکسل والجبن والبخل وضلع الدین وغلبۃ الرّجال﴾.(رواہ البخاری ومسلم)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح دعا فرمایا کرتے اے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں فکر سے، غم سے، کم ہمتی سے، کاہلی اور بزدلی سے، اور کنجوسی سے اور قرض کے بوجھ سے اور لوگوں کے دباؤ سے۔

اس دعا میں جن آٹھ چیزوں سے پناہ مانگی گئی ہے ان میں سے چار ایسی چیزیں ہیں جو حساس اور صاحب شعور آدمی کے لیے زندگی میں بے سکونی اور سخت اذیت کا باعث ہوتی ہیں اس کے کام کرنے کی قوت اور صلاحیتوں کو معطل کر کے رکھ دیتی ہیں جس کے نتیجہ میں وہ دنیا و آخرت کی بہت سی کامیابیوں اور سعادتوں سے محروم رہ جاتا ہے اور وہ چیزیں ہیں فکر و غم، قرضہ کا بوجھ اور مخالفین کا غلبہ اور باقی چار ایسی کمزوریاں ہیں جن کی وجہ سے آدمی وہ جرات مندانہ اقدامات اور محنت و قربانی والے اعمال نہیں کر سکتا جس کے بغیر نہ دنیا میں کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے اور نہ آخرت میں فوز و فلاح اور اللہ کی رضا حاصل ہوسکتی ہے۔

صحیح بخاری اور مسلم میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی دعا فرماتے تھے اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں سستی اور کاہلی سے، اور انتہائی بڑھاپے سے، قرضہ کے بوجھ سے اور ہر گناہ سے' اے اللہ میں تیری پناہ لیتا ہوں دوزخ کے عذاب سے اور دوزخ کے فتنہ سے اور عذاب قبر سے اور دولت و ثروت کے فتنے کے شر سے مفلس

ومحتاجی کے فتنہ کے شر سے اور فتنہ دجال کے شر سے۔

سنن ابوداؤد میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے تو ایک انصاری صحابی ابوامامہؓ کو مسجد میں بیٹھے دیکھا آپ نے فرمایا کیا بات ہے تم اس وقت جبکہ کسی نماز کا وقت نہیں ہے مسجد میں بیٹھے ہو؟ انہوں نے عرض کیا مجھ پر قرضوں کا بہت بوجھ ہے اور فکروں نے مجھے گھیر رکھا ہے۔ آپ نے فرمایا میں تمہیں ایسا دعائیہ کلمہ نہ بتادوں جس کے ذریعے دعا کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہیں ساری فکروں سے نجات دے دے اور تمہارے قرضے بھی ادا کردے ابوامامہ نے عرض کیا ضرور بتادیجئے آپ نے ارشاد فرمایا تم صبح وشام یہ دعاء اللہ تعالیٰ سے مانگا کرو۔

﴿اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْھَمِّ وَالْحُزْنِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْکَسَلِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنَ الْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ غَلَبَۃِ الدَّیْنِ وَقَھْرِ الرِّجَالِ﴾

’’اے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں فکر اور غم سے‘ سستی اور کاہلی سے‘ بزدلی اور کنجوسی سے اور پناہ مانگتا ہوں قرض کے غالب آنے سے اور لوگوں کے دباؤ سے‘‘۔

ابوامامہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت پر عمل کیا تو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے میری ساری فکریں ختم ہوگئیں اور میرا قرض بھی ادا ہوگیا۔

بسا اوقات انسان خصوصاً حق پر قائم رہنے کی کوشش کرنے والے شخص کو ایسے مواقع پیش آتے ہیں کہ وہ وقت کے ارباب اقتدار کے غصہ اور ناراضی کا نشانہ بن جاتا ہے اور ان کی طرف سے ظلم وزیادتی کا خطرہ اس کے لیے پریشانی کا باعث بن جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے طبرانی میں روایت منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کسی کو حاکم وقت کے ظلم وزیادتی کا خوف ہوتو اسے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرنی چاہئے۔

﴿اَللّٰھُمَّ رَبَّ السَّمٰوَاتِ السَّبْعِ وَرَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ کُنْ لِیْ

جَارًا مِنْ شَرِّ فُلَانِ بْنِ فُلَانٍ وَشَرِّ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَاَتْبَاعِهِمْ اَنْ يَفْرُطَ عَلَيَّ اَحَدٌ مِّنْهُمْ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى عَزَّ جَارُكَ وَجَلَّ ثَنَاءُكَ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُكَ.﴾

''اے اللہ، ساتوں آسمان اور عرش عظیم کے مالک فلاں بن فلاں (حاکم) کے شر سے اور سارے شریر انسانوں اور جنوں اور ان کے پیروکاروں کے شر سے حفاظت فرما اور مجھے اپنی پناہ میں لے لے کہ ان میں سے کوئی مجھ پر ظلم اور زیادتی نہ کرسکے جو تیری پناہ میں ہے وہ باعزت ہے تیری ثنا باعزت ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں''۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے متفق علیہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کی پناہ مانگو بلاؤں کی سختی سے، بدبختی کے لاحق ہونے سے، بری تقدیر سے اور دشمنوں کی ہنسی سے، اس حدیث میں چار چیزوں سے پناہ مانگنے کی تلقین فرمائی ہے درحقیقت دنیا اور آخرت کی کوئی برائی اور کوئی تکلیف، کوئی مصیبت، اور کوئی پریشانی ایسی نہیں جو ان چار عنوانوں کے علاوہ ہو۔

بلاء ہر اس حالت کا نام ہے جو انسان کے لیے باعث تکلیف اور موجب پریشانی ہو جس میں آزمائش ہو یہ دنیوی بھی ہوسکتی ہے اور دینی بھی، روحانی بھی ہوسکتی ہے اور جسمانی بھی، انفرادی بھی ہوسکتی ہے اور اجتماعی بھی لہٰذا بلاء کا لفظ تمام مصائب تکالیف اور آفات کو شامل ہے۔ اس کے بعد دوسری چیز جس سے پناہ مانگنے کی تلقین فرمائی گئی ہے وہ بدبختی کا لاحق ہونا۔ تیسری چیز بری تقدیر سے، اور آخری چیز جس سے پناہ مانگنے کا حکم فرمایا وہ شماتۃ الاعداء ہے یعنی کسی مصیبت اور ناکامی پر دشمنوں کا ہنسنا آج ہم ان تمام مصیبتوں میں گھرے ہوئے ہیں جن سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگنے کا حکم فرمایا کہیں دولت کا فتنہ سیلاب کی طرح آرہا ہے ہر فرد قرض کے بوجھ تلے دبا نظر آتا ہے۔ گھر کا غم' اولاد کا غم' دفتری اور کاروباری فکر' ہر شعبہ میں کاہلی اور سستی کا وجود، اور پھر ہر شخص اپنے اوپر دوسرے لوگوں کا دباؤ محسوس کرتا ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں کم ہمتی سامنے آرہی ہے۔

بزدلی کے خول کو اتار کر مسلمان کشمیر اور افغانستان میں اللہ کے کلمہ کی سربلندی کے خواب دیکھ رہا تھا کہ ایک وقت ایسا بھی آ گیا کہ دشمن ہماری اندرونی کشمکش اور ملکی فسادات پر خوش ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطاء فرمائے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات پر عمل کرتے ہوئے ان تمام چیزوں سے پناہ مانگیں۔

☆☆☆